تاریخ

دعوت و عزیمت

حصّہ سوم

حضرت خواجہ مُعین الدین چشتی رح
سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح
حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رح
سوانح حیات، صفات و کمالات و تجدیدی و
اِصلاحی کارنامے،
تلامذہ و منتسبین و مُسترشدین کا تذکرہ و تعارف

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳۰ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

جملہ حقوق طباعت واشاعت پاکستان میں
بحقِ فضل ربی ندوی محفوظ ہیں۔

مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

• ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ • رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
• صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ • رکن مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
• رکن عربی اکادمی دمشق • رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
• رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ • رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
• رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
• سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
• صدر اسلامی سینٹر آکسفورڈ

نام کتاب ——— تاریخ دعوت وعزیمت
تصنیف ——— مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
طباعت ——— احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ——— ۳۳۶ صفحات
ٹیلیفون : 6601817

اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔ کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
حرفِ آغاز	۱۱
باب اوّل	
۱۹ ۵۱	
ہندوستان میں چشتی سلسلہ اور اسکے اکابر شیوخ	
عالم اسلام کا نیا روحانی و فکری مرکز	۱۹
اسلامی ہند کے معمار	۲۱
ہندوستان سے چشتیوں کا پہلا تعلق	۲۲
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	۲۴
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ	۳۱
حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ	۳۶
باب دوم	
۵۲ ۱۰۱	
سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ	
کے حالات و کمالات	
نام و نسب	۵۲
ابتدائی تعلیم و تربیت	۵۳
فقر و فاقہ اور والدہ کی تربیت	۵۴
شیخ کبیرؒ سے مناسبت اور قلبی کشش	۵۴
دہلی کا سفر	۵۵
دہلی میں طالبِ علمی	۵۵

مضمون	صفحہ
استاد کے محبوب	۵۶
علمی امتیاز و تفوق	۵۶
حفظ مقامات اور اس کا کفارہ	۵۷
حدیث کی اجازت	۵۷
قلبی بیچینی اور انجذاب الی اللہ	۵۸
والدہ صاحبہ کا انتقال	۵۸
والدہ کی یاد	۵۸
والدہ کا یقین و توکل	۵۸
ایک تمنائے خام	۵۹
اجودھن کی پہلی حاضری	۶۰
طالب یا مطلوب	۶۰
مربی کی خاطر	۶۰
بیعت	۶۱
سلسلۂ تعلم کا اجراء یا	
انقطاع؟	۶۱
شیخ کبیرؒ سے درس	۶۲
درس کی لذت	۶۲
خود شکنی کی تربیت	۶۲
فیصلہ کن موقع	۶۴
ایک رفیق کی ملامت	۶۵

مضمون	صفحہ
کتنے بار حاضری ہوئی	۶۶
شیخ کی نوازشیں	۶۶
رخصت اور وصیت	۶۷
ایک دعا کی درخواست	۶۷
اجودھن سے دہلی کو	۶۸
تصفیۂ حقوق	۶۹
دہلی کی قیام گاہیں	۷۰
فقر و فاقہ	۷۲
غیر کے واسطہ کے بغیر	۷۳
شیخ کبیرؒ کی وفات	۷۳
غیاث پور کا قیام	۷۴
رجوعِ عام	۷۶
فقیر و منعم	۷۷
بیداری پر پہلا سوال	۷۸
دنیا سے تنفر اور بذل و عطا	۷۸
زمین و جائداد سے پرہیز	۷۸
فقیر کا شاہی دسترخوان	۷۹
شیخؒ کی غذا	۸۱
ترتیب	۸۱
سلاطینِ عہد سے بے تعلقی	۸۱
سلطان علاء الدین کا امتحان اور عقیدت	
بادشاہ کے آنے سے معذرت	۸۴
گھر کے دو دروازے	۸۴

مضمون	صفحہ
غمِ اسلام	۸۴
سلطان قطب الدین کی مخالفت	۸۶
اور اس کا قتل	۸۶
غیبی لنگر	۸۸
غیاث الدین تغلق کا عہد اور	
سرکاری مجلسِ مناظرہ	۸۹
مجلسِ مناظرہ کا حال حضرت	
خواجہؒ کی زبان سے	۹۲
دہلی کی تباہی	۹۳
نظام الاوقات	۹۴
امیر خسروؒ کی خصوصیت	۹۴
شب کی تیاری	۹۵
سحری	۹۶
صبح کے وقت	۹۶
دن میں	۹۷
دلداری و تربیت	۹۷
قربِ سفر	۹۷
خلفائے کبار کو اجازت نامے	
اور	
ان کی محبت و مواخات	۹۰
وفات کا حال	۹۸

باب سوم

۱۰۲ ——— ۱۱۲

(اخلاق وصفات)

جامع اوصاف ۱۰۲

اخلاص ۱۰۳

دشمن نوازی ۱۰۵

پردہ پوشی ونکتہ نوازی ۱۰۷

شفقت وتعلق ۱۰۸

غمخواریٔ عام ۱۰۹

چھوٹوں پر شفقت ۱۱۱

باب چہارم

۱۱۳ ——— ۱۲۵

(اذواق وکیفیات)

محبّت وذوق ۱۱۳

سماع ۱۱۵

مزامیر سے نفرت وممانعت ۱۱۹

سماع میں آپ کی کیفیت ۱۲۰

ذوقِ قرآن ۱۲۲

شیخؒ سے تعلق ۱۲۳

جماعت کا اہتمام اور بلند ہمتی ۱۲۴

شریعت کی پابندی اور اتباعِ سنّت کا اہتمام ۱۲۴

باب پنجم

۱۲۶ ——— ۱۳۴

(افادات وتحقیقات)

علمی پایہ ۱۲۶

علمی وادبی مناسبت ۱۲۶

حدیث وفقہ پر نظر ۱۲۷

اہمیت علم ۱۲۸

بلند علوم ومضامین ۱۲۹

علوم صحیحہ شرعیہ ۱۳۰

حلال مانع راہِ خدا نہیں ۱۳۰

قلب متوجہ الی اللہ کے بعد کوئی چیز مضر نہیں ۱۳۱

ترکِ دنیا کی حقیقت ۱۳۱

طاعت لازم ومتعدی ۱۳۲

کشف وکرامات حجاب راہ ۱۳۲

علوم انبیاءؑ واولیاءؒ ۱۳۲

دنیا کی محبّت اور عداوت ۱۳۳

مراتب تلاوتِ قرآن ۱۳۳

باب ششم

۱۳۵ ——— ۱۵۴

(فیوض وبرکات)

تجدید ایمان وتوبۂ عام ۱۳۵

بیعت ایک عہد ومعاہدہ ۱۳۷

عموم بیعت کی حکمت ۱۳۹

مضمون	صفحہ
عمومی زندگی پر اثر	۱۴۱
عشق کا روزبازار	۱۴۶
خلفاء کی تربیت	۱۴۷
چشتی خانقاہیں	۱۴۹
مریدین باختصاص	۱۵۰
باب ہفتم	
۱۵۵ ——— ۱۷۴	
(حضرت خواجہ کی تعلیم و تربیت کے اثرات)	
آپ کے خلفاء کی دینی و اصلاحی خدمات	۱۵۵
سلاطین وقت سے بے رعبی اور حق گوئی	
کے نمونے	۱۵۶
اسلامی سلطنت کی رہنمائی و نگرانی	۱۶۰
اشاعتِ اسلام	۱۶۶
خدمت و اشاعتِ علم	۱۷۰
خاتمۂ کلام	۱۷۲
مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ	
سنہ ۶۶۱ھ ——— سنہ ۷۸۶ھ	
باب اوّل	
۱۷۵ ——— ۱۸۵	
(ولادت سے بیعت تک)	
خاندان	۱۷۷

مضمون	صفحہ
ولادت	۱۷۹
تعلیم	۱۷۹
مولانا شرف الدین ابو توامہؒ سے تلمذ	
اور سنارگاؤں کا سفر	۱۸۰
ازدواج	۱۸۲
مراجعتِ وطن	۱۸۲
سفر دہلی اور انتخابِ شیخ	۱۸۴
بیعتِ شیخ نجیب الدین فردوسی	۱۸۵
باب دوم	
۱۸۶ ——— ۱۹۵	
(ہندوستان میں سلسلۂ فردوسیہ،	
اُس کے مشائخ کبار)	
خواجہ نجم الدین کبریٰؒ	۱۸۶
ہندوستان میں اس سلسلہ کی آمد	۱۸۹
سلسلۂ فردوسیہ ہندوستان میں	۱۹۰
خواجہ بدر الدین سمرقندیؒ	۱۹۰
خواجہ رکن الدین فردوسیؒ	۱۹۳
خواجہ نجیب الدین فردوسی	۱۹۴
باب سوم	
۱۹۶ ——— ۲۰۲	
(مجاہدہ و خلوت، قیام و سکونت	
اور ارشاد و تربیت)	

مضمون	صفحہ
دہلی سے واپسی	۱۹۶
شورشِ عشق	۱۹۷
راجگیر کے جنگل میں	۱۹۷
بہار کی سکونت اور خانقاہ کی تعمیر	۱۹۹
افادہ وارشاد	۲۰۲
باب چہارم	
۲۰۵ ـــــ ۲۲۲	
(صفات وخصوصیات)	
فنائیت	۲۰۵
علوِ اخلاق	۲۱۰
رحمت وشفقت	۲۱۲
دنیا سے بے لوثی وبے تعلقی	۲۱۵
علوِ ہمت	۲۱۶
تجرید وتفرید	۲۱۸
امر بالمعروف اور مسلمانوں کے حالات ومعاملات کی فکر	۲۲۱
اتباعِ سنّت	۲۲۲
باب پنجم	
۲۲۵ ـــــ ۲۳۹	
(وفات)	
نمازِ جنازہ اور تدفین	۲۳۶
اولاد واعقاب	۲۳۷

مضمون	صفحہ
ممتاز مریدین وخلفاء	۲۳۸
تصنیفات	۲۳۹
باب ششم	
۲۴۰ ـــــ ۲۴۷	
(مکتوبات)	
مکتوبات اور ان کا علمی وادبی پایہ	۲۴۰
مکتوبات کے مجموعے اور انکے مکتوب الیہ	۲۴۵
مضامین کا ماخذ	۲۴۷
باب ہفتم	
۲۴۹ ـــــ ۲۶۶	
(مقامِ کبریا)	
بے نیازیٔ سلطانِ عالم	۲۴۹
دریائے رحمت کا جوش	۲۶۱
صلائے عام	۲۶۳
کریم نکتہ نواز	۲۶۴
توبہ کی تاثیر	۲۶۶
باب ہشتم	
۲۶۷ ـــــ ۲۸۱	
(مرتبۂ انسانیت)	
ایک انقلاب انگیز دعوت	۲۶۷

مضمون	صفحہ
خالق کی نظرِ خاص	۲۶۸
امانت محبت	۲۷۰
حاصلِ وجود	۲۷۲
بارِ امانت	۲۷۳
ذرۂ خاک کا اقبال	۲۷۴
سرِّ الٰہی کا حامل	۲۷۶
مسجود و محسود	۲۷۸
دل آگاہ	۲۷۹
شکستہ تر، عزیز تر	۲۸۱
محبت کی فرمانروائی	۲۸۱
باب نہم	
۲۸۳ ——— ۲۹۵	
(تحقیقات و علوم عالیہ)	
بلند و لطیف علوم و مضامین	۲۸۳
وحدۃ الشہود	۲۸۳
تغیر صفات میں ہے نہ کہ ذات میں	۲۸۶
تیز رفتار کی حرکت نظر میں نہیں آتی	۲۸۷
خواہشاتِ نفسانی کا ازالہ مقصود نہیں شکستگی مقصود ہے	۲۸۹
کرامت بھی ایک بُت ہے	۲۹۱
کشوف و کرامات اور استدراج	۲۹۲
فضیلتِ خدمت	۲۹۴
نفس کی اصلاح کا معیار	۲۹۵

مضمون	صفحہ
باب دہم	
۲۹۸ ——— ۳۱۲	
(حفاظتِ دین و حمایتِ شریعت)	
ایک اصلاحی و تجدیدی کارنامہ	۲۹۸
نبوت ولایت سے افضل ہے	۲۹۹
انبیاءؑ کی ایک سانس تمام اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے	۳۰۲
انبیاءؑ کا جسم اور اولیاءؒ کا قلب	۳۰۲
شریعت کا لزوم و دوام	۳۰۲
شریعت کی پابندی ہمیشہ ضروری ہے،	۳۰۴
بقاءِ شریعت کا راز	۳۰۵
ایک بلیغ مثال	۳۰۵
علماء اور مشائخ کاملین کا اسوہ	۳۰۷
شریعت کی شرط	۳۰۹
اتباعِ محمدیؐ سے چارہ نہیں	۳۱۰
سلسلۂ فردوسیہ کی اشاعت اور اس کے بعض مرکز	۳۱۱
حضرت مخدوم صاحبؒ کے بعض دو ہے اور ہندی فقرے	۳۱۲

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

(اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

الحمدللہ کہ تاریخ دعوت وعزیمت کا تیسرا حصہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے دوسرے اور تیسرے حصے کے درمیان اتنا طویل وقفہ پیش آیا کہ مصنف کی طبیعت افسردہ اور شائقین مایوس سے ہو گئے۔ اس عرصہ میں مصنف کے کوتاہ قلم سے متعدد کتابیں نکلیں اور شائع ہوئیں، جتنی تاخیر ہوتی جارہی تھی اتنا ہی یہ اندیشہ بڑھ رہا تھا کہ خدانخواستہ یہ مفید سلسلہ بہت سے قدیم مصنفین کی اہم کتابوں اور خود اپنے بعض سلسلۂ تصانیف کی طرح ناتمام نہ رہ جائے، شاید ایسا ہی ہوتا اور کم سے کم یہ کہ یہ وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا، اگر اس میں ایک قابلِ صد احترام اور واجب التعمیل اشارہ اور تقاضا شامل نہ ہوتا۔

میرے مُربّی رُوحانی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہٗ نے تاریخ دعوت وعزیمت کو بار بار سن کر اور بار بار اپنی مجالس میں پڑھوا کر، تصنیف اور مصنف کی عزت و ہمت

بڑھائی، ان دو جلدوں کے بعد حضرت موصوف نے تیسری جلد کا تقاضا فرمایا اور اپنے خادم کو اس کی تکمیل کی بار بار ہدایت فرمائی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں باہر سے حاضرِ خدمت ہوا، تو پہلا سوال یہ ہی فرمایا گیا کہ تیسرا حصّہ مکمل کر لیا؟ بعض مرتبہ میں نے اپنی الجھنیں عرض کیں سنتے ہی ارشاد ہوا کہ تیسرا حصّہ تو مکمل ہی کر لیجیے! پھر جب حضرت والا کو یہ معلوم ہوا کہ یہ حصّہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی قدس اللہ سرہٗ کے تذکرہ پر مشتمل ہوگا تو اپنے تعلقِ روحانی اور نسبت خاص کی بنا پر حضرت کی طرف سے اس کا اور بھی تقاضا ہوا، ادھر اس عاجز کا یہ حال ہو گیا تھا گویا اس نے قلم رکھ دیا ہے اور اس موضوع سے مناسبت جاتی رہی ہے یہاں تک کہ جون ۶۱ء میں ایک بار جب حاضرِ خدمت ہوا تو حضرت کی مجلس مبارک میں حضرت خواجہ کا وہ مجموعہ پڑھا جا رہا تھا جو افضل الفوائد کے نام سے امیر خسروؒ کی طرف منسوب ہو کر لاہور سے شائع ہوا ہے اور ایک عزیز دوست تحفۃً لائے تھے، یہ مجموعہ ایسے غیر مستند مضامین اور بے اصل روایات پر مشتمل ہے کہ اس کا سننا بھی تحقیقی اور تاریخی ذوق رکھنے والوں پر بلکہ مذاقِ سلیم پر سخت بار ہے، اس کی نسبت امیر خسروؒ کی طرف قطعاً مشکوک ہے۔ حضرت خواجہ گیسو درازؒ جنکے اور سلطان المشائخ کے درمیان صرف ایک ہی واسطہ اور وہ بھی حضرت چراغ دہلیؒ کا ہے اور جو اسی خانوادۂ عالی کے چشم و چراغ اور محرمِ اسرار ہیں۔ صاف فرماتے ہیں کہ فوائد الفواد کے علاوہ ملفوظات کے جتنے مجموعے مشہور ہیں یاد ہوائی ہیں[1]۔ مجلس میں یہ کتاب پڑھی

---

[1] "ملفوظ شیخ نظام الدین کہ امیر حسن شاعر جمع کردہ است آں معتبر است و ملفوظہائے دیگر کہ ازاں شیخ نبشتہ اند ہمہ باد ہوا است۔" (جوامع الکلم)

جارہی تھی، حضرت کبھی کبھی اس کے مضامین پر استعجاب کا اظہار فرماتے، نیمباز مگر دلنواز نگاہیں جو کبھی کبھی مصنف پر بھی پڑجاتیں اشارہ اشارہ میں کہتیں کہ اگر کوئی مستند کتاب موجود ہوتی تو ایسی غیر مستند کتابوں کی کیا ضرورت تھی؟ یہ نگاہ دل میں تیر کی طرح پار ہوگئی اور وہیں دل نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں اس کام کو انجام دینا ہے، اور یہ ارمغان پیش کرنا ہے۔

اس کام میں توقف ہونے کا ایک سبب راہ کی دشواریاں بھی تھیں، ہندوستان کے اولیائے کرام، داعیانِ اسلام اور مشائخ عظام کے تذکرہ میں بیشمار کتابیں لکھی گئیں، ان میں بڑی بڑی ضخیم تصنیفات بھی ہیں، لیکن جب اس عصر کا کوئی مصنّف ان کے ایسے حالات جمع کرنے کے بیٹھتا ہے جن سے ان کے اصل کمالات، ان کی دینی و تبلیغی مساعی، ان کی تعلیم و تربیت کے نتائج، ان کے مزاج و مذاق پر روشنی پڑے اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے یہ حالات سبق آموز، شوق انگیز اور ہمت آفریں ہوں، اور بحیثیت ایک جلیل القدر اور کامل انسان کے ان کے حالات منظر عام پر آئیں، اور ان کی سوانح کا صحیح ڈھانچہ سامنے آجائے تو اس کو سخت مایوسی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات صدہا صفحات کی ایک کتاب سے بلکہ متعدد کتابوں کی مدد سے بھی ایک صفحہ کے بقدر بھی مواد حاصل نہیں ہوتا، عظیم ترین شخصیتوں کے تذکروں اور سوانح حیات میں اتنے بڑے بڑے خلا نظر آتے ہیں جن کو کسی قیاس اور عبارت آرائی سے بھرا نہیں جاسکتا۔ پوری پوری کتاب خوارق و کرامات، محیر العقول واقعات اور عجائبات سے بھری ہوتی ہے اور ضروری معلومات کا افسوسناک فقدان نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے مؤرخ کو (جس نے اپنی علمی اور تصنیفی ضرورت سے ہندوستان کی تاریخ کا ایسا وسیع مطالعہ کیا ہے جس کی نظیر دورِ حاضر میں ملنی مشکل ہے، اور اعیان و مشاہیر ہند کا تذکرہ آٹھ ضخیم جلدوں

میں مرتب کیا ہے[1]) اس صورتِ حال پر اس طرح شکوہ سنج پایا گیا:۔

"ملک کی بدمذاقی دیکھئے کہ ابتدا سے اب تک ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی کتاب تاریخ نویسی کے صحیح معیار پر نہیں اترتی، جس کتاب کو اٹھا کر دیکھیے معلوم ہوتا ہے کہ رزم بزم کا کوئی افسانہ ہے۔ قرناد کوس کے ذکر سے اگر کوئی صفحہ خالی ملے گا تو چنگ ورباب کے ذکر سے آپ اس کو خالی نہ پائیں گے۔ اگر مقفیٰ عبارتوں اور مسجّع فقروں کے خارزار میں آپ کا دامن الجھ گیا تو یہ بھی ملنے کا نہیں، ایسی حالت میں کیا توقع ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی علمی زندگی کی صحیح تصویر ایسے مرقع میں پائیں ـــــ کچھ ان بزرگوں کے حالات میں کتابیں ملتی ہیں جو کسی سلسلۂ طریقت کے ساتھ مربوط تھے، مگر اس بدمذاقی کا کچھ ٹھکانا ہے کہ آپ ان کتابوں سے ان کے نام ونسب، نشوونما، تعلیم وتربیت طریقۂ ماندوبود اور علمی مشاغل کی نسبت تحقیق کرنا چاہیں تو ایک حرف نہ ملیگا، قرناد کوس کا تو یہاں کچھ کام نہیں، مگر چنگ ورباب یہاں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، مصنف کا سارا زور اُن کے کشف وکرامت کے بیان کرنے پر صرف ہوجاتا ہے اور اس کو اس حد تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ماوراء کوئی اور ہستی نظر آتے ہیں، وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ سوتے ہیں نہ خصائصِ انسانی سے ان کو سروکار ہے نہ علمی مشاغل سے ان کو کچھ واسطہ ہے

---

[1] نزہۃ الخواطر عربی اتا ۸ جو پانچ ہزار شخصیتوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

ان کا صرف یہ کام ہے کہ وہ قانونِ فطرت کو ہمیشہ توڑتے رہیں اور موالید ثلاثہ و
عناصر اربعہ پر اپنی حکومت وخود مختاری کو کسی طرح قائم نہ رکھیں۔"[1]

اس دقت کا اگر آپ عملی تجربہ کرنا چاہیں تو ہندوستان میں سلسلۂ چشت کے بانی بلکہ ایک طرح سے اس ملک میں سلسلۂ اسلامی کے بانی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور ان سے حضرت کی کوئی مختصر سوانح مرتب کرنے کی کوشش کیجئے، شاید یہ خیال ہو کہ وہ مسلمانوں کا ابتدائی عہد تھا، تصنیف وتالیف کے دور کا پورے طور پر آغاز نہیں ہوا تھا، اگرچہ یہ صحیح نہیں ہے، اور اسی دور میں ہم کو قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی کی کتاب طبقات ناصری اور نور الدین محمد عوفی کی کتاب لباب الالباب بھی ملتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ساتویں صدی کی تصنیفات ہیں، لیکن اگر اس کو کسی طرح تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائیگا کہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ (متوفی ۶۶۶ھ) ایک عظیم روحانی پیشوا اور جلیل القدر مصلح تھے جنھوں نے اپنے زمانہ کو متاثر کیا اور ایک ایسے شہر میں زندگی گذاری جو اپنے عہد میں ہندوستان کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا، سیاسی حالات میں اعتدال واستقرار بھی پیدا ہو چکا تھا، لیکن اس عظیم الشان شخصیت کی سوانح نگاری اور اس کے کارناموں کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے مواد کی بے حد کمی ہے، مگر خوارق وتصرفات اور کشف و کرامات کے واقعات کی کوئی کمی نہیں۔

اس لحاظ سے حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت مخدوم الملک

---

[1] یاد ایام (تاریخ گجرات) ص۵۸ و ص۵۹ از مولانا حکیم سید عبد الحیؒ مصنف نزہۃ الخواطر و گل رعنا (م ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء)

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ جو آٹھویں صدی کی دو نامور شخصیتیں اور عظیم الشان روحانی مربی اور مصلح ہیں، خاص امتیاز و انفرادیت رکھتے ہیں، کئی صدیوں تک کسی شیخِ طریقت اور کسی دینی شخصیت کے حالات اتنی روشنی میں نہیں ہیں جتنے ان دونوں بزرگوں کے۔ یہ مواد اس لحاظ سے بھی خصوصیت رکھتا ہے کہ وہ ان حضرات کے ملفوظات اور مکتوبات سے ماخوذ ہے، یا معاصر تاریخوں اور ان کے خدام و مریدین کی کتابوں سے، اس لحاظ سے مؤرخ کو یہاں کم سے کم دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انتخاب و تحقیق کا کام یہاں بھی ضروری ہے کہ واقعات و سنین میں سخت انتشار و تضاد نظر آتا ہے۔

لیکن ان دونوں شخصیتوں کے انتخاب کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان سے متعلق تاریخی مواد آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے، یہ بات اور بھی بہت سی شخصیتوں کو حاصل ہے، اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ہندوستان میں (جو ساتویں صدی کے بعد سے عالمِ اسلام کا مرکزِ اعصاب اور احیا و تجدید کی تحریکوں کا منبع ہے) ان دونوں حضرات نے روحانی و اصلاحی تحریک کی قیادت کی اور اپنے زمانہ اور بعد کی نسلوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

حالات و تعلیمات کے انتخاب میں مصنّف نے ہمیشہ ان اجزاء و مضامین کو اہمیت دی ہے جو اس نسل کے لئے مفید، سبق آموز، قابلِ تقلید، عام فہم اور دلنشیں ہوں اور جن سے غلط فہمی اور غلط روی کا کم سے کم اندیشہ ہو، وہ خود بھی فلسفۂ الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق سے کم مناسبت رکھتا ہے اور اپنے قارئین کو بھی اس امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتا، اس کے نزدیک ایمان و یقین، عشق و محبّت، درد و سوز، جذبۂ اتباعِ سنّت، عزیمت، علوِ ہمّت، ذوق دعوت و تبلیغ، اصلاحِ اعمال و اخلاق اور صحیح علوم و دینی حِکَم و معارف ان بزرگوں کا

اصل جوہر اور ان کی سوانح حیات کا اصل پیام ہے۔ راقم سطور نے سیرت سید احمد شہیدؒ کے مقدمہ میں اپنے مسلک کی معذرت اور وضاحت کرتے ہوئے ایک شعر لکھا تھا جو صورتِ حال کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، اسی کا اعادہ یہاں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ؎

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے
جو چُھبے دل میں، وہی تنکے لئے

شاید مصنّف کی دوسری ذمہ داریاں اور نہ ختم ہونے والے مشاغل اتنی جلدی کتاب کی تکمیل کی مہلت نہ دیتے اور اس میں مزید تاخیر ہوتی، مگر اپنے وطن (رائے بریلی) کی سُئی ندی کے سیلاب نے ایک گاؤں (میدان پور) میں محصور کر کے اس کا سامان فراہم کر دیا کہ جو کام مہینوں میں ہوتا وہ خدا کی مدد سے چند ہفتوں میں ہو گیا۔ وللہ جنود السمٰوات والارض۔

مصنّف کا اخلاقی فرض اور احسان شناسی ہے کہ وہ اپنے محسنین و معاونین کا شکریہ ادا کرے۔ قدیم مآخذ میں مصنّف سب سے زیادہ سیر الاولیاء کے مصنّف امیر خورد اور فوائد الفواد کے مصنّف امیر حسن علاء سنجری کا ممنونِ احسان ہے کہ انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی سوانح حیات و تعلیمات کا سب سے زیادہ مفصل اور مستند مواد فراہم کیا۔ حضرت مخدوم الملک بہاریؒ کے حالات میں سیرۃ الشرف سے بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی اور اس سے قدیم تر مآخذ کا پتہ چلا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی تصنیفات اور مضامین ہمیشہ کی طرح بڑے مفید اور مددگار ثابت ہوئے، کاش ان کو دونوں حضرات کی مکمل سوانح حیات مرتب کرنے کا موقع ملتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس موضوع سے فطری مناسبت اور ذوق اور تاریخ ہندوستان کا وسیع علم عطا فرمایا تھا، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی بیش قیمت تصنیف نزہۃ الخواطر نے حسب معمول تاریخ و تذکرہ

کے ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا کام دیا اور مصنف نے اس سے اس طرح مدد لی اور بار بار رجوع کیا جیسے کوئی طالب علم لغت اور ڈکشنری سے بار بار مدد لیتا ہے اس موضوع پر وسیع مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کی نظر کتنی وسیع و عمیق تھی اور ان کا انتخاب و مذاق کتنا پاکیزہ اور شائستہ ہے۔

اپنے معاونین میں ناچیز مصنف جناب مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی وسنوی اور عزیز گرامی مولوی مراد اللہ صاحب منیری ندوی کا ممنون ہے جنھوں نے حضرت مخدوم الملکؒ کی سوانح حیات اور تصنیفات میں سے بعض نادر چیزیں فراہم کیں۔ عزیزی مولوی شبیر عطا ندوی سلمہٗ (جن کو تاریخی و علمی ذوق اپنے نامور والد سے ورثہ میں ملا ہے) سے بھی بعض ضروری معلومات کے حصول میں مدد ملی۔ عزیز سعید مولوی سید مشرف علی ندوی بھی مصنف کے شکریہ کے بڑے مستحق ہیں۔ مصنف نے کتاب کا بڑا حصہ املا کیا اور آں عزیز نے بڑی ہمت اور محنت سے لکھا۔ مولوی اقبال احمد صاحب اعظمی بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بھی وقتاً فوقتاً مدد کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں اور عزیزوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے عمل کو قبول کرے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا، وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ

ابوالحسن علی

مرکز دعوت اصلاح و تبلیغ

لکھنؤ

۱۱ صفر ۱۳۸۲ھ
۲۴ جولائی ۱۹۶۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

ہندوستان میں چشتی سلسلہ اور اُسکے اکابر شیوخ

عالمِ اسلام کا نیا رُوحانی وفکری مرکز

چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اس صدی کے آخر میں وسیع اسلامی دنیا میں ایک ایسے نئے وسیع ملک کا اضافہ ہو رہا تھا جو قدرتی خزانوں اور انسانی صلاحیتوں سے مالا مال تھا اور جس کے لئے مستقبل قریب میں اسلامی دعوت کا عالمگیر مرکز اور اسلامی علوم کا محافظ وامین بننا مقدر ہو چکا تھا۔

اس صدی کے اوائل میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالمِ اسلام پر مور وملخ کی طرح یورش کی، ملک کے ملک ان کی بربریت اور وحشیانہ مظالم سے تاراج اور بڑے بڑے نامی گرامی شہر جو کبھی علم وتہذیب کے علمبردار اور مدارس وخانقاہوں سے یکسر گلزار ہو رہے تھے بے چراغ ہو گئے شہروں کا امن وسکون، زندگی کا نظم ونسق اور شرفاء کی عزت وناموس خاک میں مل گئے، بخارا، سمرقند، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم اور بالآخر مرکزِ خلافت دارالسلام بغداد اس فتنۂ جہاں سوز

کی لپیٹ میں آگیا اور قدیم تہذیب کا مدفن بن کر رہ گیا۔ اس بلائے ناگہانی سے عالم اسلام کی چولیں ہل گئیں اور پوری قدیم اسلامی دنیا پر سیاسی زوال اور فکری و علمی اضمحلال کے سیاہ بادل چھا گئے۔ اس وقت اس پورے عالمِ اسلام میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جو اس فتنۂ عالم آشوب سے محفوظ رہ گیا تھا۔ یہاں تازہ دم، قوی اور پرجوش ترکی النسل خاندانوں کی حکومت تھی، جو اُن تاتاریوں اور مغلوں سے بخوبی پنجہ آزمائی کر سکتے تھے اور اپنی ایمانی قوت اور نئے اسلامی جوش کی بنا پر جنگی قوت اور شجاعت میں نہ صرف اُن کے حریف بلکہ ان سے فائق تھے، تاتاری اور مغل بار بار ہندوستان پر حملے کرتے رہے اور پسپا ہوتے رہے، صرف سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں چنگیزی مغلوں نے پانچ بار ہندوستان پر حملہ کیا، پہلا حملہ ۶۹۶ھ میں ہوا، چوتھے اور پانچویں حملے میں سلطان کی طرف سے ملک تغلق (ملک غازی) نے جوہرِ مردانگی دکھائے اور مغلوں کو اس طرح شکستِ فاش دی کہ :-

"دراں روز بار مغول را ہوس ہندوستان بردل سرد شد، و دندانِ طمع کند گشت[1]" (اس دن سے مغلوں کی ہندوستان کی ہوس سرد ہوگئی، اور اُن کے دندان حرص و آز ہمیشہ کے لئے کھٹے ہو گئے)۔

ان خصوصیات کی بناء پر عالمِ اسلام کے بہترین خاندان جن کو اپنا ناموس اور ایمان عزیز تھا اور بہترین دل و دماغ جو اپنے بدقسمت وطن میں سکون و اطمینان سے محروم ہو گئے تھے، ہندوستان کے جدید دارالامن اور دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئے۔ لائق ترین انسانوں اور شریف ترین خاندانوں کا یہ سیلاب ایران، ترکستان و عراق کی طرف سے بار بار

---

[1] منتخب التواریخ ص۱۸۶ و تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی ص۲۵۱ و ص۳۰۲ و ص۳۲۰ و ص۳۲۳ ۔

امنڈتا رہا اور ان کی وجہ سے دہلی ایک بین الاقوامی شہر اور رشکِ بغداد و قرطبہ بن گئی، نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کے دوسرے شہر اور قصبات شیراز و یمن کی ہمسری کرنے لگے۔ مورخینِ ہندوستان ضیاء الدین برنی وغیرہ جب ان شریف و نجیب خاندانوں، اساتذۂ وقت، علماء نامدار اور مشائخ کبار کی فہرست سناتے ہیں جو فتنۂ تاتار میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے اور ہنگامۂ درس و تدریس اور ارشاد و تلقین گرم کئے ہوئے تھے، نیز جنھوں نے سلطنت کی نازک ترین ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں اور ملک کی زیب و زینت کا باعث تھے، تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالمِ اسلام کا جوہر شرافت و فضیلت یہیں آگیا تھا۔[1]

اس انقلاب سے ہندوستان نہ صرف عالمِ اسلام کا ایک اہم حصّہ بن گیا تھا، بلکہ تاریخ کا صاف اشارہ تھا کہ وہ اسلام کی فکری و روحانی قوت، علمی تحریکات اور احیاء و تجدید کا نیا مرکز بن رہا ہے، اور فکرِ اسلامی اور دعوت و عزیمت کے مورخین کو اب مسلسل کئی صدیوں تک اپنی توجہ اسی پر مرکوز کرنی پڑے گی۔

اسلامی ہند کے معمار

اسلامی دنیا کے لئے ہندوستان کی دریافت اور یافت "نئی دنیا" کی دریافت سے کم انقلاب انگیز اور عہد آفریں واقعہ نہ تھا، اگرچہ پہلی صدی ہجری ہی میں یہاں اسلام کے حوصلہ مند دستے آنے شروع ہو گئے تھے اور ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے سندھ سے ملتان تک کے علاقہ کو اپنی شمشیر و اخلاق سے تسخیر کر لیا تھا، اور اس برِّ صغیر (ہند) میں جا بجا داعیان اسلام کے مرکز و خانقاہیں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح قائم ہو چکی تھیں، جیسے ع

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی ص۱۱۱ و ص۱۱۲

لیکن حقیقتاً ہندوستان کی فتح کا سہرا سکندرِ اسلام سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کے سر اور مستحکم و مستقل اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین محمد غوری (م ۶۰۲ھ) کے حصّے میں تھی اور آخری طور پر اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح حضرت خواجۂ بزرگ شیخ الاسلام معین الدین چشتیؒ (م ۶۲۷ھ) کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

ہندوستان کی فتح سے پہلے اسلام کے چاروں مشہور روحانی سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سُہروردیہ وجود میں آچکے تھے اور عرصہ سے پھل پھول رہے تھے، اپنے اپنے وقت پر ان میں سے ہر ایک کا فیض ہندوستان کو پہنچا اور ہندوستان کی اسلامی تعمیر و تشکیل میں سب کا حصّہ ہے۔ شکر اللہ مساعیہم لیکن ہندوستان کی روحانی فتح اور اس سرزمین پر اسلام کا پودا نصب کرنے کے لئے (جس کے سایہ اور پھل سے ایک عالم مستفید ہونے والا تھا) حکمتِ الٰہی نے چشتی سلسلہ کو انتخاب فرمایا۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ۔

ان اسرارِ الٰہی سے قطع نظر جن کو ہماری کوتاہ نظر نہیں پا سکتی، چشتیوں پر اس ملک کا حق ہمسائگی بھی تھا، ان کا سلسلہ اس ملک کے ہمسایہ ملک ایران میں فروغ پا رہا تھا، اپنے دردمند مزاج اور نسبتِ عشقیہ کی بنا پر بھی جو سلسلۂ چشتیہ کا سرمایہ ہے اس سلسلہ کو ہندوستان کا دل جیت لینا اور اس کو اپنی محبّت کا اسیر اور عشقِ الٰہی کا نخچیر بنا لینا آسان تھا کہ زمانۂ قدیم سے محبّت و درد اِس سرزمین کے خمیر میں ہے۔

ہندوستان سے چشتیوں کا پہلا تعلّق

غرض ان معلوم و نامعلوم حکمتوں کی بنا پر قدرت الٰہی نے ہندوستان میں اسلام کے تعارف اور اشاعت کے لئے اس سلسلہ کو انتخاب فرمایا اور چشتیوں کو ہندوستان کی طرف رُخ کرنے کا اشارۂ غیبی ہوا۔ سب سے پہلے جس چشتی شیخ نے ہندوستان کی طرف عنانِ عزیمت

موڑی وہ خواجہ ابو محمد[1] چشتی تھے، جن کی دعائیں اور بابرکت ذات سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی پشت پناہ تھی، مولانا جامی "نفحات الانس" میں لکھتے ہیں:۔

وقتے کہ سلطان محمود بہ غزو سومنات[2]	جس وقت سلطان محمود سومنات کی طرف
رفتہ بود خواجہ را در واقعہ نمودند کہ	گیا ہوا تھا خواجہ ابو محمد کو اشارۂ غیبی
بمددگاری وے باید رفت در سن ہفتاد	ہوا کہ اس کی مدد کیلئے جائیں، وہ ستر برس
سالگی با در ویشے چند متوجہ شد چوں	کی عمر میں چند درویشوں کیساتھ روانہ
آں جا رسید بہ نفس مبارک خود با مشرکان	ہوئے اور وہاں پہنچ کر بنفس نفیس
وعبدۂ اصنام جہاد کرد[3]	جہاد میں شرکت فرمائی۔

---

[1] خواجہ ابو محمد چشتی (م ۴۰۹ھ یا ۴۱۱ھ) خواجہ ابو احمد کے فرزند و خلیفہ تھے جو خواجہ ابو اسحاق شامی کے خلیفۂ اعظم اور خواجہ ناصر الدین ابو یوسف کے شیخ و مرشد تھے، خواجہ ناصر الدین ابو یوسف، خواجہ قطب الدین مودود کے شیخ ہیں، اور وہ حاجی شریف زندنی کے۔ حاجی شریف زندنی کے خلیفہ حضرت خواجہ عثمان ہارونی رح اُن کے خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح۔

[2] سلطان محمود نے سومنات پر حملہ ۴۱۶ھ میں کیا، اگر خواجہ ابو محمد رح کا سنہ وفات مذکورۂ بالا صحیح ہے تو اس سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا، غالباً مولانا جامی کی مراد حملۂ ہندوستان سے ہے، انھوں نے اسکو حملۂ سومنات سے تعبیر کیا ہے کہ ہندوستان سے باہر سب سے زیادہ اسی کارنامہ کی شہرت ہوئی۔ سومنات پر حملہ کرنے سے پہلے ہندوستان پر محمود کے ۸ حملے ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی حملے میں (اغلب ہے کہ پہلے حملے میں) شیخ ابو محمد رح ساتھ رہے ہوں گے۔

[3] نفحات الانس ص ۲۲۳

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

لیکن جس طرح محمود کی سیاسی فتح کی تکمیل اور اسلامی سلطنت کے استحکام و استقلال کی سعادت سلطان شہاب الدین غوری کیلئے مقدر تھی، خواجہ ابو محمد چشتیؒ کے کام کی تکمیل اور اسلام کی عمومی اشاعت اور اسلامی مرکزِ رشد و ہدایت کا قیام اسی سلسلہ کے ایک شیخ، شیخ الشیوخ خواجہ معین الدین سجزیؒ[1] کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔

---

[1] خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اصل نسبت سجزی ہے، جو کاتبوں کی غلطی اور بولنے والوں کی غلط فہمی سے "سنجری" بن گیا۔ قدیم مسودات و اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں سَجَزی ہی لکھا اور بولا جاتا تھا۔ سَجَزی نسبت سجستان کی طرف ہے۔ قدیم جغرافیہ نویس عام طور پر اسکو خراسان کا ایک حصہ مانتے ہیں، موجودہ زمانے میں اس کا اکثر حصہ ایران میں شامل ہے اور باقی افغانستان میں۔

اس علاقہ کا پایۂ تخت زرنج تھا جس کے کھنڈر اب زاہدان کے قریب پائے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ میں سجستان کے حدود غزنین تک تھے۔ (احسن التقاسیم)

بعض جغرافیہ دانوں کے نزدیک سَجَز، سجستان کے ایک خاص مقام کا نام ہے، جس کی طرف نسبت سَجَزی آتی ہے۔ کبھی کبھی پورے سجستان کی طرف بھی سجزی کہہ کر نسبت کرتے ہیں۔

جغرافیہ خلافت مشرقی کے مصنف جی بی اسٹرینج نے ۳۰ صفحوں میں سجستان کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیستان فارسی لفظ سنگستان سے، اخوذ ہے، عرب اسے سجستان کہتے ہیں۔ اس ملک کی زمین نشیب میں ہے اور جھیل زرہ کے گرد اور اسکے مشرق میں واقع ہے، دریائے ہلمند اور جس قدر دریا اس جھیل میں گرتے ہیں، ان سب کے ڈیلٹا اسی زمین میں پڑتے ہیں۔

فارسی میں سیستان کو نیمروز یا جنوبی ملک بھی کہتے ہیں اور جنوبی ملک کہنے کی وجہ یوں بیان ہوئی ہے کہ سیستان خراسان کے جنوب میں واقع ہے صـ ۵۰۳ و صـ ۵۰۴

قدیم تر مورخین (جن میں طبقات ناصری کے مصنّف قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی بھی شامل ہیں جو حضرت خواجہ کے کمسن معاصر ہیں[۱]) کا بیان ہے کہ حضرت خواجہؒ سلطان شہاب الدین غوری کے اس لشکر کے ساتھ تھے جس نے والی اجمیر رائے پتھورا (پرتھوی راج)[۲] کو شکست دی اور ہندوستان کی فتح کی

---

[۱] قاضی صاحب کی ولادت ۵۸۹ھ میں ہوئی۔ ۱۲

[۲] پرتھوی راج یا رائے پتھورا (۱۱۷۵ - ۱۱۹۲ء) سومیشور کا بیٹا تھا، جو اجمیر کے چوہان حکمراں خاندان کے بانی "اروناراجہ" کا فرزند اور اس خاندان کے نامور فرمانروا دگرہ راجہ عرف ولیل دیو کا بھائی تھا۔ "سومیشور" کا دہلی کے تومر راجپوت حکمراں خاندان اور اجمیر کی چوہان شاخ پر کیساں اقتدار تھا، سومیشور دہلی کے آخری تومر فرمانروا انند پال (انگ پال) کا داماد تھا اور اس رشتہ سے پرتھوی راج دہلی کے آخری فرمانروا کا نواسہ ہوتا تھا۔ انند پال کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس نے پرتھوی راج کو متبنّٰی کیا تھا، اس کے انتقال پر دہلی کی سلطنت پرتھوی راج کے حصّہ میں آئی اور اجمیر کی سلطنت اس نے اپنے باپ سومیشور سے وراثت میں پائی، اس طرح وہ راجپوتوں کی دو طاقتور مرکزی سلطنتوں دہلی و اجمیر کا مالک ہوا، چونکہ اجمیر سے اس کا آبائی اور وطنی تعلق تھا اور وہ اس کی دادھیالی گدّی تھی، اس لئے اغلب ہے کہ اس کا زیادہ تر قیام اجمیر میں رہتا تھا، اس وجہ سے اجمیر اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی مرکز تھا۔ پرتھوی راج اپنی ذات سے بڑا حوصلہ مند، منچلا فنون سپہ گری میں طاق اور بہادر راجپوت تھا، اس نے بہت سی جنگوں میں نمایاں فتوحات حاصل کیں، جنھوں نے ایک صدی تک اس کے نام کو زندہ اور روشن رکھا۔ قنوج کے راجہ جے چند کی بیٹی کو "سوئمبر" سے لے آنے کی وجہ سے وہ ان داستانوں اور نظموں کا ہیرو بن گیا جو اب تک شمالی ہند میں گائی اور پڑھی جاتی ہیں، وہ اپنی سپہ گری، حوصلہ مندی اور فتوحات کی بنا پر ہندوستان کے دورِ آخر کے بہادر راجپوتوں اور طاقتور رہنماؤں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے لیکن اس کی آخری شکست نے اسکی عظمت پر پردہ ڈال دیا، اور تاریخ ہند نے اس کا قصور معاف نہیں کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تکمیل کی، اس فتح میں ان کی دعاؤں، توجہات اور روحانیت کا بہت بڑا حصّہ تھا[1]۔

بعد کے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نے شہاب الدین غوری کے حملوں کے درمیان (جو ۵۷۹ھ سے ۶۰۲ھ تک جاری رہے) ابتدائے سنین ہی میں اجمیر میں جو اسوقت راجپوت طاقت وحکومت اور ہندو مذہب و روحانیت کا بہت بڑا مرکز[2] تھا) قیام اختیار

(صفحہ ۲۱ کا بقیہ حاشیہ) ۱۱۹۱ء (۵۸۷ھ) میں جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا، پرتھوی راج نے ترائن (حال تلونڈی) کے مقام پر جو تھانیسر سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ایک منظم فوج کے ساتھ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سلطان کو شکست فاش دی۔ اگلے سال ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ میں سلطان نے بڑی تیاری اور نئے عزم کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ دوبارہ حملہ کیا، پرتھوی راج تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی میدان میں لایا، ۱۵۰ راجپوت راجگان اپنی فوجوں کے ساتھ تھے۔ پرتھوی راج نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ اور اس طرح راجپوتوں کی آزاد سلطنت اور ہندوستان کی قدیم فرمانروائی کا خاتمہ ہوا۔

(پروفیسر الیشوری پرشاد اور دوسرے مورخین باختصار)

---

[1] طبقات ناصری ص۴۳۰ + فرشتہ ص۵۷ + منتخب ص۵۰ ؛

[2] اجمیر سے ۷ میل شمال 'پشکر' ایک مشہور مذہبی تیرتھ گاہ تھی جس کی یاترا کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے، اسکی جھیل کو جو مذہبی تقدس حاصل تھا اس میں صرف 'مان سرور' کی جھیل اس کی ہمسری کر سکتی ہے۔ پشکر کی جھیل کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ برہما نے یہاں یگ کیا اور یہاں پر سرسوتی اپنے پانچ دھاراؤں سے پرکٹ ہوتی ہیں۔ (اجمیر ڈسٹرکٹ گزیٹیر ص۱۸)

فرمالیا تھا۔ ابھی غوری کے حملوں نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور اسکی ترکتازیاں شمالی مغربی ہندوستان تک محدود تھیں کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کردیا، رائے پتھورا نے کسی مسلمان کو (جو غالباً اُس کے دربار سے متعلق تھا) اذیت پہنچائی، حضرت خواجہؒ نے اس کی سفارش کی۔ پتھورا نے متکبرانہ اور توہین آمیز جواب دیا اور کہا کہ "یہ شخص یہاں آیا ہوا ہے اور ایسی اونچی اونچی باتیں کہتا ہے جو کسی نے نہ دیکھیں نہ سنیں۔ حضرت خواجہ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ "ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کرکے (محمد غوری کو) دے دیا۔" اس کے بعد ہی محمد غوری نے حملہ کیا، پتھورا نے مقابلہ کیا، اور شکست کھائی[1]

بہرحال واقعہ کی جو ترتیب ہو اس میں شک نہیں کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے محمد غوری کے حملوں کے درمیان اور اسلامی سلطنت کی عمومیت و استحکام سے پیشتر، ہندوستان کے قلب اور قدیم ہندوستان کے عظیم سیاسی و روحانی مرکز اجمیر کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا، یہ فیصلہ ان کی اولوالعزمی عالی ہمتی اور جرأت ایمانی کا ایسا تابناک کارنامہ ہے جس کی مثالیں صرف پیشوایانِ مذاہب اور فاتحین عالم کی تاریخوں میں مل سکتی ہیں۔ ان کے استقلال و اخلاص، ان کے توکل و اعتماد، ان کے زہد و قربانی اور انکے درد و سوز کی وجہ سے ہندوستان کے لئے دارالاسلام بننے کا فیصلہ کردیا اور جو سرزمین ہزاروں برس صحیح یقین اور صحیح معرفت سے محروم اور توحید کی صدا سے ناآشنا تھی وہ علماء و اولیاء کی سرزمین اور علوم اسلامیہ اور کمالاتِ دینیہ کی محافظ و امین بن گئی اور اس کی فضائیں اذانوں سے اور دشت و جبل اللہ اکبر کی صداؤں سے اور اسکے شہر و دیار قال اللہ و قال الرسول کے نغموں سے ایسے گونج کہ صدیوں سے عالمِ اسلام گوش برآواز ہے۔ ع جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۲۷، آثار الکرام

سیر الاولیاء کے مصنّف نے بڑی صداقت و بلاغت سے لکھا ہے:۔

مملکت ہندوستان تا حد برآمدن آفتاب
ہمہ دیارِ کفر و کافری و بت پرستی بود،
و متمردان ہند ہر یکے دعوائے انا ربکم الاعلیٰ
می کردند و خدائے را جل و علا شریک میگفتند
و سنگ و کلوخ و دارو درخت و ستور و گاؤ
ہر گیں آں را سجدہ می کردند و بظلمت کفر
قفل دل ایشاں مظلم و محکم بود۔ ؎
ہمہ غافل از حکم دین و شریعت
ہمہ بے خبر از خدا و پیمبر
نہ ہرگز کسے دیدہ ہنجار قبلہ
نہ ہرگز شنیدہ کسی اللہ اکبر
وصول قدم مبارک آں آفتاب اہل
یقیں کہ بہ حقیقت معین الدین بود ظلمت ایں دیار
بنور اسلام روشن و منور گشت۔ ؎
از تیغ او بجائے صلیب و کلیسا
در دار کفر مسجد و محراب و منبر است
آنجا کہ بود نعرہ و فریاد مشرکاں
اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر است

ملک ہندوستان اپنے آخری مشرقی
کنارہ تک کفر و شرک کی بستی تھی، اہلِ
تمرد "انا ربکم الاعلیٰ" کی صدا لگا رہے تھے
اور خدا کی خدائی میں دوسری ہستیوں کو
شریک کرتے تھے، اور اینٹ، پتھر،
درخت، جانور، گائے و گوبر کو سجدہ کرتے تھے
کفر کی ظلمت سے ان کے دل تاریک اور
مقفل تھے، سب دین و شریعت کے حکم سے
غافل، خدا و پیمبر سے بے خبر تھے، نہ
کبھی قبلہ کی سمت پہچانی، نہ کسی نے
اللہ اکبر کی صدا سنی، آفتاب اہل یقین
حضرت خواجہ معین الدینؒ کے قدم مبارک
کا اس ملک میں پہنچنا تھا کہ اس ملک
کی ظلمت نور اسلام سے مبدّل ہو گئی
ان کی کوشش و تاثیر سے جہاں شعارِ
شرک تھے وہاں مسجد و محراب و منبر نظر
آنے لگے، جو فضا شرک کی صداؤں سے
معمور تھی، وہ نعرۂ اللہ اکبر سے گونجنے لگی۔

وہرکہ ازیں دیار مسلمان شد و تا روز قیامت مسلمان خواہد شد او و فرزندان الیشاں تا توالدوا تناسلوا است مسلمان خواہند بود و آں طائفہ را کہ بہ تیغ اسلام از دار حرب در دار اسلام خواہند آورد الی یوم القیٰمۃ مثوبات آں ببارگاہ باجاہ شیخ الاسلام معین الدین سجزی قدس اللہ سرہ العزیز متابعت حضرت او واصل و متواصل خواہند بود انشاء اللہ العزیز۔

اس ملک میں جس کو دولتِ اسلام ملی اور قیامت تک جو بھی اس دولت سے مشرف ہوگا نہ صرف وہ بلکہ اس کی اولاد در اولاد، نسل در نسل سب انکے نامۂ اعمال میں ہوں گے اور اس میں قیامت تک جو بھی اضافہ ہوتا رہیگا اور دائرۂ اسلام وسیع ہوتا رہے گا قیامت تک اس کا ثواب شیخ الاسلام معین الدین حسن سجزی کی روح کو پہنچتا رہے گا۔

اس طرح ہندوستان اور ہندوستان میں جو کچھ خدا کا نام لیا اور اسلام کا کام کیا گیا وہ سب چشتیوں اور ان کے مخلص و عالی ہمت بانیِ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حسنات اور کارناموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک پر اس سلسلہ کا حق قدیم ہے، مولانا غلام علی آزاد نے صحیح لکھا ہے:۔

لاشک بزرگان چشت عنبر سرشت را حقی است قدیم بر ولایت ہند۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ بزرگانِ سلسلۂ چشت کا ملک ہندوستان پر حق قدیم ہے

اور صاحب سیر الاقطاب کا یہ لکھنا بھی صحیح ہے:۔

---

[1] سیر الاولیاء ص۴۷ [2] ماثر الکرام ص۷

بہ ہندوستان برمن قدوم میمنت لزومش	ہندوستان میں انکے دم قدم کی برکت سے
طریقۂ اسلام ظاہر گشت و سیاہی کفر	اسلام کی اشاعت ہوئی اور کفر کی ظلمت
شرک از عرصۂ روزگار برفت[1] ــــ	یہاں سے کافور ہوئی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حیات ہی میں ہندوستان کی سیاسی مرکزیت اور اقتدار اجمیر سے دہلی منتقل ہو گیا، اور اجمیر نے اپنی اہمیت بہت کچھ کھو دی۔ خواجہ بزرگؒ نے دہلی میں اپنے جانشین و خلیفۂ اعظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بٹھایا اور خود اجمیر ہی میں مقیم رہے جہاں تبلیغ و ارشاد اور تعلیم و تربیت اور مشغولی بحق میں اپنی بقیہ زندگی پوری کر دی، کسی قدیم تاریخی ماخذ میں ان تبلیغی مساعی کی تفصیلات اور ان کے نتائج و اثرات کا مستند و معیّن طریقہ پر تذکرہ نہیں ملتا۔ عام طور پر اتنا ذکر کیا جاتا ہے کہ کثیر و عظیم تعداد میں بندگانِ خدا نے ان سے ایمان و احسان کی دولت پائی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے ــــ ابو الفضل "آئینِ اکبری" میں لکھتا ہے:۔

عزلت گزیں باجمیر شد و فراواں چراغ	اجمیر میں عزلت گزیں ہوئے اور اسلام
برافروخت، و از دم کبرائے او گروہا گروہا	کا چراغ بڑی آب و تاب سے روشن کیا، انکے
مردم بہرہ برگرفتند	انفاسِ قدسیہ سے جوق در جوق انسانوں نے ایمان
	کی دولت پائی۔

تقریباً نصف صدی ارشاد و تلقینِ اسلام کی اشاعت اور داعیان اسلام و اہلِ قلوب کی

---

[1] سیر الاقطاب ص۱۱۱

[2] آئینِ اکبری (سر سید ایڈیشن) ص۳۷

کی تعلیم و تربیت اور یادِ حق میں سرگرمی کے ساتھ مشغول رہ کر ۹۰ سال کی عمر میں ۶۲۷ھ[1] میں اس وقت رحلت فرمائی جب ہندوستان میں ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا جڑ پکڑ چکا تھا اور دار الحکومت دہلی میں ان کا جانشین و تربیت یافتہ شیخ وقت (خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ) ارشاد و ہدایت کے کام میں سرگرم و منہمک تھا اور ان کا عقیدتمند و حلقہ بگوش سلطان شمس الدین التمش اسلامی حکومت کی توسیع و استحکام اور عدل گستری و خلق پروری میں مشغول تھا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

خواجہ قطب الدین بختیارؒ قصبۂ اوش[2] (ماوراء النہر) میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، والدہ ماجدہ نے تربیت کی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے، مولانا ابو حفص اوشیؒ سے تعلیم حاصل کی، پھر بغداد کا سفر کیا، وہاں اُس خضر طریقت سے ملاقات و ملازمت کا شرف حاصل ہوا جس کی رہبری سے کمال و تکمیل کے مدارج تک پہنچنا مقدر تھا اور جس کے ہاتھوں اور جس کی شرکت میں اسلام میں ہندوستان کا "چشمۂ حیواں" جاری ہونا تھا۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ کی تاریخی و بابرکت مسجد میں ممتاز و جلیل القدر علماء و شیوخ کی موجودگی میں خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے، ہندوستان تشریف لائے اور اپنے شیخ کے حکم و ہدایت سے دہلی کو اپنا مستقر بنایا جو نوخیز و وسعت پذیر اسلامی سلطنت کا دار الحکومت تھا، اور جو ایک طرف عالی ہمت مسلمانوں

---

[1] سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ عام طور پر تین سنہ لکھے گئے ہیں: ۶۲۷ھ، ۶۳۲ھ، ۶۳۳ھ صاحب سیر الاقطاب نے "آفتابِ ملکِ ہند" سے سنہ وفات ۶۳۳ھ استخراج کیا ہے، صاحب خزینۃ الاصفیاء نے بھی یہی سنہ وفات مانا ہے۔ ۱۲

[2] یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ وہ فرغانہ کے نواحی میں ایک بڑا شہر ہے۔

بادشاہوں کی قدردانی دجوہر شناسی کی وجہ سے ، دوسری طرف تاتاری حملوں کی بناء پر علماء و شرفاء و اہلِ کمال کا ملجا و ماویٰ بن گیا تھا، اور عالمِ اسلام کا جوہر وہاں منتقل ہو رہا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش نے شایان شان پذیرائی کی، آپ نے دربار سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہ کیا اور سلطان کی کسی پیشکش (دیہہ وجاگیر) کو قبول نہ فرمایا، اور پہلے کیلوکھری میں، پھر ملک عزالدین کی مسجد کے قریب فقیرانہ و درویشانہ زندگی اختیار کی[1]، سلطان برابر عقیدت کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور اس کی عقیدت برابر ترقی کرتی رہی، اہل شہر کا ایسا رجوع عام ہوا کہ شیخ الاسلام وقت شیخ نجم الدین صغریٰ کو کمی ہونے لگی اور شکایت پیدا ہو گئی حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے خلیفہ کی ملاقات کے لئے دہلی تشریف لائے تو شیخ نجم الدینؒ نے جو اُن کے قدیم دوست تھے شکایت کی۔ حضرت خواجہؒ نے اپنے مرید رشید سے فرمایا:—

بابا بختیار ہم یکبار چنیں مشہور شدی کہ	بابا بختیار اتنی جلدی ایسے مشہور ہو گئے
خلق از دست تو شکایت کردن گرفت	کہ بندگان خدا کو تم سے شکایت
ازیں جا برخیز و در اجمیر بیا و بنشین	پیدا ہونے لگی۔ یہاں سے چلو اور اجمیر جاؤ وہاں
من پیش تو بایستم[2]	قیام اختیار کرو، میں تمہارے سامنے (خادم) کھڑا رہونگا۔

شیخ نے وہ ارشاد فرمایا جو ایک ایسے عالی مرتبت شیخ کو فرمانا چاہیئے جو کمالِ اخلاص و ربانیت کو پہنچ چکا تھا، مردانِ راہ و واصلینِ بارگاہ ادنیٰ مخلوق کی شکایت و آزردگی کو گناہ سمجھتے ہیں، چہ جائیکہ شیخ الاسلام کی کبیدگی کو، پھر آپ مرکزِ اسلام میں انتشار و پراگندگی کو پسند نہیں کرتے تھے جس کا اس رنجش سے خطرہ تھا، آپ نے لطیف طریقہ پر یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ اگر یہاں کے اہلِ فضل تمہاری قدر و منزلت اور مقام سے واقف نہیں تو

---

[1] فرشتہ ص ۷۲۰ ج ۲ [2] سیر الاولیا ص ۵۴

میں واقف ہوں، اور یہ کہ یہاں خادم و مخدوم و شیخ و مرید کا کوئی امتیاز نہیں، وہاں تم مخدوم رہو گے، میں خادمانہ ۔ خواجہ قطب الدینؒ نے وہی جواب دیا جو ایک مرید رشید کو دینا چاہیے عرض کیا: ۔

مخدوم مرا چہ محل آں باشد کہ پیش — مخدوما! میں تو آپ کے سامنے کھڑے
مخدوم توائم ایستاد فکیف بنشستیم[1] — ہونے کا بھی اہل نہیں، بیٹھنے کی کیا مجال؟

شیخ نے اجمیر چلنے کا حکم دیا اور مرید صادق بے چون و چرا اور بلا تامل تیار ہو گیا، لیکن جب شہر کے باہر قدم نکالا تو شیخ کو معلوم ہو گیا کہ یہ مقبولیت و ہر دلعزیزی من جانب اللہ ہے اس میں نفسانیت و انانیت کو دخل نہیں، اور یہ کہ ان کے مرید رشید نے ساری دہلی کو اپنا عاشق و پروانہ بنا لیا ہے ۔

شیخ قطب الدین ہمراہ شیخ روانہ اجمیر گردید — خواجہ قطب الدین اپنے شیخ کے ساتھ اجمیر
ازیں مقدمہ در تمام شہر دہلی شور افتاد ہمہ — روانہ ہوئے، اس اطلاع سے شہر دہلی میں
اہل شہر مع سلطان شمس الدین دُنبال — ایک شور برپا ہو گیا۔ اہل شہر مع سلطان
برآمدند، و ہر جا شیخ قطب الدین قدم — شمس الدین شہر سے نکلکر آپ کے پیچھے ہو لئے جہاں
می گذاشت خلائق خاک آں زمین بہ تبرک — خواجہ قطب الدین کا پاؤں پڑتا تھا، لوگ خاک کو
برمی داشت و نہایت اضطراب و زاری[2] نمودند۔ — تبرک بنا کر اٹھا لیتے تھے۔ لوگ بڑے بیقرار
اور آہ و زاری میں مصروف تھے ۔

ایک دل کو خوش کرنے کے لئے اور ایک جزئی مصلحت کی خاطر لاکھوں خدا کے بندوں کے دل کو رنجور و زخمی کرنا جائز نہ تھا۔ مرشد نے مرید رشید کو اجمیر لیجانے کا ارادہ فسخ کیا اور فرمایا:

---

[1] سیر الاولیاء ص۵۴ [2] ایضاً ص۵۴

بابا بختیارؒ! ہمدریں مقام باش کہ خلائق از بیرون آمدن تو در اضطراب و خراب است روانہ دارم کہ چندیں دلہا خراب و کباب باشند، بر و ایں شہر را در پناہ تو گذاشتیم۔[1]

بابا بختیار! تم یہیں رہو، اسلئے کہ خدا کی اتنی مخلوق تمہارے باہر جانے سے تباہ حال ہے میں اس کو جائز نہیں سمجھتا کہ اتنے دل دکھائے اور جلائے جائیں۔ جاؤ ہم نے اس شہر کو تمہاری پناہ میں چھوڑا۔

سلطان شمس الدین نے جس کا دارالحکومت اس نعمت سے محروم ہوا جارہا تھا، شیخ کا شکریہ ادا کیا اور خواجہ قطب الدین شہر دہلی واپس آئے اور خواجہ معین الدینؒ اجمیر واپس ہوئے۔

خواجہ قطب الدینؒ نے دہلی واپس آکر اور اپنے بوریائے فقر پر بیٹھ کر سرگرمی سے ارشاد و تربیت کا کام انجام دینا شروع کیا۔ انھوں نے "سرکار و دربار" سے ضابطہ کا کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ صرف اسکو اپنی زندگی کا اصول بنایا بلکہ اپنے سلسلہ کا اصول بنا دیا کہ فقر و استغنا کے ساتھ اور "دربار" سے دور رہ کر اپنا کام کرنا ہے، لیکن اس بے تعلقی و بے نیازی کے باوجود عوام و خواص اور شاہ و گدا سب ان کے عقیدتمند و حلقہ بگوش تھے۔

جملگی عالم از صدور و ائمہ بہ دعاگوئی روئے نہادند[2]

ساری دنیا، اعیان و اکابر دعاگوئی اور نیازمندی میں مصروف تھے۔

سلطان شمس الدین ہفتہ میں دو بار حاضری دیتا اور اخلاص و عقیدت کا اظہار کرتا[3]۔ دہلی میں جو نہ صرف ہندوستان کا دارالحکومت بلکہ عالمِ اسلام کی نئی طاقت اور دعوت و تجدید اسلام کا نیا مرکز تھا اور جہاں عالم اسلام کے ممتاز ترین علماء و اساتذہ، سادات و شرفاء اور مشائخ و اہلِ

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۵۵) [2] اخبار الاخیار (ص ۲۶) [3] تاریخ فرشتہ (ص ۱۹)

سلسلہ اور دنیائے اسلام کے بہترین دل و دماغ جمع تھے، اشاعت طریق و تربیت قلوب اور نئی ابھرتی ہوئی اسلامی سلطنت کی رہنمائی کا کام اپنے دامنِ فقر و استغنا کو ذرہ برابر آلودہ اور تر کئے بغیر انجام دینا بڑا نازک اور مشکل تھا اور اس کے لئے پہاڑ کی سی استقامت اور ہوا کی سی سُبک روی اور سُبک گامی کی ضرورت تھی۔ جس سے کسی شیشے کو ٹھیس نہ لگے۔ خواجہ صاحب نے بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس نازک اور دشوار کام کو انجام دیا، ان کو اس خدمت کے لئے طویل زمانہ نہیں ملا اپنے شیخ کے بعد تو مشکل سے ۴، ۵ سال وہ زندہ رہے، لیکن ان کی ذات سے ہندوستان میں نہ صرف سلسلہ چشتیہ کی بنیاد پڑ گئی، بلکہ جن مقاصد عالیہ کے لئے حضرت خواجہ معین الدینؒ نے ہندوستان کو اپنے قیام اور کام کے لئے انتخاب کیا تھا وہ صدیوں کے لئے محفوظ ہو گئے۔

ابھی ان کی عمر ۵۰ سال یا اس سے کچھ اوپر ہوئی تھی کہ عشق و محبت الٰہی کی وہ آگ جس کو انھوں نے صبر و ضبط کے فانوس میں مقید اور ہدایت و تربیتِ خلق کی مصلحت سے مغلوب کر رکھا تھا بھڑکی اور جذبِ الٰہی کا غلبہ ہوا ــــ ؎

صدائے تیغ تو آمد ببزم زندہ دلاں
کدام سر کہ در و ذوق ایں سرود نماند

ایک مرتبہ شیخ علی سکزیؒ[2] کی خانقاہ میں مجلس سماع گرم تھی۔ قوال نے شعر پڑھا ؎

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

---

[1] اگر حضرت خواجہ معین الدینؒ کا سنہ وفات ۶۲۷ھ بھی تسلیم کر لیا جائے تو خواجہ قطب الدینؒ کو ان کے بعد صرف ۶ سال ملتے ہیں۔ [2] بعض تذکروں میں سجزی درج ہے۔ ۱۲

خواجہ قطب الدینؒ پر وجد طاری ہوگیا، خانقاہ سے قیام گاہ پر تشریف لائے، وہی مدہوشی اور تحیر کا عالم تھا، اسی شعر کی فرمائش تھی، فرمائش کی تعمیل کی جاتی تھی۔ چار شبانہ روز عالمِ تحیر میں رہے، لیکن جب نماز کا وقت آتا ہوش آجاتا، نماز ادا کرتے، پھر اسی شعر کی فرمائش کرتے، شعر پڑھا جاتا اور عالم تحیر میں چلے جاتے۔ پانچویں رات کو انتقال کیا[1]۔ یہ واقعہ ۶۳۳ھ[2] کا ہے۔

انتقال سے پہلے عید کے روز عیدگاہ سے قیام گاہ کی طرف واپس آرہے تھے کہ ایک ایسے میدان سے گزر ہوا جہاں کوئی قبر یا آبادی نہ تھی، خواجہ وہاں ٹھہر گئے اور دیر تک کھڑے رہے کسی خادم نے عرض کیا کہ عید کا دن ہے اور خلقت منتظر، آپ نے یہاں کیوں توقف فرمایا؟" ارشاد ہوا۔ مرا ازیں زمیں بوئے دلہا می آید" (مجھے یہاں سے دلوں کی خوشبو آتی ہے) دوسرے وقت زمین کے مالک کو بلا کر اپنے صرف خاص سے اسکو خرید فرمایا اور اس کو اپنے دفن کیلئے تجویز کیا، وہیں مدفون ہوئے[3]۔

حضرت خواجہؒ کے خلفاء کی تعداد (جن کے نام تذکرہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں) ۹، ۱۰ سے کم نہ تھی، لیکن آپ کی جانشینی اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کے کاموں اور مقاصد کی تکمیل و توسیع کی سعادت حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے حصے میں آئی۔

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ

جس طرح حضرت خواجہ معین الدینؒ ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے مؤسس ربانی ہیں

خواجہ فرید الدینؒ اس کے مجدد اور اس سلسلہ کے آدم ثانی ہیں۔ آپ ہی کے دو خلفاء سلطان المشائخ

---

[1] سیر الاولیاء بروایت حضرت خواجہ نظام الدینؒ

[2] بعض تذکروں میں ۶۳۴ھ بجائے ۶۳۳ھ کے۔

[3] سیر الاولیاء بروایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ (ص ۵۵)۔ اب یہ جگہ قطب صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۲

حضرت خواجہ نظام الدین دہلویؒ اور حضرت شیخ علاء الدین علی صابر پیران کلیریؒ کے ذریعہ یہ سلسلہ ہندوستان میں پھیلا اور ان کے خلفاء و اہل سلسلہ کے ذریعہ اب بھی زندہ و قائم ہے ع

خم و خمخانہ با مہر و نشان است

حضرت خواجہؒ کا نام مسعودؒ لقب فرید الدین تھا، عام طور سے گنج شکر کے لقب سے مشہور عالم[1] ہیں، آپ نسباً فاروقی ہیں، جد بزرگوار قاضی شعیب تاتاریوں کے ہنگامہ میں کابل سے لاہور تشریف لائے، کچھ عرصہ قصور میں قیام فرمایا، قصبہ کہنیوال کی قضاۃ و جاگیر عطا ہوئی۔ یہیں ۵۶۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، صغر سنی میں ملتان کا سفر کیا جو اُس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا علمی و دینی مرکز تھا، شہر کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ کی کتاب "النافع" پڑھی، وہیں ۵۸۴ھ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی زیارت ہوئی اور ان سے بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ شیخ فرید الدینؒ آپ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تعلیم کے سلسلہ کو خیرباد کہہ کر ہمرکاب ہو جانے کا عزم کیا۔ شیخ کامل نے منع کیا اور تکمیل کی ہدایت کی۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جا کر علوم کی تکمیل کی[2]۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد شیخ کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ شیخ نے ان کے قیام کے لئے غزنین دروازہ کے پاس ایک جگہ منتخب کی، جہاں وہ ریاضت و مجاہدے میں مشغول ہو گئے۔ سلوک

---

[1] اس لقب کی حقیقت و تاریخ میں مختلف اقوال ہیں، یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔

[2] راحت القلوب میں جو آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس سفر اور دوسری سیاحتوں کی بڑی تفصیل موجود ہے، لیکن چوں کہ اس کتاب کی نسبت صحیح نہیں ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا گیا۔ بعض دوسری کتابوں میں بھی بعض دوسری تفصیلات ہیں۔ ۱۲

کی تکمیل کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے اور شیخ کی اجازت سے ہانسی میں قیام اختیار کیا جوان کے مخلص (جو بعد میں خلفائے کبار میں ہوئے) شیخ جمال الدین خطیب ہانسی کا وطن تھا۔ شیخ کا انتقال ہوا تو وہ ہانسی میں تھے، انتقال کے تیسرے روز دہلی پہنچے، مزار شیخ پر فاتحہ پڑھی۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے شیخ کی وصیت کے مطابق ان کا خرقہ اور دوسری امانتیں سپرد کیں، یہ گویا جانشینی کا اعلان تھا۔ شیخ نے دوگانہ پڑھ کر اس کو زیب تن کیا اور شیخ کی جگہ پر بیٹھے۔

دہلی کی آمد اور شیخ کی جانشینی کا تیسرا روز تھا کہ ہانسی سے آپ کا ایک آشنائے قدیم و معتقد سرمنگا نامی آپ کے اشتیاق میں دہلی آیا۔ خادموں نے اندر جانے نہیں دیا۔ معتقدین و خدام کے ہجوم سے اس درویش کو ملاقات میسر نہ آئی، منتظر تھا کہ ایک روز شیخ باہر تشریف لائے سرمنگا قدموں پہ گر گیا اور رو کر کہا کہ جب تک آپ ہانسی میں تھے آسانی اور بے تکلفی سے مل لیا کرتا تھا، اب یہاں ہم جیسے غریبوں کا کام نہیں! شیخ کے دل پر چوٹ لگی اور سمجھے کہ تنبیہ غیبی ہے، دہلی میں سکون اور عوام و فقرا سے ملنے جلنے کا موقع نہیں۔ اپنی مزید تکمیل ترقی مطلوب تھی۔ آپ نے اسی وقت اپنے دوستوں سے کہا کہ میں ہانسی جاؤں گا۔ حاضرین نے عرض کیا کہ شیخ قطب الدینؒ نے تو آپ کو اس جگہ بٹھایا ہے۔ آپ کہاں جاتے ہیں؟ فرمایا کہ "پیرؒ نے اپنی امانت سپرد کر دی ہے، شہر میں رہوں یا بیابان میں وہ ساتھ ہے"[1]۔

ہانسی کا قیام اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہاں سکون اور گمنامی رہے گی۔ یہاں خواجہ قطب الدینؒ کے ایک مرید مولانا نور ترک کی وجہ سے (جنھوں نے اہل ہانسی کو آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کر دیا) آپ کی شہرت ہو گئی اور خلق نے ہجوم کیا۔ آپ نے کہنیوال کا رخ کیا جو

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۷۲)

وطن قدیم تھا۔ کہنیوال ملتان سے قریب تھا، اور اُن کی شہرت اور عظمت کا آوازہ اَب دُور دُور بلند ہو رہا تھا، آپ نے اجودھن[1] کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا، اور ارشاد ہوا کہ:۔ وہاں کے لوگ دیر اعتقاد اور نا آشنا ہیں اور جگہ بھی غیر معروف ہے، لیکن یہاں بھی بہت جلد رجوع شروع ہو گیا اور خلائق نے ہر طرف سے ہجوم کیا۔ آفتاب شہرت و عظمت نصف النہار پر تھا اور اس کی شعاعیں دور دور پہنچ رہی تھیں اور طالبین خدا کے قلوب کو گرم کر کے کھینچ کھینچ کر لا رہی تھیں۔ تھوڑے دنوں میں مرجعیت یہاں تک بڑھی کہ آنے والوں کا سلسلہ ختم ہونے کو نہ آتا، آدھی رات تک در وازے کھلے رہتے۔

ابتدائے قیام میں عرصہ تک نہایت تنگی اور عُسرت و فقر و فاقہ کے ساتھ زندگی گذاری، پیلو کے پھل ابال لئے جاتے اور ان میں کچھ نمک ڈال کر فقراء کو تقسیم کر دیئے جاتے اور خود بدولت اپنے مہمانوں اور خادموں کے ساتھ تناول فرماتے۔ توکل و تجرید کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ افطار کیلئے لقمہ اٹھایا، فرمایا: اس میں کچھ بے اصولی معلوم ہوتی ہے؟ خادم نے عرض کیا کہ: نمک نہ تھا، ایک دانگ کا نمک قرض لیکر ڈال دیا۔ فرمایا:۔ تم نے بے اصولی کی، میرے لئے اس کا کھانا روا نہیں[2]۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حال ہوا کہ دن رات مطبخ شاہی گرم رہتا اور آدھی رات گئے تک کھانے والوں کا سلسلہ رہتا، جو آتا اس خوانِ نعمت سے حصّہ پاتا۔ جو شخص بھی آتا کسے باشد اپنا حصّہ پاتا[3]۔

شفقت و دلداری سب کے ساتھ یکساں تھی۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ: عجیب قوت اور عجب طرزِ زندگی تھا جس کا تحمّل کسی سے ہونا آسان نہیں، نئے آنے والے جو کبھی نہیں آئے اور برسوں کے ساتھ رہنے والے سب سے یکساں لطف و مہربانی اور توجّہ و التفات کے ساتھ پیش

---

[1] اجودھن کو اَب پاک پٹن کہتے ہیں، اور وہ ضلع منٹگمری (پاکستان) کا ایک قصبہ ہے۔ ۱۲

[2] سیر الاولیاء، (صـ۶۶) [3] ایضاً (صـ۶۴)۔

آتے، مولانا بدرالدین اسحٰق فرماتے ہیں کہ:۔ میں خادمِ خاص تھا، جو بات کہنی ہوتی مجھ سے فرماتے تھے، خلوت وجلوت میں یکساں حال تھا، ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔ برسوں خدمت کرنے اور ساتھ رہنے کے باوجود کوئی تفاوت نہ دیکھا۔[1]

ایک بار سلطان ناصرالدین محمود کا پورا لشکر جو بادشاہ کے اوچ اور ملتان کے سفر میں ہمرکاب تھا، خواجہؒ کی زیارت کیلئے اجودھن حاضر ہوا۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ اس کا حال بیان کرتے ہیں کہ:۔

"ہجوم قابو سے باہر تھا، آخر کار خدام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حضرت خواجہؒ کے پیرہن کی آستین بالاخانہ سے لٹکا دی۔ اہلِ لشکر آتے تھے اور اس کو بوسہ دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ آستین تار تار ہو گئی۔ مجبوراً آپ مسجد میں تشریف لائے اور خدام سے فرمایا کہ:۔ میرے گرد حلقہ بنا لو، کوئی اس حلقہ کے اندر نہ آنے پائے۔ لوگ آتے تھے اور حلقہ کے باہر کھڑے ہو کر سلام کر کے رخصت ہو جاتے تھے۔ اچانک ایک بوڑھا فراش حلقہ توڑ کر اندر آ گیا اور شیخ کے پاؤں پر گر گیا۔ پاؤں پکڑ کر بوسہ لیا اور کہا:۔ "شیخ فریدؒ! تنگ آ گئے؟ اللہ تعالیٰ کے اِس انعام کا اس سے زیادہ شکریہ ادا کرو"۔ شیخ نے یہ سُن کر نعرہ مارا اور اس فراش کو بہت نوازا اور اس سے معذرت کی۔"[2]

سلطان ناصرالدین نے خود حاضری کا قصد کیا، نائبُ السّلطنت غیاث الدّین بلبن نے جو ہمرکاب تھا، عرض کیا کہ:۔ لشکر بہت ہے اور اجودھن ایک بے آب و گیاہ مقام ہے، اگر فرمان ہو تو میں خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور جہاں پناہ کی طرف سے معذرت اور ہدیہ و فتوح پیش کروں چنانچہ کچھ نقد اور چار گاؤں کا فرمان لیکر حاضر ہوا اور نقد اور فرمان پیش کیا۔ شیخؒ نے فرمایا: "یہ کیا ہے؟" غیاث الدین نے کہا کہ: "یہ کچھ نقد ہے اور یہ جاگیر کا فرمان سلطانی"۔ شیخ نے تبسم فرمایا، اور کہا کہ:۔

---

[1] سیر الاولیاء (ص۶۵) [2] ایضاً (ص۷۹)

نقد تو ہم کو دے دو اور فرمان واپس لے جاؤ کہ اس کے طالب بہت ہیں، یہ کہہ کر ساری رقم اُسی وقت درویشوں میں تقسیم کر دی[1]

سلطان غیاث الدین حضرتؒ سے معتقدانہ تعلق رکھتا تھا، دہلی کی سلطنت کا حصول بھی حضرتؒ کی دُعا اور محبّت کا نتیجہ سمجھتا تھا اور خدّام کی خدمت کو اپنی سعادت تصوّر کرتا تھا، حضرت خواجہؒ نے ایک مرتبہ ایک شخص کے اصرار سے ایک سفارشی رقعہ لکھا جو سفارش و بے نیازی کا عجیب مجموعہ ہے، فرماتے ہیں:-

"میں اِس شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اگر آپ اس کو کچھ دینگے تو حقیقی عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوگا اور آپ مشکور ہوں گے اور اگر آپ نہ دیں گے تو اس کا مانع اللہ تعالیٰ ہوگا، آپ معذور ہوں گے۔"[2]

حضرت شیخ فریدالدینؒ کے اپنے نامور معاصرین اور دوسرے سلسلہ کے مشائخ کبار سے دوستانہ و برادرانہ تعلقات تھے اور ان کے پورے مرتبہ شناس اور قدردان تھے۔ شیخ الاسلام شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ جو سلسلۂ سہروردیہ کے نامور شیخ اور ہندوستان کے عظیم ترین روحانی پیشواؤں اور داعیوں میں گذرے ہیں[3] ان کے ہم عصر تقریباً ہم عمر تھے۔ دونوں کے بڑے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے اور آپس میں بہت دلچسپ اور بے تکلفی کی خط و کتابت ہوتی تھی۔ شیخ فریدالدینؒ شیخ بہاءالدینؒ کو "شیخ الاسلام" کے لقب سے مخاطب

---

[1] سیر الاولیاء ص۷۹ و ص۷۰ - ۱۲ [2] اخبار الاخیار - اصل رقعہ فصیح عربی میں ہے - ۱۲

[3] شیخ الاسلام شیخ بہاءالدین زکریا کی ولادت ۵۶۶ھ کی ہے، اور شیخ کبیر کی ولادت ۵۶۹ھ کی - ۱۲

کرتے تھے۔ دونوں کے خلفاء اور مریدین بھی آپس میں ایک دوسرے سے بڑے خلوص و محبت سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کا اعتراف اور بزرگ داشت کرتے تھے۔ شیخ الاسلامؒ کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ، اور شیخ کبیرؒ کے خلیفہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے درمیان بڑی محبت اور گہرا تعلق تھا۔

حضرت خواجہ فریدالدینؒ کی زندگی کا اصل جوہر اور معاصرین میں ان کا امتیاز وہ ذوق و شوق اور درد و عشق اور جذب الٰہی و خدا مستی ہے جس نے حضرت خواجہ نظام الدین و حضرت علاءالدین علی صابر جیسے عاشقوں اور دردمندوں کی تربیت کی، اور جو اجودھن کی اس دکان عشق کا خاص سود اتھا۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ ایک روز کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ شیخ کبیرؒ (حضرت خواجہ فریدالدینؒ) حجرے میں تھے، سر برہنہ تھا اور چہرے کا رنگ متغیر، حجرے میں والہانہ کیفیت میں پھرتے تھے اور یہ اشعار پڑھتے تھے ؎

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم — خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصودِ خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم از برائے تو زیم

(میری آرزو ہے کہ ہمیشہ آپ ہی کا ہو کر جیوں، خاک ہو جاؤں اور آپ کے قدموں کے نیچے زندگی گذرے، مجھ مسکین و بیچارے کا دونوں جہاں میں مقصود آپ ہی ہیں آپ ہی کے لئے جیتا ہوں، آپ ہی کے لئے مرتا ہوں)۔

یہ شعر پڑھ کر سجدے میں سر رکھ دیتے تھے، پھر یہی شعر پڑھتے تھے اور حجرے کا چکر لگاتے تھے، پھر سجدے میں پڑ جاتے تھے، دیر تک یہی کیفیت رہی[1]۔

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۳۳

خشیت و رقّت کا بڑا غلبہ تھا، کوئی عبرت انگیز و رقّت خیز بات سنتے یا مجلس میں کوئی عاشقانہ شعر پڑھا جاتا یا کسی بزرگ کا کوئی واقعہ سنتے تو بے اختیار روتے، بعض اوقات ہاڑیں مار مار کر روتے، ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، قرآن مجید کے حفظ کا اہتمام اور تلاوت کا بڑا ذوق تھا اور دونوں چیزیں (روزہ اور حفظ قرآن) کی اپنے خلفائے خاص و مریدانِ با اختصاص کو وصیت و تاکید فرماتے تھے۔ سماع کا بڑا ذوق تھا۔ کسی نے کہا کہ علماء کو اس میں اختلاف ہے، فرمایا:۔

سبحان اللہ یکے سوخت و خاکستر شد	سبحان اللہ! ایک جلا بھی اور راکھ بھی
دیگرے ہنوز در اختلاف است[1]۔	ہو گیا دوسرا ابھی اختلاف ہی کر رہا ہے۔

ساری زندگی کا اصول اہلِ دول و ارباب حکومت سے بے تعلقی، کنارہ کشی، اخفائے حال اور درویشانہ زندگی تھا۔ اپنے مشائخ کرام کا مسلک جان کر اور اسی میں خلوص کی حفاظت اور طریقہ کی اشاعت کا راز سمجھ کر اس روش پر سختی اور مضبوطی سے قائم تھے، ان کے ایک برادرِ طریقت شیخ بدر الدّین غزنویؒ نے (جو حضرت خواجہ قطب الدّین کے خلفائے کبار میں سے تھے) بعض اعیانِ سلطنت سے خصوصی تعلق رکھا تھا اور اُس نے ان کے لئے دہلی میں خانقاہ تعمیر کی تھی اور ان کی مخصوص طریقے پر خدمت کرتا تھا۔ انقلاب روزگار سے جب وہ امیر عتاب شاہی میں آیا تو شیخ کو بھی زحمت و کلفت پیش آئی، آپ نے شیخ کبیرؒ سے دُعا کی درخواست کی۔ شیخ نے جواب میں لکھا کہ:۔

"جو اپنی روش پر چلے گا وہ ضرور ایسی حالت میں گرفتار ہوگا، جس سے ہمیشہ بے چین رہیگا، آپ تو پیران پاک کے معتقدین میں ہیں، پھر اُن کی رَوش کے خلاف خانقاہ کیوں بنوائی، اور اس میں کیوں بیٹھے؟ حضرت خواجہ قطب الدینؒ

---

[1] ملاحظہ ہو حالات حضرت سلطان المشائخؒ - ۱۲۔ [2] سیر الاولیاء ۱۲۔

اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کا تو یہ طریقہ اور روش نہیں تھی کہ اپنے لئے خانقاہ بنا کر دکان جمائیں، ان کا شیوہ تو گمنامی و بے نشانی تھا[1]۔

ان کے اس طبعی ذوق کی وجہ سے باوجود رجوعِ عام اور امراد خواص کی عقیدت کے انتقال سے پہلے پھر عسرت اور تنگی کا دور شروع ہو گیا، سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے فرمایا کہ:۔

"حضرت شیخ شیوخ العالم کو آخر عمر میں کہ انتقال کا زمانہ قریب تھا تنگی پیش آئی، میں ماہ رمضان میں موجود تھا، اتنا تھوڑا کھانا آیا کرتا تھا کہ موجود لوگوں کو کافی نہ ہوتا تھا۔ کسی رات بھی میں نے ان دنوں سیر ہو کر کھانا نہ کھایا، سامان بھی جو دیکھنے میں آتا تھا بہت معمولی اور برائے نام تھا، میں جب رخصت ہونے لگا تو حضرتؒ نے خرچ کے لئے مجھے ایک سلطانی[2] عطا فرمایا۔ اس روز مولانا بدر الدین اسحٰقؒ کے ذریعہ پیغام پہنچا کہ آج توقف کریں کل جائیں، جب افطار کا وقت ہوا تو حضرت شیخؒ کی خدمت میں گیا اور میں نے عرض کیا کہ حضرتؒ کی بارگاہ سے مجھے ایک سلطانی عطا ہوا تھا اجازت ہو تو اس سے کچھ کھانے کا انتظام کر لیا جائے؟ حضرت نے اجازت مرحمت فرمائی اور بڑی دعائیں دیں[3]"

صاحب سیر الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی روایت سے وفات کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

---

[1] سیر العارفین ص۸۵ ماخوذ از بزم صوفیہ [2] سکہ (غالباً اس وقت کا روپیہ)
[3] سیر الاولیاء ص۶۶

"محرم کی پانچ تاریخ کو بیماری میں شدت ہوئی۔ عشاء کی نماز جماعت سے ادا کی، نماز کے بعد بیہوشی طاری ہوگئی۔ ایک گھڑی کے بعد ہوش آیا تو دریافت کیا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ پڑھ لی ہے۔ فرمایا دوبارہ پڑھ لوں کیا خبر کیا ہو؟ دوبارہ نماز پڑھی اور پھر بیہوش ہوگئے۔ اس مرتبہ بیہوشی زیادہ سخت اور طویل تھی، پھر ہوش آیا اور پوچھا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی؟ عرض کیا گیا کہ دو بار پڑھ چکے ہیں، فرمایا کہ ایک بار اور پڑھ لوں، کون جانے کیا ہو؟ تیسری مرتبہ پھر پڑھی۔ اسکے بعد واصل بحق ہوئے[1]۔

تاریخ وفات ۵ محرم روز سہ شنبہ ۶۶۴ھ ہے۔ اجودھن (پاک پٹن) میں مدفون ہوئے بعد میں سلطان محمد تغلق نے گنبد تعمیر کیا۔

حضرت خواجہؒ کے پانچ فرزند اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ فرزندوں کے نام یہ ہیں۔ شیخ نصرالدین نصراللہ، شیخ شہاب الدین، شیخ بدرالدین سلیمان، خواجہ نظام الدین، شیخ یعقوب۔ صاحبزادیوں کے نام: بی بی مستورہ، بی بی فاطمہ، بی بی شریفہ۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۸۹ [2] صاحب سیرۃ الاولیاء نے متعدد مقامات پر ۶۶۹ھ کے ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو حضرت خواجہؒ کی زندگی سے متعلق ہیں۔ بعض مقامات پر حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی تحریر کا حوالہ ہے کہ حضرت خواجہؒ نے مجھ سے یہ فرمایا، فلاں ہدایت کی، اگر ان سنین کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو سنہ وفات ۶۶۴ھ جو عام طور پر مشہور اور زیادہ تر کتابوں میں مذکور ہے مشکوک ہو جاتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ حضرت خواجہؒ کی وفات اسکے بعد ہوئی، بعض دوسری کتابوں میں بعد کے سنین درج ہیں، ان میں قرین قیاس ۶۷۰ھ ہے جو خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین درج ہے۔ ۱۲

حضرت خواجہؒ کی وفات کے بعد ان کے تیسرے صاحبزادے شیخ بدرالدین سلیمانؒ باپ کے سجادہ پر بیٹھے ان کے فرزند و سجادہ نشین شیخ علاءالدین اجودھنی تقدس و اتقا میں مشہور تھے۔ محمد تغلق بھی ان کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گیا تھا[1]۔ اللہ تعالیٰ نے روحانی سلسلہ کی طرح حضرت خواجہؒ کی اولاد اور خاندان کو بھی بڑی برکت عطا فرمائی، ہندوستان کے مختلف حصوں میں یہ خاندان آباد ہے اور بالعموم فریدی کہلاتا ہے۔

حضرت خواجہ کے خلفاء میں پانچ حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔ شیخ جمال الدینؒ ہانسویؒ، شیخ بدرالدین اسحٰقؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ علی احمد صابرؒ اور شیخ عارفؒ۔

شیخ جمال الدین (احمد بن محمد) خطیب ہانسوی حضرت خواجہ کے بڑے عزیز خلیفہ و معتمد خاص تھے۔ انھیں کی خاطر حضرت خواجہ نے ۱۲ سال ہانسی میں قیام فرمایا تھا۔ آپ جب کسی کو خلافت نامہ لکھ کر دیتے تھے تو فرماتے تھے کہ ہانسی جا کر شیخ جمال الدین کو دکھا دینا اگر شیخ جمال الدین صاد فرماتے تو آپ بھی اسکو قبول کرتے، اگر وہ صاد نہ کرتے تو آپ بھی نامنظور فرماتے اور فرماتے کہ جمال کا پھاڑا ہوا سیا نہیں جا سکتا۔ فرماتے تھے کہ جمال میرا جمال ہے۔

شیخ جمال الدین نے اپنے شیخ کی زندگی میں ۶۵۹ھ میں انتقال کیا۔ شیخ قطب الدین منورؒ (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے عزیز خلیفہ) ان کے پوتے ہیں۔

شیخ بدرالدین اسحٰق بن علی سادات بخارا میں سے تھے۔ حضرت خواجہ فریدالدینؒ کے خلیفہ، خادم اور داماد تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ ان کی بڑی عزت کرتے تھے، اپنے شیخ کی

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۹۶

[2] تذکرۃ الخواطر، ماخوذ از سیر الاولیاء و اخبار الاخیار وغیرہ

صحبت و تعلیم کا نمونہ تھے ۔ آنکھیں ہمیشہ پُر آب رہتی تھیں، رقت کا بڑا غلبہ تھا جس سے ضعفِ بصارت ہوگیا تھا کسی نے کہا کہ آپ ذرا آنسو روکیں تو میں آپ کے استعمال کے لئے سرمہ بنادوں فرمایا کہ آنکھوں پر میرا قابو نہیں ان کی عبادت و ریاضت کو دیکھ کر شیخ کبیرؒ کی یاد تازہ ہوتی تھی، نہایت جید الاستعداد اور فاضلِ اجل تھے ۔ مدت تک دہلی کی مشہور درسگاہ مدرسۂ معزیہ میں درس دیا، تکمیلِ علم کیلئے بخارا تک کا سفر کیا، فارسی و عربی میں بے تکلف و آبدار شعر کہتے تھے، مضامینِ علمیہ کو نظم کرنے کی خاص قدرت تھی، صرف کے مسائل میں ایک منظوم رسالہ ہے ۔ خواجہ محمد امام اور خواجہ محمد موسیٰ جو حضرت خواجہ نظام الدین اودلیاد کے امامِ نماز تھے، انھیں کے صاحبزادے تھے، ۱۰ جمادی الاخریٰ سنہ ۶۹۰ھ میں وفات پائی

شیخ عارف کو حضرت خواجہؒ نے خلافت دے کر سیوستان روانہ کیا تھا، انھوں نے حضرت خواجہؒ کو خلافت نامہ واپس کیا اور عرض کیا کہ یہ کام بہت نازک ہے، یہ مسکین اس کارِ عظیم کا اہل نہیں، مجھے آپ کی دعا اور عنایت کافی ہے، پھر آپ کی اجازت سے حج بیت اللہ کو گئے اور واپس نہ آئے[۱]۔

شیخ کبیر علاء الدین علی بن احمد صابر نسباً اسرائیلی تھے، ترک و تجرید اور زہد و مجاہدہ میں ان کی نظیر نہ تھی، پیران کلیر میں عرصہ تک عبادات و افادہ میں مشغول رہ کر ۱۲ ربیع الاول سنہ ۶۸۹ھ یا سنہ ۶۹۰ھ میں وفات پائی حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی آپ ہی کے خلیفہ تھے[۲]۔

---

[۱] نزہۃ الخواطر ۱ [۲] سیر الاولیاء ص ۱۸۴ و ص ۱۸۵

[۳] نزہۃ الخواطر ۱ ۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیخ علی احمد صابر کے حالات سے معاصر تذکرے اور تاریخیں خاموش ہیں۔ سیر الاولیاء میں امیر خورد نے ان کا تذکرہ ضمناً اس طرح کیا ہے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (بقیہ ص ۴۸ پر)

سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدینؒ پہلے چشتی شیخ ہیں جن کے اثرات ان کی زندگی میں سارے ہندوستان میں پھیلے اور جنھوں نے ہندوستان کے اسلامی معاشرہ اور ہر طبقہ کو متأثر کیا اور حکومت سے لیکر عوام وغربا تک کو اپنے حلقۂ عقیدت واثر میں لیا، اسی کے ساتھ وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) ——— کو شبہ ہے کہ یہ حضرت شیخ علی احمد صابر پیران کلیری کا تذکرہ ہے یا اسی نام کے کسی اور بزرگ کا، امیر خورد لکھتے ہیں:—

بندہ از خدمت والد خود رحمۃ اللہ علیہ سماع دارد کہ درویشے بود بزرگ صاحب نعمت کہ او را شیخ علی صابر گفتندے و او درویشی قدمے ثابت و نفسے گیرا داشت و ساکن قصبہ دیگری بودے و پیوند بخدمت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہ العزیز داشت و او را از حضرت شیخ شیوخ العالم اجازت بیعت بود (ص ۱۸۵)

بندہ نے اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ایک عالی مرتبہ درویش تھے جن کو شیخ علی صابر کہتے تھے، درویشی میں راسخ اور صاحب نسبت وتاثیر قصبہ دیگری کے رہنے والے تھے۔ حضرت شیخ فرید الدینؒ سے نسبت ارادت رکھتے تھے، اور آپ نے انکو اجازت بیعت دے رکھی تھی۔

معاصر یا زمانہ قریب کے تذکروں میں خواہ ان کا تذکرہ بالکل نہ ہو یا سرسری ومختصر ہو ان کے سلسلہ کے مشائخ کبار کے حالات ان کا علو شان، ان کے علوم ومقامات، اہل بصیرت کا اس سلسلہ کی مقبولیت پر اتفاق اور عالم میں اسکے فیوض وبرکات وآثار شاہد ہیں کہ بانیٔ سلسلہ نہایت عالی مقام، عالی نسبت اور عنداللہ مقبول تھے، اس سے بڑھ کر خود تاریخ کی شہادت بھی نہیں ہو سکتی اور نہ یہ تاریخ کی پہلی غفلت اور چوک ہے، زمانۂ سابق میں بھی بہت سی باکمال شخصیتیں تاریخ کی تیز نگاہوں سے بچ گئیں اور زاویہ خمول میں رہیں۔

اس سلسلہ (صابریہ چشتیہ) میں بڑے نامور مشائخ عارف ومحقق ومصلح پیدا ہوئے مثلاً حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولویؒ

ہندوستان کے پہلے شیخ طریقت اور مرشدِ روحانی ہیں جن کے حالات سب سے زیادہ تفصیل و وضاحت اور استناد کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے مشائخ نے نہ کوئی تصنیف کی نہ ان کے خلفاء نے اپنے شیخ کے ملفوظات و حالات جمع کئے، نہ انھوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات و حالات کا کوئی مجموعہ تیار کیا[1]، لیکن ان کے ملفوظات و حالات جمع کرنے کا

(صـ۴۷ کا بقیہ حاشیہ) جن کی ذات بابرکات کو بعض اہل نظر نے نویں صدی کا مجدد بھی شمار کیا ہے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، بانی دارالعلوم دیوبند، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، ہمارے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ سے حفاظت و تجدید دین کا عالمگیر کام لیا، اور اس وقت سب سے زیادہ وسیع متحرک و فعال یہی سلسلہ ہے، دارالعلوم دیوبند و مظاہر العلوم کی تعلیمی خدمت اور مولانا تھانوی کی تصنیفات و مواعظ سے اور پھر آخر میں مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک دعوت و تبلیغ سے اس سلسلہ کے فیوض عالمگیر ہوئے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تاریخ چشت مشائخ میں صحیح لکھا ہے کہ:

"گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاسؒ نے کیا تھا۔" (صـ۲۳۴)

آج بھی رائے پور میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کی خانقاہ سلسلہ چشتیہ کی قدیم خانقاہوں کی یکسوئی، سرگرمی، یاد حق کی مشغولی اور درد و محبت کی یاد تازہ کرتی ہے (افسوس ہے کہ حضرت کی وفات کے بعد یہ خانقاہ بھی گزشتہ خانقاہوں کی فہرست میں شامل ہوگئی، کل شئ ھالک الا وجھہ۔ ع

عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

---

[1] حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات خیر المجالس میں ہے۔ فرمایا میرے حضرت (بقیہ صـ۵۰ پر)

خاص اہتمام کیا گیا، اس سلسلہ میں دو بڑے قیمتی و مستند ماخذ ہیں، ایک فوائد الفواد جو امیر حسن علا سجزی (م ۷۳۷ھ) کی تالیف ہے جسکو حضرت خواجہ نے لفظاً لفظاً سنا اور تحسین فرمائی اور حضرت خواجہؒ کے اصحاب و خدام نے اسکی صحت کو عام طور پر تسلیم کیا اور رحمز جاں بنایا[1]۔ دوسرا سیر الاولیاء جو امیر خورد سید محمد مبارک علوی کرمانی (م ۷۷۰ھ) کی تصنیف ہے، امیر خورد خورد سالگی میں حضرت خواجہ سے بیعت ہوئے اور ان کی صحبت کی سعادت حاصل کی، پھر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے رجوع کیا۔ ان کے والد نور الدین مبارک بن سید محمد کرمانی (م ۷۴۹ھ) حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے رفیق قدیم اور مخلص و بے تکلف دوستوں میں تھے، اس کتاب میں زیادہ تر انہی سے روایت ہے۔ اپنے شیخ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے بھی سنی ہوئی بہت سی باتیں درج ہیں، اپنے چشم دید حالات اور سنے ہوئے ملفوظات بھی ہیں، حضرت خواجہؒ کے حالات و سوانح اور ان کے خلفاء کبار کے حالات و کمالات کا یہ مفصل و مستند ذخیرہ ہے۔ ان دو کتابوں کی وجہ سے خاص طور پر حضرت خواجہؒ کے حالات، ذوق، رجحانِ طبع، تعلیم و تربیت کے طریقے، اصلاحی و تبلیغی کوشش، ان کے فیوض و برکات اور اثرات محفوظ ہو گئے اور تاریخ کی روشنی اور گرفت میں آ گئے۔

(صفحہ ۴۹ کا بقیہ حاشیہ)

پیر و مرشد جناب سلطان الاولیاء قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے تھے، میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی اس واسطے کہ خدمت شیخ الاسلام حضرت فرید الدین اور شیخ الاسلام حضرت مولانا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور باقی خواجگان چشت وغیرہ مشائخ جو داخل ہمارے شجرے میں ہیں کسی نے کوئی تصنیف نہیں کی۔

(سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس)

[1] اس میں ۳ر شعبان سے ۹ر شعبان تک کی مختلف مجالس کے ملفوظات ہیں۔

اسی شخصیت کی عظمت و تاثیر اور حالات و مآخذ کی سہولت کی وجہ سے دعوت و عزیمت کی ایک مرکزی اور عہد آفریں شخصیت کی حیثیت سے ان کی ذات کو انتخاب کیا گیا، کتاب کے آئندہ ابواب اسی اجمال کی تفصیل کے لئے ہیں۔

باب دوم

سُلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدّینؒ

حالات و کمالات

نام و نسب محمد نام نظام الدین لقب و عرف عام، والد ماجد کا نام احمد بن علی سادات حسینی میں سے تھے، نانہال بھی سادات میں تھا، دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب دونوں ہم جد تھے اور دونوں بخارا سے آکر کچھ مدّت لاہور رہے، وہاں سے بدایوں آئے۔

سنہ ۶۳۶ھ میں بدایوں میں آپ کی ولادت[1] ہوئی، بدایوں (قدیم بداؤں) شرفاء و سادات کا قدیم مسکن تھا، بہت سے ساداتِ کرام اور مشائخ عظام نے ایران و خراسان سے آکر یہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔[2]

---

[1] صاحب سیر الاولیاء نے آپ کی عمر شریف کا حساب لگا کر اس سنہ کی تعیین کی ہے۔ ۱۲

[2] بداؤں روہیل کھنڈ میں دریائے سوتھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اُس زمانہ میں بہت آباد (بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

ابتدائی تعلیم و تربیت

حضرت نظام الدین پانچ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ماجدہ نے جو اپنے وقت کی ایک بڑی صالحہ اور باخدا خاتون تھیں، اس دُرِّ یتیم کی پرورش اور دینی و اخلاقی تربیت کا مردانہ ہمت اور پدرانہ شفقت کے ساتھ اہتمام کیا۔ کتابیں پڑھنے کے قابل ہوئے تو مولانا علاء الدین اصولی[1] کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فقہ کی ابتدائی کتابوں تک ان سے تعلیم حاصل کی، قدوری ختم کی تو مولانا علاء الدین نے فرمایا کہ مولانا نظام الدین اب دستارِ فضیلت باندھو۔ والدہ صاحبہ سے آکر کہا کہ استاد نے دستار بندی کا حکم فرمایا ہے، میں دستار کہاں سے لاؤں؟ والدہ صاحبہ نے کہا:۔ بابا خاطر جمع رکھو۔ میں اس کی تدبیر کروں گی چنانچہ روئی

(صفحہ ۵۲ کا بقیہ حاشیہ) اور پُر رونق مقام تھا اور دہلی کے لئے سرحدی شہر کا کام دیتا تھا، چنانچہ پرانی دہلی کے ایک دروازہ کا نام دروازۂ بداؤں تھا۔ (نزہۃ الخواطر)۔

قلعۂ بداؤں کے موجودہ کھنڈر اس کی عظمت اور استحکام کا پتہ دے رہے ہیں۔ ۱۱۹۶ء میں سلطان محمد غوری کے جرنیل قطب الدین ایبک نے اسے فتح کیا اور اپنے غلام ملک شمس الدین کو امیر بداؤں مقرر کیا۔ التمش نے یہاں ۱۲۲۲ء میں ایک خوبصورت اور وسیع مسجد تعمیر کرائی جو اب بھی موجود ہے۔ اس مقام کی اہمیت کا مزید ثبوت درکار ہو تو وہ اس سے ملتا ہے کہ دہلی کے دو بادشاہ التمش اور اس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ دونوں تخت نشینی سے پہلے بداؤں کے گورنر رہ چکے تھے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا بذیل بداؤں) منقول از مقالاتِ دینی و علمی، مولوی محمد شفیع صاحب ایم، اے۔ (جلد اول صفحہ ۲۴۱)۔ ۱۲

[1] مولانا علاء الدین علی الاصولی شیخ جلال الدین تبریزی کے مریدین میں تھے اور اپنے شیخ کے نقش قدم پہ اخفاء حال کا بڑا اہتمام تھا، صبر و رضا کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور اوقات عزیز کو افادہ و عبادت میں مشغول و معمور رکھتے تھے۔ (نزہۃ الخواطر بحوالہ فوائد الفواد)۔

خرید کر اسکو کتوایا اور بہت جلد پگڑی تیار کر کے دی[1]۔ والدہ صاحبہ نے اس تقریب میں علماء و صلحاء وقت کی دعوت کی، خواجہ علی مرید شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ایک پیچ باندھا اور حاضرین مجلس نے علم نافع اور تکمیل کی دعا کی[2]۔

فقر و فاقہ اور والدہ کی تربیت

اس چھوٹے سے شریف گھرانے میں جو سایۂ پدری سے محروم تھا فقر و فاقہ کوئی نئی بات نہ تھی حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ والدہ کا معمول تھا کہ جس روز ہمارے گھر کچھ پکانے کو نہ ہوتا تو فرماتیں کہ آج ہم سب خدا کے مہمان ہیں۔ مجھے یہ بات سن کر بڑا ذوق آتا۔ ایک دن کوئی خدا کا بندہ ایک تنکہ غلہ گھر میں دے گیا، چند دن متواتر اس سے روٹی ملتی رہی، میں تنگ آ گیا اور اس آرزو میں رہا کہ والدہ صاحبہ کب یہ فرمائیں گی کہ ہم سب خدا کے مہمان ہیں، آخر وہ غلہ ختم ہوا اور والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ آج ہم خدا کے مہمان ہیں، یہ سنکر مجھے ایسا ذوق اور ایسا سرور حاصل ہوا کہ بیان میں نہیں آ سکتا[3]۔

شیخ کبیر سے مناسبت اور قلبی کشش

حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا۔ بارہ سال کا رہا ہوں یا کچھ کم زیادہ، اس وقت میں لغت پڑھتا تھا۔ ایک شخص جو ابوبکر خرّاط کے نام سے مشہور تھا، ابوبکر قوال بھی کہتے تھے میرے استاد کے پاس آیا، وہ ملتان ہو کر آ رہا تھا، اس نے بیان کیا کہ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے پاس سے آ رہا ہوں، اس نے ان کے فضائل و مناقب بیان کرنے شروع کئے کہ وہاں کے لوگ ایسے ذاکر، شاغل ہیں اور اوراد و نوافل کا ایسا انہماک ہے اور ذکر کی ایسی فضا ہے کہ مائیں اور لونڈیاں بھی چکی چلاتے وقت ذکر میں مشغول رہتی ہیں، اسی طرح کی اور بہت سی خصوصیتیں بیان کرتا رہا، مگر کوئی چیز

---

[1] سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس ص۱۴۵ [2] ایضاً ص۹۶ [3] سیر الاولیاء (ص۱۱۳)

[4] شیخ کبیر سے مراد اس کتاب میں ہر جگہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی ذات ہے۔ ۱۲

میرے دل میں نہ جمی، اسکے بعد اس نے بیان کیا کہ وہاں سے اجودھن آیا، وہاں میں نے ایسا بادشاہ دین دیکھا اور اس نے شیخ الاسلام شیخ فریدالدینؒ کا تذکرہ کیا، یہ سنتے ہی میرے دل کو بے اختیار کشش ہوئی، اور ان کی محبت وارادت میرے دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ مجھے ان کا نام لینے میں مزا آنے لگا، اور میں ہر نماز کے بعد مزے لیکر ان کے نام کی رٹ لگاتا۔[1]

دہلی کا سفر | سولہ سال کی عمر میں حضرت خواجہ بدایوں سے دہلی آگئے۔[2]

دہلی میں طالب علمی | آپ نے دہلی آکر طالب علمی کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ مدت تین چار سال کی تھی، دہلی میں اس وقت بڑے نامور اساتذہ جمع تھے۔ یہ سلطان ناصرالدین محمود کا عہدِ حکومت اور غیاث الدین بلبن کا عہدِ وزارت تھا اور مولانا شمس الدین خوارزمی جو کہ مستوفی الممالک ہوکر شمس الملک کے لقب سے مشہور روزگار ہوئے استاذ الاساتذہ کی حیثیت رکھتے تھے سلطنت کے ایک اہم ترین عہدے کی ذمہ داری اور مشغولیت کے ساتھ اس زمانے کے علماء کی طرح درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا،

---

[1] سیر الاولیاء (ص۱۰۱) فوائد الفواد (ص۱۴۹)

[2] یہ سیر الاولیاء کا بیان ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ تین چار سال دہلی میں طالب علمی کرنے کے بعد خواجہ صاحب اجودھن گئے اور حضرت خواجہ فریدالدین سے بیعت کی، بیعت کے وقت آپنے اپنی عمر بیس سال بیان کی ہے (سیر الاولیاء ص۱۰۱) اس لئے سیر العارفین کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ آپ پچیس سال کی عمر میں بدایوں سے لاہور تشریف لے گئے۔

[3] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از قاضی ضیاءالدین برنی (ص۱۱۲) - ۱۲

[4] یہ صدر محاسب یا اکاؤنٹنٹ جنرل کا عہدہ تھا اور بہت بڑے علماء کو دیا جاتا تھا۔

حضرت خواجہؒ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔

اُستاد کے محبوب

مولانا شمس الدین کو حضرتؒ سے تعلق خاص تھا، اور وہ ان کے محبوب ترین شاگرد تھے، آپ جس حجرۂ خاص میں مطالعہ فرماتے تھے اس میں کسی شاگرد کو آنے کی اجازت نہیں تھی، مگر حضرت خواجہؒ اور ان کے دو رفیق[۲] مولانا قطب الدین ناقلہ اور مولانا برہان الدین باقی اس قانون سے مستثنیٰ تھے۔[۱]

خواجہ شمس الملک کی عادت تھی کہ اگر کوئی شاگرد ناغہ کر دیتا تھا یا دیر سے آتا تھا تو فرماتے تھے کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا تھا کہ آپ نہیں آئے؛ حضرت خواجہ نے خود یہ قصہ بیان کرتے ہوئے تبسم فرمایا اور کہا کہ اگر کسی سے مزاح فرماتے تو کہتے کہ مجھ سے کیا قصور ہوا کہ آپ نہیں آئے تاکہ میں پھر وہی قصور کروں لیکن مجھ سے ناغہ ہو جاتا یا دیر میں جاتا تو میرے جی میں آتا کہ آج مجھ سے بھی یہی فرمائیں گے لیکن آپ مجھے دیکھ کر یہ شعر پڑھتے۔[۲]

آخر کم از آنکہ گاہ گاہے آئی و بما کنی نکاہے

اس کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب آبدیدہ ہو گئے اور سب سننے والوں پر رقت طاری ہو گئی اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اپنے حجرے میں اپنے ساتھ بٹھاتے، میں ہزار معذرت کرتا مگر منظور نہ فرماتے۔[۲]

علمی امتیاز و تفوق

حضرت خواجہ نے اپنی ذہانت، مناسبت خداداد اور محنت سے اپنے رفقاء کے درمیان علمی امتیاز اور تفوق پیدا کر لیا۔ علمی مباحثوں اور سوال و جواب میں (جو قدیم نظامِ تعلیم کا ایک اہم جزو اور علمی استعداد و ذکاوت کی علامت سمجھی جاتی تھی) آپ کی طلاقت لسانی اور قوتِ استدلال کا ایسا اظہار ہوا کہ آپ جس علمی مسئلہ پر بحث کرتے طلبہ لاجواب ہو جاتے

---

[۱] سیر العارفین - ۱۲ [۲] فوائد الفواد ص ۶۸

اور محفل پر آپ کے علم و ذہانت کا سکہ بیٹھ جاتا، چنانچہ آپ کے ساتھی آپ کو مولانا نظام نجّاش اور مولانا نظام الدین محفل شکن کے لقب سے پکارنے لگے۔[1]

حفظِ مقامات اور اس کا کفارہ

اس زمانہ کے نصاب میں مقامات حریری داخل درس تھی عام طور پر طلبہ سمجھ لینے اور اس کے مشکل الفاظ و مفردات کے یاد کر لینے پر اکتفا کرتے تھے، لیکن حضرت خواجہؒ نے اپنے علمی ذوق اور بلند ہمتی سے اس کے چالیس مقامے حفظ کئے، بعد میں اس کے کفارے میں حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" حفظ کی۔[2]

حدیث کی اجازت

آپ نے حدیث اپنے زمانہ کے مشہور محدث شیخ محمد المایکلی مشہور کمال الدین زاہد (م ۶۸۴ھ) سے پڑھی جو مصنف مشارق الانوار علامہ حسن ابن محمد الصّغانی کے براہ راست شاگرد تھے۔ فقہ میں ان کو بیک واسطہ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین المرغینانی سے تلمذ تھا، آپ نے ان سے "مشارق الانوار" کا درس لیا اور حدیث کی اجازت حاصل کی۔[3]

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۰۱)　　[2] ایضاً

[3] سیر الاولیاء (ص ۱۰۵) اجازت نامہ جو عربی میں ہے اور سیر الاولیاء میں بلفظہ منقول ہے، ۲۳ ربیع الاول ۶۷۹ھ تاریخ درج ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اجازت نامہ آپ کو جب حاصل ہوا ہے اس وقت آپ کی عمر (سنہ ولادت ۶۳۶ھ کے حساب سے) ۴۳ سال تھی اور یہ واقعہ شیخ کبیر کی وفات (۶۶۴ھ) کے تیرہ سال کے بعد اور اس وقت کا ہے جب آپ مسند ارشاد و تربیت پر متمکن تھے اور آپ کی شہرت دور دور پہونچ چکی تھی۔ اجازت نامہ میں آپ کے لئے الشیخ الامام العالم الناسک السالک اور مقبول المشائخ الکبار منظور العلماء الاخیار الابرار" کے الفاظ ہیں اس لقب و شہرت میں حدیث کی تکمیل اور حصول اجازت سے آپ کے علمی ذوق اور علو ہمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قلب کی بیچینی اور انجذاب الی اللہ

حضرت خواجہ اگرچہ پورے انہماک کے ساتھ طلبِ علم میں مشغول تھے اور ان کی بلند ہمتی اور عزیمت اس سلسلہ میں کسی کسلمندی اور تساہل کی روادار نہ تھی لیکن دل کسی اور چیز کو ڈھونڈھتا تھا، اس بحث و مباحثہ اور علوم ظاہری کی فضا میں ان کی طبیعت متوحش ہو جاتی تھی، ایک دن فرمایا کہ ایام جوانی میں کہ جب لوگوں کیساتھ نشست و برخاست رکھتا تھا ہمیشہ دل پر گرانی رہتی تھی اور دل ہی دل میں کہتا تھا کہ میں کب ان لوگوں کے بیچ میں سے چلا جاؤں گا۔ اگرچہ یہ سب پڑھنے پڑھانے والے لوگ تھے اور ہمیشہ علمی بحث و مباحثہ میں مشغول رہتے تھے، لیکن اکثر میری طبیعت متوحش ہو جاتی اور میں دوستوں سے کہتا کہ میں ہمیشہ تمہارے درمیان نہیں رہوں گا، میں کچھ دن تمہارے یہاں مہمان ہوں، امیر حسن علا سجزی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یہ حضرت شیخ الاسلام فریدالدینؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے کا قصہ ہے۔ فرمایا: "ہاں!"

والدہ صاحبہ کا انتقال

دہلی کے قیام میں حضرت خواجہ کی والدہ ماجدہ نے انتقال فرمایا۔

والدہ کی یاد

ایک روز عرصہ کے بعد حضرت خواجہ نے اپنی والدہ کے انتقال کا ذکر کیا، ذکر کرتے ہوئے اتنا گریہ طاری ہوا کہ جو کچھ فرماتے تھے پورے طور پر سننے میں نہیں آتا تھا۔ اسی حالت میں یہ شعر پڑھا ؎

افسرس دلم کہ ہیچ تدبیر نکرد　　بہائے وصال را بہ زنجیر نکرد[1]

والدہ کا یقین و توکل

حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں:- ایک دن نیا چاند دیکھ کر حاضر ہوا اور قدمبوسی کی اور نئے چاند کی مبارکباد معمول کے مطابق پیش کی، فرمایا کہ:- آئندہ مہینہ کے چاند کے موقع پر کس کی قدمبوسی کرو گے؟ میں سمجھ گیا کہ انتقال کا وقت قریب ہے، میرا دل

---

[1] فوائد الفواد (ص۴۷)

بھر آیا اور میں رونے لگا۔ میں نے کہا کہ:۔ مخدومہ! مجھ غریب کو آپ کس کے سپرد کرتی ہیں؟ فرمایا:۔ اس کا کل جواب دونگی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس وقت کیوں نہیں جواب دیتیں۔ یہ بھی فرمایا کہ: جاؤ آج رات شیخ نجیب الدین کے یہاں رہو، ان کے فرمانے کے مطابق میں وہاں گیا۔ آخر شب میں صبح کے قریب خادمہ دوڑتی ہوئی آئی کہ بی بی تم کو بلا رہی ہیں۔ میں ڈرا اور میں نے پوچھا خیریت ہے؟ کہا ہاں، جب میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ:۔ کل تم نے مجھ سے ایک بات پوچھی تھی۔ میں نے اس کا جواب دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں اس کا جواب دیتی ہوں غور سے سنو! فرمایا تمہارا دایاں ہاتھ کون سا ہے، میں نے ہاتھ سامنے کر دیا، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: خدایا! اس کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔ یہ کہا اور جاں بحق تسلیم ہوئیں، میں نے اس پر خدا کا بہت شکر کیا اور اپنے دل میں کہا کہ اگر والد ہوتے اور موتیوں سے بھرا ہوا ایک گھر چھوڑ کر جاتیں تو مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی۔

ایک تمنائے خام

اس وقت دار الحکومت دہلی کی پوری فضا خاص طور پر طلبہ اور علماء کے حلقے قضا و افتاء کے تذکروں، ان منصبوں پر علماء کی تقرری اور قاضیوں اور مفتیوں کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کے قصوں سے معمور و گرم تھے۔ حضرت خواجہؒ اپنی فطری سعادت اور اعلیٰ روحانی استعداد کے باوجود اس وقت کم سن اور نوجوان تھے۔ علمی امتیاز اور معاشی تنگ حالی کے ساتھ اگر ان کے دل میں بھی کسی جاہ و منصب کا ولولہ اور امنگ پیدا ہوتی تو فطرت انسانی کے کچھ خلاف نہیں۔ آپ نے ایک دن شیخ نجیب متوکلؒ سے عرض کیا کہ دعا کیجئے کہ میں قاضی ہو جاؤں۔ شیخ نجیب الدین خاموش رہے اور کچھ نہ فرمایا۔ حضرت خواجہ سمجھے کہ انھوں نے سنا نہیں۔ دوبارہ ذرا بلند آواز سے فرمایا کہ:۔ دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ کہیں کا قاضی ہو جاؤں۔ شیخ نے فرمایا۔ قاضی مت ہو کچھ اور چیز ہو۔[2]

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۵۱)

[2] فوائد الفواد

اجودھن کی پہلی حاضری

حضرت خواجہؒ اجودھن حاضر ہونے سے پہلے دہلی میں شیخ کبیر کے برادرِ حقیقی خواجہ نجیب الدین متوکل سے متعارف ہو چکے تھے اور کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہنا بھی ہوا تھا، ان کی صحبت اور گفتگو نے شیخ کبیر کے ساتھ محبت کی اس چنگاری میں جو کمسنی اور بدایوں کے قیام ہی سے طبیعت میں ودیعت تھی، اشتعال و حرکت پیدا کر دی آپ نے شیخ کبیر کی خدمت میں حاضری کا عزم کر لیا اور بالآخر آپ انکی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

طالب یا مطلوب؟

اپنی اس ملاقات اور پہلی حاضری کا حال خود ہی بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ میں جب شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا۔ ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ　　سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

میں نے چاہا کہ پائے بوسی کے اشتیاق کو جو عرصہ دراز سے بیچین کئے ہوئے تھا ذرا تفصیل سے بیان کروں، لیکن شیخ کے رعب و جلال سے زبان اور قوتِ گویائی نے ساتھ نہ دیا، اتنا ہی کہہ سکا کہ قدمبوسی کا سخت اشتیاق تھا۔ شیخ نے جب دیکھا کہ میں اتنا مرعوب ہوں تو فرمایا:- "لِکُلِّ دَاخِلٍ دَهشَة" ہر نئے آنے والے پر رعب ہوتا ہی ہے۔[1]

مرید کی خاطر

شیخ کبیرؒ نے حضرت خواجہ کی بڑی خاطر فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ اس پردیسی طالب علم کے لئے جماعت خانہ میں چارپائی بچھائی جائے حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ جب چارپائی بچھ گئی تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ہرگز اس چارپائی پر آرام نہ کروں گا، کتنے معزز مسافر کتنے حافظ کلام اللہ کتنے عاشقانِ خدا زمین پر

---

[1] فوائد الفواد (صـ۳۱)

سورہے ہیں، میں چارپائی پہ کیسے لیٹوں ؟ یہ خبر منتظم خانقاہ مولانا بدرالدین اسحٰق کو پہنچی، انھوں نے فرمایا کہ ان سے کہدو کہ تمھیں اپنے دل کی کرنا ہے یا شیخ کے ارشاد کی تعمیل۔ میں نے عرض کیا کہ شیخ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا، فرمایا کہ جاؤ چارپائی پر سوؤ۔[1]

بیعت اسی حاضری میں کسی وقت حضرت خواجہ جس ارادے سے آئے تھے، اس کی تکمیل کی اور شیخ کبیر سے بیعت ہوگئے، اس وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔[2]

سلسلۂ تعلیم کا اجرا یا انقطاع ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ کی کچھ کتابیں ابھی باقی تھیں، جذب و شوق کا تقاضا تھا کہ اب اس سلسلہ کو ختم کیا جائے اور علمِ حقیقی اور معرفت حقیقی میں صرف کیا جائے جو پیدائش کا اصل مقصد اور یہاں کی حاضری کی غرض و غایت ہے۔ گویا سعدیؒ کا یہ شعر حسب حال تھا۔ ؎

سعدی بشوے لوح دل از نقش غیر دوست
علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است

تعلیم و تعلم کا طول طویل سلسلہ پہلے بھی قلب حسّاس اور روح بیدار پہ بار تھا لیکن اسکو ایک ضرورت سمجھ کر اور اسلئے بھی کہ کوئی دوسرا راستہ سامنے نہ تھا، اختیار کیا تھا، اب جبکہ یقین کا سرِ رشتہ اور علمِ حقیقی کا سرچشمہ مل گیا اس سلسلۂ دراز کا جاری رکھنا طبیعت پہ سخت بار تھا اور زبانِ حال کہہ رہی تھی ؎

میری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب — مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم، نخیل بے رطب

لیکن جس شیخ کامل سے تعلق پیدا کرلیا تھا وہ جذبِ کامل کے ساتھ خود بھی کامل العلم تھا اور طریقت کیلئے بقدر ضرورت علمِ ظاہر کو ضروری سمجھتا تھا، خود اسکے شیخ نے یہی ہدایت اسکو کی تھی، پھر مولانا نظام الدین سے ارشاد و تربیت کا جو کام لینا تھا اس کی نازک ذمہ داریوں کو

---

[1] سیر الاولیاء (ممکنی) [2] ایضاً ص۱۶ [3] فوائد الفواد ص۵۷

ادا کرنے کے لئے علم راسخ کی ضرورت تھی، یوں بھی صاحب نظر شیوخ طالب کی مناسبت کو دیکھتے ہیں حضرت خواجہ نے بیعت کے بعد فرمایا کہ میں تعلیم ختم کردوں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاؤں؟ شیخ کبیرؒ نے فرمایا کہ میں کسی کو تعلیم سے نہیں چھڑاتا، وہ بھی کرو یہ بھی کرو، دیکھو کیا چیز غالب آتی ہے؟ یہ بھی فرمایا کہ: درویش کو تھوڑا علم بھی چاہیے[1]۔

شیخ کبیرؒ سے درس

شیخ کبیر کی یہ خصوصی عنایت اور اختصاص تھا کہ آپ نے حضرت خواجہ کو متنفس نفیس بعض چیزیں پڑھانا شروع کیں۔ فرمایا کہ: نظام تم کو کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی ہوں گی، چنانچہ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی تصوف کی مشہور کتاب عوارف المعارف کا درس شروع کیا اور چھ باب اس کے پڑھائے، اسکے علاوہ تمہید ابو شکور سالمی بھی اول سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی، مزید برآں تجوید کی تعلیم بھی دی، اور چھ پارے کامل تجوید کیساتھ پڑھائے[2]

درس کی لذت

حضرت خواجہ زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اس درس کی لذت کو یاد فرماتے رہے، فرماتے تھے کہ عوارف کے درس میں جو حقائق اور نکات حضرتؒ کی زبان سے سنے وہ پھر کبھی سننے میں نہ آئیں گے، بیان کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت تقریر فرماتے تھے تو یہ آرزو ہوتی تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آجاتی تو بڑا اچھا ہوتا[3]۔

خود شکنی کی تربیت

عوارف کا جو نسخہ درس کے وقت شیخ کبیر کے ہاتھ میں ہوتا تھا وہ کچھ سقیم بھی تھا اور خط بھی باریک تھا، چند ہی اسباق کے بعد ایک ایسا مقام آیا جہاں شیخ کو کچھ دیر تامل رہا، خواجہ نے سادگی اور نوعمری

---

[1] سیر الاولیاء (صـ۱۰۷)۔ [2] ایضاً صـ۱۰۶ [3] فوائد الفواد صـ۷۵

میں کہا کہ میں نے شیخ نجیب الدین متوکل کے پاس ایک اور نسخہ دیکھا تھا، وہ نسخہ صحیح تھا، شیخ نے فرمایا:۔ "درویش را قوتِ تصحیحِ نسخہ سقیم نیست"۔ (فقیر کو سقیم نسخہ کی تصحیح کی طاقت نہیں) بار بار شیخ نے یہ فقرہ دہرایا، خواجہ فرماتے ہیں کہ شروع میں تو مجھے خیال نہ آیا لیکن بار بار شیخ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تو سبق کے دوسرے ساتھی مولانا بدر الدین اسحٰق نے بتلایا کہ خطاب تمھاری طرف ہے، حضرت خواجہ کے ہوش اڑ گئے، فرماتے ہیں کہ "سر بر ہنہ کردم و در پائے شیخ افتادم" کہتے جاتے تھے۔ نعوذ باللہ میرا اس سے حضرت پر تعریض کرنا ہرگز مقصود نہ تھا، خواجہ فرماتے ہیں میں نے ہر چند معذرت کی، لیکن حضرت کا ملالِ خاطر نہ گیا۔ فرماتے ہیں میں اُٹھ گیا، لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ وہ دن جیسا مجھ پر گذرا اور جس حزن و غم کا پہاڑ مجھ پر ٹوٹا شاید کبھی کسی شخص کو ایسا کبھی پیش آیا ہو۔ سراسیمہ و پریشان باہر آیا، ایک مرتبہ تو یہ جی چاہا کہ کنوئیں میں گر کر جان دے دوں لیکن کچھ سوچ کر باز رہا، اسی پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں جنگل کو نکل گیا اور بہت رویا۔

شیخ کبیرؒ کے ایک صاحبزادے شہاب الدین نامی سے خواجہ کا خاص میل ملاپ تھا، انھوں نے شیخ کبیرؒ سے خواجہ کا یہ حال کہا جو مقصود تھا پورا ہو چکا تھا، حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔ "آمدم سر بر قدم مبارک آوردم" معافی ہوئی۔ دوسرے روز طلب فرمایا اور ارشاد ہوا: یہ سب میں نے تمھاری تکمیل حال کیلئے کیا، پیر شاطر مرید ہوتا ہے۔ اس ارشاد کے بعد خلعت و کسوتِ خاص سے سرفراز فرمایا گیا۔[1]

---

[1] فوائد الفواد (ص۲۰۰) یہاں پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ شیخ کامل نے تلمیذ رشید کی ایک معمولی سی اطلاع اور معروض پر اتنی برافروختگی اور آزردگی کا اظہار فرمایا، اسلئے کہ جیسا کہ خود شیخ کے جملہ سے معلوم ہوتا ہے یہ سب آزردگی بہ تکلف اور طالب رشید کی ترقی باطنی اور خود شکنی کے لئے ہے۔ شیخ مجتہد و مخلص اسکے لئے اپنے مختلف ذرائع اختیار کر سکتا ہے اور اس کے لئے کسی تقریب و موقع کا بھی انتخاب کر سکتا ہے، حضرت کعب بن مالک کے ابتلا کے واقعہ سے اور انکو اس کوتاہی پر جو ان سے بلا ارادہ سرزد ہوئی تھی جو سرزنش کی گئی اور انکے ساتھ جو رویہ اختیار کیا (البقیہ ص۶۴ پر)

فیصلہ کن موقع

حضرت خواجہ نظام الدین کے لئے وہ وقت جب شیخ کبیر ان کے صرف اتنا کہہ دینے پر کہ "میں نے شیخ نجیب الدین کے پاس ایک بہتر نسخہ دیکھا ہے"۔ اپنی کبیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، ایک بڑا نازک وقت تھا، بظاہر اس معصوم جملہ اور اطلاع پر کہ "میں نے آپ ہی کے بھائی کے پاس ایک بہتر نسخہ دیکھا ہے" اتنی ناراضگی اور احتجاج کی ضرورت نہ تھی لیکن شیخ کامل کو ایک ایسے طالب علم سے جس کو اس کا جانشین بننا تھا اور لوگوں کی خود شکنی کی تربیت کرنی تھی، اتنی خود بینی بھی گوارا نہ تھی، پھر اس مسترشد کو کمال حال کے جس مقام تک پہونچانا تھا اسکے لئے اضطرار و اضطراب، شکستہ دلی و شکستگی کی خاص کیفیت پیدا کرنی مقصود تھی، لیکن ایک ذہین اور صاحب استعداد نوجوان کیلئے جو اپنی علمی تکمیل کر چکا تھا، یہ وقت بڑا نازک اور فیصلہ کن تھا اور اسی پر اس کے مستقبل کا انحصار تھا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے صحیح لکھا ہے :—

"صادق و کاذب طلب میں امتیاز کا وقت آگیا۔ دنیا دیکھ رہی تھی، اب مولانا نظام الدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ کیا مولانا نجّات اور محفل شکن ہی کے لقب کو لیکر دنیا سے واپس چلے جائیں گے؟ جیسے لاکھوں ہی نجات و محفل شکن آئے اور چلے گئے، یا مشائخ کے سلطان کا جو تخت خالی ہے اس پر قدم رکھنے کی ہمت کرتے ہیں، اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہوتی ہے، ورنہ سچ یہی ہے۔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

چند کلیاں جواب تک ان کے ہاتھ میں تھیں وہ پھینک دی گئیں اور اپنی تنگ دامانی

(۶۳ کا بقیہ حاشیہ) اور کرایا گیا اس سے بھی روشنی اور رہنمائی حاصل کیجا سکتی ہے۔ ۱۲

کے علاج کے آخری فیصلہ پر وہ ڈٹ گئے۔ ظرف کے چھوٹے ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ بھلا میرا کیا قصور، میں نے غلطی ہی کیا کی ہے، ایک اچھے نسخہ کا علم تھا، اس کا اظہار کیا گیا تھا پھر اس پاتی برہمی کے کیا معنی؟ یہی شوشہ اگر سامنے آجاتا وہی لمبی لکیر بن سکتا تھا۔ اتنی لمبی کہ شیطان کی آنت بھی اس سے چھوٹی ہو۔ بڑھاپے میں دماغی توازن صحیح نہیں رہا ہے، مزاج میں تندی اور غصہ سے آگے بڑھ کر اسی کو "نفسانیت" کا ثبوت بھی قرار دیا جاسکتا تھا بلکہ دین کی آڑ لیکر سلطان جی چاہتے تو "اسوۂ حسنہ نبویہ" کے معیار پر شیخ کبیر کے اس طرز عمل کو کھوٹا بتا کر لوگوں کو دکھا سکتے تھے، لیکن ظاہر ہے وہ اپنا علاج کرانے آئے آئے تھے، شیخ کبیر کی کمزوریوں کا علاج اجودھن آنے سے مقصود نہ تھا، اس کو طے کر چکے تھے کہ یہ معالج طبیب ہے، اس کے بعد تنقید کا حق ان کے لیے باقی ہی کب رہا تھا۔[1]

ایک رفیق کی ملامت

خواجہ فرماتے ہیں کہ میں شیخ کبیر کی خدمت میں اجودھن حاضر تھا، ایک عالم بھی جو میرے دوست اور ہم درس تھے اور ہم دونوں ایک ساتھ مذاکرہ کرتے تھے، اجودھن آئے، انھوں نے جب مجھے پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھا تو بڑی حیرت و تاسف سے مجھ سے کہا: "مولانا نظام الدین تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے اگر تم شہر میں درس و تدریس کی خدمت میں مشغول رہتے تو مجتہد زمانہ ہوتے اور بڑی شان و شوکت سے رہتے"۔ میں نے اپنے دوست کی یہ بات سنی اور ان سے معذرت کر دی، اسکے بعد جب میں شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے خود بخود فرمایا کہ: نظام! اگر تمہارا کوئی دوست تمہیں ملے اور تم سے کہے کہ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے اور تعلیم و تعلم کا وہ سلسلہ کیوں چھوڑ دیا

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" ج ۲ ص ۹۴-۹۵

جو فارغ البالی اور خوشحالی کا ذریعہ بنتا، اور یہاں اس حال میں کیوں ہو، تو تم اسکا کیا جواب دوگے؟ میں نے عرض کیا کہ جو ارشاد عالی ہو وہی کہدونگا۔ فرمایا اگر کبھی کوئی ایسا سوال کرے تو یہ شعر پڑھ دینا ؎

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر و برو ترا سلامتی باد ما مرنگونساری

اس کے بعد حکم ہوا کہ خانقاہ کے مطبخ سے مختلف قسم کے کھانے ایک خوان میں اپنے سر پہ رکھ کر اس رفیق کے پاس لے جاؤ۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ میرے دوست نے جب یہ منظر دیکھا تو دوڑتا ہوا دوڑا اور میرے سر سے خوان اتارا اور کہنے لگا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ میں نے سارا قصہ سنا یا، اس نے یہ سنکر کہا کہ تمہارے شیخ ایسے ہیں کہ انھوں نے تم کو بے نفسی کے اس مقام پر پہنچا دیا ہے، مجھے بھی ان کی خدمت میں لے چلو، جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو اپنے ملازم سے کہا کہ یہ خوان اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ چلو، میں نے کہا کہ نہیں، جیسے میں یہ خوان اپنے سر پہ رکھ کر لایا ہوں ویسے ہی سر پہ رکھکر لیجاؤنگا، غرض ہم دونوں خدمتِ بابرکت میں پہنچے اور ہمارے دوست نے حضرت کے ہاتھ پہ بیعت و توبہ کی اور آپکے حلقۂ خدام میں داخل ہوئے[1]۔

کتنے بار حاضری ہوئی؟ حضرت خواجہ شیخ اکبر کی زندگی میں تین بار اجودھن حاضر ہوئے پہلی یا کسی اور حاضری میں خلافت سے مشرف ہوئے، تذکروں میں اسکی صراحت نہیں ہے[2]

شیخ کی نوازشیں ایک حاضری میں ایک دن ۲۵ جمادی الاولیٰ کو نماز[3] جمعہ کے بعد طلبی ہوئی، شیخ کبیر نے اپنا لعابِ دہن حضرت خواجہ کے دہن میں ڈالا، قرآنِ مجید کے حفظ کی وصیت فرمائی، فرمایا کہ خدا نے دین و دنیا تم کو دی، یہاں سب کچھ یہی ہے، دہلی کی طرف روانہ کیا اور فرمایا:۔۔۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۳۹ و ص ۲۴۰ [2] فوائد الفواد (ص ۴۳)

[3] یہاں سیر الاولیاء میں سنہ تسع وستین وستمائۃ (۶۶۹ھ) یا تو غلط درج ہو گیا ہے اور تسع وخمسین ۵۹ مراد ہے اسلئے کہ شیخ کبیر کی وفات کا سنہ سیر الاولیاء وغیرہ میں ۶۶۴ھ ہے یا پھر تسلیم کیا جائے کہ آپکا سنہ وفات ۶۶۷ھ ہے جیسا کہ خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین درج ہے بہرحال سیر الاولیاء کے سنین میں تضاد ہے

"برو ملکِ ہندگیر" نظرۃ منک تکفینی[1]

رخصت و وصیت

فرمایا کہ دہلی جانا تو مجاہدہ میں مشغول رہنا، بیکار رہنا کچھ نہیں (نفلی) روزہ رکھنا نصف ماہ ہے، دوسرے اعمال نماز و حج (نفلی) نصف ماہ۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ خلافت نامہ لکھ کر دیا اور ہدایت کی کہ مولانا جمال الدین کو ہانسی میں اور قاضی منتجب کو دہلی میں دکھا دینا، ارشاد ہوا کہ تم ایک سایہ دار درخت ہو گے جس کے سایہ میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی، استعداد کی ترقی کے لئے مجاہدہ کرتے رہنا۔

حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ ہانسی میں شیخ جمال الدین کو خلافت نامہ دکھایا، بڑا اظہارِ مسرت کیا اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس[2]

ایک دعا کی درخواست

اسی حاضری میں یکم شعبان کو حضرت خواجہ کی طرف سے شیخ کبیر کی خدمت میں اس دعا کی درخواست پیش کی گئی کہ:-

خلق کے در بدر نہ پھرنا پڑے، درخواست قبول ہوئی اور دعا فرمائی گئی۔[3]

ایک موقع پر فرمایا گیا کہ میں نے اللہ سے تمہارے لئے تھوڑی سی دنیا مانگ لی ہے، خواجہ فرماتے ہیں کہ میں یہ سن کر متفکر ہوا کہ بڑے بڑے لوگ دنیا کے سبب سے فتنہ میں پھنس گئے میرا کیا حال ہوگا، شیخ نے فوراً ہی فرمایا کہ تم فتنہ میں نہیں پڑو گے۔ خاطر جمع رکھو۔ اب مجھے اطمینان ہوا۔[4]

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۲۳) [2] ایضاً ص ۱۱۶ و ص ۱۱۷ اس موقع پر سیر الاولیاء میں جو ۶۶۹ھ پھر دیا گیا ہے اسکے متعلق اوپر گفتگو ہو چکی ہے۔ ۱۲ [3] سیر الاولیاء ص ۱۲۳۔ [4] ایضاً ص ۱۳۲

اجودھن سے دہلی کو

خواجہ نظام الدینؒ اب اپنے مرشد و مربی سے رخصت ہو کر ہندوستان کی تسخیر روحانی اور خلق خدا کے ارشاد و تربیت اور تبلیغ و ہدایت کی عظیم و مقدس مہم پر روانہ ہوئے۔ یہ ایک فقیر بے نوا تھا جو ہندوستان بلکہ ساتویں صدی ہجری کے عالمِ اسلام کی سب سے مستحکم اسلامی دارالسلطنت کو جا رہا تھا۔ اس کے پاس اخلاص، اعتماد علی اللہ اور استغنا عن الخلق کے سوا کوئی زادِ راہ اور کوئی ہتھیار و سلاح نہ تھا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے خوب لکھا ہے:۔

"ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دارالسلطنت دہلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں نیچے سے اوپر تک بیشمار جھوٹے آلہہ پر اجائے بیٹھے ہیں، ان میں وہ بھی ہے جسکی زبان کی معمولی حرکت لوگوں کے تن سر سے جدا کر دیتی ہے وہ بھی ہیں جن کی نیازمندی خاک سے اٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے۔ گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے، مناصب بٹ رہے ہیں، روپے لٹائے جا رہے ہیں، گودیں بھر رہی ہیں اور جن جن ذرائع سے یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجودھن جانے سے پہلے دہلی کی علمی محفلوں کی محفل شکنی میں ان کی عام شہرت ہو چکی ہے، کچھ نہیں تو قضا کے عہدے سے لیکر شیخ الاسلامی و صدر جہانی کی خدمات تک کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پا رہے ہیں، لیکن اب خالق کی صورت میں جو الٰہ ان کو مل چکا تھا، سینہ اُسی کے وزن سے اتنا معمور تھا کہ کسی مخلوق کی کوئی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی، قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی جس کا اظہار وہی کبھی کبھی ان مشہور تیز الفاظ میں فرمایا کرتے تھے:۔

"ایمان کس تمام نہ شود تا ہمہ خلق — در نزدیکی او ہم چو پشک شتر نہ نماید"[1]

---

[1] سیر الاولیاء ص۱۵۵

مجلسِ مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لئے ساری ساری رات نماز پڑھتا تھا، اپنی انھیں نمازوں کو نگاہِ خلق میں حصولِ عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ جامع ملفوظات راوی ہیں کہ :-

دریں میاں خواجہ ذکر اللہ بالخیر
چشم پر آب کردہ بر لب مبارک راند
بسوز اوّل شیخ الاسلامی را، پس
خانقاہ را، بعد ازاں خود را[1]

یہ سُنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں
آنسو آگئے، اور فرمایا کہ پہلے شیخ الاسلامی
کو جلاؤ، پھر آگ لگاؤ خانقاہ کو،
پھر اپنی خودی کو جلا کر خاک کردو۔

الغرض اس شان کے ساتھ سب کچھ جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے ..... اور جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی اسی کے پایۂ تخت میں آپ پہونچ گئے۔[2]"

تصفیۂ حقوق شیخ کبیرؒ نے ارادت و خلافت کے ساتھ کئی بار یہ تاکید کی تھی کہ مخالفین کو خوش کرنے کی پوری کوشش کرنا اور اہلِ حقوق کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا۔ خواجہ فرماتے ہیں کہ میں جب دہلی چلا تو مجھے یاد آیا کہ مجھے ۲۰ جیتل[3] ایک شخص کے دینے ہیں، اور ایک کتاب میں نے کسی سے مستعار لی تھی وہ کھو گئی ہے، میں نے بدایوں کے قیام میں یہ عزم کر لیا تھا کہ میں جب دہلی پہنچوں گا

---

[1] فوائد الفواد (ص ۲۳)

[2] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (ص ۱۵۰)

[3] جیتل یا چیتل تانبہ کا ایک سکہ تھا، ایک تنکہ کے (روپیہ) چونسٹھ جیتل اور ایک جیتل کے چار فلوس یعنی دھیلے تھے

تو اِن اہل معاملہ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا، جب میں اجودھن سے دہلی واپس آیا تو جس شخص کے بیس جیتل مجھے دینے تھے وہ بزاز تھا، میں نے اس سے کپڑا خریدا تھا، کسی وقت بیس جیتل میرے پاس جمع نہیں ہوئے کہ میں اسکو پہنچا دیتا، معاش کی بڑی تنگی تھی، کبھی پانچ جیتل ہاتھ آئے، کبھی دس، ایک مرتبہ دس جیتل ملے میں اُس بزاز کے دروازہ پر پہنچا، اسکو آواز دی، وہ باہر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تمھارے بیس جیتل میرے ذمہ ہیں، ایک مرتبہ تو مجھے دینے کی مقدرت نہیں، یہ دس جیتل لایا ہوں، اس کو لے لو، دس انشاء اللہ اسکے بعد پہنچا دوں گا۔ اس شخص نے یہ سنکر کہا کہ ہاں معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کے پاس سے آرہے ہو، اس نے وہ دس جیتل تو لے لئے اور کہا کہ میں نے دس جیتل معاف کئے۔

اس کے بعد میں اس شخص کے پاس گیا جس کی کتاب میں نے لی تھی، اس نے مجھے پہچانا نہیں، میں نے کہا کہ صاحب میں نے آپ سے ایک کتاب مستعار لی تھی، وہ کھو گئی، اب میں اس کی نقل تیار کر کے آپ کو دوں گا، میں بالکل اسی طرح لکھوا کر آپ کو پہنچا دوں گا۔ اس شخص نے کہا کہ ہاں تم جہاں سے آرہے ہو وہاں کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے، اسکے بعد اس نے کہا کہ میں نے وہ کتاب تم کو بخشی[1]

دہلی کی قیام گاہیں

خواجہ صاحبؒ اہل دہلی بلکہ اہلِ ہند کی خدمت کے لئے جب دہلی پہنچے تو باوجود اس کے کہ دہلی کا کوچہ کوچہ محلوں اور ایوانوں سے آباد تھا اور روز نئی نئی عمارتیں بن رہی تھیں، خواجہ صاحبؒ کے قیام کا کوئی ٹھکانا نہ تھا جب تک کہ غیاث پور کا قیام اختیار نہیں فرمایا، آپ نے اتنی قیامگاہیں اختیار کیں اور اتنے مقامات تبدیل کئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں اس فقیر کے لئے اپنا درویشانہ سامان رکھنے اور اپنا بوریہ بچھانے کے لئے جگہ نہیں تھی۔

سیر الاولیاء کے مصنف میر خورد اپنے والد سید مبارک محمد کرمانی کی زبانی جو حضرت خواجہؒ کے دوست

---

[1] فوائد الفواد (صفحہ ۱۴)

اور رفیق تھے، اس نقل مکانی کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو ناظرین کی عبرت کے لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔ سید مبارک محمدؒ کرمانی فرماتے ہیں :۔

" جتنے سال سلطان المشائخ شہر دہلی میں رہے کوئی مکان آپ کی ملکیت میں نہ تھا اور ساری عمر آپنے کوئی جگہ اپنے اختیار سے انتخاب نہیں فرمائی۔ جب آپ بدایوں سے آئے تو سرائے میاں بازار میں جس کو نمک کی سرائے بھی کہتے ہیں، اُترے، والدہ اور ہمشیرہ کو وہاں رکھا اور خود ایک قواس (کمان گیر) کی بارگاہ میں جو سرائے مذکور کے سامنے تھی، مقیم ہوئے۔ امیر خسروؒ کا بھی اسی محلہ میں مکان تھا کچھ عرصہ کے بعد راوت عرض کا مکان خالی ہوا، اس کے لڑکے علاقوں میں چلے گئے۔ امیر خسروؒ کی معرفت جو راوت عرض کے نواسے تھے سلطان المشائخ کو یہ مکان قیام کے لئے مل گیا، آپ دو سال اس مکان میں رہے، یہ مکان شہر پناہ کے متصل منڈوہ دروازہ و مندھ پل کے نزدیک تھا، اس طرح سے کہ شہر پناہ کا بُرج اس عمارت کے اندر آ گیا تھا، مکان کے ایوان و رواق بڑے بلند اور شاندار تھے، اس عرصہ میں راوت عرض کے لڑکے آ گئے، سلطان المشائخؒ کو اس مکان سے منتقل ہو جانا پڑا، آپ کی کتابیں جن کے سوا کوئی اور سامان نہ تھا ہم سروں پر رکھ کر چھپر والی مسجد میں (جو سراج بقال کے سامنے تھی) لے آئے۔ دوسرے روز سعد کاغذی نے جو شیخ صدرالدین کے مریدین میں تھے، یہ قصہ سنا اور سلطان المشائخ کے پاس آ کر بڑی عزت و توقیر اور خوشامد سے اپنے مکان پر لے گیا۔ بالاخانہ پر ایک بہت اچھی بارگاہ بنی ہوئی تھی، وہاں آپ کو ٹھہرایا۔ سلطان المشائخ ایک مہینہ وہاں ٹھہرے، اسکے بعد وہاں سے بھی اُٹھے، رکابدار کی سرائے میں جو قیصر پل کے

منتقل تھی۔ سرائے کے درمیان ایک مکان تھا، وہاں مقیم ہوئے۔ ایک مدت کے بعد وہاں سے بھی منتقل ہو کر شادی گلابی کے مکان میں جو محمد میوہ فروش کی دکان کے درمیان واقع تھا، قیام اختیار کیا۔ اس درمیان میں شمس الدین شراب دار[1] کے لڑکے اور اعزہ جو آپ کے معتقد تھے آپ کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ شمس الدین شراب دار کے مکان میں لے آئے۔ کئی سال سلطان المشائخ اس مکان میں رہے۔ اس مکان میں بڑی راحت اور سکونِ خاطر میسر آیا۔[2]

فقر و فاقہ

خواجہ صاحب دہلی تشریف لائے تو ابتلا و تربیت کا وہ دور شروع ہوا جو اس راہ کے ان سالکوں کو جو آگے چل کر مرجع خلائق و سرچشمۂ فیوض بنتے ہیں عادتاً پیش آیا کرتا ہے، یہ وہ وقت تھا کہ سارے ہندوستان کی دولت اور زر و جواہر دہلی امنڈ کر آرہے تھے اور ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ایک جیتل میں دو سیر میدے کی پکی پکائی روٹیاں مل جاتی تھیں اور دو جیتل میں ایک من خربوزہ آجاتا تھا، لیکن خواجہ صاحب کے فقر و فاقہ کا یہ حال تھا کہ فرماتے ہیں کہ:- میرے پاس ایک دانگ بھی نہ ہوتا کہ اس سے میں روٹیاں خرید کر خود کھاؤں اور والدہ و ہمشیرہ اور گھر کے ان لوگوں کو کھلاؤں جو میری کفالت میں تھے، خربوزہ کی اس ارزانی و فراوانی کے باوجود پوری پوری فصل گذر جاتی اور خربوزہ چکھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اپنے اس حال میں خوش رہتا اور آرزو کرتا کہ جتنی فصل باقی ہے وہ بھی گذر جائے اور میں اسی حال میں رہوں۔[3]

---

[1] بادشاہ کو پانی پلانے کا عہدہ - ۱۲

[2] سیر الاولیاء، (ص ۱۰۸)

[3] سیر الاولیاء، (ص ۱۱۳)

غیر کے واسطہ کے بغیر

اسی زمانہ میں جبکہ آپ شہر پناہ کے اس برج میں مقیم تھے جو مندہ دروازہ کے متصل ہے، کئی روز گذر گئے اور کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں آئی۔ ایک طالبعلم کو اس کا علم تھا کہ کئی روز سے حضرت کو فاقہ ہے، اس طالبعلم نے بعض ہمسایوں کو جو نوربافت تھے اس کی اطلاع کی، وہ کھانا تیار کرکے لائے۔ کھانے کیلئے ہاتھ دھلاتے وقت کھانا لانے والوں میں سے ایک بولا خدا طالبعلم کا بھلا کرے کہ اسنے ہمیں خبر کردی۔ خواجہ نے ہاتھ روک لئے اور فرمایا:۔ کیا خبر کی؟ اس نے کہا کہ:۔ فلاں طالبعلم نے ہمیں بتلایا کہ آپ کئی روز سے فاقہ سے ہیں، چنانچہ ہم یہ کھانا تیار کرکے لائے۔ آپنے فرمایا: معاف رکھو۔ کتنی ہی ان لوگوں نے کوشش کی، آپ نے کھانا قبول نہیں کیا۔[1]

شیخ کبیرؒ کی وفات

آخری بار آپ شیخ کبیرؒ کی خدمت میں تین چار مہینے قبل گئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ:۔ ۵ محرم کو شیخ کبیرؒ نے وفات پائی اور شوال کے مہینہ میں مجھے حضرت نے دہلی بھیجدیا۔ بیماری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا اور آپ بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ رہے تھے، ایک روز کہیں سے خربوزہ آیا تھا، خربوزہ کاٹ کر میں نے شیخ کے سامنے رکھا شیخ نے تناول فرمایا اور ایک قاش مجھے عنایت فرمائی۔ میرے دل میں آیا کہ یہ دولت اب کب ملیگی کہ اپنے دست مبارک سے مجھے عنایت فرمارہے ہیں، میں کھالوں اور دو مہینے مسلسل روزے رکھکر (فرض روزہ توڑ دینے) کا کفارہ ادا کردونگا۔ فرمایا کہ نہیں نہیں میرے لئے تو شریعت کی اجازت ہے، تمہارے لئے جائز نہیں۔[2]

فرمایا کہ انتقال کے وقت مجھے یاد فرمایا اور فرمایا کہ: نظام الدین تو دہلی میں ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ میں بھی اپنے شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی رحلت کے وقت حاضر نہ تھا، ہانسی میں تھا۔ فوائد الفواد

---

[1] جوامع الکلم (ملفوظات حضرت خواجہ سید محمد گیسو درازؒ) ص ۲۹۶ [2] سنہ ۶۶۴ھ [3] فوائد الفواد (ص ۵۳)

میں ہے کہ یہ تذکرہ کرتے وقت آپ پر ایسا گریہ طاری ہوا کہ تمام حاضرین کے دل متاثر ہوئے۔[1]

وفات کے بعد آپ اجودھن حاضر ہوئے۔ مولانا بدرالدین اسحٰق نے شیخ کبیرؒ کی وصیت کے مطابق جامہ مصلّٰے اور عصا سپرد کیا جو حضرت خواجہ کو دینے کے لئے شیخ کبیرؒ نے مولانا کے حوالہ کیا تھا۔[2]

غیاث پور کا قیام

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک روز آپ نے شہر کے شور و شر کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ ابتدائی زمانہ میں بھی میرا شہر میں دل نہیں لگتا تھا۔ ایک روز قتلغ خاں کے حوض پر تھا، ان دنوں میں قرآن مجید یاد کر رہا تھا، وہاں ایک درویش یادِ خدا میں مشغول تھا۔ میں اسکے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں؟ انھوں نے کہا: ہاں! میں نے کہا: اپنی مرضی سے اس شہر میں رہتے ہیں؟ اس نے کہا: یہ بات تو نہیں ہے۔ اسکے بعد اس درویش نے واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک اچھے درویش کو دیکھا، بیرون کمال دروازہ، احاطہ میں جو لبِ خندق ہے اس دروازے کے قریب ایک بلند زمین ہے جس پر شہدا کی چار دیواری بنی ہوئی ہے، وہ درویش بیٹھا ہوا ہے۔ اس درویش نے مجھ سے کہا کہ اگر ایمان کی خیر چاہتے ہو تو اس شہر سے چلے جاؤ۔ میں نے اسی وقت سے اس شہر سے چلے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیکن موانع پیدا ہوتے رہے، آج پچیس سال ہو گئے کہ میرا ارادہ باقی ہے لیکن جانے کی نوبت نہیں آتی۔ حضرت خواجہ نے یہ حکایت بیان کر کے فرمایا کہ میں نے جب اس درویش کی یہ بات سنی تو اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ میں اس شہر میں نہ رہوں گا۔ کئی جگہ کا خیال آتا تھا کہ میں وہاں چلا جاؤں۔ کبھی دل میں آتا تھا کہ قصبہ پٹیالی[3] چلا جاؤں، وہاں ان دنوں ایک ترک تھا۔ کبھی دل کرتا تھا کہ بشنالہ جاؤں، وہ ایک پاک صاف جگہ ہے، چنانچہ

---

[1] فوائد الفواد ص ۵۳ [2] سیر الاولیاء، ص ۱۲۲

[3] ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے جو خسرو کا ننہال یہیں تھا اور اسی تقریب سے وہ وہاں رہتے تھے۔ ۱۲

بشنالہ چلا گیا، تین روز وہاں رہا، کوئی مکان نہیں ملا، نہ کرایہ کا نہ بقیمت، ان تین دنوں روزانہ کسی ایک کا مہمان رہتا تھا، جب وہاں سے واپس آیا تو یہی خیال لگا رہا کہ ایک روز حوض رانی کی طرف گیا ہوا تھا، وہاں ایک باغ میں جس کو "باغِ حیرت" کہتے ہیں، اللہ سے مناجات کی۔ طبیعت متوجہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ خداوندا! میں اس شہر سے چلا جانا چاہتا ہوں، لیکن کوئی جگہ اپنی مرضی سے اختیار نہیں کرونگا جہاں آپ کی مرضی ہو وہاں چلا جانا چاہتا ہوں، اس درمیان میں ایک غیبی آواز "غیاث پور" کے نام کی آئی۔ میں نے کبھی غیاث پور دیکھا نہیں تھا، اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ غیاث پور کہاں ہے، میں نے جب آواز سنی تو ایک دوست کے پاس گیا۔ وہ دوست ایک نیشاپوری نقیب تھا، جب میں اس کے گھر گیا اور اسکو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ غیاث پور گیا ہوا ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ وہی غیاث پور ہے، الغرض غیاث پور آیا، اس وقت تک یہ مقام ایسا آباد نہیں تھا، ایک غیر معروف جگہ تھی، آدمی بھی کم تھے۔ میں آیا، میں نے وہاں سکونت اختیار کرلی، جب کیقباد[1] نے کیلوکھری کو اپنی فرودگاہ بنایا تو وہاں ہجومِ خلائق ہوا۔ امراء اور اعیانِ سلطنت اور ان کے متعلقین کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ جب میں نے یہ اژدحام دیکھا تو اپنے دل میں کہا کہ اب یہاں سے بھی چلا جانا چاہیئے، اسی خیال میں تھا کہ ایک بزرگ کا جو میرے استاد بھی تھے، شہر میں انتقال ہوا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب میں ان کے فاتحہ میں جاؤں گا تو پھر کسی طرف کا قصد کروں گا، اپنے دل میں اس کو طے کرلیا۔ اسی روز نمازِ عصر کے وقت ایک جوان آیا حسین لیکن نحیف، خدا جانے مردانِ غیب میں سے

---

[1] سلطان معزالدین کیقباد (۶۸۶ھ، ۶۸۸ھ) بغراخاں کا لڑکا اور غیاث الدین بلبن کا پوتا تھا، ۳ سال حکومت کی۔ ۱۲

[2] سرسید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں: معزالدین کیقباد نے ۶۸۶ھ میں ایک قلعہ بنوایا اور کیلوکھری اسکا نام لکھا اگرچہ اس قلعہ کا اب نشان نہیں لیکن اسی جگہ ہمایوں کے مقبرے کے پاس موضع کیلوکھری موجود ہے اور دس پانچ جھونپڑے موجود ہیں ۱۲۔
(آثار الصنادید باب ۳، ص ۴)

تھا یا کون تھا، اس نے آتے ہی مجھے خطاب کر کے یہ شعر پڑھا۔ ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی کہ انگشت نمائے جہاں خواہی شد

(جس روز خدا نے تم کو چاند بنایا تھا، اسی روز سمجھنا چاہیئے تھا کہ ساری دنیا کی انگلیاں تمھاری طرف اٹھیں گی)

حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اس نے کچھ اور باتیں بھی کہیں جس کو میں نے لکھ لیا ہے، اسکے بعد اس نے یہ کہا کہ پہلی مرتبہ آدمی کو مشہور نہیں ہونا چاہیئے، اور جب کوئی شخص مشہور ہو جائے تو پھر ایسا بننا چاہیئے کہ کل روزِ قیامت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ کیا ہمّت و حوصلہ ہے کہ خلقِ خدا سے بھاگ کر گوشہ گیری اختیار کی جائے اور یادِ خدا میں مشغول ہوا جائے۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ قوت و حوصلہ کی بات تو یہ ہے کہ مخلوق کے باوجود یادِ خدا میں مشغول ہو۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کچھ کھانا لا کر اسکے سامنے رکھا، اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا، اسی وقت میں نے اپنے دل میں نیت کی کہ میں یہیں رہوں گا جب میں نے یہ نیت کر لی، تو اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور چلا گیا[1]۔

رجوعِ عام

غیاث پور کے دورانِ قیام میں خلقِ خدا اور طالبین کا رجوع شروع ہوا اور فتوحات کا دروازہ کھُل گیا

تذکروں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ غیاث پور میں کتنی مدّت گزرنے کے بعد آپ کی ذات بابرکات کو مرجعیت، اور غیاث پور کی خانقاہ کو شہرت عام حاصل ہوئی۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ غیاث پور کا قیام اختیار کرنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک عسرت اور بے اسبابی کا دور گذرا، یہانتک کہ ایک عرصہ

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۲۹

تک آپ سخت گرمیوں اور لودھوں کے زمانہ میں جامع مسجد کو جو خاصہ فاصلہ پر تھی جمعہ کے دن پیادہ پا تشریف لیجاتے تھے، یہاں تک کہ اس "عُسر" کے بعد "یسر" کا دور[1] آگیا اور وہ رجوع عام شروع ہوا کہ اسکے سامنے سلاطینِ دہلی کے درباروں کی عظمت ماند پڑ گئی، امیر خسروؒ کے ان اشعار کی تصویر سامنے آگئی۔

ے
در حجرۂ فقر بادشاہی — در عالم دل جہاں پناہی
شاہنشہے بے سریر و بے تاج — شاہانش بہ خاک پائے محتاج

فقیر و منعم

صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ:- وارد و صادر میں سے پردیسی ہو یا شہری جو آتا اور سعادت[2] قدمبوسی حاصل کرتا کسی کو محروم نہ فرماتے، پوشاک، نقد، تحائف جو بھی خدا بھیجتا سب ہی ان آنے جانے والوں پر صرف ہوتا، جو بھی آتا اور جس وقت بھی آتا محروم نہ جاتا[3]۔

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا:-

"فتوحات کا یہ حال تھا کہ دولت کا دریا آگے دروازے کے بہتا تھا، کوئی دن فتوحات سے خالی نہ ہوتا، صبح سے شام تک لوگ آتے بلکہ عشا تک، مگر لینے والے لانے والوں سے زیادہ ہوا کرتے اور جو کچھ کوئی لاتا اس سے زیادہ حضرتؒ کی عنایت سے پاتا۔"[4]

---

[1] انّ مع العسر یُسرًا - ان مع العسر یُسرا ـــــ بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے، بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ ۱۲

[2] سیر الاولیاء۔

[3] سراج المجالس (ترجمہ خیر المجالس) ملفوظات حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ (صـ۲۰۲)

بیداری پر پہلا سوال

عادتِ مبارک تھی کہ جب قیلولہ سے اٹھتے تو دو باتیں سب سے پہلے پوچھتے، ایک یہ کہ زوال ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ کوئی آیا تو نہیں، تاکہ اسکو انتظار نہ کرنا پڑے[1]۔

دنیا سے تنفّر اور بذل و عطا

دنیا کا جس قدر رجوع بڑھتا گیا اتنی ہی طبیعت اس سے متنفر ہوتی گئی، اکثر گریہ فرماتے، جتنی بڑی فتوحات ہوتیں اتنی ہی زیادہ گریہ کرتے اور اتنی ہی زیادہ کوشش فرماتے کہ جو کچھ آیا ہے جلد تقسیم ہو جائے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آدمی کو بھیجکر ہدایت فرماتے کہ جو کچھ ہو تقسیم کر دیا جائے، جب سب تقسیم ہو جاتا اور ضرورتمندوں کو پہنچ جاتا تو سکونِ خاطر ہوتا۔ ہر جمعہ کو حجروں اور انبار خانوں کو اس طرح خالی کرا دیتے جیسے جھاڑو دے دی گئی ہو، اس کے بعد مسجد جاتے، اگر بادشاہوں یا شہزادوں میں سے کوئی آستانہ پر حاضر ہوتا اور ان کی نذر اور آمد آمد کی خبر پہونچتی تو ٹھنڈی سانس بھر کر فرماتے کہ: کہاں آئے ہیں، فقیر کا وقت غارت کرتے ہیں[2]۔

زمین و جائداد سے پرہیز

امیر حسن علا سنجری فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حاضر تھا، ان دنوں میں ایک امیر نے باغ اور بہت سی زمین اور اسکے سازوسامان کی دستاویز حضرتؒ کی خدمت میں بھیجی تھی اور اپنی عقیدت و اخلاص کا اظہار کیا تھا، حضرتؒ نے قبول نہ فرمایا، متبسم ہو کر فرمایا کہ اگر میں اسکو قبول کروں تو پھر لوگ کہا کرینگے کہ شیخ باغ کی سیر کو گئے ہیں اور اپنی کھیتی اور زمین دیکھنے تشریف لے گئے ہیں۔ میرے کام سے اس کو کیا مناسبت؟ میرے بزرگوں اور مشائخ میں سے کسی نے زمین و جائداد قبول نہیں کی[3]۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۲۶ ۔ [2] ایضاً ص ۱۲۹ [3] فوائد الفواد (ج ۱) ص ۹۹

فقیر کا شاہی دسترخوان

خود دائم الصوم تھے، لیکن دونوں وقت شاہی دسترخوان لگتا اور انواع و اقسام کے کھانے وافر مقدار میں چنے جاتے، امیر و غریب، شاہ و گدا، شہری و پردیسی، صالح و گناہگار کسی کی تفریق نہ تھی، سب ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے، لے جانے کی بھی اجازت تھی۔ بعض لوگ کھاتے اور باندھ کر بھی لے جاتے، یہ شاہی دسترخوان اپنی نوعیت میں یکتا تھا۔ اسی دسترخوان پر بیٹھ کر سیکڑوں ہزاروں غربا کو وہ کھانے نصیب ہوتے جن کے انھوں نے نام ہی نام سنے تھے، بڑے بڑے امرا درباراور اعیان سلطنت کو بھی اس دسترخوان پر حاضری کی آرزو ہوتی تھی اور اس کھانے کی لذت کو وہ یاد کرتے تھے، ہدایت وارشاد اور سلوک و تربیت کے فیض عام کے علاوہ (جس کا ہر وقت دروازہ کھلا رہتا تھا) حضرت خواجہؒ کا یہ بھی فیض تھا جو دلّی میں اپنی پوری روانی کے ساتھ جاری تھا اور جو ہزاروں بندگانِ خدا کی پرورش کا ذریعہ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی نے درویش کے اس خوانِ "سلطانی" کا ذکر کرتے ہوئے خوب لکھا ہے:۔

> "آج جن چیزوں پر ایوانِ نعمت کے قصّوں کے ساتھ غریبوں کا دکھڑا رویا جاتا ہے، گویا یہ بھی ایک قسم کی حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہے ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیۂ اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے۔ خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا، گذر چکا کہ ولی عہدِ سلطنت خضر خاں تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا۔ علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا، لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جسمیں اسے بھی باگزاری داخل کرنی پڑتی تھی"[1]

---

[1] نظامِ تعلیم (ص ۲۱۴)

یہی خانقاہیں تھیں جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غربا، فقرا تک ان کا حصہ پہنچ جاتا تھا، اور یہی مطلب ہے اس مشہور نقرہ کا کہ :-

"مالِ صوفی سبیل است"[1]

غربت و امارت کا یہ سنگم یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امرا و غربا دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے اس سے غریبوں اور حاجتمند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی علاقہ ایسا ہوگا جہاں

توخذ من اغنیاءھم — انکے دولتمندوں سے لیا جائے اور ان کے

وترد علیٰ فقراءھم — ضرورتمندوں کو پہونچا دیا جائے۔

کے نبوی فرمان کی تعمیل میں ارباب صدق و صفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا، خصوصاً جن بزرگوں کا کسی خاص وجہ سے امرا اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا، یوں سمجھئے کہ غربا کی قسمت جاگ اٹھتی تھی[2]۔

اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھئے اور اس پر غور کیجئے، آپ کو نظر آئے گا کہ امرا اور غربا کے درمیان ان بزرگوں کا وجود با جود حلقۂ اتصال بنا ہوا تھا ——

اور میرا خیال ہے کہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسری اغراض رکھتے تھے ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں، بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں، بلکہ ان ہی کے

---

[1] نظام تعلیم (ص ۲۱۴) [2] ایضاً (ص ۲۳۰)

ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو[1]"

شیخ کی غذا

شیخ خود کھانے میں شریک ہوتے لیکن اس شاہی دسترخوان پر جس پر انواع و اقسام کے کھانے اور الوانِ نعمت ہوتے، ان کی غذا عام طور پر ایک یا آدھی روٹی اور کچھ کریلہ وغیرہ کی سبزی یا تھوڑے سے چاول ہوتے[2]۔ آپ کے ایک مرید باختصاص مولانا شمس الدین یحییٰ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں:-

"میں ایک مرتبہ دسترخوان پر موجود تھا افطار کے وقت میری نظر سلطان المشائخ پر تھی، میں نے دیکھا کہ کھانا شروع ہونے کے وقت آپ نے لقمہ لینے کے لئے جو ہاتھ پیالہ کی طرف بڑھایا تھا وہ آخر تک وہیں رہا، منہ تک آنے کی نوبت نہ آئی کہ دسترخوان بڑھا دیا گیا[3]"

ترتیب

دسترخوان پر بیٹھنے کا قاعدہ اور ترتیب یہ تھی کہ سب سے آگے مخدوم زادگان (مرشد سے نسبتِ قرابت رکھنے والے) ہوتے، پھر علماء، پھر رؤسا و اشراف[4]

سلاطین عہد سے بے تعلقی

سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد سلطنتِ ہندوستان کی دینی رہنمائی بلکہ سلطنتِ اسلامی کی تاسیس، اسلامی معاشرہ کی اصلاح اور اس میں روحانیت و انابت کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ ابتدا ہی سے سلاطین وقت سے بے تعلقی کے اصول پر پڑی تھی، اور یہ اس سلسلہ کا ایک شعار اور مشائخ چشتیہ کا مقدس ترکہ اور امانت بن گئی تھی۔ مشائخ چشت نے اس "شیشہ و آہن" کو جمع کرنے میں اپنا پورا کمال دکھا دیا تھا۔ ایک طرف وہ دربار کے غلط رجحانات کی اصلاح اور وقت کے فتنوں کے استیصال سے غافل اور غم

---

[1] نظامِ تعلیم ص ۲۲۸ [2] سیر الاولیاء ص ۱۲۵ [3] ایضاً ص ۱۲۵ [4] ایضاً ص ۲۰۲

اسلام سے خالی اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل سے بے فکر نہ تھے، دوسری طرف وہ ایک اصول اور عقیدے کے طور پر یہ طے کر چکے تھے کہ ان کو دربار سے براہ راست کوئی تعلق رکھنا نہیں ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے لیکر خواجہ نظام الدینؒ تک یہ گویا ایک طے شدہ حقیقت تھی کہ ان کبھی دربار میں جاتا ہے اور نہ سلاطینِ وقت سے ملاقات کرنی ہے، اس اصول پر یہ سب حضرات سختی سے کاربند رہے، اس کا نتیجہ تھا کہ سیاست کے خارزار میں ان کا دامن کبھی نہیں اُلجھا، اور انقلاباتِ سلطنت کا ان مرکزوں اور ان کی سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ان کا اخلاص، ان کی بے لوثی اور بے غرضی تمام سیاسی اختلافات کے باوجود مُسلّم رہی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سب سے طویل عرصہ تک اس سلسلہ کو اپنا کام جاری رکھنے اور ہندوستان پر اثر انداز ہونے کا موقع ملا اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ اس سلسلہ کو قبول عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔

حضرت شیخ نظام الدینؒ جب سے شیخ کبیر کے پاس سے ہندوستان کی تسخیر روحانی اور تبلیغ و ارشاد پر مامور ہو کر آئے تھے دہلی کے تخت پر یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ بیٹھے اور انھوں نے بڑے جاہ و جلال کیساتھ سلطنت کی، لیکن سوائے ایک موقع کے جبکہ دینی ضرورت درپیش تھی (سماع کی حلت و حرمت کی مجلسِ مناظرہ) وہ کبھی نہ دربار میں گئے اور نہ بادشاہِ وقت کو اپنے یہاں آنے کی اجازت دی۔ غیاث الدین بلبن کے عہدِ سلطنت میں ان کا آفتاب شہرت و قبولیت نصف النہار پر نہیں پہنچا تھا، اس لئے غیاث الدین کو ان کی طرف توجہ نہیں ہوئی، معز الدین کیقباد لہو و لعب اور سیر و شکار میں مشغول رہا۔

جلال الدین خلجی پہلا بادشاہ تھا جو صاحب علم و حلم، جوہر شناس اور ارباب کمال کا قدردان تھا اور حضرت خواجہ کی شہرت بھی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جلال الدین نے کئی بار حاضری کی اجازت چاہی لیکن کبھی منظور نہیں ہوئی۔ آخر سلطان نے امیر خسروؒ کے ساتھ (جو سلطان کے مصحف بردار تھے) یہ منصوبہ بنایا کہ ایک مرتبہ بلا اطلاع حضرت کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ امیر خسروؒ نے مناسب جانا کہ اپنے مرشد کو اس کی اطلاع دے دی جائے، اس لئے کہ اگر میں نے اسکی اطلاع نہ دی تو شاید

میرے حق میں یہ اچھا نہ ہو، اگرچہ بادشاہ نے اس بارے میں امیر خسروؒ کو اپنا رازدار بنایا تھا لیکن اپنے مرشدؒ سے سے رازداری امیر خسرو کو مناسب نہ معلوم ہوئی۔ امیر نے حضرت خواجہؒ سے جاکر عرض کیا کہ کل بادشاہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ حضرت خواجہ نے یہ سنتے ہی اپنے مرشد کی قبر کی زیارت کی نیت سے اجودھن کا رخ فرمالیا اور روانہ ہوگئے۔ بادشاہ کو جب اسکی اطلاع ملی تو امیر خسروؒ پر ناراض ہوا کہ تم نے میرا راز فاش کردیا اور حضرت خواجہؒ کی قدمبوسی کی سعادت سے محروم کردیا۔ امیر خسروؒ نے کہا کہ بادشاہ کی بخشش سے جان جانے کا خوف تھا لیکن مرشدؒ کی بخشش سے سلب ایمان کا خوف تھا۔ بادشاہ حلیم و فرزانہ تھا اس نے اس جواب کو پسند کیا اور خاموش ہوگیا۔

سُلطان علاءُالدّین کا امتحان اور عقیدت

سلطان علاء الدین خلجی جو سند ہستان قدیم کا سب سے باجبروت اور اقبال مند بادشاہ اور سکندر ثانی ہے اپنے چچا جلال الدّین کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا۔ ابتدا میں اسکو حضرت خواجہ سے نہ کوئی خاص عقیدت تھی نہ تنفر تھا، بعض لوگوں نے سلطان کو حضرت خواجہ کی طرف سے بدگمان کرنے کی کوشش کی اور ان کی مقبولیت اور رجوع عام سے سلطنت کیلئے خطرات ثابت کئے، سلطان علاءالدین نے امتحاناً ایک عریضہ آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے اور ولیعہد خضر خاں کے ہاتھ بھیجا جس میں آپ سے انتظام سلطنت کے بارے میں مشورے اور نصائح کی درخواست کی گئی تھی، جب خضر خاں یہ خط لیکر خواجہ کی خدمت میں آیا آپنے وہ کاغذ ہاتھ میں لے لیا اور اس کا مضمون بھی نہیں پڑھا۔ حاضرین مجلس سے فرمایا کہ ہم دعا کرتے ہیں، اسکے بعد ارشاد ہوا کہ درویشوں کا بادشاہوں سے کیا کام؟ میں ایک فقیر آدمی ہوں، شہر کا ایک گوشہ اختیار کر رکھا ہے، بادشاہ اور مسلمانوں کیلئے دعاگوئی میں مشغول ہوں، اگر اس وجہ سے بادشاہ کو مجھ سے تعرض کرنا ہے میں یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں، اللہ کی زمین وسیع ہے سلطان علاءالدین اس جواب سے بہت خوش ہوا، اور کہا کہ میں جانتا تھا کہ حضرت خواجہؒ کو امور سلطنت و سیاست

لہ سیر الاولیاء ص ۱۳۵

کوئی سروکار نہیں، لیکن بدخواہ چاہتے ہیں کہ مجھے مردان خدا سے لڑادیں اور اس طرح ملک تباہ ہو جائے۔[1]

بادشاہ کے آنے سے معذرت

سلطان نے حضرت خواجہؒ سے بڑی معذرت کی اور کہلوایا کہ میں آں مخدوم کا معتقد ہوں۔ مجھ سے گستاخی ہوئی۔ معاف کیا جائے اور حاضری کی اجازت دیجائے کہ قدمبوسی کی سعادت حاصل کروں۔" حضرت خواجہؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔" آنے کی حاجت نہیں، میں غائبانہ دعا کرتا ہوں اور غائبانہ دعا بڑی موثر ہوتی ہے۔[2]

گھر کے دو دروازے

سلطان نے اس کے بعد بھی ملاقات کیلئے بڑا اصرار کیا حضرت نے فرمایا کہ اس فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازے سے آئے گا، میں دوسرے دروازے سے باہر چلا جاؤں گا۔[3]

غمِ اسلام

اگرچہ علاء الدین حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا، لیکن اس کو آپ سے برابر عقیدت رہی، اور وہ مہماتِ سلطنت اور فکر و تردد کے موقع پر حضرت خواجہؒ سے رجوع کرتا رہا۔ ایسے موقع پر آپ سے دعا کی درخواست کرتا اور آپ اہتمام کے ساتھ دعا فرماتے۔

قاضی ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ:۔ جب ملک نائب (کافور) دورنگل کے محاصرے میں مشغول تھا، تلنگانہ کا راستہ پُرخطر ہو گیا تھا، راستہ کے تھانے اور چوکیاں بھی اٹھ گئیں تھیں، چالیس روز سے زیادہ ہو گئے تھے کہ لشکر کی سلامتی اور خیریت کی اطلاع سلطان تک نہیں پہنچی تھی، سلطان کو بڑا تردد تھا، اکثر اعیان و امراءِ دربار کا خیال ہونے لگا تھا کہ لشکر کسی حادثہ یا فتنہ کے نذر ہو گیا کہ سلسلۂ رسل و رسائل منقطع ہو گیا ہے۔ اسی فکر و تردد کے ایام میں ایک روز سلطان نے ملک قرا بیگ اور قاضی مغیث الدین بیانوی کو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں بھیجا اور کہلایا کہ لشکرِ اسلام کی خیریت نہ معلوم ہونے سے مجھے سخت تردد ہے

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۳۴ [2] ایضاً ص ۳۵ [3] ایضاً ص ۱۳۵

آپ کو اسلام کا غم اور فکر مجھ سے زیادہ ہی ہے اگر نور باطن سے آپ کو لشکر کا کوئی حال معلوم ہو تو مجھے مطمئن و مسرور فرمائیں، سلطان نے پیغام لے جانے والوں کو ہدایت کی کہ حضرتؒ کی زبان سے اس موقع پر جو کچھ نکلے اس کو محفوظ رکھیں، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کریں۔ وہ دونوں حضرات شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے سلطان کا پیغام پہنچایا، آپ نے پیغام سننے کے بعد بادشاہ کی فتح و نصرت کا حال بیان کرنا شروع کیا اور فرمایا کہ "یہ فتح کیا ہے ہم اور فتوحات کی بھی امید رکھتے ہیں" یہ سنکر ملک قرا بیگ اور قاضی مغیث الدین شاداں فرحاں واپس آئے اور سلطان کو جواب سُنایا سلطان یہ جواب سنکر بہت خوش ہوا، اس کو یقین ہو گیا کہ ورنگل فتح ہو چکا۔۔۔۔ اسی روز نماز عصر سے فارغ ہوئے تھے کہ ملک نائب کے قاصد پہنچے اور ورنگل کا فتح نامہ لائے، جمعہ کے دن وہ فتح نامہ منبروں پر سے پڑھکر سنایا گیا، صحن میں خوشی کا نقارہ بجا اور خوشیاں منائی گئیں۔ سلطان کا اعتقاد اور بڑھ گیا۔[1]

ایک دوسری مرتبہ جب مغل دہلی پر حملہ آور ہوئے سلطان بنفس نفیس جنگ میں شریک تھا، اس نے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں عرض کرایا کہ یہ بڑا اہم موقع ہے آپ متوجہ رہیں حضرت خواجہ نے تمام اہل خانقاہ سے ارشاد فرمایا کہ: متوجہ الی اللہ رہیں اور خدا سے مسلمانوں کی فتح کی دعا کریں چنانچہ سب مشغول رہے اور تھوڑی عرصہ میں فتح کی خبر آئی، مغلوں نے شکستِ فاش کھائی۔[2]

قاضی ضیاء الدین سلطان علاء الدین کے اہل دربار میں سے تھے، کہتے ہیں کہ: اپنے پورے عہد حکومت میں کبھی سلطان کی زبان سے حضرت خواجہؒ کے بارے میں کوئی خلافِ شان بات نہیں نکلی۔ اگرچہ دشمن اور حاسدین شیخؒ کی شاہانہ دادودہش، رجوع خلائق اور شاہی لنگر کو سلطان سے رنگ آمیزی اور ایسے طریقے پہ بیان کرتے کہ سلطان بدگمان ہو جائے، لیکن سلطان نے کبھی اس کی طرف التفات نہیں کیا اور خاص طور پر اپنے آخر عہد میں اسکو حضرتؒ سے غایت درجہ کا اخلاص و اعتقاد پیدا ہو گیا تھا، اس سب کے باوجود کبھی ملاقات کی نوبت نہ آئی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صـ۳۳۳ [2] سیر الاولیاء صـ۱۶۰

سلطان علاء الدین کے بعد اس کا دوسرا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ ولی عہد سلطنت

سُلطان قطب الدّین کی مخالفت اور اُسکا قتل

خضر خاں کو محروم و مکحول کر کے غاصبانہ تخت سلطنت پر بیٹھا۔

"خضر خاں چونکہ حضرت والا کا مرید تھا اور وہی علاء الدین کا ولی عہد تھا جس سے قطب الدین نے حکومت غصب کی تھی، اس لئے قطب الدین حضرتؒ سے بھی ناراض رہتا تھا، اس نے اپنی ایک نئی جامع مسجد "جامع میری" کے نام سے بنوائی تھی اور تمام مشائخ و علماء کو حکم تھا کہ اسی میں آکر نماز جمعہ ادا کریں۔ سلطان المشائخ نے کہلا بھیجا کہ:۔ "مسجد نزدیک داریم و ایں احق است ہمیں جا خواہیم گزار" (ہمارے قریب ایک مسجد ہے اس کا حق زیادہ ہے، ہم وہیں نماز پڑھیں گے) اور وہ جامع میری نہیں گئے۔ بادشاہ سخت برافروختہ ہوا۔ اسی کے ساتھ ہر نوچندی کو اعیان اور مشاہیر شہر میں دربارِ شاہی میں پیش ہو کر نذر گزارتے تھے، سلطان المشائخ اس تقریب میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے، ادائے رسم کیلئے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیتے تھے

اس سے بھی وہ برہم تھا، اس نے اپنے تمام امراء و وزراء کو حکم دیا کہ:۔

"کسے بزیارت شیخ غیاث پور نہ رود"

(کوئی شیخ کی زیارت کے لئے غیاث پور نہ جائے)

امیر خسروؒ نے لکھا ہے کہ:۔ "بارہا می گفت کہ ہر کہ سر شیخ برد ہزار تنکا او را دہم"

(جو شیخ کا سر لائے گا اس کو ہزار تنکہ دوں گا) ایک روز شیخ ضیاء الدین رومی کی درگاہ میں سلطان جی اور قطب الدین کا آمنا سامنا بھی ہو گیا، سلطان جی نے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے سلام کیا، قطب الدین نے جواب نہ دیا۔ یوں

مسلسل واقعات قطب الدین کی حکومت کے چار سالہ مدت میں پیش آتے رہے[1]۔
نوچندی کی حاضری پر اصرار کا قصہ سب سے آخر میں پیش آیا۔ قطب الدین نے بھرے
دربار میں اعلان کیا کہ: "اگر در غرۂ ماہ آئندہ نیامد بیاریم چنانکہ دانیم" گویا کہ یہ
اسکی دھمکی تھی کہ بزور حکومت دربار میں گھسٹوا کر بلواؤں گا۔ شاید قتل ہی کا
ارادہ ہو۔ سلطان جی کو بادشاہ کے اس عزم مصمم کی خبر پہنچی۔ سلطان المشائخ
ہیچ نگفت۔ اب مہینہ ایک ایک دن کر کے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ "ہر چند ماہ نزدیک رسید
التفاتِ مخلصاں را روئے بیشتر می داد" (مہینہ جتنا نزدیک آ رہا تھا اہل تعلق کا فکر و
تردد بڑھتا جا رہا تھا) چاند مغرب کے بعد دیکھا گیا، کل پہلی تاریخ ہے، شہر کے
اعیان و امرا دربار میں جائیں گے، لیکن سلطان المشائخ یہی طے کئے ہوئے ہیں کہ میں
نہیں جاؤں گا۔ قطب الدین یہ فیصلہ کئے ہوئے ہے کہ:۔ اگر نیامد بیاریم چنانکہ
دانیم"۔ "صرف شب درمیان است"۔ دلّی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، دُنیا اور
دین کے دو[2] بادشاہوں کا کل معرکہ ہے۔ رات گذرنے کبھی نہ پائی کہ:۔ ہم دریں
شبِ ماہ بلائے از آسمان بر جان بادشاہ نازل شد" (اسی شبِ ماہ میں بادشاہ
کی جان پر آفتِ آسمانی نازل ہوئی) یعنی "خسرو خاں موئے سر سلطان را گرفت و باہم
در آویختند پہلوئے سلطان را بہ خنجر شگافتہ بر زمین انداخت و سر آں مشوم را از تن
جدا کردہ از بام ہزار ستون بزیر افگند" (طباطبائی) خسرو خاں نے بادشاہ کے
سر کے بال پکڑے، دونوں باہم دست و گریبان ہوئے۔ خسرو خاں نے سلطان
کے پہلو کو خنجر سے چیر کر زمین پر ڈال دیا اور اس شامت زدہ کا سر تن سے جدا

---

[1] نظام تعلیم ص ۲۲۰

کرکے بام ہزار ستون سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔"[1]

غیبی لنگر اسی زمانہ میں جب سلطان قطب الدین کی طرف سے اس بات کی خاص روک تھام تھی کہ امرارِ دربار اور راعیان سلطنت کی طرف سے حضرت خواجہ کی خدمت میں کوئی نذر پیشکش نہ ہونے پائے، تاکہ دیکھا جائے کہ یہ شاہانہ لنگر خانہ کس طرح چلتا ہے، آپنے خاص طور پر تاکید فرما رکھی تھی کہ اس زمانہ میں کھانا زیادہ پکایا جائے اور دسترخوان وسیع سے وسیع تر کر دیا جائے۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا:۔

"ایک بار سلطان قطب الدین کو کسی بدخواہ نے کہا کہ شیخ ہماری فتوحات قبول نہیں کرتے اور امرا و سرداروں کی لائی ہوئی فتوحات قبول کرتے ہیں، آخر وہ سب بھی تو آپ ہی کے یہاں سے لے جاتے ہیں۔ سلطان قطب الدین نے یہ بات سچ جان کر حکم کیا کہ:۔ کوئی امیر یا

---

[1] نظام تعلیم و تربیت صفحہ ۲۳ سیر الاولیاء میں یہ واقعہ منقول ہے۔ مگر تاریخ و ماہ و سنہ درج نہیں صفحہ ۱۵۰ و صفحہ ۱۵۱ تاریخ فرشتہ جلد اول میں ضمن تذکرۂ سلطان قطب الدین، سلطان کے قتل کی تاریخ شب پنجم ربیع الاوّل ۶۲۱ھ مذکور ہے جسکے ساتھ نوچندی کے سلام کی روایت اور چاندرات میں بادشاہ کے قتل کا واقعہ میل نہیں کھاتا (صفحہ ۲۲۷)۔ پھر اسی کتاب کی جلد دوم میں جہاں حضرت سلطان المشائخ کا تذکرہ ہے وہاں سلطان کے قتل کی تاریخ ۲۹ شوال لکھی ہے اور سنہ کا تذکرہ نہیں (صفحہ ۴۰۰ و صفحہ ۴۰۱ جلد ۲) لیکن اس سلسلہ میں سب سے قدیم تر اور قابل اعتماد ماخذ امیر خسروؒ کی مثنوی "تغلق نامہ" ہے، جو سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد کی تصنیف اور امیرؒ کی مستند اور مشہور مثنوی ہے۔ اس میں انھوں نے نہایت صراحت سے لکھا ہے کہ:۔ قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۶۲۰ھ کی عین چاندرات کو واقع ہوا۔ وہ فرماتے ہیں ؎

چوں تاریخ عرب شد ہفتصد و بیست — ثباتِ قطب شد کم جانب زیست
جماد دوئیں راشد پدیدار — ہلالِ تیرہ و تاریک دیدار
مہ باریک بُود از حالت تلخ — بناخن کردہ خود را پیش ازاں سلخ
شد آں مہ بر ہمہ گیہاں مُبارک — مگر بر طالعِ سُلطاں مُبارک

(تغلق نامہ صفحہ ۱۹ طبع حیدر آباد)

ان اشعار سے تاریخ کا بھی صحیح تعین ہو گیا اور واقعہ کی نوعیت و اہمیت کی بھی تصدیق ہو گئی۔ ۱۲

سردار شیخ کے یہاں نہ جاوے، دیکھو وہ اس قدر دعوت لوگوں کی کہاں سے کرتے ہیں اور جاسوس مقرر کئے کہ دیکھتے رہیں جو امیر وہاں جاوے مجھے آکر اطلاع کریں۔ جناب شیخ نے سنا فرمایا:۔ کھانا آج سے زیادہ پکایا جاوے، ایک مدت بعد سلطان نے لوگوں سے دریافت کیا کہ خانقاہ شیخ کا کیا حال ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ سابق جسقدر پکتا تھا اب اس سے دوگنا پکتا ہے بادشاہ یہ سنکر پشیمان ہوا کہا میں غلطی پر تھا، آپ کا معاملہ عالمِ غیب سے ہے[1]"

غیاث الدین تغلق کا عہد اور سرکاری مجلس مناظرہ

قطب الدین مبارک شاہ کے بعد چند مہینے خسرو خاں نے غاصبانہ سلطنت کی اور شعائر اسلام کو سرنگوں کرکے اسلام کی تذلیل کی۔ ۷۲۰ھ میں غیاث الدین تغلق (ملک غازی) نے خسرو خاں کو قتل کرکے تغلق خاندان کی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ سلطان غیاث الدین اگرچہ صاحب علم نہ تھا لیکن شریعت اور علماء کا احترام کیا کرتا تھا۔ حضرت خواجہ سماع سنتے تھے انکی وجہ سے دہلی میں اس کا عام ذوق اور رواج ہوگیا تھا۔ ایک شخص شیخ زادہ حسام الدین فرجام نامی جو ایک عرصہ تک حضرت خواجہ کے سایۂ عاطفت میں رہا تھا اور باوجود مجاہدوں کے ذوق و شوق اور عشق کی دولت سے فیضیاب نہیں ہو سکا تھا نیز قاضی جلال الدین الولوالجی نائب حاکم مملکت کو بھی اہل درد و محبت سے ایک طرح کی کد تھی۔ قاضی صاحب اور دوسرے علماء نے شیخ زادہ حسام کو آمادہ کیا اور اس نے بادشاہ کو متوجہ کیا کہ خواجہ نظام الدین مقتدائے زمانہ ہیں اور وہ سماع سنتے ہیں جو امام اعظمؒ کے مذہب میں حرام ہے اور ان کی وجہ سے ہزارہا مخلوق اس فعل ممنوع کا ارتکاب کرتی ہے، سلطان اس مسئلہ سے بے خبر تھا، اسکو تعجب ہوا کہ ایسے بزرگ جو مقتدائے عالم ہیں

---

[1] خیر المجالس ماخوذ از ترجمہ صـ۲۰۳ [2] سماع کی حقیقت، اغراض و مقاصد اور اسکے آداب و احکام کی بحث چوتھے باب "اذواق و کیفیات" میں ملاحظہ ہو۔ ۱۲

ایسا نامشروع کام کیسے کرتے ہیں۔ لوگوں نے سماع کی حلت کے فتوے اور کتب شرعیہ کی روایات بادشاہ کے سامنے پیش کیں، بادشاہ نے کہا کہ چونکہ علمائے دین نے سماع کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے اور وہ اسکو منع کرتے ہیں اسلئے حضرت خواجہ اور تمام علماء شہر اور صدور و اکابر کو طلب کیا جائے اور ایک مجلس منعقد کی جائے تاکہ یہ تحقیق ہو جائے کہ حق کیا ہے۔ میر خورد کی زبان سے اسکی تفصیل سنئے:۔

"قصر شاہی میں حضرت خواجہؒ کی طلبی ہوئی۔ حضرت خواجہؒ قاضی محی الدین کاشانی اور مولانا فخر الدین زرادی کی معیت میں کہ دونوں سرآمد علماء اور اساتذۂ وقت تھے محل میں تشریف لے گئے۔ پہلے قاضی جلال الدین نائب حاکم نے حضرت خواجہؒ کو وعظ و نصیحت شروع کی اور نامناسب طریقے پر آپ سے خطاب کیا، یہاں تک کہا کہ اگر اسکے بعد آپ نے سماع کی حلت کا دعویٰ کیا اور سماع سنا تو میں حاکم شرع ہوں، میں آپ کو سزا دوں گا۔ یہ سنکر حضرت خواجہؒ کو جلال آگیا اور فرمایا کہ:۔ جس منصب کے بھروسہ پر تم یہ بات کہہ رہے ہو اس سے معزول ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ٹھیک بارہ روز بعد قاضی اپنے منصب سے معزول ہو کر دہلی سے روانہ ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ اس مجلس مباحثہ میں تمام علماء و اکابر صدور و امراء اور ارکانِ سلطنت حاضر تھے بادشاہ اور سب حاضرین مجلس کی توجہ حضرت خواجہ کی طرف تھی اور سب آپ کی تعظیم کرتے تھے۔ شیخ زادہ حسام نے کہا کہ آپ کی مجلس میں سماع ہوتا ہے، لوگ رقص کرتے ہیں، آہ و نعرہ لگاتے ہیں، اسی طرح اور بہت سی باتیں کہیں، حضرت خواجہؒ نے شیخ زادہ کی طرف دیکھا اور فرمایا، شور مت کرو، زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں، پہلے یہ بتلاؤ سماع کی تعریف کیا ہے؟ شیخ زادہ حسام نے کہا کہ میں نہیں جانتا، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ علماء سماع کو حرام کہتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ: جب

تم کو سماع کے معنی ہی نہیں معلوم تو مجھے تم سے کچھ کہنا نہیں ہے اور نہ کہنا چاہیئے
شیخ زادہ حسام شرمندہ ہوا، بادشاہ پوری توجہ سے آپ کی تقریر سن رہا تھا، جب
کوئی زور سے بات کرتا تو کہتا کہ شور مت کرو، سنو کہ شیخ کیا فرماتے ہیں۔ —
حاضر الوقت علماء میں مولانا حمید الدین اور مولانا شہاب الدین ملتانی خاموش تھے
مولانا حمید الدین نے اتنا فرمایا کہ یہ مدعی حضرت خواجہ کی مجلس کا جو حال بیان
کرتے ہیں یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے اور بہت سے مشائخ اور
درویشوں کو بھی میں نے دیکھا ہے — اسی دوران میں شیخ الاسلام شیخ
بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے نواسے مولانا علم الدین آ گئے۔ بادشاہ نے ان سے کہا
کہ آپ بھی عالم ہیں اور سیاح بھی، اس وقت سماع کی بحث درپیش ہے، میں
آپ سے پوچھتا ہوں کہ سماع سننا حرام ہے یا حلال؟ مولانا علم الدین نے کہا کہ
میں نے اس باب میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے، اس میں اس کی حرمت و حلت
کے دلائل نقل کئے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ جو دل سے سنتے ہیں ان کے لئے حلال ہے
اور جو نفس سے سنتے ہیں ان کے لئے حرام۔ اس کے بعد بادشاہ نے مولانا علم الدین
سے پوچھا کہ آپ بغداد و شام و روم ہر جگہ پھر چکے ہیں، وہاں کے مشائخ سماع سنتے
ہیں یا نہیں، اور وہاں کوئی منع کرتا ہے؟ مولانا علم الدین نے فرمایا کہ:۔ ان سب
شہروں میں بزرگ و مشائخ سماع سنتے ہیں اور بعض دف و شبانہ کے ساتھ بھی،
کوئی مانع نہیں ہوتا اور سماع مشائخ کے درمیان حضرت جنیدؒ و شبلیؒ کے وقت
سے مروّج چلا آ رہا ہے، بادشاہ مولانا علم الدین کی زبان سے یہ سن کر خاموش
ہو گیا اور اس نے کچھ نہیں کہا۔ مولانا جلال الدین نے عرض کیا کہ بادشاہ

سماع کی حرمت کا فرمان صادر کریں اور امام اعظمؒ کے مذہب کی پاسداری فرمائیں۔ اس پر حضرت خواجہؒ نے بادشاہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بارے میں کوئی فرمان جاری نہ کریں، بادشاہ نے آپ کا یہ مشورہ قبول کیا اور اس بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا۔ مولانا فخرالدین (جو مجلس میں حاضر تھے) کا بیان ہے کہ ابتدائے چاشت سے زوال تک یہ بحث جاری رہی، اہلِ مجلس تحریم کی کوئی دلیل نہیں دے سکے اور آخر میں اس پہ بحث آکر ختم ہوگئی کہ اس کا ترک اولیٰ ہے یا اس کا فعل۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ حضرت خواجہؒ سماع سن سکتے ہیں اور کسی کو ان کے منع کرنے کی اجازت نہیں، لیکن یہ روایت مرجوح ہے۔۔۔ انھیں دنوں میں کسی نے حضرت خواجہؒ سے کہا کہ اب تو سماع کے لئے فرمان سلطانی ہوگیا ہے کہ آپ جس وقت چاہیں سماع سنیں وہ حلال ہے۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اگر وہ حرام ہے تو کسی کے کہنے سے حلال نہیں ہوسکتا اور اگر حلال ہے تو کسی کے کہنے سے حرام نہیں ہوسکتا۔ مجلس کے اختتام پر بادشاہ نے خواجہ کو بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ رخصت کیا۔[1]"

مجلس مناظرہ کا حال حضرت خواجہ کی زبان سے

قاضی ضیاءالدین برنی اپنی کتاب "حسرت نامہ" میں لکھتے ہیں کہ:۔ جب حضرت خواجہ اس مجلس سے فارغ ہوکر مکان پر تشریف لائے تو آپ نے نماز ظہر کے وقت مولانا محی الدین کاشانی

---

[1] سیر الاولیاء باختصار ص ۵۲۷ تا ص ۵۳۲

اور امیر خسرو کو طلب فرمایا، ارشاد ہوا کہ دہلی کے علماء عداوت و حسد سے بھرے ہوئے تھے، انھوں نے وسیع میدان پایا، اور دشمنی کی بہت سی باتیں کیں، عجائب بات یہ دیکھی کہ صحیح احادیث نبویہؐ کا سننا ان کو گوارا نہیں، ان کے جواب میں یہی کہتے تھے کہ ہمارے شہر میں فقہ پر عمل حدیث پر مقدم ہے، یہ باتیں وہی کہہ سکتے ہیں جن کا احادیث نبویہؐ پر اعتقاد نہ ہو، میں جب کوئی حدیث صحیح پڑھتا تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے تھے کہ اس حدیث سے امام شافعی استدلال کرتے ہیں اور وہ ہمارے علماء کے دشمن ہیں، ہم نہیں سنیں گے، معلوم نہیں کہ یہ با اعتقاد ہیں یا نہیں، اولوالامر کے سامنے ایسی زبردستی سے کام لیتے تھے، اور احادیث صحیح کو روکتے تھے، میں نے کوئی عالم ایسا دیکھا نہ سنا کہ اسکے سامنے احادیث صحیحہ پڑھی جائیں اور وہ کہے کہ میں نہیں سنتا، میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا قصہ ہے اور وہ شہر جہاں ایسی جرأت اور زبردستی کی جاتی ہے وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے، تعجب نہیں کہ اگر اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے اس کے بعد بادشاہ اور امراء اور عوام جب قاضی شہر اور علماء شہر سے یہ سنیں گے کہ اس شہر میں حدیث پر عمل نہیں ہوتا تو ان کا حدیث نبویؐ پر اعتقاد کیسے رہیگا۔ مجھے ڈر ہے کہ علماء شہر کی اس بدعقیدگی کی نحوست سے آسمان سے بلاء و جلاء و قحط و وبا نہ برسے[1]

دہلی کی تباہی

اس واقعہ کے ٹھیک چھٹے سال حضرت خواجہ کی وفات کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کے فرزند اور جانشین محمد تغلق نے دلی کو بالکل خالی کر دینے اور دیوگیر (دولت آباد) منتقل ہو جانے کا فرمان جاری کیا اور اس میں ایسی ضد اور عجلت سے کام لیا کہ حقیقتاً شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور دلّی سا گلزار و آباد شہر جس میں پہلے رہنے کو جگہ نہیں ملتی تھی ایسا خالی ہوا کہ سوائے جنگلی جانوروں اور درندوں کے وہاں کسی متنفس کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔

محمد قاسم تاریخ فرشتہ میں لکھتا ہے:۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۲۷، ص ۵۳۲

احدے از مردم دہلی را کہ بآب و ہوائے
آں جا خوگر گرفتہ بودند، بحال خود
نگذاشتہ طرّاً بدولت آباد فرستاد
و دہلی بنوعے ویراں گشت کہ آواز
ہیچ متنفس بجز شغال و روباہ جانوران
صحرائی بگوش نمی رسید[1]

کارپردازن حکومت نے کسی ایک شخص کو
بھی جو دہلی کی آب و ہوا کا خوگر تھا اپنی
جگہ نہیں چھوڑا، سب کو کلیۃً دولت آباد
(دیوگیر) بھیج دیا اور دہلی اس طرح ویران
ہوئی کہ کسی ایک جاندار کی آواز بھی سوائے گیدڑ
لومڑی اور جنگلی جانوروں کے کان میں نہیں آتی تھی

وہ تمام علماء جو اس مجلس میں موجود تھے اور دوسرے بھی ان کی بدولت دولت آباد جلاوطن ہوئے، دولت آباد پہنچے تو وہاں سخت قحط اور وبا کا سامنا کرنا پڑا، ہزاروں راستہ میں لقمۂ اجل بن گئے اور ہزاروں وہاں پہنچ کر قحط اور بیماریوں کا شکار ہوئے اور حضرت خواجہ کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

نظام الاوقات

امیر خورد نے حضرت خواجہ کا نظام الاوقات اس طرح لکھا ہے:۔
"روزہ افطار کرنے کے بعد (جو اہل جماعت کے ساتھ ہوتا تھا) اپنے بالاخانہ کے قیامگاہ پر تشریف لے جاتے تھے۔ احباب و خدام جو شہر اور اطراف سے آئے ہوتے تھے مغرب و عشاء کے درمیان اوپر ہی بلا لئے جاتے تھے۔ ایک گھڑی وہاں ہم نشینی اور ملاقات کا شرف حاصل ہوتا، ہر قسم کے تر و خشک میوے اور کھانے پینے کی لطیف و لذیذ چیزیں حاضر کی جاتی تھیں حاضرین مجلس تناول کرتے، آپ ہر ایک کی دلداری فرماتے اور خیریت و حالات دریافت فرماتے۔"[2]

امیر خسرو کی خصوصیت

عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے پھر نیچے تشریف لاتے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھکر پھر بالاخانہ پر تشریف لیجاتے، کچھ دیر مشغول

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) ص ۲۴۳ [2] سیر الاولیاء، ص ۱۲۵

رہتے پھر آرام کرنے کے لئے چارپائی پر تشریف لیجاتے، اس وقت خدام تسبیح لاکر آپ کے ہاتھ میں دیتے، اس وقت سوائے امیر خسرو کے کسی کو آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی،[1] وہ سامنے بیٹھ کر ہر طرح کے قصے اور باتیں کرتے، آپ پسندیدگی میں سر مبارک کو حرکت دیتے، وقتاً فوقتاً ارشاد ہوتا کہ ترک کیا خبر ہے؟ امیر خسرو اتنی بات سنکر طویل گفتگو کا موقع نکال لیتے، اگر آپ ایک نکتہ پوچھتے تو وہ ساری داستان سناتے،[2] اس موقع پر بعض کم سن اعزہ اور بعض پروردہ جو صاحب خانہ تھے حاضر ہوتے اور قدمبوسی کرتے۔ ؎

نخفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شبہا
کہ دیدہ بر کفِ پایت نہد بخواب شود

شب کی تیاری

جب امیر خسرو اور صاحبزادگان اجازت لیکر رخصت ہوتے تو اقبال خادم آتے اور پانی کے بھرے ہوئے چند آفتابے آپ کے وضو کیلئے رکھ کر باہر چلے جاتے، اس کے بعد حضرت خواجہ خود اٹھتے اور دروازہ کو زنجیر لگاتے، پھر وہاں کی خبر اللہ کے سوا کسی کو نہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ تمام رات کیا راز و نیاز ہوتے اور اپنے مالک سے کیا ذوق و شوق کی

---

[1] امیر خسرو کو حضرت خواجہؒ سے جو والہانہ و عاشقانہ تعلق تھا وہ ان کے سوانح اور دیوان سے معلوم ہوتا ہے، بلبل کو گل سے اور پروانہ کو شمع سے جو تعلق ہوتا ہے، اسی طرح کا تعلق امیر خسرو کو اپنے مرشد سے تھا۔ حضرت خواجہ کو بھی اس عاشق صادق سے ایسا تعلق تھا کہ فرماتے تھے کہ: "من از ہمہ تنگ آیم واز تو تنگ نیایم"، مجھے بعض اوقات ہر ایک سے وحشت ہونے لگتی ہے لیکن اس حالت میں بھی تم سے نہیں ہوتی مزید برآں ایک بار فرمایا: "از ہمہ کس تنگ آیم تا حدے کہ از خود تنگ آیم واز تو تنگ نیایم" بعض اوقات اپنے سے بھی اکتانے لگتا ہوں مگر تم سے نہیں اکتاتا (سیر الاولیاء ص ۳۰۲) ایک بار ارشاد فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ آپ امیر خسرو کو جس نظر سے دیکھتے ہیں ایک بار وہ نظر مجھ پر ڈال دیجئے، میں نے اس کو تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن میرے دل میں آیا کہ اس سے کہوں کہ وہ قابلیت تو لاؤ (ص ۳۰۲) ۱۲

[2] ؎ بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را — من از شوق حضوری طول دادم داستانے را

باتیں ہوتیں حضرت خواجہؒ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ دو شعر دیکھے ہیں جو بالکل حسب حال ہیں۔ ؎

تنہا منم و شب و چراغی　　مونس مشدہ تا پگاہ روزم
کاہش ز آہ سرد یکشم　　گاہ از تف سینہ برفروزم

کبھی کبھی یہ شعر بھی آپ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا ہے اور حکایتِ حال ہے۔ ؎

بارے بہ تماشائے من و شمع بیا
کز من دمکے نماند و از وے دودے

سحری سحر کا وقت ہوتا تو خادم آتا اور باہر سے دروازہ پر دستک دیتا، حضرت خواجہ دروازہ کھول دیتے سحری جس میں ہر قسم کی چیزیں ہوتیں سامنے رکھتا، آپ اس میں سے بہت کم تناول فرماتے، باقی کیلئے ارشاد ہوتا کہ بچوں کے لئے حفاظت سے رکھ لو۔ خواجہ عبدالرحیم جن کے ذمہ سحر کا لے جانا تھا بیان کرتے ہیں کہ اکثر ہوتا کہ حضرت خواجہ سحری میں سے کچھ نہ کھاتے، میں عرض کرتا کہ حضرت دالا افطار کے وقت بھی بہت کم کھاتے ہیں اگر سحری بھی کچھ نہ کریں گے تو ضعف بہت بڑھ جائیگا، اس پر گریہ فرماتے اور کہتے کہ کتنے غریب اور بیکس مسجدوں کے کونوں اور چبوتروں پر بھوکے پڑے ہوئے ہیں اور فاقہ سے رات گذار دیتے ہیں، یہ کھانا میرے حلق سے کیسے اتر سکتا ہے چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ سحری میں جیسی لاتا ویسی ہی اٹھا کر لے جاتا۔

صبح کے وقت جب دن ہوتا جس کی جمال مبارک پر نظر پڑتی دیکھتا کہ کھلی ہوئی مستی ہے اور آنکھیں بیداری سے سرخ ہیں، ایسے شدید مجاہدوں سے بھی آپ کے اندر کوئی ضعف نظر نہ آتا اور آپ کی کسی ہیئت میں جو آپ کی معمول تھی تغیر نہ ہوتا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ آپ چار سو یا پانچ سو رکعت نماز پڑھتے ہیں یا اتنی تسبیح کا معمول ہے۔ مگر عزیزان باطنی مشغولیتوں میں گذرتی جن کا حال اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اور دلجوئی اور قلوب کے تفقد و دریافت میں مشغول رہتے، جس سے افضل کوئی کام نہیں۔ ع

"دل بدست آور کہ حج اکبر است"

دن میں دن میں تمام روز اپنے مشائخ کے سجادہ پر قبلہ رو باطنی طور پر مشغول، مُتَوَجِّهًا اِلَی اللہ تعالیٰ کَاَنَّہٗ یَنْظُرُ اِلَیْہِ (اللہ کی طرف متوجہ ہو کر گویا وہ روبرو دیکھ رہے) بیٹھ کر گذار دیتے۔ آنے والوں میں مختلف طبقوں کے لوگ ہوتے، علماء و مشائخ، صدور و اکابر، وضیع و شریف ہر ایک کے علم و مرتبہ کے مطابق جس کا جو فن ہوتا اسی میں اس سے گفتگو کرتے اور اس کی دلجوئی فرماتے ظاہری طور پر ان میں مشغول ہوتے اور باطن میں پورے طور پر مشغول بحق ہوتے[1]

دلداری و تربیت نماز ظہر کا وقت ہوتا، نماز ادا کرنے کے بعد جو عزیز قدمبوسی کے لئے آئے ہوئے ہوتے ان کو طلب فرمایا جاتا اور ان سے گفتگو و دلداری میں کچھ وقت گذرتا عبادات و سلوک و محبت الٰہی کے بارے میں ان کی رہنمائی کی جاتی، اکابر علماء و صلحاء کی (جو اس مجلس میں حاضر ہوتے) ہمت نہ ہوتی کہ سر اٹھا کر چہرۂ مبارک کو دیکھتے، ایسا رعب اور من جانب اللہ عظمت تھی کہ آپ کے چہرے پر نظر کرنا مشکل تھا۔

قربِ سفر عمر مبارک جب اسی ۸۰ سے متجاوز ہوئی تو سفر آخرت کے آثار نمایاں ہوئے ایک روز ارشاد فرمایا کہ:۔ میں نے خواب میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ ارشاد ہوا:۔ نظام ہم کو تمہارا بڑا اشتیاق ہے[2]۔

خلفائے کبار کو اجازت نامے اور ان کی محبت و مواخات بیماری کے دوران میں آپ نے متعدد حضرات کو خلافت عطا فرمائی اور اجازت نامے لکھ کر دیئے۔ مولانا فخر الدین زرادی نے

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۲۵ و ص ۱۲۹ [2] ایضاً ص ۱۴۱

ان کا مضمون مرتب کیا، اور سید حسین کرمانی نے ان کی کتابت کی، آپ نے ان پر اپنے دستخط مبارک ثبت کئے، دستخط کے الفاظ یہ تھے :۔ "من الفقیر محمد بن احمد بن علی البداؤنی البخاری" ان اجازت ناموں پر ۲۰ ذی الحجہ ۷۲۴ھ درج ہے، گویا یہ وفات سے تین مہینے ۲۷ دن پہلے لکھے گئے ہیں[1]۔

جن حضرات کیلئے یہ اجازت نامے تھے ان کو جہاں جہاں وہ تھے پہنچا دیئے گئے، جو حضرات موجود تھے ان کو بلا کر خود عطا کئے گئے۔ پہلے شیخ قطب الدین منور کی طلبی ہوئی، سلطان المشائخ نے خلعت خلافت عطا فرمایا اور وصیت فرمائی، اجازت نامہ ان کو مرحمت ہوا اور ارشاد ہوا کہ جاؤ دوگانہ ادا کرو۔ دوستوں نے مبارکباد دی، اسی دوران میں شیخ نصیر الدین محمود (چراغ دہلی) کو یاد فرمایا گیا، ان کو بھی خرقہ خلافت اور اجازت نامہ عطا ہوا اور وصیت فرمائی گئی۔ شیخ نصیر الدین محمود ابھی کھڑے ہوئے تھے کہ شیخ قطب الدین منور کی دوبارہ طلبی ہوئی، وہ آئے تو ارشاد ہوا کہ شیخ نصیر الدین محمود کو خلافت کی مبارکباد دو، پھر شیخ نصیر الدین سے ارشاد ہوا کہ شیخ منور کو مبارکباد دو، دونوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی، پھر دونوں کو ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کا حکم ہوا، پھر فرمایا کہ تم دونوں بھائی بھائی ہو، تقدیم و تاخیر کا کچھ خیال نہ کرنا[2]۔

وفات کا حال

وفات سے ۴۰ روز پیشتر استغراق و تحیر کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ امیر خورد نے تفصیل سے وفات کا حال لکھا ہے، ان کا بیان ہے :۔

"جمعہ کا دن تھا، سلطان المشائخ پر ایک کیفیت تھی، نور تجلی سے ان کا باطن منور معلوم ہو رہا تھا، نماز کے اندر بار بار سجدے فرماتے تھے۔ اسی حالت تحیر میں مکان تشریف لائے، گریہ میں ترقی ہو گئی۔

---

[1] حضرت خواجہؒ کی وفات ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو ہوئی

[2] سیر الاولیاء، ص ۲۳۰ و ص ۲۳۱ و ص ۲۳۲ و ص ۲۴۸ و ص ۲۴۹

روزانہ کئی کئی بار غیبوبت و استغراق ہو جاتا تھا، پھر توجہ ہو جاتی تھی، یہی فرماتے تھے کہ آج جمعہ کا دن ہے، دوست کو دوست کا وعدہ یاد آتا ہے اور وہ اس کیفیت میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں دریافت فرماتے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے اور میں نماز پڑھ چکا ہوں؟ اگر جواب دیا جاتا کہ آپ نماز پڑھ چکے ہیں تو فرماتے کہ پھر پڑھ لیں، ہر نماز کو مکرر ادا کرتے جتنے دن اس عالم میں رہے یہ دو باتیں مکرر فرماتے:۔ آج جمعہ کا دن ہے؟ ہم نماز پڑھ چکے ہیں؟ اور کبھی یہ مصرع پڑھتے۔

ع "می رویم و می رویم و می رویم"

اسی دوران میں ایک روز تمام خدام و مریدین کو جو حاضر تھے طلب فرمایا اور ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ:۔ "تم گواہ رہنا کہ اگر اقبال (خادم) نے کوئی چیز بھی گھر میں جنس میں بچالی ہے تو کل روز قیامت اسکو خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔" اقبال (خادم) نے عرض کیا کہ میں نے کچھ نہیں چھوڑا ہے، سب آپ پر صدقہ کر دیا ہے واقعی اس جوانمرد نے ایسا ہی کیا تھا، سوائے اس غلّہ کے جو چند دن کے لئے فقرائے خانقاہ کو کفایت کرتا سب کچھ تقسیم کر دیا تھا میرے چچا سید حسین نے اطلاع دی کہ غلّہ کے سوا ہر چیز محتاجوں کو پہنچ گئی سلطان المشائخ اقبال سے ناراض ہوئے انکو طلب کیا اور فرمایا کہ اس مُردار یت کو کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ اقبال نے عرض کیا کہ غلّہ کے سوا جو کچھ موجود تھا سب کچھ تقسیم ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ خلقت کو بلاؤ۔ جب لوگ حاضر ہوئے تو فرمایا کہ غلّہ کے انبار خانے توڑ ڈالو اور تمام غلّہ بے تکلف اٹھا لے جاؤ اور وہاں جھاڑو دے دو۔ ذرا سی دیر میں خلقت جمع ہو گئی اور اسنے غلّہ کو لوٹ لیا۔

اس بیماری میں کچھ احباب اور خدمتگار حاضر ہوئے اور انھوں نے پوچھا کہ:۔ آں مخدوم کے بعد ہم مسکینوں کا کیا حال ہوگا؟ فرمایا کہ: یہاں اتنا ملتا رہے گا جس سے تمہارا گذر ہو جائے۔ میں نے بعض معتبر مشائخ سے سنا ہے کہ لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے درمیان کون نصیب ور ہوگا؟[1] فرمایا: جس کی قسمت یاوری کریگی۔ بعض دوستوں اور خادموں نے میرے نانا شمس الدین وامغانی سے عرض کیا کہ وہ سلطان المشائخ سے پوچھیں کہ ہر شخص نے اپنے

---

[1] غالباً جانشینی و خلافت کے متعلق سوال تھا۔ ۱۲

اعتقاد کے مطابق آپ کے احاطہ میں بلند بلند عمارتیں بنالی ہیں اور سب کی نیت یہ ہے کہ آپ اُس کی عمارت میں آرام فرمائیں، اگر وہ ناگزیر وقت آگیا تو آپ کو کس عمارت میں دفن کریں تاکہ کوئی خود رائی سے کام نہ کرے۔ مولانا شمس الدین نے یہ پیغام پہنچایا تو ارشاد ہوا کہ:۔ میں کسی عمارت کے نیچے دفن ہونا نہیں چاہتا، میں جنگل میں آسودہ خاک ہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ کو باہر میدان میں دفن کیا گیا، بعد میں سلطان محمد تغلق نے اس پر گنبد تعمیر کرایا۔

وفات سے ۴۰ روز پہلے سے غذا بالکل ترک فرمادی تھی، کھانے کی خوشبو بھی گوارا نہ تھی، گریہ اس شدت سے غالب تھا کہ ایک گھڑی کیلئے بھی آنسو نہیں تھمتے تھے۔ ؎

گر نہ بینی گریۂ زارم ندانی فرق کرد
کاب چشم است آنکہ بیشت می رود دریا آب مجو

اسی درمیان میں اخی مبارک ایک روز مچھلی کا شوربہ لائے۔ مخلصین نے بڑی کوشش کی کہ آپ تھوڑا سا تناول فرمالیں۔ سلطان المشائخ نے پوچھا کہ:۔ یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ:۔ تھوڑا سا مچھلی کا شوربہ ہے۔ فرمایا:۔ بہتے ہوئے پانی میں ڈال دو۔" آپ نے کچھ تناول نہیں فرمایا۔ میرے چچا سید حسین نے عرض کیا کہ کئی دن ہو گئے ہیں کہ آں مخدوم نے کھانا ۔۔۔۔ بالکل چھوڑ دیا ہے اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ فرمایا:۔ سید جو حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا مشتاق ہو اس سے دنیا میں کھانا کیسے کھایا جائے!۔ الغرض، ۴۰ روز کی مدت میں جس طرح کھانا تناول نہیں فرمایا۔ اسی طرح بات بھی بہت کم کی۔ آخر چہار شنبہ کے دن تک جس دن آپ کی وفات ہوئی یہی حال رہا۔

۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو طلوع آفتاب کے بعد زہد و عبادت، حقیقت و معرفت اور ہدایت و ارشاد کا یہ آفتاب غروب ہو گیا

اے یعنی مدفون ہوں۔ ۱۲

نماز جنازہ شیخ الاسلام رکن الدین نبیرۂ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی نے پڑھائی نماز کے بعد شیخ الاسلام رکن الدین نے فرمایا کہ:۔

"مجھے اب معلوم ہوا کہ مجھے ۴۰ سال تک دہلی میں اسلئے رکھا گیا کہ مجھے اس نماز جنازہ کی امامت کا شرف حاصل ہو۔"[1]

ساری عمر تجرّد میں گذری اسلئے کوئی اولاد نہیں تھی، روحانی سلسلہ سارے ہندوستان میں پھیلا، اور ابھی تک جاری ہے۔

---

[1] سیر الاولیاء (ص۱۵۲) تا (ص۱۵۵)

باب سوم

اخلاق وصفات

جامع اوصاف حضرت خواجہ نظام الدین کے اوصاف وخصوصیات کا خلاصہ اور ان کا صحیح ترین وجامع ترین تعارف ان الفاظ میں ہے جو عطائے خلافت کے وقت ان کے صاحب نظر شیخ ومرشد (شیخ کبیر حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ) کی زبان سے نکلے۔ انھوں نے فرمایا:۔

باری تعالیٰ ترا علم وعقل وعشق دادہ است	اللہ تعالیٰ نے تم کو علم وعقل وعشق کی دولت عطا
وہر کہ بدیں صفت موصوف باشد ازو	کی ہے اور جو ان صفات کا جامع ہو وہ
خلافت مشائخ نیکو آید۔[1]	مشائخ کی خلافت کی ذمہ داریاں خوب ادا کر سکتا ہے

حضرت خواجہؒ کی سیرت اسی جامعیت کا مرقع ہے، یہاں علم وعقل وعشق تینوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ محبت ومعرفت حقیقی اور مشائخ کبار کی تربیت وصحبت جو بہترین اثرات ونتائج پیدا کرتی ہے اور جن کے بہترین مجموعہ کا نام دور آخر میں "تصوف" پڑ گیا ہے، یعنی اخلاص واخلاق اسکی بہترین بحثیں انکی زندگی میں نظر آتی ہیں

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۲۴۵)

اخلاص ان کی زندگی کا بہترین جوہر جس نے ان کو اپنے معاصرین ہی میں نہیں بلکہ مشائخ اسلام میں ایک بلند مقام اور اپنے زمانہ ہی میں نہیں بلکہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں قبول عام اور بقائے دوام عطا کیا ہے اور ان کو محبوبیت کے خاص انعام سے نوازا، وہ توحید و اخلاص کی وہ خاص کیفیت اور ذوق ہے جس میں محبت و رضائے الٰہی کے سوا کوئی چیز مطلوب و مقصود نہیں رہی، محبت و یقین کے شعلہ نے ہر طرح کے خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیا تھا، حُبِّ دنیا، حبِّ جاہ اور اس طرح کی تمام محبتوں اور طلبوں کا استیصالِ کلی ہو چکا تھا ؎

شاد باش اے عشق خود سودائے ما ؛ اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما ؛ اے تو افلاطون و جالینوسِ ما
عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت ؛ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ؛ شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت

امیر حسن علا سجزی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ مسجد میں قیام کرتے ہیں اور وہاں قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل پڑھتے ہیں میں نے عرض کیا کہ اگر اپنے گھر ہی رات کو قیام کریں تو کیسا ہے؟ فرمایا: آدمی اپنے گھر میں ایک پارہ پڑھے وہ مسجد میں ایک قرآن ختم کرنے سے بہتر ہے، اس پر یہ ذکر آ گیا کہ گذشتہ زمانے میں ایک صاحب جامع مسجد دمشق میں رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے، اس لالچ میں کہ اس کی عام شہرت ہو گی اور شیخ الاسلامی کے عہدے پر جو اس زمانہ میں خالی تھا) ان کا تقرر ہو جائے گا، یہ سنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا:۔

بسوزد اول شیخ الاسلامی[1] و پس خانقاہ را ؛ آگ لگاؤ ایسی شیخ الاسلامی کو پھر خانقاہ کو

---

[1] مولانا رومؒ

ولبعد ازاں خود را[1]۔ پھر اپنے کو خاک کر کے رکھ دو

حضرت خواجہؒ کی ساری زندگی اسی "دل سوختگی" اور "خود باختگی" کا نمونہ ہے اور اسی چیز نے ان کی صحبت میں کیمیا اور اکسیر کی خاصیت پیدا کر دی تھی۔ انھیں کے سلسلہ کے ایک سوختہ دل شیخ[2] (جو نویں صدی میں نظامی سلسلہ کے مقتدیٰ تھے) یہ دو شعر منقول ہیں جو اس صورتِ حال اور جذبہ کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں

مارا نہ مرید و رُد خواں می باید — نے زاہد نے حافظِ قرآں می باید
صاحب دردے سوختہ جاں می باید — آتش زدہ بہ خاکساں می باید

اپنے ہی بارے میں نہیں، اپنے خلفاء اور جانشینوں کے بارے میں بھی (جن سے تہذیب، اخلاق اور تزکیۂ نفس کا کام لینا تھا) اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ وہ اخلاص کے اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ حُبِّ جاہ کا ان کے دل سے خاتمہ ہو چکا ہے۔ مولانا فصیح الدین نے سوال کیا کہ مشائخ کی خلافت کا اہل کون ہوتا ہے؟ فرمایا:۔

"کسے را کہ در خاطر او توقع خلافت نباشد"[3] وہ شخص جو خلافت کا متوقع اور منتظر بھی نہ ہو۔

صاحب سیر الاولیاء کا بیان ہے، کہ ایک مرتبہ آپ کو اپنے ایک ممتاز خادم کے متعلق جن کو اجازت دی جا چکی تھی معلوم ہوا کہ وہ کئی کمبل تہہ کر کے بچھا کر اس پر مشائخ کی طرح بیٹھتے ہیں اور امراء و عوام و خواص ان کی خدمت میں معتقدانہ حاضر ہوتے ہیں، آپ اس سے اتنے آزردہ ہوئے کہ جب وہ آئے تو آپ نے

---

[1] فوائد الفواد (ص ۲۴)

[2] حضرت شاہ محمد بنیا (محمد بن قطب) لکھنویؒ (م ۸۷۴ھ)

[3] سیر الاولیاء (ص ۳۴۵)

ان سے منھ پھیر لیا اور ان کو اجانت سے محروم کر دیا، عرصہ تک ان سے ایسی ہی بے رُخی رہی جبتک کہ ان کا عذر ظاہر نہیں ہوا اور انھوں نے معافی نہیں مانگی، ان پر نظر عنایت مبذول نہیں ہوئی[1]۔

دشمن نوازی

اخلاص و فنائیت اور بے نفسی کے اس مقام پر پہنچ کر سالک کے دل سے رنج و شکایت انتقام کا جذبہ اور ایذا کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے، وہ نہ صرف آشنا پر درد دوست نواز ہوتا ہے بلکہ دشمن کا احسانمند اور دشمن کے حق میں دعاگو بن جاتا ہے، گویا دشمنی کوئی احسان ہے کوئی نادر تحفہ اور زخم دل کا مرہم ہے جس پر بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے اور منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ امیر علاء سنجری راوی ہیں کہ حضرت نے ایک مرتبہ یہ مصرع پڑھا۔ ع

ہر کہ ما را رنج داده راحتش بسیار باد"

(جو ہم کو رنج دے خدا اس کو بہت راحت پہنچائے)

اسکے بعد یہ شعر ارشاد ہوا ——

ہر کہ او خارے نہد در راہِ ما از دشمنی
ہر گلِ کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

سیر العارفین میں ہے کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی فرماتے تھے کہ حصار اندرپت میں (جو موضع غیاث پور کے قریب ہے) جھجّو نامی ایک شخص تھا جس کو بے وجہ حضرت سے دشمنی تھی، برا بھلا بھی کہتا رہتا تھا اور آپ کو تکلیف و ایذا پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا، اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخؒ نے اسکے جنازے میں شرکت کی، دفن کے بعد اس کی بالیں پر دو رکعت نماز پڑھی اور دعا فرمائی کہ خدایا! اس شخص نے

---

[1] سیر الاولیاء میں اس واقعہ کی تفصیل ہے۔ ۱۲ [2] فوائد الفواد ص۸۶ (ترجمہ) جو ہمارے راستہ میں کانٹے بچھائے اللہ کرے اسکے گلشنِ حیات میں جو پھول کھلے بے خار رہے۔ ۱۲

جو کچھ کہا ہو یا برا سوچا ہو میں نے اس کو بخش دیا تو میری وجہ سے اس کو سزا نہ دینا۔[1]

ایک مرتبہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے ذکر کیا کہ بعض آدمی جناب والا کو منبر پر اور دوسرے موقعوں پر برا بھلا کہتے ہیں ہم سے سنا نہیں جاتا۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ میں نے سب کو معاف کیا تم بھی معاف کرو اور ایسے آدمی سے جھگڑا نہ کرو۔ اسکے بعد آپنے فرمایا کہ اگر دو آدمیوں کے درمیان رنجش ہو تو اس رنجش کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باطن کو عداوت سے خالی کرے، دوسرے کی طرف سے بھی آزار کم ہو جائے گا۔ فرمایا کہ: "آخر لوگ برا بھلا کہنے سے کیوں رنجیدہ ہوتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ مال صوفی سبیل است و خون او مباح"۔ (صوفی کا مال وقف ہے اور اس کا خون روا) جب معاملہ یہ ہے تو کسی برا بھلا کہنے والے سے کیوں جھگڑا کیا جائے؟[2]

ایک دن فرمایا کہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ نیکوں کے ساتھ نیکی اور بدوں کے ساتھ بدی کی جائے، لیکن مردانِ خدا کا اصول یہ ہے کہ بدی کا بدلہ بھی نیکی سے دیا جائے۔ فرمایا:۔

یکے خار بہند و تو ہم خار بہ ہی ایں خار خار	اگر کوئی کانٹا رکھے اور تم بھی کانٹا رکھ دو
باشد ..... میانِ مردمان ہمچنین	تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائینگے لوگوں کے
الست بالنغزاں نغزی و با کوزان کوزی	درمیان عام اصول یہی ہے کہ سیدھوں کے ساتھ
امامیان درویشان ہمچنین است کہ	سیدھا اور ٹیڑھوں کیساتھ ٹیڑھا لیکن
بالنغزاں نغزی با کوزاں ہم نغزی[3]	درویشوں کا اصول یہ ہے کہ سیدھوں کیساتھ
	سیدھا اور ٹیڑھوں کیساتھ بھی سیدھا۔

حضرت خواجہ کا اس بارے میں معیار اتنا بلند تھا کہ برا کہنا تو بڑی چیز ہے وہ برا چاہنے کو بھی روا نہیں رکھتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا:۔

---

[1] سیر العارفین (قلمی) [2] فوائد الفواد ص ۹۵ [3] ایضاً ص ۸۷

بدگفتن اندک است اما بدخواستن — برا کہنا بھی برا ہے لیکن بُرا چاہنا

ازاں بدتر است[1]۔ — اس سے کہیں بُرا ہے۔

جب یہ معاملہ آپ کا سب کے ساتھ تھا تو اپنے شیخ کے عزیزوں اور تعلق والوں کے ساتھ کیوں نہ ہوتا جن کے احسان سے آپ کا رواں رواں تر تھا۔

سیر العارفین میں ہے کہ حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے نواسے خواجہ عطاء اللہ ایک لاابالی و بیباک آدمی تھے۔ ایک دن قلم دوات لیکر آئے اور کہا کہ میرے لئے فلاں سردار کو ایک خط لکھ دیجئے تاکہ مجھے وہ کوئی اچھی رقم دیدے۔ شیخ نے فرمایا کہ: نہ میری اس سردار سے کبھی ملاقات ہوئی ہے نہ وہ کبھی یہاں آیا ہے، جس شخص سے جان پہچان نہ ہو اسکو رقعہ کس طرح لکھا جائے؛ صاحبزادے کو غصہ آگیا اور انھوں نے سخت سست کہنا شروع کیا کہ ہمارے ہی نانا کے مرید ہوا اور ہمارے ہی خاندان کا صدقہ پایا ہے، اب ایسے احسان فراموش ہو گئے ہو کہ میرے لئے ایک رقعہ تم سے نہیں لکھا جاتا، یہ تم نے کیا پیری مریدی کا جال بچھایا ہے اور خلق خدا کو دھوکہ دے رہے ہو؛ یہ کہکر دوات زمین پر پٹک دی اور اٹھکر چلے، حضرتؒ نے دامن پکڑ لیا اور فرمایا کہ ناراض ہو کر کیوں جا رہے ہو، خوش ہو کر جاؤ۔ اسکے بعد ایک رقم سامنے رکھی اور رضامند کر کے رخصت کیا[2]۔

پردہ پوشی و نکتہ نوازی

سیر الاولیاء میں ہے کہ اکثر معمول تھا کہ جو لوگ باہر سے آتے وہ کوئی شیرینی یا تحفہ خرید کر اپنے ساتھ لاتے اور پیش کرتے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ اسی ارادہ سے آرہے تھے، ایک مولوی صاحب بھی ساتھ تھے، انھوں نے سوچا کہ لوگ مختلف تحائف پیش کرینگے اور وہ اکٹھا حضرت کے سامنے رکھیں گے، خادم سب کو اٹھا کر لے جائے گا، کیا پتہ چلے گا کہ کون لایا؟ انھوں نے تھوڑی سی مٹی راستہ سے اٹھا کر کاغذ میں باندھ لی، جب سلطان المشائخؒ کی خدمت

---

[1] سیر الاولیاء صفحہ ۵۵ [2] سیر العارفین (قلمی)

میں حاضر ہوئے ہر ایک نے اپنی چیز سامنے رکھی، مولوی صاحب نے بھی اپنی پڑیا سامنے رکھدی، خادم وہ سب چیزیں اٹھا کر لے جانے لگا، پڑیا کو بھی اٹھانا چاہا۔ حضرتؒ نے فرمایا "اس کو یہیں چھوڑ دو، یہ میری آنکھ کا سرمہ ہے"۔ یہ اخلاق و عالی ظرفی دیکھ کر ان عالم صاحب نے توبہ کی اور مرید ہوئے[1]۔

شفقت و تعلق

اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہؒ کو عام انسانوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں اور اپنے اہل تعلق کے ساتھ ایسی شفقت و محبت عطا فرمائی تھی جس کو اگر ماں کی شفقت سے تشبیہ یا اس پر بھی ترجیح دی جائے تو واقعات کے لحاظ سے اس میں کوئی مبالغہ اور شاعری نہ ہوگی۔ شیوخ کاملین کی یہ شفقت دراصل نبیؐ کی اس شفقت کی وراثت اور نیابت ہے جس کی حقیقت اس آیت میں بیان کی گئی ہے:-

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	اے لوگو! تمہارے پاس ایسا پیغمبر آیا جو تمہاری
عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ	جنس سے ہے جس کو تمہاری تکلیف و مضرت کی بات
بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝	گراں گذرتی ہے جو تمہاری منفعت کا بڑا خواہشمند ہے،
(التوبہ ع ۱۶)	ایمانداروں کے ساتھ بڑا ہی شفیق و مہربان ہے۔

اور اس حکم کی تعمیل ہے جس کا خطاب رسولؐ سے ہے:-

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ	ان لوگوں کے ساتھ فروتنی کے ساتھ پیش آؤ جو
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (شعراء ع ۱۱)	مسلمانوں میں داخل ہو کر تمہاری راہ پر چلیں۔

اس شفقت اور تعلق نے وہ "اتحاد" پیدا کر دیا تھا کہ دوسروں کی جسمانی اذیت سے اپنے کو جسمانی طور پر اذیت اور دوسروں کی قلبی راحت سے اپنے کو قلبی راحت ملتی تھی۔ امیر حسن علاء سنجری راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس میں دھوپ تھی، سایہ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے، آپ نے سایہ میں بیٹھنے والوں سے فرمایا:-

---

[1] سیر الاولیاء، صـ۱۴۲

"بھائی ذرا مل کر بیٹھو تاکہ ان بھائیوں کیلئے بھی جگہ ہوجائے، دھوپ میں یہ بیٹھے ہیں اور میں جلا جارہا ہوں۔"[1]

ایک مرتبہ آپ نے کسی بزرگ کا مقولہ نقل کیا جو درحقیقت اپنے ہی حال کی ترجمانی تھی کہ "خدا کی مخلوق میرے سامنے کھانا کھاتی ہے اور میں اس کھانے کو اپنے حلق میں پاتا ہوں، جیسے وہ کھانا میں ہی کھا رہا ہوں۔"[2]

امیر حسن علاء سنجری فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ بے وقت حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اس طرف عزیزوں سے ملنے آیا ہوا تھا، حاضری کو جی چاہا۔ بعض دوستوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص کسی اور کام سے آیا ہو اور شروع سے حاضری کی نیت نہ کی ہو تو شیخ کی خدمت میں نہیں حاضر ہونا چاہیئے۔ میں نے دل میں کہا کہ اگرچہ قاعدہ یہی ہے لیکن دل نہیں مانتا کہ یہاں آکر حضرتؒ کی زیارت کے بغیر واپس چلا جاؤں، میں آج قاعدہ کے خلاف ہی کروں گا۔ حضرتؒ نے فرمایا "اچھا کیا"، پھر یہ شعر پڑھا۔ ؎

در کوئے خرابات دسرائے او باش

معنے بنود ببیا و بنشیں و بہ باش

پھر فرمایا کہ مشائخ کا معمول یہی ہے کہ کوئی انکے پاس اشراق سے پہلے اور عصر کی نماز کے بعد نہیں جاتا، لیکن میرے یہاں یہ قاعدہ نہیں جس وقت جس کا جی چاہے آئے۔"[3]

غمخواریٔ عام

یہ اہل قلوب غم دنیا سے فارغ البال لیکن دنیا والوں کے غم اور خلقِ خدا کی فکروں سے نڈھال اور خستہ حال رہتے ہیں، وہ اپنا غم بھلا دیتے ہیں اور ساری دنیا کا غم اپنا غم بنا لیتے ہیں۔ یہ کہنے کا حق درحقیقت انھیں کو ہے کہ۔ ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے نواسے خواجہ شرف الدین سے کسی مجلس میں کسی صوفی نے کہا کہ خواجہ نظام الدینؒ

---

[1] فوائد الفواد ص۹۱ [2] سیر الاولیاء ص۷۷ [3] فوائد الفواد (ج۱) ص۹۸

عجب فارغ البال بزرگ ہیں، مجرد ہیں، اہل، عیال واطفال کا کوئی تردد ان کو نہیں ہے ان کو ایسا فراغِ خاطر حاصل ہے کہ ایک ذرۂ غم بھی ان کو چھو نہیں گیا ہے۔ وہ عزیز اس مجلس سے اٹھے تو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے چاہتے تھے کہ خود اس کا ذکر کریں۔ حضرت خواجہؒ نے خود ہی ارشاد فرمایا:۔

"میاں شرف الدین وہ رنج و غم جو میرے دل کو وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے شاید ہی کسی دوسرے شخص کو اُس سے زیادہ ہوتا ہو، جو شخص میرے پاس آتا ہے اپنا حال مجھ سے بیان کرتا ہے اُس سے دوچند فکر و تردد اور غم و الم مجھے ہوتا ہے، بڑا سنگدل ہے وہ جس پر اپنے دینی بھائی کا غم اثر نہ کرے، اسکے علاوہ یہ جو کہا گیا ہے:۔

"المخلصون علی خطر عظیم" (مخلصین کو بڑا خطرہ درپیش رہتا ہے)

اس سے بھی سمجھ سکتے ہو کہ۔ ع

نزدیکاں را بیش بود حیرانی[1]

حضرت خواجہؒ کے نزدیک مسلمان کا دل خوش کرنا اور اس کی دلجوئی و راحت رسانی افضل ترین عمل اور تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ تھا۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ فرمایا:۔

"مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی اس میں لکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچاؤ کہ مومن کا دل اسرارِ ربوبیت کا مقام ہے"۔ کسی بزرگ نے خوب کہا ہے۔ ؎

می کوش کہ راحت بجانے برسد یا دست شکستہ بنانے برسد

(کوشش کر دکہ کسی انسانی جان کو تم سے آرام پہنچے، یا جو دست شکستہ ہے اسکو تمھارے ذریعہ روٹی ملے)

---

[1] سیر العارفین (قلمی)

ایک مرتبہ فرمایا، کہ:۔

"قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور چلن نہ ہوگا
جتنا دل کا خیال رکھنے اور دل خوش کرنے کا"[1]

چھوٹوں پر شفقت حضرت خواجہؒ اپنے قیمتی مشاغل اور اعلیٰ کیفیاتِ باطنی کے ساتھ بچّوں اور چھوٹوں پر بڑے شفیق تھے، اور وہ اپنی شدید مصروفیات کے باوجود اُن کی دلجوئی و ملاطفت کے لئے وقت نکال لیتے تھے، ان عظیم ذمہ داریوں اور باطنی مشغولیت کے باوجود ان بچوں کی پوری رعایت فرماتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتے۔

خواجہ رفیع الدین ہارون آپ کے حقیقی بھانجے کے صاحبزادے تھے، اگر کبھی کھانے کے وقت وہ موجود نہ ہوتے، تو اگرچہ بڑے بڑے بزرگ دسترخوان پر بیٹھے ہوتے، لیکن آپ ان صاحبزادے کا انتظار کرتے۔ آپ اپنے بچے کی طرح خلوت و جلوت میں ان کی تربیت و دلداری فرماتے[2]۔

خواجہ رفیع الدین کو تیر و کمان اور پیراکی و کشتی کا بڑا شوق تھا، حضرت سلطان المشائخ بڑی شفقت کے ساتھ ان سے انھیں فنوں کی باتیں کرتے تھے، ان کی ہمت افزائی اور تشویق فرماتے، ان فنوں کی باریکیوں اور نکتوں کی تعلیم دیتے، تاکہ یہ خوش ہوں[3]۔

جو شریف النسب اور ذی استعداد نوجوان اپنے زمانہ کے شوقین لوگوں کے جیسا لباس پہنتے اور ان میں نوجوانی کے تقاضے سے لباس میں تجمل پیدا ہوتا (جس کو بعض سخت گیر ثقاہت و متانت کے خلاف سمجھ کر اعراض کرتے ہیں) حضرت خواجہؒ ان کی بھی دلجوئی فرماتے، اور اس کو جوانی اور زمانہ کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز فرماتے اور اپنے اخلاق و محبت سے ان کی اصلاح و تربیت کی کوشش فرماتے۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۲۸ [2] ایضاً ص ۲۰۳ [3] ایضاً ص ۲۰۳

سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد لکھتے ہیں کہ میرے چچا سید حسین کرمانی کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ وہ اس زمانہ کے شوقین نوجوانوں کے لباس اور وضع میں ایک روز تشریف لائے۔ حضرت خواجہؒ نے ان کو دیکھ کر فرمایا:۔

سید بیا و بنشیں و سعادت ببر[1] | سید آؤ، بیٹھو اور سعادت میں حصہ لو۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس شفقت و ملاطفت اور اس دلجوئی و دلنوازی سے کتنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت ہوئی ہوگی اور کتنے "آہوئے وحشی" اسیر دامِ محبت ہوئے ہوں گے اور ان کا شمار خدا کے مقبول بندوں اور شیوخ کاملین میں ہوا ہوگا۔

حضرت خواجہؒ کے ان اخلاق و صفات اور صوفیہ صافیہ کی سیرت کو دیکھ کر امام غزالی کی اس رائے اور شہادت کی تصدیق ہوتی ہے جس کا انھوں نے "تلاش حق" کے طویل سفر اور مختلف گروہوں اور انسانی طبقات کے عمیق مطالعہ کے بعد اظہار کیا ہے:۔

"مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صوفیہ ہی اللہ کے راستہ کے سالک ہیں، انکی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، علماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی اُن کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، انکے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کیجائے۔"[2]

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۰۳ [2] المنقذ من الضلال

باب چہارم

اذواق وکیفیات

محبّت و ذوق حضرت خواجہ کی سیرت اور زندگی کا مرکزی نقطہ جو ان کے تمام اخلاق واحوال واعمال کا محور ہے وہ عشق الٰہی کی نعمت خداداد ہے جو ان میں ابتدائے حال سے نمایاں تھی، محبت کی یہ چنگاری جو ازل سے ان کی فطرت میں ودیعت تھی شیخ کبیر کی صحبت اور طریقۂ چشتیہ کی نسبت سے شعلۂ جاں سوز بن گئی اور اسنے مدت العمر ان کو اور نصف صدی سے زائد دہلی اور اسکے ماحول کو گرم اور منور رکھا اور اس کی وجہ سے صدیوں تک ہندوستان کی فضا عشق الٰہی کی حرارت سے گرم اور گداز رہی ان کے تمام حالات واشغال گفتگو اور مجالس، اشعار اور انکے انتخاب، واقعات اور ان کی تمثیل، غرض ہر چیز سے اسی سوزِ باطن اور اسی حرارتِ عشق کا اظہار ہوتا ہے ؎

شعلہا آخر ز ہر موئیم دمید
از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک بار اولیاء اللہ کے دمِ واپسیں کے واقعات بیان ہو رہے تھے حاضرین میں سے ایک نے ایک بزرگ کی حکایت بیان کی کہ ان کا انتقال ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ اللہ کا نام

ان کی زبان پر جاری تھا، حضرت خواجہؒ آبدیدہ ہو گئے اور یہ رباعی پڑھی۔ ؎

آیم بسر کوئے تو پویاں پویاں　　رخسارہ بآبِ دیدہ شویاں شویاں
بیچارہ زد وصل تو جویاں جویاں　　جاں می دہم و نام تو گویاں گویاں[1]

(ترجمہ) آپ کی گلی میں چلا آ رہا ہوں خراماں خراماں، آنسوؤں سے اپنے رخسار کو دھوتا ہوں، آپ کے وصل کا جویا اور طالب بن کر جان دے رہا ہوں، آپکا نام بھی لئے جا رہا ہوں)

اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ دل میں محبوب کے سوا کسی کے خیال کی جگہ نہیں رہی تھی، کسی دوسری طرف توجہ بھی دل پر بار تھی

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

امیر حسن علاء سنجری راوی ہیں کہ ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر کبھی اتفاق سے میں ان کتابوں کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں جو میں نے پڑھی ہیں تو طبیعت میں وحشت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنے دل میں کہتا ہوں کہ کہاں پڑ گیا، اس پر حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر کا واقعہ بیان کیا کہ وہ کمال حال پہ پہنچ گئے تو وہ کتابیں جو وہ پڑھ چکے تھے اوان کو کونے میں رکھ دیا تھا۔ ان کو سامنے رکھ کر ایک روز مطالعہ کرنے لگے۔ غیبی آواز آئی اے ابوسعید ہمارا عہد نامہ واپس کر دے کہ اب تو دوسری چیز میں مشغول ہو گیا، خواجہ جب اس مقام پر پہنچے تو رو پڑے اور یہ شعر پڑھا ؎

تو سایۂ دشمنے کجا در گنجی　　جائے کہ خیال دوست زحمت باشد[2]

(ترجمہ) کسی دشمن کا سایہ بھی کہاں سما سکتا ہے، جہاں دوست کا خیال بھی حجاب بنے)

اسی "سرورِ عشق" کا نتیجہ یہ تھا کہ شب کی خلوت اور رات کے راز و نیاز کے بعد جب دن میں تشریف لاتے تو بقول امیر خورد معلوم ہوتا کہ شراب چھلک رہی ہے، رات کی بیداری سے آنکھیں سُرخ ہوتیں۔ امیر خسرو

---

[1] فوائد الفواد ص۸۰　　[2] فوائد الفواد ص۹

نے یہی دیکھ کر کہا ہے:۔ ؎

تو شبانہ می نمائی بہ سرے کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد[1]

اور اسی حرارتِ عشق اور سُرور و مستی کا نتیجہ تھا کہ پیرانہ سالی میں برابر روزہ رکھتے، تقلیلِ غذا، طویل شب بیداری اور سخت مجاہدات کے باوجود ضعف و ناطاقتی ظاہر نہ ہوتی تھی، اسّی سال سے عمر متجاوز ہونے کے باوجود چہرے پر وہی سرخی اور نشاط و انبساط کی وہی کیفیت پائی جاتی تھی جو جوانی میں رہی ہوگی بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ تھا[2]

سماع[3] محبت کی یہی حرارت اور تپش تھی جس کی تسکین کا ایک ذریعہ سماع تھا یعنی عشقِ الٰہی کے اشعار اور عارفانہ ابیات کا سننا جس سے قلب کو اپنی آگ نکالنے اور آنسوؤں کے چھینٹوں سے اس کی گرمی کو کم کرنے کا موقع ملے اور اسی کے ساتھ مجاہدات سے تھکا ہوا جسم اور طبیعت اور

---

[1] سیر الاولیا، صفحہ ۱۲۸ [2] سیر الاولیاء

[3] مسئلہ سماع (بلا مزامیر) کی موافقت مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اسمیں نقطۂ اعتدال یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ مطلقاً حرام ہے نہ کوئی عبادت و طاعت و امر مقصود، اعتدال اور خاص شرائط کے ساتھ ایک تدبیر و علاج ہے اور اصحاب ضرورت و اہلیت کے لئے بقدر ضرورت مباح اور بعض اوقات مفید، اس سلسلہ میں مشہور چشتی شیخ قاضی حمید الدین ناگوری کا قول بڑا جامع و معتدل معلوم ہوتا ہے۔ ایک مجلس میں سماع کی حلت و حرمت پر بحث تھی، قاضی صاحب نے فرمایا کہ:۔

"میں ہوں حمید الدین کہ سماع سنتا ہوں اور مباح کہتا ہوں علماء کی روایت کی بنا پر اسلئے کہ درد دل کا مریض ہوں اور سماع اسکی دوا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے شراب سے علاج کرنے کی ایسے وقت میں اجازت دے دی ہے جبکہ ازالہ مرض کے لئے اور کوئی دوا ہی نہ ہو اور حکیموں کا بھی اس پر اتفاق ہو کہ صحت شراب کے بغیر ناممکن ہے۔ اس تقدیر پر میرے مرض کی دوا جو کہ لاعلاج ہے سرود کا سننا ہے، لہٰذا اسکا سننا ہمارے لئے مباح اور تم پر حرام ہے۔" (سیر الاقطاب قلمی)

نفی کی چوٹ کھایا ہوا دماغ غذا اور تازگی حاصل کر سکے مولانا رومؒ جو ایک بڑے صاحب سماع تھے اسی لئے فرماتے ہیں ؎

پس غذائے عاشقاں آمد سماع — کہ ازو باشد خیالِ اجتماع

قوتے گیرد خیالاتِ ضمیر — بلکہ صورت گردد از بانگ صفیر

آتشِ عشق از نواہا گرد تیز — آں چنانکہ آتش آں جوزیر

خود حضرت خواجہؒ نے اپنی زبان سے سماع کی یہی حکمت بیان کی ہے:-

سماع حق مریدان و معتقدان و اصحاب ریاضت است، چوں نفس و تن ہلاک شود، اورا حق الیست "ان لنفسك علیك حقا" یعنی بدرستی کہ برائے نفس برابر تو حق است چوں نوبانے از سماع بیاساید باز اورا بر کارے بہ برنگیزند[1]

سماع مریدین صادقین اور اہل عقیدت اور اصحاب ریاضت کا کام ہے۔ جب طبیعت پوری چوٹ کھا جائے تو ان کا حق ہے (کہ سماع سے قوت و تازگی حاصل کریں) حدیث میں آتا ہے کہ ان لنفسك علیك حقا تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے۔ جب ایک مدت تک نفس سماع کے ذریعہ آرام حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسکو کام میں لگاتے ہیں

ایک بزرگ مولانا کاشانی فرماتے ہیں:-

اصحاب ریاضت و ارباب مجاہدہ از کثرتِ معاملات گاہ گاہ اتفاق افتد کہ کلالتے و ملالتے در قلوب و نفوس حادث شود و قبض

اصحاب ریاضت و ارباب مجاہدہ کے قلوب و نفوس احوال و کیفیات کے کثرت سے پیش آنے کی وجہ سے کبھی کبھی اکتا جاتے ہیں اور انکو

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۹۸

بسطے کہ موجب فتور اعمال و قصور احوال بود
طاری گردد پس مشائخ متاخر از برائے رفع
ایں عارضہ و دفع ایں حادثہ ترکیبے روحانی
از سماع اصوات طیبہ و الحان متناسبہ و
اشعار و اشعار مہیجہ و مشوقہ بر وجہے کہ مشروع
بودہ نمودہ اند[1]

تکان و ضعف محسوس ہونے لگتا ہے اور
ان پر وہ قبض و بسط جو اعمال و احوال میں سستی
اور کوتاہی کا باعث ہوتا ہے طاری ہو جاتے ہیں
اس بنا پر مشائخ متاخرین نے اچھی آوازوں متناسب
نغموں اور شوق انگیز اشعار کے سننے کو اس
طرح پر کہ حدودِ شرع سے باہر نہ ہوں ایک
علاج روحانی کے طور پر تجویز کیا ہے۔

سماع کی اس حکمت کے علاوہ، اس کی ایک دوسری حکمت ان حضرات کے نزدیک یہ تھی کہ اس سے حضوری کی ایک کیفیت درد کی لذت اور ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے اور یہ لمحات بقیہ اوقات کو بھی اپنے دامن میں لیکر پاک اور نورانی بنا دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ:-

مردم را ہمہ روز حضور کجا میسر شود اگر در روزے
وقتے خوش در یافت ہمہ اوقات متفرقہ آں
روز در پناہ آں وقت باشد و اگر در جمعے
صاحب نعمتے باشد جملہ اشخاص در پناہ
آں شخص باشند[2]

فرمایا، آدمی کو ہر روز حضوری کہاں میسر
آتی ہے اگر کسی دن کوئی وقت اچھا ہاتھ
آجائے تو اس دن کے تمام متفرق اوقات اس
وقت کی پناہ میں ہوتے ہیں، دیکھو اگر کسی مجمع میں
ایک صاحب ذوق اور صاحب نعمت ہوتا ہے،
تمام حاضرین اس کی پناہ میں ہوتے ہیں۔

پس یہ سماع، حضرت خواجہ اور ان مشائخ کی (جو اسی کیفیت کے حامل اور آتشِ محبت سے

---

[1] مصباح الہدایت ص ۱۸۰ و ص ۱۸۲ [2] سیر الاولیاء ص ۵۲۳

سے جل رہے ہوں) طبعی کیفیت کا نتیجہ، تسکین کا سامان، قوت و غذا اور رقت و حضوری کا ذریعہ تھا جسکو وہ حضرات علاجًا اور ضرورتًا اختیار کرتے تھے اور علاج اور ضرورت کے بقدر ہی اس سے کام لیتے تھے نہ وہ کوئی عبادت، تقرب الی اللہ کا ذریعہ تھا، نہ مستقل سلوک اور شب و روز کا مشغلہ تھا۔

اسی کے ساتھ حضرت خواجہؒ نے سماع کو ان تمام خلافِ شرع منکرات و بدعات اور اسبابِ لہو و لعب سے جو غیر مسلموں کے اثر سے خاص طور پر ہندوستان میں اہل ہوائے یا خام کار صوفیوں نے سماع میں شامل کر لئے تھے خود بھی دور رکھا اور اپنے متبعین کو ان سے اجتناب کی انتہائی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے سماع کے آداب اس طرح بیان فرمائے :۔

آپ نے فرمایا:۔

"سماع کی چار قسمیں ہیں:۔ حلال[۱]، حرام[۲]، مکروہ[۳]، مباح[۴]۔ اگر صاحبِ وجد کا میلان محبوبِ حقیقی کی طرف زیادہ ہو تو سماع مباح ہو، اور اگر محبوب مجازی کی طرف زیادہ ہے، تو مکروہ ہے، اگر محبوب مجازی کی طرف میلانِ کلی ہے تو حرام ہو، اگر محبوبِ حقیقی کی طرف میلانِ کلی ہو تو حلال ہو، پس جس کو سماع کا ذوق ہو، اس کو چاہیئے کہ وہ ان چاروں درجوں کو جانتا ہو۔"

نیز ارشاد فرمایا کہ:۔

"سماع مباح کے لئے چند چیزیں چاہئیں:۔ مُسمِع (سنانیوالا) مستمع (سننے والا) مسموع (جو کچھ پڑھا جا رہا ہے) آلۂ سماع (ذریعہ) مستمع کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ پوری عمر کا آدمی ہو، کم سن نہ ہو، عورت نہ ہو۔ مستمع کیلئے ضروری ہے کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے وہ یادِ حق سے خالی نہ ہو۔ مسموع کے لئے شرط ہے کہ وہ بے حیائی اور ہنسی مذاق کا کلام نہ ہو۔ آلۂ سماع سے مراد مزامیر ہے، جیسے چنگ و رباب کہ یہ درمیان

میں نہ ہو۔"[1]

مزامیر سے نفرت و ممانعت

حضرت خواجہ مزامیر (آلات غنا اور باجے وغیرہ سے) سختی سے منع فرماتے تھے اور جب کبھی اس بارے میں کسی بے احتیاطی کی اطلاع ملتی تو نہایت ناراض ہوتے اور اس بارے میں کسی عذر کو قبول نہ فرماتے۔ سیر الاولیاء میں ہے:-

"مجلس میں ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ ان دنوں بعض حاضر باش درویشوں نے ایک ایسی مجلس میں جس میں چنگ و رباب اور مزامیر تھے شرکت کی اور رقص کیا۔ فرمایا:- اچھا نہیں کیا، جو خلاف شرع ہے وہ ناپسندیدہ ہے۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یہ لوگ جب باہر آئے اور لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا، اس مجلس میں مزامیر تھے، آپ نے سماع کس طرح سنا اور رقص کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم سماع میں ایسے مستغرق تھے کہ ہمیں کچھ پتہ نہ چلا کہ مزامیر ہیں یا نہیں۔ حضرت سلطان المشائخ نے سنکر فرمایا کہ:- یہ جواب بھی کچھ نہیں، یہ بات تو ہر معصیت کے متعلق کہی جا سکتی ہے[2]۔"

حضرت خواجہؒ مزامیر کی ممانعت میں بڑی شدت اور مبالغہ فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ:-

"جب عورت کو نماز میں امام کی غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے دستک دیتے وقت اس کی ممانعت ہے کہ ہتیلی پر ہتیلی ماری جائے کہ اس سے تالی کی آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ لہو ہے، جب لہو و لعب سے اتنا پرہیز آیا ہے تو سماع میں بطریق اولیٰ مزامیر کی ممانعت ہونی چاہیئے[3]۔"

---

[1] سیر الاولیاء ص ۴۹۱ و ص ۴۹۲ [2] ایضاً ص ۵۲۰ و ص ۵۲۱ [3] ایضاً ص ۵۲۲

سماع میں آپ کی کیفیت

حضرت خواجہؒ فرماتے تھے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے درد و ذوق عطا فرمایا ہے اس کو بغیر مزامیر کے ایک ہی شعر سنکر رقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جسے عالمِ ذوق کی خبر نہیں، اس کے سامنے پڑھنے والے کتنا ہی پڑھیں اور کیسے ہی مزامیر کیوں نہ ہوں اس پہ کوئی اثر نہیں ہوتا، اسلئے کہ وہ اہلِ درد میں سے نہیں ہے، اس کام کا تعلق درد سے ہے نہ کہ مزامیر وغیرہ سے[1]

چنانچہ حضرت خواجہؒ کا حال یہ تھا کہ عارفانہ اور عاشقانہ اشعار سنتے ہی آپ پر سخت رقت طاری ہوتی لیکن اس طرح کہ لوگوں کو خبر نہ ہوتی، خدام رومال دیتے جاتے اور وہ آپ کے آنسوؤں سے تر ہوتے جاتے، یہ دیکھ کر لوگ سمجھتے کہ آپ پر گریہ طاری ہے[2]

امیر خورد (جو خود بھی اپنی کمسنی میں ان مجالس سماع میں شریک ہوتے تھے اور زیادہ تر اپنے والد اور چچا سے ان پُرکیف مجلسوں اور ان وجد ان انگیز اشعار کا ذکر کرتے ہیں جو وہاں پڑھے گئے) کہتے ہیں کہ بعض مرتبہ بہت سے شعر پڑھے جاتے لیکن کیفیت نہ پیدا ہوتی، یکایک کوئی ہندی کا دوہا یا فارسی کا کوئی شعر پڑھ دیتا اور مجلس مکیف ہو جاتی۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شاہی امیر قیر بیک نے ایک مجلس آراستہ کی، مشائخ و صدور شہر کا اجتماع تھا، سماع شروع ہوا، کہنے والے بہت کچھ سناتے رہے کچھ اثر نہیں ہوا، آخر حسن بہدی قوال نے یہ شعر پڑھا ؎

در کلبۂ درویشی در محنت بیخویشی
مگذار مرا با من ہر سوئے مکن افسانہ

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ حضرت سلطان المشائخ پر گریہ اور ایک حالت طاری ہوئی اور اس کیفیت کا تمام حاضرین مجلس پر اثر ہوا، اور سب مکیف ہو گئے[3]

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۲۳ [2] ایضاً ص ۵۱۴ [3] ایضاً ص ۵۱۴

ایک دوسری مجلس کا ذکر ہے، بالاخانہ پر مجلس ہو رہی تھی، امیر خسرو کھڑے تھے اور سلطان المشائخ ناسازی طبع کی وجہ سے چارپائی پر تشریف رکھتے تھے، حسن بہدی نے سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

سعدی تو کیستی کہ در آئی دریں کمند
چنداں فتادہ اند کہ ماصید لاغریم

حضرت خواجہؒ پر گریہ طاری ہوا اور اس میں ڈوب گئے۔ خواجہ اقبال رومال بڑھاتے جاتے تھے اور آپ آنسو پونچھ کر حسن بہدی کی طرف اُن کو بڑھاتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد سماع ختم ہوا، امیر حاجی فرزند امیر خسرو نے امیر خسرو ہی کی غزل پڑھنی شروع کی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

خسرو تو کیستی کہ در آئی دریں شمار
کیں عشق تیغ بر سر مردانِ دیدہ است

حضرت خواجہ پر پھر وہی کیفیت طاری ہوئی اور گریہ کا غلبہ ہوا[1]

ایک مرتبہ امیر خسرو نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

رخ جملہ را نمود، مرا گفت تو مبیں
زیں ذوق مست بیخبرم کیں سخن چہ بود

آپ نے گوشہ چشم سے امیر خسرو کو دیکھا، اور کیفیت طاری ہوئی[2]۔

عام طور پر جس شعر پر حضرت خواجہؒ کو ذوق آتا تھا، دہلی کی مجلسوں اور شہر کی گلیوں میں عرصہ تک اس کا چرچا رہتا تھا اور لوگ اس سے لطف لیتے تھے اور ذوق حاصل کرتے رہتے تھے[3]۔ سلطان علاء الدین نے بھی اہل دربار اور حضرت خواجہؒ کے یہاں آنے جانے والوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ: جس

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۱۵ [2] ایضاً ص ۵۱۶ [3] ایضاً ص ۵۱۰

شعر پر حضرت خواجہ کو ذوق آئے اس کو یاد لکھا جائے اور بادشاہ کو سنایا جائے۔ اکثر جب بادشاہ نے وہ شعر سنا جس پر حضرت خواجہ کو وجد آیا تھا تو بڑی تعریف کی اور دیر تک ذوق لیتا رہا۔

ذوقِ قرآن

قرآن مجید کا ذوق، اسکے حفظ کا اہتمام اور تلاوت کی کثرت مشائخ چشت کا خصوصی ذوق اور ان کی قدیم روایت ہے۔ خواجۂ بزرگ معین الدین چشتیؒ سے لیکر حضرت خواجہ نظام الدینؒ تک سب کے یہاں قرآن مجید کا خصوصی ذوق اور شغف ملتا ہے اور ہر ایک نے اپنے خلفا خاص اور مریدین بااختصاص کو حفظ قرآن اور اشتغال بالقرآن کی تاکید کی ہے[1]۔

خلافت دیتے وقت شیخ کبیر نے حضرت خواجہ کو حفظ قرآن کی وصیت کی تھی حضرت خواجہ نے یہ وصیت پوری کی اور دہلی پہنچتے ہی اس کا سلسلہ شروع کر دیا حضرت خواجہ اپنے مریدین اور اصحاب خاص کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہتے تھے اور تاکید فرماتے تھے۔ امیر حسن علاء سجزی جب حضرت خواجہ سے متعلق ہوئے تو وہ بوڑھے تھے اور شعر و شاعری زندگی بھر کا مشغلہ تھا حضرت خواجہ نے ان کو ہدایت کی کہ قرآنی ذوق کو شعر و شاعری کے ذوق پر غالب کریں۔ امیر فوائد الفواد میں فرماتے ہیں:۔

بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ ام می باید	بارہا آں مخدوم کی زبان مبارک سے میں نے
کہ قرآن خواندن بر شعر گفتن غالب	یہ لفظ سنے ہیں کہ چاہیئے کہ قرآن کا پڑھنا
آید[2]۔	شعر کہنے پر غالب آجائے۔

پھر ان کو حفظ قرآن کی ہدایت ہوئی۔ انھوں نے ایک ثلث یاد کر لیا تو ارشاد ہوا۔

دیگر ہا اندک اندک یاد گیر و یاد	تھوڑ تھوڑا یاد کرو اور اگلا یاد کیا ہوا
گرفتہ پیشینہ مکرر می کن[3]	دہراتے رہو۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" از مولانا مناظر احسن گیلانی (جلد دوم) ۱۲۔

[2] فوائد الفواد ص ۲۴۹ [3] فوائد الفواد ص ۹۳

مولانا بدرالدین اسحٰق کے صاحبزادے خواجہ محمد حضرت خواجہؒ کی کفالت و پرورش میں تھے ان کو بھی قرآن مجید یاد کرایا۔ خواجہ محمد امام بڑے اچھے حافظ و خوش الحان تھے، ان کو آپ نے نماز کا امام بنایا تھا ان کی قرأت سے آپ بڑے محظوظ ہوتے اور آپ کو ان کی قرات سن کر بڑی رقت اور ذوق آتا[1]۔ ان کے دوسرے بھائی خواجہ موسیٰ بھی حافظ و قاری تھے معمول تھا کہ جب دسترخوان پر بیٹھتے تو پہلے خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ کچھ قرآن شریف پڑھتے، اسکو دعائے مائدہ[2] کہتے تھے۔ اس کے بعد کھانا شروع ہوتا تھا۔ اپنے نواسوں (خواہرزادہ کے صاحبزدگان) خواجہ رفیع الدین وغیرہ کو بھی قرآن حفظ کرایا[3]۔ خود بھی نوافل میں قرآن شریف پڑھتے اور خاص خدام سے دریافت فرماتے کہ ان کا کیا معمول ہے؟

شیخ سے تعلق

یوں تو جو شخص جس سے کوئی نعمت پاتا ہے (اگر اس کی طبیعت میں شرافت اور احسانمندی کا جذبہ ہے) اس کا گرویدہ ہوتا ہے اور اسکو اپنا محسن سمجھتا ہے لیکن حضرت خواجہ کو اپنے محسن سے عاشقانہ اور والہانہ تعلق تھا اور انکے اختصاص امتیاز اور روحانی ترقیات میں اسکو خاص دخل تھا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کسی محبوب کی تعریف ہوتی تو انکو اپنے شیخ کی یاد تازہ ہوجاتی اور وہ انھیں کو اسکا مصداق سمجھتے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ کی زندگی میں ایک مجلس میں قوال نے یہ شعر پڑھا۔

؎ مخرام بدیں صفت مبادا
کز چشم بدت رسد گزندی

فرماتے ہیں کہ مجھے شیخ کے اخلاق و اوصاف ان کا فضل و کمال اور ان کی لطافت و زیبائی یاد آگئی۔ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بیان نہیں ہوسکتی۔ قوال نے چاہا کہ آگے بڑھے، میں نے بار بار وہی شعر پڑھوایا، یہ ذکر

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۰۰

[2] سیر الاولیاء ص ۱۹۹

[3] سیر الاولیاء ص ۲۰۳

کرکے گریہ طاری ہوگیا۔ فرمایا اسکے بعد زیادہ دن نہیں گذرے کہ حضرت نے انتقال کیا[1]۔

جماعت کا اہتمام اور بلند ہمتی

ضعف پیری اور شدید مجاہدات کے باوجود جماعت سے نماز پڑھنے کا بیحد اہتمام تھا۔ صاحب سیر الاولیا لکھتے ہیں:۔

عمر شریف اسی سے متجاوز ہوگئی۔ جب بھی پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھنے کے لئے بالاخانہ سے (جو بہت بلند تھا) جماعت خانہ میں اترکر ان درویشوں اور ساتھیوں کے ساتھ جو وہاں موجود ہوتے تھے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ اس کبر سنی کے باوجود ہمیشہ روزہ رکھتے، کم افطار کرتے[2]۔"

شریعت کی پابندی اور اتباع سُنّت کا اہتمام

حضرت خواجہ خود بھی اتباع سنت کا اہتمام بلیغ رکھتے تھے کہ بقول سعدیؒ

؎ محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ

اور اپنے اصحاب و خدام کو بھی بڑی تاکید فرماتے تھے۔ سنن کے علاوہ تاکید تھی کہ مستحبات و آداب تک فوت نہ ہوں۔ سیر الاولیاء میں آپ کا ارشاد منقول ہے:۔

استقامت می باید کہ بر متابعت	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی
رسول علیہ السلام والصلوٰۃ باشد	واتباع پر مضبوطی و ثابت قدمی دکھانی
وہیچ مستحب و آداب فوت نہ شود[3]۔	چاہیئے اور کوئی مستحب اور ادب بھی فوت نہ ہونے پائے۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۹۶

[2] سیر الاولیاء، ص ۱۲۵

[3] سیر الاولیاء، ص ۳۱۸

مشائخ کے لئے اور جس کو پیری مریدی کرنا ہو، شریعت کا علم ضروری سمجھتے تھے تاکہ اس سے کوئی عمل خلاف شریعت نہ صادر ہو۔ نہ دوسرے کو کسی خلاف شرع امر کی تلقین کرے۔ فرماتے ہیں:۔

" پیر آں چناں باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم باشد و چوں ایں چنیں باشد او خود ہیچ نامشروع نہ فرماید[1]۔

پیر ایسا چاہیئے کہ احکام شریعت و طریقت و حقیقت کا (ضروری) علم رکھتا ہو اور جب ایسا ہوگا تو وہ کسی خلاف شرع کام کے لئے نہ کہے گا۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۴۷

باب پنجم

افادات و تحقیقات

علمی پایہ حضرت خواجہؒ باطنی کمالات کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے، اپنے زمانہ کے تمام مروجہ علوم کو بلند ہمتی، محنت اور اہتمام سے پڑھا تھا، ان کے اساتذہ میں اس عہد کے نامور ترین فضلا اور شیوخ ہیں، ادب اور علوم دینیات کی تعلیم انھوں نے مستوفی الممالک شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی سے پائی تھی، حدیث کا درس مولانا کمال الدین زاہد محمد ابن احمد مارکلی سے لیا جو صاحب مشارق الانوار امام حسن ابن محمد الصغانی کے شاگرد اور بیک واسطہ صاحب ہدایہ کے شاگرد تھے۔ کچھ کتابوں کو شیخ کبیر حضرت فرید الدین گنج شکرؒ سے پڑھ کر علم میں مزید جلا حاصل کی۔

علمی و ادبی مناسبت اگرچہ اپنی مناسبتِ فطری اور شیخ کی نسبتِ باطنی کے اثر سے روز بروز الفاظ کے مقابلہ میں معانی اور معانی کے مقابلہ میں حقائق و احوال اور "اسم" سے زیادہ "مسمیٰ" میں مشغولیت بڑھتی گئی، پھر بھی علم و ادب سے مناسبت اور علمی ذوق آخر تک قائم رہا۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ مولانا رکن الدین چغر نے کشاف اور مفصل اور ان کے علاوہ بعض کتابیں حضرت سلطان المشائخ کی خاطر نقل کر کے خدمت میں پہنچائیں۔ یہ دونوں کتابیں مشہور معتزلی فاضل علامہ محمود جار اللہ

لہ سیر الاولیاء ص ۳۱۷

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی تصنیف ہیں۔ پہلی کتاب تفسیر میں ہے اور دوسری نحو میں، اس سے بھی آپ کے علمی ذوق اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سیر الاولیاء میں ہے کہ سید خاموش ابن سید محمد کرمانی مجلس خلوت میں "خمسۂ نظامی" حضرت خواجہؒ کی خدمت میں پڑھتے تھے[1]۔ آپ کا ادبی ذوق اتنا بلند اور پاکیزہ تھا کہ امیر خسرو جیسے سرآمد روزگار شاعر (جو اپنے طرز میں بے نظیر اور فارسی کے صف اوّل کے شعراء میں ہیں) کو شاعری میں مشورہ دیا اور رہنمائی فرمائی۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ ابتدا میں امیر خسرو جو غزل کہتے تھے اس کو حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں بنظر اصلاح پیش کرتے تھے۔ ایک روز حضرت نے ان سے کہا کہ صفاہانیوں کے طرز میں کہا کرو[2]۔

حدیث و فقہ پر نظر

سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار میں جو مجلس مناظرہ ہوئی تھی اس میں حضرت خواجہؒ نے مسئلہ پر جو تقریر اور اس کی تنقیح فرمائی اس سے بھی حضرت کے علمی مرتبہ اور وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے عہد سے پہلے کتب صحاح متداول نہیں ہوئی تھیں اور صحیحین تک سے لوگ زیادہ مانوس اور آشنا نہیں تھے۔ حدیث میں مشارق الانوار اور مشکوٰۃ سرمایۂ علمی اور حدیث کا منتہی سمجھی جاتی تھی[3]۔ بکثرت موضوع اور ضعیف احادیث صوفیوں کی زبان پر جاری اور بزرگوں کے ملفوظات مجالس میں بے تکلف منقول ہیں۔ نقد حدیث اور موضوعات کا علم علامہ محمد طاہر پٹنی سے پہلے یہاں نظر نہیں آتا۔ حضرت خواجہؒ کے ملفوظات اور سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسی بہت سی بے اصل روایات سے (جو زبان زد خلائق ہیں) استدلال نہیں فرماتے تھے اور آپ کی اس پر نظر تھی کہ احادیث صحیحہ کا سب سے مستند مجموعہ صحیحین ہیں فوائد الفواد میں ہے کہ کسی نے دریافت کیا کہ یہ

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۲۱۹ [2] سیر الاولیاء، ص ۳۰۱

[3] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" کا باب حدیث۔ ۱۲

حدیث کیسی ہے: السخی حبیب اللہ وان کان کافراً" فرمایا: کسی کا مقولہ ہے، ایک شخص نے عرض کیا کہ:۔ یہ اربعین (چہل حدیث) کی حدیث ہے۔ فرمایا:۔ جو کچھ صحیحین میں ہے وہ صحیح ہے۔[1]

اہمیتِ علم

اپنے مشائخ کرام کی طرح آپ کی نظر میں بھی علم کی بڑی اہمیت اور عظمت تھی اور اسکو سالکین اور ان لوگوں کیلئے جو ارشاد و تربیت کا کام کریں آپ بہت ضروری سمجھتے تھے۔

---

[1] فوائد الفواد صـ۱۰۳

اس موقعہ پر اس کا اظہار ضروری ہے کہ باوجود اسکے کہ آپ صحیحین کے مرتبہ سے واقف تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحاح ستہ کے عام طور پر اور صحیحین کے خاص طور پر ہندوستان میں متداول نہ ہونے کی وجہ سے ان علماء و مشائخ کا اشتغال نہیں تھا۔ خود آپنے بھی (اگر مجلس مناظرہ کی روئداد صحیح ہے) مجلس مناظرہ میں جن حدیثوں کو حلت سماع کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے وہ صحاح کی احادیث نہیں ہیں اور محدثین کے نزدیک ان کا پایہ کچھ بلند نہیں ہے فریق مقابل کے علماء نے بھی جو اکابر علماء اور اعیان قضاۃ میں سے تھے جس طرح گفتگو اور استدلال کیا ہے اس سے علمِ حدیث سے نہ صرف ان کی بے خبری کا ثبوت ملتا ہے بلکہ ایک عالم دین کو اسکے بارے میں جو رویہ اختیار کرنا چاہیئے اس کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کتب صحاح اور نقد حدیث اور جرح و تعدیل کے فن کے شائع نہ ہونے کی وجہ سے خانقاہوں میں بہت سی ایسی رسوم، یہاں تک کہ سجدۂ تعظیمی رائج تھیں اور بہت سے ایسے اوقات و ایام کے فضائل کی روایات مشہور تھیں اور مشائخ کے ملفوظات میں ان کا بڑی آب و تاب سے ذکر آتا ہے۔ جن کا احادیث کے صحیح مجموعوں میں کوئی وجود نہیں اور محدثین ان پر سخت کلام کرتے ہیں اسکو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حضرات محدثین اور ان مخلصین کی کوششوں کی قدر ہوتی ہے جنھوں نے ہندوستان میں فن احادیث کی اشاعت کی اور صحیح و ضعیف احادیث میں امتیاز پیدا کیا۔ شکر اللہ مساعیھم

بنگال کے ایک نہایت عالی استعداد نوجوان جو بعد میں اخی سراج الدین کے نام سے مشہور ہوئے اور جو پنڈوہ کی مشہور عالم چشتی خانقاہ کے بانی اور سرِ حلقہ ہیں۔ لکھنوتی سے بہ نیت ارادت دہلی آئے حضرت خواجہؒ کے مرید ہوئے۔ آپ نے مولانا فخرالدین زرادی سے فرمایا کہ: "یہ جوان بڑی قابلیت رکھتا ہے اگر کچھ علم ظاہر بھی رکھتا ہوتا تو درویشی میں مستحکم ہوتا۔" یہ بات سنکر مولانا فخرالدین نے عرض کیا کہ:۔ اگر اجازت ہو تو میں اس کو کچھ عرصہ اپنی صحبت میں رکھکر ضروری مسائل یاد کرادوں۔ فرمایا کہ: یہ آپ کی صحبت کا بڑا مستحق ہے مولانا فخرالدین ان کو اپنے ساتھ لے گئے اور عرصہ قلیل میں علم سے مناسبت پیدا کرادی۔ حضرت خواجہؒ کی وفات کے بعد بھی وہ تکمیلِ علم کے لئے کچھ عرصہ دہلی میں ٹھہرے رہے، پھر وطن واپس آگئے اور مشرقی و بنگالہ میں سلسلہ چشتیہ کی اشاعت کا ذریعہ بنے[1]

بلند علوم و مضامین

علم ظاہر و باطن کی اس جامعیت اخلاص اور تفکر و مجاہدات کی بنا پر آپ کو ان بلند اور صحیح علوم اور حقائق و معارف سے حصۂ وافر ملا جو اولیاء کاملین اور کبار مخلصین ہی کو ملا کرتا ہے اور جو صفائے باطن، طہارت اخلاق اور اخلاص کا نتیجہ ہے اور جس کو اہلِ تصوف علومِ لدنیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ صاحبِ سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ کسی علم میں گفتگو ہوتی یا کوئی اشکال پیش آتا، آپ اپنے نورِ باطن سے ان کا جواب شافی عطا فرماتے ؎

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

آپ اس مسئلہ پر ایسی بلیغ تقریر فرماتے کہ تمام حاضرینِ مجلس حیرت میں رہ جاتے اور ایک دوسرے سے کہتے کہ یہ کتابی جوابات نہیں ہیں۔ یہ الہامِ ربانی اور علمِ لدنی کے فیوض ہیں، اسی بنا پر شہر کے چوٹی کے علماء جو تصوف کے منکر اور اہلِ تصوف کے مخالف مشہور تھے حضرت خواجہؒ کے حلقہ بگوش اور اپنے علمی غرور اور زعم پر نادم ہوئے اور آپ کے خدام اور ارادتمندوں میں شامل ہو گئے۔

[1] سیر العارفین وغیرہ ۱۲۔۵

علومِ صحیحہ شرعیہ

اس علمی رسوخ، اتباعِ سنّت اور استقامت علی الشریعت نے آپ کے ذہن کو ایسا سلیم اور مستقیم بنا دیا تھا کہ اہلِ تصوّف میں جو باتیں عرصۂ دراز سے ظاہر شریعت کے خلاف چلی آتی تھیں اور بہت جگہ اہلِ تصوّف کا شعار بن گئی تھیں، آپ اپنی سلامتیِ ذہن سے اُن کو قبول نہیں کرتے تھے اور آپ کا ذوق اور تحقیق اُن کے خلاف تھی۔

تصوّف کے حلقوں میں بہت عرصہ سے اس خیال کا اظہار ہو رہا تھا کہ ولایت نبوت سے افضل اور اولیاء کو انبیاء پر فضیلت حاصل ہے اسلئے کہ ولایت عبارت ہے حضرت حق کے ساتھ مشغولیت اور ماسوی اللہ سے انقطاع سے اور نبوت میں (دعوت و تبلیغ کی وجہ سے) مخلوق کے ساتھ مشغولی ہوتی ہے۔ پھر اس میں کئی مذہب پیدا ہو گئے اور کسی نے یہ تاویل کی کہ انبیاء کی ولایت ان کی نبوت سے افضل ہے، لیکن آپ اسکو تسلیم نہیں کرتے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ:۔ یہ مذہب باطل ہے، اس سبب سے کہ اگرچہ انبیاء مخلوق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں لیکن جس وقت کہ وہ حق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں اس مشغولیت کا قلیل سے قلیل زمانہ بھی اولیاء کے تمام اوقات پر فضیلت رکھتا ہے۔[2]

حلال مانع راہ خدا نہیں

تصوّف کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا اور مشہور کیا گیا ہے کہ تصوّف تعطل اور بیکاری و بے عملی کا نام ہے اور ہر اشتغال و صول اللہ سے مانع

---

[1] سیر الاولیاء ص۱۳۰

[2] فوائد الفواد ص۱۲۰ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رح نے اتنا مزید اضافہ کیا کہ انبیاء عین مشغولی بخلق کی حالت میں بھی اولیاء سے (عین اس وقت جب وہ حق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں) زیادہ متوجہ الی اللہ اور مشغول باللہ ہوتے ہیں) ان کی مشغولیت بخلق چونکہ حکم الٰہی سے ہوتی ہے اسلئے وہ عین مشغولیت بحق اور امر الٰہی کا امتثال ہوتا ہے۔ ۱۲

اولیاءِ سلوک کا رہزن ہے۔ حضرت خواجہ معرفت و تحقیق کے جس مقام پر فائز تھے اور وسائل و رسوم سے بلند ہو کر مقاصد اور لب لباب پر جس طرح آپ کی نظر تھی اس کا مقتضا یہ تھا کہ آپ اس مقام سے آگے بڑھ چکے تھے اور فعل حلال و مشروع کی نورانیت اور اس کا ذریعۂ قرب ہونا آپ کی نظر میں تھا۔ حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کے ملفوظات "جوامع الکلم" میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین نے فرمایا:۔

ہیچ کسے (چیزے) کہ حلال است مانع	کوئی چیز جو حلال ہے راہ خدا کی مانع
راہ خدائی نیست و قاطع سلوک نیست	اور قاطع سلوک نہیں ورنہ مشروع و
وگرنہ مشروع و حلال نبودی[1]	حلال نہ ہوتی۔

قلب متوجہ الی اللہ کے بعد کوئی چیز مضر نہیں

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ خدا کی طرف متوجہ دل اور پاک نفس چاہیئے اسکے بعد جس کام میں رہنا ہو رہو، تمھیں کوئی نقصان نہ ہوگا۔[2]

ترکِ دُنیا کی حقیقت

ترکِ دنیا اور حقیقی زہد و درویشی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

ترکِ دنیا آں نیست کہ کسے خود را	ترکِ دنیا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی
برہنہ کند مثلاً لنگوتہا بندد و بنشیند،	اپنے کو ننگا کر دے مثلاً لنگوٹہ باندھ کر
ترکِ دنیا آں است کہ لباس بپوشد	بیٹھ جائے، صحیح معنی میں ترکِ دنیا یہ
و طعام نجورد و انچہ بر سد رد و ابدارد	ہے کہ کپڑے پہنے، کھانا کھائے اور
و بجمع او میل نکند و خاطر را متعلق	جو کچھ میسّر آئے اُس کو استعمال کرے،

---

[1] جوامع الکلم ص ۱۶۰ [2] یعنی مشروع وجوہ معاشی اور ظاہری مشاغل وغیرہ۔ [3] سیر الاولیاء ص ۱۶۰

بہ چیزے ندارد ترک دنیا است[1] — لیکن اسکے جمع کرنے کی طرف متوجہ نہو اور اپنے دل کو کسی چیز میں پھنسائے نہیں یہی ترکِ دنیا ہے

طاعت لازم و متعدی

فرمایا:- طاعت کی دو قسمیں ہیں لازم اور متعدی۔ طاعتِ لازمی اسے کہتے ہیں جس کی منفعت طاعت کرنے والے کو پہنچے، جیسے نماز، روزہ، حج، اوراد و تسبیحات وغیرہ۔ طاعت متعدی وہ ہے جس کی منفعت اور راحت دوسرے کو پہنچے، مثلاً دو مسلمانوں میں اتفاق کرادینا، شفقت، دوسروں کے ساتھ مہربانی وغیرہ اس کو طاعت متعدی کہتے ہیں اور اس کا ثواب بے حد و بے اندازہ ہے۔

طاعتِ لازمی کی قبولیت کے لئے بڑے اخلاص کی ضرورت ہے اور طاعتِ متعدی جس طرح بھی کرے گا ثواب ملے گا[2]۔

کشف و کرامات حجابِ راہ

ارشاد ہوا کہ اولیاء سے جو کچھ اظہار ہوتا ہے وہ ان کی سکر و مستی کا نتیجہ ہے، اسلئے کہ وہ اصحاب سکر ہیں، اسکے برخلاف انبیاء اصحاب صحو ہیں، سالک کیلئے کشف و کرامات حجابِ راہ ہیں، محبت سے استقامت پیدا ہوتی ہے[3]۔

علومِ انبیاء و اولیاء رح

فرمایا کہ:- تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ جس کو طورِ حس کہنا چاہئے، دوسرا طورِ عقل اور تیسرا طورِ قدس۔ طورِ حس میں مطعومات (کھانے پینے کی چیزیں) مشمومات (جن کی خوشبو محسوس ہوتی ہے) وغیرہ محسوسات معلوم ہوتی ہیں، اسکے بعد طورِ عقل ہے اس کا تعلق دو علموں سے ہے، کسبی اور بدیہی، لیکن عالم قدس میں پہنچ کر عقل سے حاصل کئے ہوئے کسبی علوم بھی بدیہی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ بدیہی بھی علمِ قدس نہیں ہے۔ کسبی کا کیا ذکر؟ وہ انبیاء و اولیاء کے علوم ہیں۔ اسکے بعد فرمایا کہ جس پر عالمِ قدس کا دروازہ کھلتا ہے اسکی علامت کیا ہو سکتی ہے؟ جو شخص

---

[1] فوائد الفواد ج ۱ ص ۴۰ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۴ [3] فوائد الفواد ج ۱ ص ۳۳

عالمِ عقل میں ہوتا ہے اور وہ کسی مسئلہ کو بدیہی یا کسبی علم سے حل کرتا ہے اور اس سے اس کو ایک فرحت حاصل ہوتی ہے وہ عالمِ قدس میں راہ نہیں پاتا۔ اس درمیان میں کسی بزرگ کا واقعہ بیان کیا کہ وہ فرماتے تھے کہ غیب سے کچھ علوم اور واردات دل پر گذرتے ہیں انشاء اللہ ان کو قلم بند کروں گا، اسکے بعد بہت کچھ لکھا۔ پھر فرمایا کہ بہت کچھ لکھا گیا لیکن جو کچھ مقصود تھا وہ ضبطِ تحریر میں نہیں آسکا۔[1]

دنیا کی محبت اور عداوت

ایک دن اس کا ذکر ہو رہا تھا کہ کسی کو دنیا کی محبت ہوتی ہے اور کسی کو اس سے نفرت۔ فرمایا کہ:۔ تین طرح کے لوگ ہیں جو دنیا کو دوست رکھتے ہیں اور دن رات اس کی یاد اور فکر میں رہتے ہیں ایسے لوگ بہت ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو دنیا سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا حقارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور ہمیشہ اسکی دشمنی میں رہتے ہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کو نہ دنیا سے محبت ہوتی ہے نہ نفرت اور اس کا ذکر محبت یا عداوت کے ساتھ نہیں کرتے، یہ پہلی دونوں قسموں سے بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ نے حکایت سنائی کہ:۔ ایک شخص حضرت رابعہ بصریؒ کے پاس آیا اور دنیا کی سخت مذمت کرنے لگا۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے اس سے کہا کہ:۔ برائے مہربانی آپ اسکے بعد نہ آئیے گا۔ آپ کو دنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ آپ اسکا بہت ذکر کرتے ہیں۔[2]

مراتب تلاوتِ قرآن

ایک مرتبہ آپ نے تلاوت قرآن پاک کے مراتب اس طرح بیان فرمائے کہ: پہلا مرتبہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھے اسکے معانی دل پر گزارے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کا دل حق تعالیٰ کے ساتھ متعلق و مشغول ہو۔

فرماتے کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو کم از کم اس شعور کو ہر شخص میں ہونا چاہیئے کہ میں اس نعمت کے

---

[1] فوائد الفواد ج ۱ ص ۶۹ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۸۹

لائق کہاں تھا' اور میرے نصیب ایسے کہاں تھے کہ مجھے یہ دولت ملے، اگر یہ سب حاصل نہ ہو تو ٹھیٹے پر جس ثواب اور جزا کا وعدہ ہے اسکو ذہن میں تازہ اور مستحضر رکھا جائے[1]۔

اگرچہ حضرت خواجہؒ نے جیسا کہ انھوں نے کئی بار ارشاد فرمایا کوئی تصنیف نہیں کی، لیکن آپ کی سب سے بڑی تصنیفات آپ کے تربیت کئے ہوئے اور آپ کی صحبت پائے ہوئے وہ خلفائے کبار اور اصحابِ نامدار ہیں جو عملِ صحیح اور علمِ صحیح کا نمونہ تھے اور جن کے دل کی راستی علم کی گہرائی اور فہم کی پختگی "راسخین فی العلم" کے شایانِ شان تھی۔ امیر حسن علاء سنجری کی فوائد الفواد اور امیر خورد کی سیر الاولیاء میں آپ کے بہت سے اقوال و ملفوظات منقول ہیں جو آپ کی شانِ تحقیق کا مظہر ہیں۔

---

[1] فوائد الفواد ص۱۷

[2] فوائد الفواد ص۴۵ و خیر المجالس ص۳۵

باب ششم

فیوض و برکات

تجدید ایمان و توبۂ عام

قبل اس کے کہ اُن فیوض و برکات کا ذکر کیا جائے جو حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے ساتھ تعلق اور ان کے ہاتھ پر توبہ و بیعت کے ذریعہ لاکھوں مسلمانوں کو پہنچے، اور ایک ایسے زمانہ میں جب مسلمانوں کی حکومت اپنے پورے عروج پر تھی اور غفلت، خدا فراموشی اور نفس پرستی کے اسباب و محرکات پورے شباب پر تھے، ایک ایسی دینی اور روحانی لہر پیدا ہوئی جس کو ہر محسوس کرنے والے نے محسوس کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشائخ طریقت کی بیعت عام اور ارشاد و تلقین توبہ کی حکمت اور ضرورت بیان کر دی جائے، تاکہ معلوم ہو کہ کن حالات و ضروریات کے ماتحت اس طریقے کو اختیار کیا گیا اور اس سے کیا دینی فوائد پہنچے، راقم سطور نے تاریخ دعوت و عزیمت کے حصۂ اول میں حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے تذکرہ کے ضمن میں جو کچھ لکھا تھا پہلے اسی کو کسی قدر اختصار و ترمیم کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:۔

"خیر القرون کے بعد اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور

معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ خصوصی تعلیم و تربیت کے ذرائع سے عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی اور روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں و پابندیوں کو اور شعور و احساس ذمہ داری کیساتھ دوبارہ قبول کرے، اس میں پھر اپنی ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اُسکے افسردہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو، اور اُسکے مضمحل قویٰ میں پھر حرکت و نشاط پیدا ہو، اسکو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین کی صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے۔ ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ اسلامی حکومتیں جن کا یہ اہلی فرض تھا (اسلیئے کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر وہ قائم تھیں بقول سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ وہ ہدایت کیلئے مبعوث ہوا تھا۔ "جبایت" "تحصیل وصول" کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھیں بلکہ اپنے سربراہوں اور عمّالِ حکومت کے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کیلئے مضر اور اس کے راستہ میں مزاحم تھیں، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہّم پرست اور شکّی واقع ہوئی تھیں کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں قیادت و سیادت کی آمیزش پائیں برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ اسکو وہ فوراً کچل کر رکھ دیتیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کیلئے اسکے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ایمان و عمل اور اتباعِ شریعت کیلئے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں اور پھر وہ نائب پیغمبر اُنکی دینی نگرانی

وتربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت، اپنی استقامت اور اپنے نفسِ گرم سے پھر ایمانی حرارت، گرمیِ محبت، خلوص وللّٰہیت، جذبۂ اتباعِ سنّت اور شوقِ آخرت پیدا کر دے، اُن کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک زندگی سے توبہ کی ہے اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح وتربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ نے میرے سپرد کی ہے اور اس محبت و اعتقاد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربوں و اجتہاد اور کتاب و سنّت کے اصول و تعلیم کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان احتساب و اخلاص اور ان کے اعمال و عبادات میں ایمانی کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء و تجدید دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا کو حقیقتِ ایمان اور درجۂ احسان تک پہنچا دیا ہے[1]"

بیعت ایک عہد و معاہدہ

یہ بیعت پچھلے گناہوں سے توبہ اور خدا و رسول کے احکام کی تعمیل اور اتباعِ شریعت کا ایک معاہدہ ہوتا تھا، سلطان المشائخ بیعت لیتے وقت بیعت کرنے والے سے کیا الفاظ کہلواتے تھے اور آئندہ کیلئے اس سے کیا عہد لیتے تھے کسی تذکرہ میں اسکے صحیح الفاظ نظر سے نہیں گزرے، لیکن حضرت خواجہ نے خود اپنے شیخ و مرشد شیخ کبیر حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے بیعت لینے کا طریقہ اور ان کی تلقین کا ذکر کیا ہے اور ان کو اپنے شیخ سے جو والہانہ تعلق اور ان کی پیروی کا جو جذبہ تھا، اس سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے

[1] تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ اوّل صـ ۲۰۲

کہ وہ بھی اسی طرح اپنے نئے مریدین کو تلقین فرماتے ہوں گے - ارشاد ہے:-

"جب کوئی شخص شیخ شیوخ العالم فرید الدین والحق کی خدمت میں بہ نیت ارادت آتا فرماتے پہلے ایک بار سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھو اسکے بعد سورۂ بقر کا آخری رکوع 'امن الرسول سے آخر تک پڑھتے' اسکے بعد شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو ..... ان الدین عند اللہ الاسلام تک پڑھتے' اسکے بعد فرماتے کہ تم نے بیعت کی اس ضعیف کے ہاتھ پر اسکے شیخ اور شیخ کے مشائخ کے ہاتھ پر اور حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دستِ مبارک پر اور حضرت عزت (جل مجدہٗ) سے عہد کیا کہ اپنے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی حفاظت اور شریعت کے راستہ اور طریقے پر قائم رہو گے[1]"

بیعت کی اس تلقین میں اسلام کے بنیادی عقائد آگئے، سمع وطاعت (سننے اور ماننے) کا وعدہ اور ارادہ بھی آگیا، یہ بات بھی آگئی کہ اللہ کے یہاں قابلِ قبول دین صرف دینِ اسلام ہے اس کا احساس بھی بیدار و تازہ کر دیا گیا کہ یہ بیعت در اصل دستِ مبارک نبوی پر ہے اور شیخ کا ہاتھ اس دستِ مبارک کا قائم مقام ہے۔ رب العزت سے اس کا بھی عہد کیا گیا کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی معصیتوں سے حفاظت کی جائے گی اور راہِ شریعت پر قائم رہا جائیگا، جی۔ یہ ایمان اور خدا و رسول سے اپنا پرانا عہد استوار کرنے کا اس سے بہتر اور عام فہم طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بیعت کرنے والے سو فی صدی اس عہد پر قائم رہتے تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیعت کرنے والوں میں سے ایک بڑی تعداد اس اقرار اور عہد کی شرم اور لاج رکھتی اور ہزاروں اور لاکھوں بندگانِ خدا کے لئے یہ تجدید ایمان اور انقلابِ حال کا ذریعہ بن جاتی۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۲۳

عمومِ بیعت کی حکمت

بیعت و ارشاد میں ان حضرات نے جو وسعت و اذنِ عام فرما رکھا تھا اور جس طرح بغیر کسی امتحان و امتیاز کے لوگوں کو اجازت تھی کہ وہ بیعت کریں اور حلقۂ ارادت میں داخل ہو جائیں، خاص طور پر حضرت خواجہ کے یہاں اس باب میں جو وسعت و رعایت تھی، اس پر بعض لوگوں کو یہ کھٹک پیدا ہو سکتی ہے کہ جب بیعت ایک معاہدہ ہے اور اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے تو اس میں اتنی وسعت کیوں روا رکھی گئی ہے؟ حضرت خواجہ نے ایک موقع پر خود ہی اس اشکال کا جواب دیا ہے اور اس عمومیت کی حکمت بیان کی ہے۔

مولانا ضیاء الدین برنی (مصنف تاریخ فیروز شاہی) فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر تھا، اشراق سے چاشت تک آپ کی روح پرور جان نواز باتیں سنتا رہا، اس روز خاص طور پر بہت کثرت سے لوگ بیعت ہوئے، یہ دیکھ کر میرے دل میں آیا کہ مشائخ متقدمین نے مرید کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ سلطان المشائخ نے اپنی فیاضیٔ عنایت سے اس کا اذن عام دیدیا ہے اور آپ خاص و عام سب کو مرید کر لیتے ہیں، میں نے چاہا کہ میں اس بارے میں سوال کروں سلطان المشائخ اپنے کشف سے میرے خطرے پر مطلع ہو گئے، فرمایا:۔

"مولانا ضیاء الدین! تم ہر طرح کی باتیں پوچھتے ہو، یہ نہیں پوچھتے کہ میں بغیر تحقیق کے آنے والوں کو کیوں مرید کر لیتا ہوں۔"

یہ سنکر مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا اور میں نے آپ کے قدم لیکر عرض کیا کہ ایک عرصے سے میرے دل میں یہ اشکال تھا آج بھی یہ وسوسہ آیا تھا، اللہ نے آپ کے دل میں یہ بات ڈال دی حضرت نے فرمایا:۔

"حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں اپنی حکمتِ بالغہ سے ایک خاصیت رکھی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر زمانہ کے لوگوں کی راہ و رسم اور عادتیں الگ ہوتی ہیں اور ان کے مزاج و طبیعت پچھلے لوگوں کے اخلاق و طبائع سے میل نہیں کھاتے، تھوڑے لوگ اس سے

مستثنیٰ ہوتے ہیں اور یہ ایک تجربہ کی بات ہے۔ ارادت کی اصل یہ ہے کہ مرید ماسوی اللہ سے منقطع اور مشغول مع اللہ ہو جائے، جیسا کہ کتب تصوف میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ مشائخ متقدمین جب تک طالب میں ارادت میں انقطاع کلی نہ دیکھ لیتے بیعت کا ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے، لیکن سلطان ابوسعید ابوالخیر کے عہد سے لیکر شیخ سیف الدین باخرزی کے زمانے تک اور شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی سے لیکر شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہ اللہ العزیز کے وقت تک کہ یہ سب حضرات سرآمد روزگار اور آیۃ من ایات اللہ تھے خلق خدا کا ان کے دروازوں پر ہجوم ہوا اور ہر طبقہ کے لوگوں نے اتنا دحام کیا، ان بندگانِ خدا نے آخرت کی ذمہ داریوں سے ڈر کر ان عاشقانِ خدا کا دامن تھامنا چاہا اور ان مشائخ کبار نے بھی خاص و عام کو اپنی بیعت میں قبول کیا، اور خرقہ، توبہ و تبرک عطا کیا، ہر شخص ان محبوبانِ خدا کے معاملات پر اپنے کو قیاس نہیں کر سکتا کہ شیخ ابوسعید، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ اسرارہم نے جس طرح لوگوں کو مرید کیا، میں بھی مرید کروں اس لئے کہ اگر خدا کا کوئی محبوب گناہگاروں میں سے ایک عالم کو اپنے دامن عاطفت میں لے لے تو لے سکتا ہے — اب میں تمہارے سوال کا جواب لیتا ہوں کہ میں مرید کرنے میں کیوں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیتا اور اپنا اطمینان نہیں کرتا ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں علی سبیل التواتر سن رہا ہوں کہ بہت سے مرید ہونے والے معصیت سے تائب ہو جاتے ہیں، نماز باجماعت ادا کرنے لگتے ہیں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاتے ہیں، اگر میں بھی شروع ہی سے اس بات کی شرط کروں کہ ان میں ارادت کی حقیقت یعنی انقطاعِ کلی پایا جاتا ہے کہ نہیں، اور ان کو توبہ و تبرک کا خرقہ (جو خرقہ،

ارادت کی جگہ پر ہے) نہ دوں تو وہ خیر کی اس مقدار سے بھی جو ان اللہ کے بندوں سے وجود میں آرہی ہے محروم ہو جائیں گے، دوسرا سبب یہ ہے کہ بغیر اسکے کہ میرے دل میں خیال آئے یا میں اسکی درخواست اور التماس کروں یا کوئی وسیلہ اور سفارش اختیار کروں شیخ کامل و مکمل (شیخ کبیر) نے مجھے بیعت لینے کی اجازت دی۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان بڑی عاجزی و درماندگی اور بڑی مسکنت و بیچارگی کے ساتھ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمام گناہوں سے توبہ کی، میں یہ سمجھ کر کہ شاید اسکی بات سچ ہو، اسکو بیعت کرلیتا ہوں، خاص طور پر اسلئے کہ بہت سے معتبر لوگوں سے سنتا ہوں کہ بہت سے بیعت کرنیوالے اس بیعت کی وجہ سے معاصی سے باز آجاتے ہیں[1]"

عمومی زندگی پر اثر

اس بیعت و تعلق کا جس سے مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگ یکساں مستفیض ہوئے، عام زندگی و معاشرت، لوگوں کے اخلاق و عادات، اشغال و اوقات اور اہلِ حکومت سے لیکر اہلِ حرفہ تک کے حالات پر کیا اثر پڑا، اور دارالحکومت دہلی میں جو شوکت، قوت دولت و ثروت اور عیش و عشرت کا گہوارہ تھا اور مال غنیمت اور سینکڑوں ہزاروں برس کے خزانوں کے زر و جواہر، صناعوں کی مصنوعات اور ملک کے اطراف و جوانب کے تحائف و عجائبات روزانہ سیلِ رواں کی طرح وہاں امنڈ رہے تھے۔ دینداری، خدا طلبی، عشقِ الٰہی، توبہ و انابت اور رجوع الی اللہ صفائی معاملات، راست گفتاری اور دیانت داری کی کیا کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کی تفصیل اُس عہد کے صاحبِ نظر اور معتبر مؤرخ ضیاء الدین برنی کی زبان سے سُنیئے وہ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[2]:-

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۴۶ و ص ۳۴۸ بحوالہ حسرت نامہ مولانا ضیاء الدین برنی [2] تاریخ فیروز شاہی کے اقتباس کا یہ ترجمہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم، اے (رفیق دارالمصنفین) کی کتاب "بزم صوفیہ" سے حذف و اختصار کیساتھ نقل کیا گیا ہے۔ ص ۱۹۹ و ص ۲۰۲

"سلطان علاء الدین کے زمانہ کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوف شیخ الاسلام نظام الدین شیخ الاسلام علاء الدین اور شیخ الاسلام رکن الدین سے آراستہ تھا' ایک دنیا اُن کے انفاسِ متبرکہ سے روشن ہوئی اور ایک عالم نے اُن کی بیعت کا ہاتھ پکڑا اور اُن کی مدد سے گناہگاروں نے توبہ کی اور ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاریوں سے ہاتھ اٹھا لیا' اور ہمیشہ کے لئے پابندِ نماز ہو گئے اور باطنی طور پر دینی مشغلے کی طرف رغبت ظاہر کی اور توبہ صحیح ہو گئی اور عباداتِ لازمہ اور متعدیہ کا معمول ہو گیا' اور دنیا کی حرص و محبت جو انسانوں کے فوائد اور فرمانبرداری کی بنیاد ہے' ان مشائخ کے اخلاقِ حمیدہ اور ترکِ تجرید کے معاملات کے دیکھنے سے دلوں سے کم ہو گئی اور سالکوں کو نوافل اور وظائف کی کثرت اور اوصافِ عبودیت کی پابندی سے کشف و کرامات کی آرزو دل میں پیدا ہونے لگی' اور ان بزرگوں کی عبادات و معاملات کی برکت سے لوگوں کے دلوں میں سچائی پیدا ہو گئی' اور ان کے مکارمِ اخلاق و مجاہدہ و ریاضت کے دیکھنے سے اللہ والوں کے دلوں میں اخلاق کے بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی اور ان دینی بادشاہوں کی محنت اور اخلاق کے اثر سے خداوند تعالیٰ کے فیض کی بارش دنیا میں ہونے لگی اور آسمانی مصیبتوں کے دروازے بند ہو گئے اور ان کے زمانہ کے لوگ قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا اور گرفتار نہیں ہوئے اور ان کی مخلصانہ اور عاشقانہ عبادت گزاری کی برکت سے مغلوں کا فتنہ جو سب سے بڑا فتنہ تھا ایسا فرو ہوا اور یہ تمام ملاعین اس قدر آوارہ و تباہ ہوئے کہ اس سے زیادہ تباہ نہیں ہو سکتے تھے اور یہ تمام باتیں جو ان تینوں بزرگوں کے وجود سے ان کے معاصرین کو نظر آئیں' وہ شعارِ اسلام کی بلندی کا ذریعہ بن گئیں اور احکام شریعت و طریقت کو جو رونق و رواج حاصل ہوا اس کا کیا کہنا' کتنا عجیب زمانہ وہ تھا' جو سلطان علاء الدین کے آخری دسویں سال میں نظر آیا' ایک

طرف سلطان علاء الدین نے ملک کی بہتری کے لئے تمام نشہ آور ممنوع چیزوں کو اور فسق و فجور کے اسباب کو قہر و غلبہ تعزیر و تشدد اور قید و بند سے روک دیا اور مال جو دینی اور ملکی فساد کا ذریعہ اور ہوا پرستوں کیلئے گناہوں کا آلہ اور حریصوں، بخیلوں اور تاجروں کیلئے سود، ذخیرہ اندوزی کا سامان اور فتنہ پردازوں کے لئے بغاوت کی استعداد اور نیکوں کے لئے کبر، مفاخرت، غفلت اور کسلمندی پیدا کرنے والا ہے اور عبادت گذاروں کے لئے نسیان و فراموشی کا باعث ہے، سلطان علاء الدین ہر بہانے سے کہ جو اسکو ملتا مالداروں اور حکام سے سختی سے لے لیتا اور بازار والوں کو کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والی اور سب سے زیادہ فریب کرنے والی قوم ہے، سچائی اختیار کرنے، سچائی کے ساتھ مال بیچنے اور سچ کہنے کے لئے خون خرابہ میں رکھتا تھا۔

دوسری طرف اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا، اور گناہگاروں کو خرقہ پہناتے اور ان سے توبہ کراتے تھے اور اپنی مریدی میں قبول کرتے تھے، اور خاص و عام، غریب و دولت مند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل شریف و رذیل، شہری اور دیہاتی، غازی و مجاہد، آزاد و غلام، سب کو طاقیہ، توبہ اور پاکی کی تعلیم دیتے تھے اور یہ تمام لوگ چونکہ اپنے کو شیخ کا مرید سمجھتے تھے، بہت سے گناہوں سے باز آتے تھے، اور اگر شیخ کے کسی مرید سے لغزش ہو جاتی بھی تو پھر از سر نو بیعت کر لیتے، اور توبہ کا خرقہ عطا کرتے تھے اور شیخ کی مریدی کی شرم تمام لوگوں کو بہت سی ظاہری و باطنی برائیوں سے روک دیتی تھی اور عام طور پر لوگ تقلید و اعتقاد کی وجہ سے عبادت کیطرف رغبت کرتے تھے، مرد و عورت بوڑھے، جوان، بازاری، عامی، غلام اور نوکر سب کے سب نماز ادا کرتے تھے،

اور زیادہ تر مرید چاشت و اشراق کے پابند ہو گئے تھے آزاد اور نیک کام کرنیوالوں نے شہر سے غیاث پور تک چند تفریحی مقامات پر چبوترے تعمیر کر دیئے تھے، چھپر ڈال دیئے تھے، کنویں کھدوا دیئے تھے، پانی سے بھرے ہوئے گھڑے اور مٹی کے لوٹے رکھوا دیئے تھے، چٹائیاں بچھوا دی تھیں، ہر چبوترہ اور ہر چھپر میں ایک چوکیدار اور ایک ملازم مقرر کر دیا تھا، تاکہ مرید اور توبہ کرنے والے نیک لوگوں کو شیخ کے آستانے تک آنے جانے میں نماز ادا کرنے کے وقت وضو کرنے کے لیے کوئی تردد نہ ہو اور چبوترہ اور چھپر میں نفل پڑھنے والے نمازیوں کا ہجوم دیکھا جاتا تھا، ارتکاب گناہ لوگوں کے درمیان کم ہو گیا تھا، اور اکثر آدمیوں کے درمیان چاشت، اشراق، اوابین، تہجد اور زوال کے وقت رکعات نماز کی تحقیقات زیادہ تھی کہ ان نوافل میں ہر وقت کتنی رکعتیں ادا کرتے ہیں اور ہر رکعت میں کلام پاک کی کون سی سورۃ اور کون سی آیت پڑھتے ہیں ..... پنجگانہ نمازوں اور ہر نفل سے فارغ ہونے کے بعد کون کون سی دعائیں آتی ہیں۔ اکثر نئے مرید شیخ کے قدیم مریدوں سے غیاث پور کی آمد و رفت کے وقت پوچھتے تھے کہ شیخ رات کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں اور ہر رکعت میں کیا پڑھتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنی بار درود بھیجتے ہیں، اور شیخ فرید اور شیخ بختیار رات دن میں کتنی بار درود بھیجتے تھے اور کتنی بار سورۃ اخلاص پڑھتے تھے، نئے مرید شیخ کے قدیم مریدوں سے اسی قسم کے سوالات کرتے تھے، روزے، نوافل اور تقلیل طعام کے متعلق پوچھتے تھے، اس نیک زمانہ میں اکثر آدمیوں کو حفظ قرآن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، نئے مرید شیخ کے پرانے مریدوں کی صحبت میں رہتے تھے، پرانے مریدوں کو اطاعت، عبادت،

ترک تعلق، تصوف کی کتابوں کے پڑھنے، مشائخ کے اوصاف حمیدہ اور ان کے معاملات کے بیان کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا، دنیا اور دنیاداروں کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا تھا، کسی دنیادار کے گھر کی طرف اپنا رخ نہیں کرتے تھے، دنیا اور اہل دنیا کے میل جول کی حکایت نہیں سنتے تھے اور اس کو عیب اور گناہ جانتے تھے ــــ کثرت نوافل اور اسکی پابندی کا معاملہ اس بابرکت زمانہ میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ بادشاہ نے محل میں بہت سے امراء، سلاحدار، لشکری، شاہی نوکر شیخ کے مرید ہوتے تھے اور چاشت و اشراق کی نمازیں ادا کرتے تھے، ایام بیض اور عشرہ ذی الحجہ کے روزے رکھتے تھے اور کوئی محلہ ایسا نہیں تھا جس میں ایک مہینہ بیس دن کے بعد صلحا کا اجتماع نہیں ہوتا تھا، اور صوفیوں کی محفل سماع نہیں ہوتی تھی اور باہم گریہ وزاری نہیں کرتے تھے۔ شیخ کے چند مرید تراویح کی نمازیں مسجدوں اور گھروں میں ختم قرآن کرتے، وہ لوگ جو مستقیم الحال ہو چکے تھے، رمضان، جمعہ اور تہواروں کی راتوں میں قیام کرتے اور صبح تک بیدار رہتے، پلک کو پلک سے نہیں لگنے دیتے، شیخ کے مریدوں میں سے بڑے درجہ کے مرید تمام سال رات کے ایک یا دو تہائی حصے تہجد کی نمازیں گذارتے، بعض عباد تگذار عشا کی نماز کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے، شیخ کے مریدوں میں سے چند آدمیوں کو میں جانتا ہوں کہ شیخ کے فیض نظر سے صاحب کشف و کرامات ہو گئے تھے، شیخ کے مبارک وجود، ان کے انفاس کی برکت، ان کی مقبول دعاؤں کی وجہ سے اس ملک کے اکثر مسلمان عبادت، تصوف اور زہد کیطرف مائل اور شیخ کی ارادت کی طرف راغب ہو گئے تھے ــ سلطان علاء الدین اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہو گیا تھا، خواص و عوام کے دلوں نے نیکی اختیار کر لی تھی، عہد علائی کے چند آخری سالوں میں شراب، معشوق، فسق و

فجور، جوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پاتا، بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خواری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہو سکتے تھے، بازار والوں سے جھوٹ بولنے، کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا، اکثر طالبعلموں اور بڑے بڑے لوگوں کی رغبت جو شیخ کی خدمت میں رہتے تھے تصوف اور احکام طریقت کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف ہو گئی تھی، قوت القلوب، احیاء العلوم ترجمۂ احیاء العلوم، عوارف، کشف المحجوب، شرح تعرف، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، لوائح و لوامح قاضی حمید الدین ناگوری، فوائد الفواد، میر حسن سجزی کے بہت سے خریدار پیدا ہو گئے تھے، زیادہ تر لوگ کتب فروشوں سے سلوک و حقائق کی کتابوں کے بارے میں دریافت کرتے تھے، کوئی پگڑی ایسی نہ تھی جس میں مسواک اور کنگھی لٹکی نظر نہ آتی تھی، صوفیوں کی کثرت خریداری کی وجہ سے لوٹے اور چرمی طشت گراں ہو گئے تھے، حاصل کلام یہ کہ خداوند تعالیٰ نے شیخ نظام الدینؒ کو پچھلی صدی میں شیخ جنیدؒ اور شیخ بایزیدؒ کے مثل پیدا کیا تھا۔"[1]

عشق کا "روز بازار"

توبہ، تجدید ایمان اور اصلاحِ حال کے اس عام ذوق و رجحان کے علاوہ جس سے دہلی کا کوچہ کوچہ متاثر ہو رہا تھا اور ایوانِ شاہی اور "بامِ ہزار ستون" تک اس کی لہریں پہنچی تھیں، ایک نئی تبدیلی یہ تھی کہ دماغی نخوت اور قلبی افسردگی کی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی ص ۳۴۶ و ص ۳۴۱

اس دنیا میں جہاں نائے ونوش اور "لعیش کوش" کے سوا عرصہ سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی، جذبۂ الٰہی کی ایک ہوا چلنے لگی اور عشق کا سودا عام ہوگیا، ہر جگہ درد و محبت کا تذکرہ، حقیقت و معرفت کی باتیں اور عارفانہ و عاشقانہ اشعار کی گونج تھی۔ امیر خورد مصنف سیر الاولیاء نے خوب لکھا ہے:-

کار محبت و عشق را رونق بازارے	محبت و عشق کے کاروبار کا زمانہ
در جہاں پیدا آمدے ..... و خلق	میں ایک بازار لگ گیا، لوگوں کو
را در آبِ زماں راحت جز حکایت	سماع کی حکایات، سننے، اخلاص و
سماع و اخلاص و نیازمندی و شفقت	دنیازمندی، شفقت و نرمی، دلجوئی
و لینت و دل دریافتن و سر در زیر	اور اہلِ دل کے قدموں پر سر رکھ دینے
پائے اہل دلان نہادن کارے دیگر	کے علاوہ کسی اور بات سے راحت
نبود[1]	نہیں حاصل ہوتی تھی۔

خلفاء کی تربیت

اس سلسلۂ ارشاد و تربیت اور طریقۂ عشق و محبت کو ہندوستان میں دور دور تک پھیلانے اور دیر تک قائم رکھنے کے لئے آپ نے اپنے عالی استعداد، سراپا اخلاص خلفاء کا بڑا اہتمام فرمایا، ان میں وہ سب اوصاف و کمالات پیدا کرنے کی کوشش فرمائی جو مشائخ کاملین کے لئے ضروری ہیں، ان سے مجاہدات کرائے، ان کے قلوب کی نگرانی کی، ان میں جو اعلیٰ استعداد رکھتے تھے، لیکن زیورِ علم سے عاری تھے اُن کی تعلیم و تکمیل کا بندوبست کیا، ان میں سے جن کے دلوں سے ابھی تک بحث و مناظرے کا نشہ نہیں گیا تھا، ان کی اصلاح فرمائی، جو خلق خدا کی رہنمائی اور اجتماعی زندگی کے اہل تھے، لیکن انھیں گوشہ نشینی، عزلت گزینی

---

[1] سیر الاولیاء، صـ۳۰۶

اور انفرادی عبادات و مجاہدات کا ذوق تھا، ان کو اجتماعی زندگی اختیار کرنے اور "خلق خدا کی جفا وقفا" کو برداشت کرنے پر مجبور کیا، اصلاح و تربیت کا جو عالمگیر کام آپ کے پیش نظر تھا اور اپنے خواص اصحاب سے دین کی دعوت کا جو کام لینا تھا اس میں جو چیز حارج اور مزاحم نظر آئی آپ نے اسکو ترک کر دیا۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ ایک من بلند حیثیت کے دوستوں اور خدام نے جن کا وطنی تعلق اودھ سے تھا آپس میں طے کیا کہ سلطان المشائخ سے پڑھنے پڑھانے اور بحث و مذاکرہ کرنے کی اجازت طلب کریں، اگرچہ ان دوستوں میں سے ہر ایک عالم متبحر تھا لیکن سلطان المشائخ کے فیض صحبت سے یاد حق میں مشغول تھا، مگر جس کام میں عمر گذاری تھی اس کا شوق بالآخر اس کا محرک ہوا۔ مولانا جلال الدین کو لوگوں نے آگے کیا اور خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت سلطان المشائخ پر یاد الٰہی کی ایسی کچھ تجلی تھی کہ لوگوں کو بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مولانا جلال الدین کو کچھ جرأت تھی، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر اجازت ہو تو احباب کسی وقت بحث کر لیا کریں؛ سلطان المشائخ سمجھ گئے کہ یہ ان سب علماء کا عندیہ ہے اور مولانا جلال الدین ان کے نمائندہ ہیں۔ فرمایا کہ:۔ میں کیا کروں مجھے تو ان سے تو دوسرا ہی کام لینا مقصود ہے۔[1]

مولانا سید نصیر الدین محمود جو بعد میں حضرت خواجہؒ کے خلیفہ اعظم اور اصل جانشین ہوئے اور چراغ دہلی کے نام سے ان کا نام تمام دنیا میں روشن ہے، اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ وہ کسی جنگل یا پہاڑ پر بیٹھ کر خدا کی یاد کریں۔ انھوں نے ایک دن امیر خسرو کو واسطہ بنایا اور کہلوایا کہ یہ ناچیز اودھ میں رہتا ہے، خلق کے ہجوم سے اپنی مشغولیت میں فرق پڑتا ہے اگر اجازت ہو تو میں کسی صحرا یا پہاڑ پر رہ کر فراغ خاطر کے ساتھ خدا کی عبادت کروں۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۰۶

امیر خسرو نے جب یہ پیغام عرض کیا تو ارشاد ہوا:۔

او را بگو ترا درمیان خلق می باید بود	اُن سے کہہ دو کہ تمکو مخلوق ہی کے درمیان
وجفا و قضائے خلق می باید کشید	رہنا ہوگا، اور مخلوق کی بے مروتی اور
ومکافات آں ببذل وایثار وعطا	بے رخی کو برداشت کرنا ہوگا! اور اس
می باید کرد[1]	کا بدلہ سخاوت وایثار سے دینا ہوگا۔

مولانا حسام الدین ملتانی نے خلافت کے بعد عرض کیا کہ:۔ اگر اجازت ہو تو شہر چھوڑ دوں اور کسی چشمہ کے کنارے سکونت اختیار کروں، اس لئے کہ شہر میں کنوؤں کا پانی ملتا ہے اور اس سے وضو کرنے میں دل کو اطمینان نہیں ہوتا[2]؛ ارشاد ہوا کہ نہیں شہر ہی میں رہو اور ایک عام آدمی کی طرح رہو سہو، نفس چاہتا ہے کہ تم کو ایک آرام کی جگہ لیجائے اور ایسی جگہ رکھے کہ تمہیں جمعیت خاطر نصیب نہ ہو، جب تم شہر سے باہر چلے جاؤ گے اور کسی چشمہ کے کنارے سکونت اختیار کروگے تو پردیسی اور شہری تمہارا سراغ لگا کر پہنچیں گے اور مشہور ہوگا کہ فلاں درویش فلاں جگہ مقیم ہے اور پھر تمہارا وقت خراب کرے گا، اس کے علاوہ کنوئیں کے پانی میں علماء کا اختلاف ہے اور شریعت نے اس میں وسعت دی ہے۔

چشتی خانقاہیں

اللہ تعالےٰ نے حضرت خواجہ کو بڑے جلیل القدر خلفاء عطا فرمائے تھے جن میں سے حسب ذیل خاص طور پر مشہور و ممتاز ہوئے:۔

(۱) مولانا شمس الدین یحییٰ	(۲) شیخ نصیر الدین محمود
(۳) شیخ قطب الدین منور ہانسوی	(۴) شیخ حسام الدین ملتانی
(۵) مولانا فخر الدین زرادی	(۶) مولانا علاء الدین نیلی

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۳۷ [2] پانی بھرنے والوں کی بے احتیاطی کی وجہ سے اور کسی چیز کے گر کے پڑنے کے خیال سے۔

(۷) مولانا برہان الدین غریب؛ (۸) مولانا یوسف چندیری

(۹) مولانا سراج الدین اخی سراج (۱۰) مولانا شہاب الدین

مریدین بااختصاص

(۱) خواجہ ابوبکر (۲) مولانا محی الدین کاشانی

(۳) مولانا وجیہ الدین پائلی (۴) مولانا فخر الدین مروزی

(۵) مولانا فصیح الدین (۶) امیر خسرو

(۷) مولانا جلال الدین (۸) خواجہ کریم الدین سمرقندی

(۹) امیر حسن علا سنجری (۱۰) قاضی شرف الدین

(۱۱) مولانا بہار الدین ادہمی (۱۲) شیخ مبارک گوپاموی

(۱۳) خواجہ موید الدین کردی (۱۴) خواجہ تاج الدین داوری

(۱۵) خواجہ ضیار الدین برنی (۱۶) خواجہ موید الدین انصاری

(۱۷) خواجہ شمس الدین خواہر زادہ (۱۸) مولانا نظام الدین شیرازی

(۱۹) خواجہ سالار (۲۰) مولانا فخر الدین میرٹھی

ان میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو آپ نے خلافت خاص عطا فرمائی اور اپنا جانشین بنایا۔ وہ اپنے شیخ کے قدم بقدم تھے، انھوں نے نہایت نامساعد حالات اور سخت سیاسی طوفانوں میں رشد و ہدایت کا یہ چراغ روشن رکھا۔ بقول شاعر ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن، چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

فیروز تغلق کی تخت نشینی اور اس سے ہندوستان کو جو فیوض و برکات پہنچے اُس میں حضرت سید نصیر الدین ہی کا ہاتھ تھا، پورے تیئیس[۳۲] سال تک انھوں نے سلسلہ چشتیہ کا مرکزی نظام دار الحکومت دہلی میں بیٹھ کر کامیابی کیساتھ چلایا، پھر اس چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوا، جس نے جنوبی ہند ہی نہیں سارے ہندوستان کو عشق و محبت کی حرارت سے گرم اور اس کی خوشبو سے مُعطّر کر دیا، یعنی حضرت سید محمد گیسو درازؒ مدفون گلبرگہ[۲] (م ۸۲۵ھ) جن کے متعلق کسی صاحب نظر نے کہا ہے ؎

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کے دوسرے خلیفہ علامہ کمال الدین (م ۷۵۶ھ) تھے، جن کی اولاد اور خلفاء نے اس سلسلہ کو اس صدی تک آب و تاب کیساتھ قائم رکھا، اس سلسلہ میں حضرت یحییٰ مدنی، شاہ کلیم اللہ جہان آبادی، مولانا شاہ فخر الدین دہلوی، خواجہ نور محمد مہاروی شاہ نیاز احمد بریلوی اور خواجہ سلیمان تونسوی جیسے اکابر روزگار گذرے، جنھوں نے عشق الٰہی کا بازار گرم رکھا، اور لاکھوں بندگانِ خدا کے دلوں میں محبت الٰہی اور خدا طلبی کی آگ بھڑکا دی[۳]۔

حضرت چراغ دہلی کے خلفاء میں شیخ عبد المقتدر کندی، شیخ احمد تھانیسری اور شیخ جلال الدین حسین بخاری معروف بمخدوم جہانیاں جہاں گشت خاص طور پر قابل ذکر ہیں — ان میں ہر ایک شیخ وقت اور مرجع خلائق تھا۔

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی، از سراج عفیف۔

[۲] حضرت خواجہ سید محمد گیسو درازؒ کے حالات و کمالات کیلئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

[۳] ان بزرگوں کے مفصل حالات کیلئے ملاحظہ ہو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

دہلی کی مرکزی خانقاہ کے بعد جس کے مسند ارشاد پر یکے بعد دیگرے دو شیخ اجل حضرت خواجہ نظام الدینؒ اور حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ متمکن رہے:۔ ہندوستان کے مختلف مقامات پنڈوہ، لکھنوتی، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، زین آباد، مانڈو، احمد آباد، صفی پور، مانک پور، بہلون میں چشتی خانقاہیں قائم ہوئیں، جنھوں نے صدیوں تک چراغ سے چراغ روشن رکھا اور عشق و محبت، صدق و اخلاص، علو ہمت و عزیمت، خدمت خلق، ایثار و قربانی، بذل و عطا، فقر و زہد، علم و معرفت کی شمع روشن رکھی، اور ہندوستان کی فضا کو جس پر پے در پے مادیت اور غفلت کے حملے ہوتے رہے اور کسی وقت ایسا محسوس ہوا کہ سارا ملک تنکے کی طرح غفلت و تعیش کے سیلاب میں بہ جائے گا اور متاع درد جس کشتی میں ہے وہ بھی غرق ہو جائے گی، لیکن ان سوختہ سامانوں اور سوختہ دلوں نے اس متاع کی حفاظت کی اور یہ آگ کہیں نہ کہیں سلگتی رہی، ان میں ہر خانقاہ اور اسکے دینی و اصلاحی کارناموں کیلئے ایک مستقل ضخیم کتاب درکار ہے، خاص طور پر بنگال میں شیخ علاء الحق پنڈوی[1]، حضرت نور قطب عالم پنڈوی[2]

---

[1] شیخ علاء الدین علاء الحق پنڈوی کا اصل نام عمر ہے، آپ کے والد اسعد لاہوری بنگال میں منصب وزارت پر فائز تھے۔ شیخ علاء الحق حضرت محبوب الٰہی کے مشہور خلیفہ مولانا سراج الدین عثمانی اودی معروف بہ اخی سراج (م ۷۵۸) کے خلیفہ اور پنڈوہ کی مشہور عالم چشتی خانقاہ کے بانی ہیں۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی (م ۸۰۸ھ) آپ ہی کے خلیفہ ہیں۔ ۷۸۸ھ میں وفات پائی۔

[2] نور الدین احمد نام، نور الحق اور قطب عالم لقب، اپنے والد شیخ علاء الحق پنڈوی کے خلیفہ و جانشین تھے، اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت و مرجعیت عطا فرمائی، آپ کے زمانہ میں پنڈوہ کی خانقاہ ہندوستان کی سب سے بڑی خانقاہ تھی۔ مجاہدات، خدمت خلق اور بے نفسی و خود شکنی اور علوم و حقائق میں مرتبۂ عالی رکھتے تھے۔ خلفاء میں حضرت شیخ حسام الدین حسام الحق مانکپوری (م ۸۵۳) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کی ذات سے بہار اور اودھ میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی بڑی اشاعت ہوئی۔

۸۱۸ھ میں وفات پائی، تصنیفات میں "مونس الفقراء" "انیس الغرباء" اور مکاتیب کا مجموعہ یادگار ہے۔ ملفوظات و مکتوبات میں غضب کی سادگی اور تاثیر ہے۔ (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۳)

دکن میں شیخ برہان الدین غریب اُن کے خلفاء ہیں شیخ زین الدین، شیخ یعقوب، شیخ کمال الدین ناگوری فتنی، پھر ان کے خلیفہ قطب عالم عبداللہ بن محمود بن الحسین (م ۸۵۷) اور ان کے فرزند و خلیفہ شاہ عالم گجراتی نے بوریائے فقر پہ بیٹھ کر اپنے اپنے زمانہ میں بادشاہی کی ہے۔

مالوہ میں شیخ وجیہ الدین یوسف، شیخ کمال الدین، مولانا مغیث الدین وغیرہ اودھ میں حضرت شیخ محمد بینا لکھنوی، شیخ سعد الدین قدوائی خیرآبادی، شیخ عبد الصمد عرف صفی الدین صفی پوری، شیخ حسام الحق مانک پوری، شیخ عبدالکریم مانک پوری اور شاہ پیر محمد سلونی اور شاہ پیر محمد لکھنوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، یہ سب سلسلۂ نظامیہ کے شیوخ کبار ہیں جنھوں نے اپنی اپنی جگہ ارشاد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا۔ ان سے فیض پانے والوں کی تعداد کو خدا کے سوا کوئی شمار نہیں کر سکتا۔

ان خالص چشتی خانقاہوں کے علاوہ ہندوستان میں جابجا ایسی نامور خانقاہیں بھی قائم تھیں جن کے مشائخ کبار اور بانیانِ سلسلہ کو سلسلۂ نظامیہ کے مشائخ چشت سے نسبتِ خاص اور اجازتِ عام حاصل تھی اور وہ چشتی ذرق اور نسبت کے حامل تھے، ان میں سے جونپور کی خانقاہ رشیدی اور پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ خانقاہ رشیدی کے بانی حضرت علامہ محمد رشید جونپوری (م ۱۰۸۳ھ) کو اپنے شیخ طیب بنارسی اور سید احمد الحکیم حسینی مانکپوری سے سلسلۂ حسینیہ نظامیہ میں اجازت حاصل تھی، خانقاہ مجیبی کے بانی تاج العارفین حضرت شاہ محمد مجیب اللہ قادری پھلواروی (م ۱۱۹۱ھ) کو سلسلہ چشتیہ نظامیہ اپنے پیر بیعت حضرت خواجہ عماد الدین تلندر اور حضرت شاہ معین الدین کرجوی کے واسطہ سے پہونچا ہے۔ شاہ معین الدین کرجوی حضرت شیخ پیر محمد سلونی کے خلیفہ تھے۔

آخر میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ذات سلسلہ نظامیہ وصابریہ اور ان کی خصوصیتوں

اور برکتوں کی جامع تھی۔ حضرت حاجی صاحب کو سلسلہ نظامیہ سے نسبت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے طریق سے حاصل تھی، جن کو حضرت درویش بن محمد قاسم اودھی سے سلسلہ نظامیہ میں اجازت تھی۔ حضرت درویش کو تین طریقوں سے سلسلۂ نظامیہ پہونچا تھا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرۃ الرشید" ج ۲ (صـ ۱۰۶)

باب ہفتم

حضرت خواجہؒ کی تعلیم و تربیت کے اثرات
آپ کے خلفاء کی دینی و اصلاحی خدمات

حضرت سلطان المشائخ نے اپنے خلفاء اور مریدین کی بڑے اہتمام اور توجہ سے تربیت فرمائی تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی کے امراء دربار اور ارکان سلطنت میں سے ایک بڑے عہدہ دار خواجہ مؤید الدین تھے، ان کو حضرت خواجہؒ سے تعلق پیدا ہوگیا، اور یہ تعلق اتنا بڑھا کہ اُن کی طبیعت "سرکار دربار" سے اُچاٹ ہوگئی اور وہ حضرت خواجہؒ کی خدمت میں رہ پڑے۔ سلطان ان کا بڑا قدردان تھا اور اُن کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ اس نے ایک حاجب کے ذریعہ حضرت خواجہؒ سے شکایت کی اور کہا کہ: حضرت ہر ایک کو اپنا جیسا بنانا چاہتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں اپنے جیسا کیا، اپنے سے بہتر۔[1]

حضرت خواجہؒ کی صحبت و تربیت سے صرف عبادت و ریاضت کا ذوق اور اپنی اصلاح و ترقی ہی کی فکر نہیں پیدا ہوگئی تھی، بلکہ دعوت و تبلیغ کا جذبہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی ہمت اور حوصلہ،

---

[1] سیر الاولیاء (صفحہ ۳۱۱)

سلاطینِ وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت اور بے خوفی و شجاعت بھی پیدا ہوگئی تھی، اور یہ خدا کے نام اور مردانِ خدا کی صحبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس دل میں اللہ کا خوف سما جائے گا اُس دل سے غیر اللہ کا خوف قدرتی طور پر نکل جائیگا اور جو دل طمع دنیا سے آزاد ہوجائے گا اُس پر کسی کا رعب اور اس کو کسی سے ہراس نہیں ہوسکتا، جس پر خالق کی عظمت اور مخلوق کی صحیح حیثیت کا انکشاف ہوگیا، وہ سلاطین عالم کے کروفر، ان کے دربار داں کے تزک و احتشام اور اُن کے غلاموں اور افسروں کی صف بندیوں اور "زنگاہ رویرد" اور "دوربا ش" کو بچوں کے کھیل اور گڑیوں کے گھروندوں سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتا اور جاہ و جلال کی کسی نمائش پر کلمۂ حق کہنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتا، یہی توحید و تجرید کا طبعی نتیجہ، حقیقی تصوف کا خاصہ اور مردانِ خدا اور درویشانِ کامل کا شیوہ ہے ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسد اللّٰہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت خواجہؒ کے تربیت یافتہ خدام و مریدین نے اس "اسد اللّٰہی" اور اس حق گوئی و بیباکی کے ایسے نمونے پیش کئے جن کی نظیر ملنی آسان نہیں۔

سلاطینِ وقت سے بے رعبی اور حق گوئی کے نمونے

سلطان محمد تغلق کے شوکت و جبروت سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ سلطان کا ایک مرتبہ ہانسی کے پاس سے گزر ہوا، وہاں سے چار کوس کے فاصلہ پر ہنسبی مقام میں خیمہ شاہی و خرگاہ نصیب ہوا، سلطان نے مخلص الملک نظام الدین مدرباری کو جو اپنے ظلم و قساوت میں اس زمانہ میں مشہور تھا ہانسی کے حصار کے معائنہ کے لئے بھیجا، وہ جب حضرت شیخ قطب الدین منور (نبیرہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی و خلیفہ حضرت سلطان المشائخ) کے مکان کے پاس پہنچا تو دریافت کیا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ لوگوں نے کہا شیخ قطب الدین منور کا جو حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ ہیں

کہا کہ عجیب بات ہے کہ بادشاہ اس جوار میں آئے اور شیخ اُسکے سلام کو حاضر نہ ہوں؛ مخلص الملک نے واپسی پر سب کیفیت عرض کی اور یہ بھی کہا کہ سلطان المشائخ کے ہانسی میں ایک خلیفہ ہیں جو جہاں پناہ کے سلام کیلئے حاضر نہیں ہوئے۔ بادشاہ کو یہ سنکر غصہ آیا، اُسی وقت حسن سربرہنہ کو جو ایک بڑا مغرور وجاہ پسند شخص تھا شیخ قطب الدین کو لانے کے لئے بھیجا، حسن سربرہنہ جب مکان کے قریب پہنچا تو تنہا پیادہ پا شیخ کی دہلیز میں آکر عاجزانہ طریقے پر بیٹھ گیا۔ شیخ نے بلایا حسن نے جاکر عرض کیا کہ آپ کی بادشاہ کے یہاں طلبی ہے۔ فرمایا کہ اس میں مجھے کچھ اختیار ہے یا نہیں؟ اُس نے کہا مجھے فرمانِ سلطانی ہے کہ میں آپ کو بہرحال لے آؤں۔ شیخ نے فرمایا الحمدللہ کہ میں اپنے اختیار سے نہیں جارہا ہوں۔ پھر گھر والوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا کہ تم کو خدا کے سپرد کیا، یہ کہا اور مصلّی کاندھے پر ڈالا، لاٹھی ہاتھ میں لی اور پیادہ پا روانہ ہوگئے، حسن نے سواری کے لئے عرض کیا: فرمایا: ۔نہیں مجھ میں قوت ہے، میں پیدل چل سکتا ہوں۔ جب ہانسی پہنچے تو سلطان کو خبر ہوئی، سلطان نے حکم دیا کہ دہلی چلیں۔ دہلی پہنچ کر دربارِ شاہی میں طلب کیا۔ شیخ نے فیروز شاہ سے جو اُس زمانہ میں نائب باربک تھے کہا کہ ہم فقیر لوگ ہیں بادشاہوں کی مجلس کے آداب سے واقف نہیں، جیسا آپ کا مشورہ ہو ویسا کیا جائے۔ فیروز نے جو فقیر دوست اور صحیح الاعتقاد شخص تھا کہا کہ لوگوں نے آپ کے متعلق بادشاہ کے کان بہت بھرے ہیں، اگر آپ کچھ تعظیم اور تواضع سے کام لیں تو بہتر ہے۔ ایوانِ شاہی کی دہلیز میں قدم رکھا تو امرا و ملوک اور نقیب و چاؤش دورویہ کھڑے تھے۔ صاحبزادہ نورالدین جو ہانسی سے ہمرکاب آئے تھے، کم عمر تھے اور انھوں نے کبھی بادشاہوں کی بارگاہ نہیں دیکھی تھی، ان پر ایک ہیبت سی طاری ہوئی۔ شیخ قطب الدین منور نے ان سے پکار کر کہا کہ:

"بانورالدین! العظمۃ والکبریاء للہ" صاحبزادہ کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی میرے اندر ایک قوت پیدا ہوئی، سارا رعب جاتا رہا اور جو امرا و ملوک وہاں کھڑے تھے وہ مجھے بالکل بکریوں کی طرح معلوم ہونے لگے۔ جب سلطان کو یہ اندازہ ہوا کہ شیخ آرہے ہیں تو وہ کھڑا ہوگیا اور کمان ہاتھ میں لیکر تیر اندازی

میں مشغول ہوگیا۔ شیخ قریب آئے تو اُس نے خلافِ معمول تعظیم کی اور مصافحہ کیا۔ شیخ نے بہت مضبوطی سے بادشاہ کا ہاتھ پکڑا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں آپکے جوار میں پہنچا، آپ نے میری کوئی تربیت نہ فرمائی اور اپنی ملاقات سے عزت نہ بخشی؟ شیخ نے فرمایا کہ یہ درویش اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ بادشاہوں سے ملاقات کرے، ایک کونے میں پڑا ہوا بادشاہ اور اہلِ اسلام کی دعاگوئی میں مصروف ہے۔ اسکو معذور سمجھا جائے۔ بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اپنے بھائی فیروز شاہ سے کہا کہ شیخ کی جیسی مرضی ہو ویسا کرو۔ شیخ منور نے فرمایا کہ مجھ فقیر کا مقصود و مطلوب یہی ہے کہ اپنے دادا اور باپ کے گوشۂ عافیت میں واپس جائے۔ فیروز شاہ نے اس کی تعمیل کی۔ شیخ کی واپسی کے بعد بادشاہ نے ایک امیر سے کہا کہ مجھے جن بزرگوں سے مصافحہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے جس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اُس کے ہاتھ میں کپکپی تھی لیکن شیخ منور نے اتنی مضبوطی سے مصافحہ کیا کہ ان پر ذرا اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔

بادشاہ نے فیروز شاہ اور مولانا ضیاء الدین برنی کو ایک لاکھ تنکے کے ساتھ شیخ منور کی خدمت میں بھیجا شیخ نے فرمایا نعوذ باللہ کہ یہ درویش ایک لاکھ تنکہ قبول کرے۔ انھوں نے واپس آکر سلطان سے عرض کیا۔ سلطان نے کہا کہ اگر ایک لاکھ قبول نہیں کرتے تو پچاس ہزار پیش کرو۔ شیخ نے اسکو بھی قبول نہ کیا۔ سلطان نے فرمایا اگر شیخ یہ بھی قبول نہ کریں گے تو خلقت مجھے کیا کہے گی۔ یہاں تک کہ بات دو ہزار تک پہنچی۔ فیروز شاہ اور مولانا ضیاء الدین نے عرض کیا کہ اس سے کم کا ہم بادشاہ کے سامنے تذکرہ نہیں کر سکتے، شیخ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! درویش کو تو دو سیر چاول دال ایک ٹنگ کا گھی کافی ہے، وہ ان ہزاروں روپیوں کو کیا کرے گا، بڑی کوششوں اور حیلوں سے یہ کہہ کر کہ بادشاہ درپے آزار ہو جائے گا، آپنے دو ہزار تنکے قبول کئے اور وہ بھی اپنے برادران طریقت اور اہلِ حاجت میں تقسیم کر کے ہانسی واپس آگئے[1]۔

جس زمانہ میں سلطان محمد تغلق نے دہلی کی آبادی کو دیوگیر منتقل ہو جانے کا حکم دیا، اس زمانہ میں اس نے عزم کیا کہ ترکستان اور خراسان کو بھی اپنے قبضہ میں لائے اور چنگیز خان کی اولاد کا قلع قمع کرے[2]، اسی زمانہ میں حکم ہوا کہ دہلی اور

---

[1] تنکا یا تنگا، اس عہد میں ہندوستان کا روپیہ تھا، اس میں ایک تولہ چاندی ہوتی تھی، یہ ترکی زبان کا لفظ ہے اسکے معنی سفید کے ہیں یعنی نقری سکہ۔ [2] سیر الاولیاء ص ۲۵۳ تا ص ۲۵۵

اطراف دہلی کے تمام صدور و اکابر حاضر ہوں بڑے بڑے خیمے نصب کریں، ان خیموں میں منبر رکھے جائیں اور ان منبروں پر چڑھ کر حضرات علماء تقریر کریں اور جہاد کی ترغیب دیں۔ اس روز حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے خلفاء خاص مولانا فخر الدین زرّادی، مولانا شمس الدین یحییٰ اور شیخ نصیر الدین محمود کی بھی طلبی ہوئی۔ شیخ قطب الدین دبیر[1] جو حضرت سلطان المشائخؒ کے ایک راسخ الاعتقاد مرید اور مولانا فخر الدین زرّادی کے شاگرد تھے، مولانا فخر الدین کو سب سے پہلے بارگاہ سلطانی میں لائے۔ مولانا کو سلطان کی ملاقات سے بہت اجتناب تھا۔ کئی بار فرمایا کہ میں اپنے سر کو اس شخص کے دربار میں کٹا ہوا اور پڑا ہوا دیکھتا ہوں، یعنی میں کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہوں گا اور یہ شخص مجھے معاف نہیں کرے گا۔ جب مولانا سراپردۂ سلطانی میں داخل ہوئے تو شیخ قطب الدین دبیر نے مولانا کی جوتیاں اٹھالیں اور خدمتگاروں کی طرح بغل میں لیکر کھڑے ہو گئے، سلطان نے ان سے کچھ نہیں کہا اور مولانا فخر الدین سے بات چیت میں مشغول ہو گیا۔ سلطان نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں چنگیز خاں کی اولاد کا قلع قمع کروں، آپ اس کام میں ہمارا ساتھ دیں گے؟ مولانا نے فرمایا انشاء اللہ تعالیٰ۔ سلطان نے کہا کہ یہ شک کا کلمہ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ مستقبل کے متعلق ایسا ہی کہا جاتا ہے، سلطان نے یہ سنکر پیچ و تاب کھایا اور کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجئے؟ مولانا نے فرمایا کہ غصہ دباؤ۔ سلطان نے کہا کون سا غصہ۔ مولانا نے فرمایا غضب سبعی (درندوں والا غصہ) اس پر سلطان کو ایسا غصہ آیا کہ چہرہ پر ظاہر ہو گیا مگر کچھ کہا نہیں۔ کہا کہ کھانا لاؤ، خاصہ شاہی لگا، سلطان اور مولانا دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھا رہے تھے، مولانا ایسی ناگواری کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سلطان کے ساتھ ہم پیالہ ہونا پسند نہیں کرتے، سلطان اور زیادہ اظہارِ تعلق کیلئے ہڈی سے گوشت نکال نکال کر مولانا کے سامنے رکھتا تھا، مولانا بڑی ناگواری کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کھاتے تھے پھر دسترخوان بڑھایا گیا، اور سلطان نے مولانا کو رخصت کیا۔ رخصت کے وقت ایک ادنی پوشاک اور ایک روپیہ کی تھیلی پیش کی، لیکن اس سے پہلے کہ خلعت اور کیسہ مولاناؒ کے ہاتھ میں آئے شیخ قطب الدین دبیر نے

---

[1] دبیر کا عہدہ سکریٹری کا سمجھنا چاہیئے۔ ۱۲

ہاتھ بڑھا کر اُن کو لے لیا، اُن کے رخصت ہونے کے بعد سلطان نے شیخ قطب الدین دبیر سے کہا کہ اے فریبی آدمی تو نے یہ کیا حرکت کی، پہلے فخرالدین کی جوتیاں اپنے بغل میں لیں، پھر ان کی خلعت اور کیسہ سنبھال لیا اور اُس کو میری تلوار سے بچالیا۔ اور بلا اپنے سر لے لی۔ شیخ قطب الدین دبیر نے کہا کہ مولانا فخرالدین میرے استاد اور میرے مرشد کے خلیفہ ہیں، اور میرے لئے مناسب تو یہ تھا کہ میں ان کی جوتیاں تعظیماً سر پر رکھتا، بغل میں لینا تو کوئی بڑی بات نہیں اور یہ خلعت و کیسہ کیا بڑی چیز ہے؟ سلطان نے کہا کہ ان کفر آمیز عقیدوں کو چھوڑ دو ورنہ میں قتل کر دوں گا۔ اخیر وقت جب مولانا فخرالدین زرّادیؒ کا ذکر سلطان کی مجلس میں آتا تو سلطان ہاتھ مل کر کہتا کہ افسوس فخرالدین میری خون آشام تلوار سے بچ گئے۔[1]

اسلامی سلطنت کی رہنمائی و نگرانی

مشائخ چشت نے اگرچہ سلاطینِ وقت سے بے تعلق اور "سرکار، دربار" سے دُور رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کو اپنے اور اپنے پورے سلسلہ کے لئے دائمی اصول بنا دیا تھا، لیکن وہ سلاطینِ وقت کی رہنمائی و نگرانی سے غافل نہیں تھے اور جب کبھی ان کو صحیح مشورہ یا کسی بہتر انتخاب یا اپنا روحانی اثر استعمال کرنے کا موقع ملتا تو وہ اس زرّیں موقع کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ہندوستان کی مرکزی سلطنت کے متعدد فرمانروا اور صوبوں کی خود مختار سلطنتوں کے متعدد حکمراں ان مشائخ چشت سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے اور اس تعلق سے بہت سے مفاسد کا ازالہ بہت سے منکرات کا سدباب اور بہت سے احکام شریعت اور عدل گستری اور خلق پروری کا رواج ہوا۔

ہندوستان کے سلاطین میں سلطان فیروز تغلق کو اپنی حُسنِ سیرت، نیک نفسی، رعیت پروری، رحم دلی امن پسندی، رفاہ عامہ، ازالۂ مظالم اور تبلیغِ اسلام کے ذوق، مدارس کے قیام وغیرہ میں جو امتیاز و خصوصیت حاصل تھی اس میں مشکل ہی سے ہندوستان کا کوئی دوسرا فرمانروا اس کا سہیم و شریک ہوگا۔ سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی سے اس بادشاہ کے تعمیری کارناموں اور اسکے زمانہ کی خیر و برکت، امن و امان اور سرسبزی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

[1] سیر الاولیاء، ص ۲۷۱ و ص ۲۷۳

تاریخ فرشتہ کا مصنف، لکھتا ہے:—

او بادشا ہے بود فاضل و عادل و کریم و	وہ ایک فاضل، منصف مزاج، شریف و
حلیم و رعیت و سپاہی از و راضی بودند و	مہربان، رحم دل و بردبار بادشاہ تھا، رعیت
ہیچ کس در عہدِ او یارائے ظلم نہ داشت[1]	اور فوج سب اس سے راضی تھی کسی کو اسکے

عہدِ حکومت میں ظلم کرنے کی مجال نہ تھی۔

مصنف نے اُس کے آئینِ حکومت کی تین بڑی خصوصیتیں لکھی ہیں، اُس نے کسی مسلمان یا ذمی کی سیاست[2] و تعزیر نہیں کی، انعامات، عطیوں اور تالیف قلب کی وجہ سے لوگوں کو سیاست کی ضرورت نہیں رہی۔

۲۔ خراج و محاصل کو رعایا کی استطاعت کے مطابق وصول کیا، اضافہ و توفیر کو جو سلاطینِ ماضی کا دستور تھا، موقوف کیا، رعایا کے بارے میں کسی مفسد کی شکایت کی سماعت نہیں کی، اس کی بدولت ملک آباد اور رعایا مرفہ الحال رہی۔

۳۔ حکومت کے عہدوں اور علاقوں کی صوبہ داری پر دیندار و خدا ترس لوگوں کو مامور کیا، کسی فساد انگیز و بدنفس کو عہدہ نہیں دیا۔ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے اصول کے مطابق حکام و امراء اور کارپردازانِ حکومت نے بھی اسکی پیروی کی[3]۔

لیکن بہت سے لوگوں کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ فیروز شاہ کی تخت نشینی اور اس کے انتخاب میں خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا خاص ہاتھ[4] اور اسکی فیروزمندی اور کامیابیوں میں ان کی دعاؤں اور توجہات کا بہت بڑا حصہ تھا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) صـ۲۷۸

[2] تعزیر و تعذیب کے وہ نئے نئے طریقے جو سلاطینِ سابق نے ایجاد کئے تھے۔

[3] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) صـ۲۷۱

[4] تاریخ فرشتہ صـ۲۵۹ (ج ۱)

سراج عفیف لکھتے ہیں :۔

چوں سلطان محمد دنیال طغی در ٹھٹھہ رفت
خدمت شیخ نصیر الدین را برابر خود برد، چوں
سلطان محمد در ٹھٹھہ نقل کرد و سلطان فیروز شاہ
در بادشاہی نشست، خدمت شیخ نصیر الدین
بر سلطان فیروز شاہ پیغام کردہ کہ باین خلق عدل و
انصاف خواہی کرد یا برائے ایں مشتے مسکینان
دالی دیگر از اللہ تبارک و تعالیٰ التماس کردہ
آید، سلطان فیروز جواب فرستاد کہ با بندگانِ
خدائے تعالیٰ حلم و رزم و اتفاق کنم، چوں
خدمت شیخ ایں لفظ شنید، بر سلطان فیروز
جواب فرستاد اگر با خلق ایں چنیں خلق
خواہی کرد، ما ہم برائے تو از اللہ تبارک و تعالیٰ
بہ چہل سال ملک خواستہ ایم، عاقبت ہم چناں
شد، سلطان فیروز تا چہل سال ملک راند۔[1]

جب سلطان محمد تغلق ٹھٹھہ ملک طغی کی بغاوت
فرو کرنے گیا ہوا تھا، حضرت شیخ نصیر الدین کو
اپنے ساتھ لے گیا تھا، سلطان کا جب انتقال
ہوا اور سلطان فیروز شاہ دربار شاہی میں بیٹھا،
حضرت شیخ نصیر الدین نے فیروز شاہ کو پیغام
بھیجا کہ خدا کی اس مخلوق کیساتھ تم عدل و انصاف
کروگے یا میں ان غریبوں کیلئے اللہ سے کوئی
دوسرا حاکم مانگوں۔ سلطان فیروز نے جواب
دیا کہ "بابندگانِ خدائے تعالیٰ حلم و رزم و
اتفاق کنم"، جب حضرت شیخ نے یہ جواب سنا
تو کہلوا بھیجا کہ اگر مخلوق کیساتھ اسی طرح معاملہ
کروگے تو میں نے اللہ تعالیٰ سے تمہارے لئے
چالیس سال مانگ لئے ہیں، اور واقعہ بھی
یہی ہے کہ سلطان فیروز نے چالیس سال حکومت کی

سلطان محمد شاہ بہمنی (۷۵۹، ۷۶۰ھ) کو تمام مشائخ دکن نے بادشاہ تسلیم کرلیا تھا اور اسکے ہاتھ پر حاضر اور غائبانہ بیعت کرلی لیکن حضرت شیخ برہان الدین غریب کے خلیفہ و جانشین حضرت شیخ زین الدین (م ۸۰۱ھ)

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸

نے اس پیشکش پر انکار کر دیا کہ بادشاہ شراب نوشی اور منہیاتِ شرعی کا مرتکب ہے اور فرمایا:۔

سزاوارِ پادشاہیِ خلق کسے ہست کہ در حفظ	خلقِ خدا پر حکومت کرنے کا اہل وہ شخص
شعارِ ملّت محمدیؐ کوشیدہ سرّاً و علانیۃ	ہے جو شعائرِ اسلام کی حفاظت میں کوشش کرے
پیرامونِ مناہی نہ گردد	اور خلوت و جلوت کسی حالت میں بھی ممنوعاتِ شرعی کے قریب نہ جائے۔

۷۶۷ھ میں جب سلطان دولت آباد میں فاتحانہ داخل ہوا تو حضرت شیخ کو پیغام بھیجا کہ یا تو آپ میرے دربار میں حاضر ہوں یا میری خلافت کی تحریر اپنے دستِ خاص کی میرے پاس بھیجیں۔ شیخ نے اسکے جواب میں فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی تقریب سے ایک عالم، ایک سیّد اور ایک ہیجڑا کافروں کے ہاتھ پڑ گئے، انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ تینوں بُت خانہ میں جائیں، جو بت کو سجدہ کرے گا اس کی جان بخشی ہوگی اور جو انکار کرے گا وہ قتل کر دیا جائیگا، پہلے عالم کو لے گئے، انھوں نے قرآن کی رخصت پر عمل کیا[1] اور بت کا سجدہ کر کے اپنی جان بچا لی، سیّد نے عالم کی تقلید کی، جب ہیجڑے کی باری آئی اس نے کہا میری تمام زندگی ناشائستہ کاموں میں گذری، میں نہ عالم ہوں نہ سیّد کہ ان میں سے کسی فضیلت کی پناہ میں ایسا کام کروں، اس نے قتل ہو جانا منظور کر لیا اور بت کا سجدہ نہیں کیا، میرا قصہ بھی اسی ہیجڑے کے قصے سے مشابہت رکھتا ہے، میں تمھارے ہر قسم کے ظلم کو برداشت کروں گا، لیکن نہ دربار میں حاضر ہوں گا اور نہ تمھارے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ بادشاہ کو سخت غصہ آیا اور شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ نے بلا توقف اپنی جائے نماز کاندھے پر ڈالی اور شیخ برہان الدین کے مقبرے میں جا کر ان کی قبر کی پائنتی اپنی لاٹھی گاڑ دی اور جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئے اور کہا کہ اب کوئی مرد ہو تو مجھے اپنی جگہ سے ہلائے۔ بادشاہ نے شیخ کی یہ مضبوطی اور استقامت دیکھی تو پشیمان ہوا اور اپنے ہاتھ سے یہ مصرع کاغذ پر لکھ کر صدرِ شریف کے ہاتھ بھیجا

---

[1] الا ان تتقوا منھم تقاۃ (سورہ آل عمران، رکوع ۳) مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو۔

ع "من زانِ توام تو زانِ من باش"

شیخ نے فرمایا کہ اگر سلطان محمد شاہ غازی شریعت کے طور و طریق کی حفاظت و ترویج کی کوشش کرے اور ممالکِ محروسہ سے شراب خانے یک قلم اٹھا دے، اپنے باپ کی سنّت پر عمل کرے اور لوگوں کے سامنے شراب نہ پیئے اور قضاۃ و علماء و صدور کو حکم دے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں سعیٔ بلیغ سے کام لیں تو فقیر زین الدین سے بڑھ کر بادشاہ کا کوئی دوسرا دوست و خیر خواہ نہ ہوگا۔ نیچے یہ شعر اپنے قلم مبارک سے تحریر فرمایا ؎

تا من بزیم بجز نکوئی نہ کنم — جز نیک دلی و نیک خوئی نہ کنم
آنہا کہ بجائے ما بدیہا کردند — تا دست رسد بجز نکوئی نہ کنم

(ترجمہ) جب تک جان میں جان ہے سوائے اچھائی، نیک دلی اور نیک خوئی کے مجھ سے کچھ سرزد نہ ہوگا۔ جن لوگوں نے ہمارے ساتھ برائی کی، جب موقع ملے گا ہم ان کے ساتھ سوائے بھلائی کے کچھ نہ کرینگے)

سلطان محمد شاہ اپنے نام کے ساتھ غازی کا خطاب دیکھ کر بہت خوش ہوا اور فرمان جاری کیا کہ القاب شاہی کیساتھ اس کا بھی اضافہ کیا جائے، قبل اسکے کہ سلطان کی حضرت شیخ سے ملاقات ہو سلطان نے مرہٹ واڑہ کی حکومت مسند عالی خان محمدؒ کے حوالہ کی اور خود بدولت گلبرگہ پہنچا اور شراب کی دکانوں کو اپنی پوری حکومت سے ختم کر کے شریعت کی ترویج و اشاعت میں اپنی کوشش مبذول کی، دکن کے چوروں و فسادیوں کو جو گذرگاہ پر مشہور تھے اور جنھوں نے رہزنی کو اپنا شیوہ بنالیا تھا، ختم کرنے کا انتظام کیا، چھ سات مہینے کے اندر اندر ملک ان سے پاک ہوگیا۔ ایک روایت کے مطابق چند مہینے کی مدت میں چوروں، رہزنوں کے بیس ہزار سر کاٹ کر اطراف و جوانب سے گلبرگہ میں لائے گئے۔ سلطان اس عرصہ میں حضرت شیخ زین الدین سے برابر خط و کتابت کرتا رہا اور اخلاص و عقیدت کی راہ و رسم بڑھاتا رہا۔ شیخ نے بھی اسکی ہمت افزائی، قدردانی اور ہدایات اور مشوروں سے دریغ نہیں کیا۔[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) از صفحہ ۵۶۰ تا صفحہ ۵۶۲، طبع پونا سنہ ۱۸۳۲ء) - ۱۲

چشتیوں کی بڑی بڑی خانقاہیں ہندوستان کے جن حصّوں اور صوبوں میں قائم ہوئیں، انھوں نے وہاں کی اسلامی حکومتوں اور سلاطینِ وقت کی رہنمائی اور اسلامی حکومت کی حفاظت و تقویت سے غفلت نہیں کی، بنگال کی مشہور عالم خانقاہ جو پنڈوہ میں تھی وہاں کی اسلامی حکومت کے لئے قوت اور پشت پناہی کا ذریعہ تھی، جب وہاں سے اسلامی اقتدار ختم ہونے لگا تو ان درویشوں نے اسکی فکر کی اور اس کو دوبارہ بحال کرنے کی امکانی کوشش کی[1]۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی تاریخ مشائخِ چشت میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت نور قطب عالم شیخ علاء الحق کے فرزند رشید تھے، جس زمانہ میں وہ مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز تھے، بنگال کی سیاست بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی، راجہ کنس (جو بٹھوریہ ضلع راج شاہی کا جاگیردار تھا) بنگال کے تخت پر قابض ہوگیا تھا اور مسلمانوں کی قوت کا خاتمہ کرنے پر تلا ہوا تھا، حضرت نور قطب عالم نے براہِ راست اور سیّد اشرف جہانگیر سمنانی کی وساطت سے سلطان ابراہیم شرقی کو بنگال پر حملہ کرنے کی دعوت دی، سیّد اشرف جہانگیر کے مجموعے میں وہ دلچسپ خطوط خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہیں، جن میں اس سیاسی کشمکش کی تفصیل درج ہے۔ سیّد اشرف جہانگیر نے جو خط حضرت نور قطب عالم کے مکتوب کے جواب میں لکھا وہ بنگال میں صوفیائے کرامؒ کے کارناموں پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔"

ان چند واقعات سے جو تاریخ کے وسیع انبار میں سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر بغیر کسی تاریخی ترتیب کے جمع کر دیئے گئے، اندازہ ہوگا کہ مشائخ چشت کا تصوف، محض عزلت و خلوت، نفس کشی اور ترکِ دنیا

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ریاض السّلاطین تاریخ بنگالہ تصنیف غلام حسین سلیم ص۱۱۰ عنوان مسلّط شدن راجہ کانس زمیندار تا ص۱۱۶ [2] تاریخ مشائخ چشت ص۲۰۲

اور اقبال کے الفاظ میں "سربزیری اور گوسفندی و بیشی" نہیں تھا، انھوں نے اپنے اپنے دور میں زمانہ کے دھارے کو بدلنے اور حالاتِ زمانہ سے پنجہ آزمائی کی بھی کوشش کی۔ جابر سلاطین کے روبرو کلمۂ حق کہنے، اُن کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرنے اور ان کو صلاح و مشورہ دینے سے بھی پس و پیش نہیں کیا، اور جب کبھی اُن کے اولوالعزم مشائخ کو موقع ملا انھوں نے اصلاح و انقلاب کی کوششوں سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اشاعتِ اسلام

سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد ہندوستان میں پہلے ہی دن سے اشاعت و تبلیغِ اسلام پر پڑی تھی اور اس کے عالی مرتبت بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھ پر اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے کہ تاریخ کے اس اندھیرے میں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کی یہ کثرت بہت کچھ حضرت خواجہؒ کی کوششوں اور روحانیت کی رہینِ منت ہے، ان میں سے ایک بڑی تعداد حضرت خواجہؒ کی روحانی قوت، اشراقی کمال اور عند اللہ مقبولیت کے واقعات سے مسلمان ہوئی، اسوقت تک ہندوستان جوگ و اشراقیت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے بہت سے فقیر و سنیاسی اشراقی اور قلبی قوت میں بڑا کمال رکھتے تھے، ریاضیاتِ شاقہ اور مختلف مشقوں سے انھوں نے کشف و تصرف کی بڑی قوت بڑھا رکھی تھی، اُن میں بہت سے لوگ اس نوواردِ مسلمان فقیر کے امتحان اور اُسکو زک دینے کے لئے اُس کے پاس آئے، لیکن ان کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ یہ غریب الوطن درویش اُن سے اپنی قلبی قوت اور اشراقیت میں بڑھا ہوا ہے اور ساحرینِ فرعون کی طرح ان کو یہ اندازہ ہوگیا کہ اُس کے کمالات اور قوتوں کا منبع اور سرچشمہ کچھ اور ہے، اسی کے ساتھ اُن کے اخلاق کی پاکیزگی، صاف ستھری زاہدانہ اور بے طمع زندگی، ایمان و یقین کی قوت، خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی، اور بلا تفریقِ مذہب و ملت انسان سے محبت اور انسانیت کا احترام دیکھ کر مخالفین بھی معتقد، اور دشمن بھی دوست ہوگئے۔ تذکرہ و تصوف کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جوگیوں و سنیاسیوں کے ساتھ مقابلہ اور حضرت خواجہؒ کی اشراقی قوت اور کشف و تصرفات کے جو واقعات کثرت کیساتھ نقل کئے گئے ہیں، اگرچہ ان کو تاریخی سند سے اور قدیم تر معاصر ماخذ کے ذریعہ ثابت کرنا مشکل ہے لیکن ہندوستان کے

اُس وقت کے ذوق و رجحان اور اجمیر کی دینی و روحانی مرکزیت کو دیکھتے ہوئے یہ واقعات خلافِ قیاس نہیں، دراصل جس چیز نے حضرت خواجہؒ کا گرویدہ اور اسلام کا حلقہ بگوش بنایا وہ تنہا ان کی قلبی قوت تھی، بلکہ ان کی روحانیت، اخلاص، اخلاق اور اُن کا وہ طرزِ زندگی تھا جس کا ہندوستان کے اہلِ فن اور عوام نے اس سے پہلے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔

خواجہ بزرگؒ کے اہلِ سلسلہ میں سے حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی کوششوں اور توجہات کو اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی مجالس اور خانقاہ میں ہر مذہب و ملت کے آدمی اور ہر طبقہ کے لوگ آتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں:۔

بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین از ہر جنس درویش وغیرآں برسید۔[1]	حضرت خواجہ فریدالدینؒ کی خدمت میں ہر صنف و نوع کے لوگ درویش وغیر درویش پہنچتے تھے۔

حضرت خواجہؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو عالی استعداد قلبی قوت عطا فرمائی تھی اسکے پیشِ نظر بعید نہیں کہ اشاعتِ اسلام میں وہ بھی معین ہوئی ہو اور نومسلموں کی بہت بڑی تعداد ان کی روحانیت اور کشف و کرامات دیکھکر مسلمان ہوئی ہو۔ پنجاب اور پاک پٹن کے اطراف میں بہت سی مسلمان برادریاں اور خاندان اپنے اسلاف کے قبولِ اسلام کو حضرت خواجہؒ کی توجہ اور تبلیغ کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اپنی نسبت اُن کی طرف کرتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں لکھتا ہے:۔

"پنجاب کے مغربی صوبوں کے باشندوں نے خواجہ بہاءالحق ملتانی اور بابا فرید پاک پٹنی کی تعلیم سے اسلام قبول کیا۔ یہ دونوں بزرگ تیرھویں صدی عیسوی کے قریب خاتمہ اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں گذرے ہیں۔ بابا فرید شکر گنجؒ کا تذکرہ جس مصنف نے

---

[1] فوائدالفواد ص۵

لکھا ہے، اس نے تحریر کیا ہے کہ سولہ[۱۶] قوموں کو انھوں نے تعلیم و تلقین سے مشرف باسلام کیا۔ لیکن افسوس ہے اس مصنّف نے ان قوموں کے مسلمان ہونے کا مفصل حال نہیں لکھا[۱]

حضرت خواجہ نظام الدینؒ کو اہلِ ہند میں اشاعت اسلام سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ محض تقریر اور کہنے سننے سے کسی شخص کا اپنے قدیم عقیدے سے ہٹنا اور نئے دین کو قبول کر لینا، بالخصوص ہندو قوم کا جو اپنی پختگی، قدامت پرستی اور ذات پات اور چھوت چھات کی پابندی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، محض حُسنِ تقریر اور وعظ و نصیحت سے مسلمان کر لینا آسان نہیں، اس کے لیے اُن کے لئے موثر و طویل صحبت کی ضرورت تھی۔

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک غلام جو مسلمان تھا حضرت کی مجلسِ مبارک میں حاضر ہوا اور اپنے ایک ہندو دوست کو اپنے ساتھ لایا اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ حضرت خواجہؒ نے اس غلام سے فرمایا کہ: تمہارا یہ بھائی کچھ اسلام کی طرف بھی میلان رکھتا ہے؟ غلام نے عرض کیا کہ: اس کو حضرت کے قدموں میں اسی لئے لایا ہوں کہ آپ کی نظرِ کیمیا اثر کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے۔ یہ سنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرمایا کہ کسی کے کہنے سننے سے اس قوم کا دل نہیں پھرتا، ہاں اگر اسکو کسی نیک بندے کی صحبت میسّر آجائے تو امید ہوتی ہے کہ اس کی صحبت کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے[۲]۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پچاس[۵۰] برس کے عرصہ میں جس میں حضرت خواجہ نظام الدینؒ دہلی جیسے مرکزی مقام میں مسندِ ہدایت و ارشاد پر متمکن رہے اور ان کی خانقاہ کا دروازہ ہر انسان کیلئے کھلا رہا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے مختلف ضرورتوں اور تقریبوں سے لاکھوں کی تعداد میں غیر مسلم آتے تھے اور اپنی خوش اعتقادی کی بنا پر حضرت خواجہؒ کی زیارت کو بھی حاضر ہوتے تھے، بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ میوات کا علاقہ جو حضرت خواجہؒ کے مرکز غیاث پور سے جانبِ جنوب متصلاً واقع ہے اور

---

[۱] دعوت اسلام، ترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی صـ۲۹۷ [۲] فوائد الفواد صـ۱۸۲

جہاں کے رہنے والوں کی رہزنی اور شورہ پشتی کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں شہر پناہ دہلی کے دروازے سرِ شام ہی سے بند ہو جاتے تھے اور جن کی کئی بار غیاث الدین بلبن کو تادیب کرنی پڑی حضرت خواجہؒ کے فیوض و برکات اور اُن کی تعلیم و تربیت سے ضرور مستفید ہوا ہوگا اور عجب نہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں میواتی انھیں کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ہوں۔

چشتی خانقاہوں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بالواسطہ اور بلاواسطہ گرد و پیش کی غیر مسلم آبادیوں کو اپنے اخلاق، روحانیت اور مساوات و اخوت سے جس کی فضا ان خانقاہوں میں قائم تھی ضرور متاثر کیا، اور اُن قوموں کو جو کشف و کرامت اور روحانیت سے خاص طور پر متاثر ہوتی ہیں اسلام میں داخل کرنے کا ذریعہ بنے، پنڈوہ کی چشتی خانقاہ اور احمد آباد اور گلبرگہ کے چشتی مشائخ کے اثر سے غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد کا مسلمان ہونا بالکل قرینِ قیاس ہے، گیارھویں صدی میں سلسلۂ چشتیہ کے مجدد حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کو اشاعتِ اسلام کا بڑا اہتمام تھا، انھوں نے اپنے خلیفہ و جانشین شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں جابجا اس کی تاکید و ہدایت ہے، ان کے مطالعہ سے ان کی اس مسئلہ میں بے چینی اور فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

در آں کوشید کہ صورت اسلام وسیع گردد	اسکی کوشش کرو کہ اسلام کا دائرہ وسیع
وذاکر ایں کثیر۔[1]	اور اسکے حلقہ بگوش کثیر ہوں۔

دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

بہر حال کلمۃ الحق کوشید و از مشرق تا
مغرب ہمہ حقیقی برکنید[2]

---

[1] مکتوبات کلیمی، مکتوب نمبر ۶، صفحہ ۶۰ [2] ایضاً نمبر ۸۰ صفحہ ۶۲

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :۔

"شیخ نظام الدین صاحبؒ کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندو گروہ در گروہ اسلام ہو گئے۔ بعض اپنے رشتہ داروں کے ڈر سے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔"

شاہ کلیم اللہ صاحب ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"و دیگر مرقوم بود بہیہ دیارام و ہندوہائے دیگر بسیار در ربقۂ اسلام آمدہ اند، اما با مردم قبیلہ پوشیدہ می مانند۔"

ساتھ ہی ساتھ اس چیز کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد اپنے مسلمان ہونے کو مخفی رکھے، مبادا بعد موت اُسکے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

"برادرِ من اہتمام نمایند کہ آہستہ آہستہ ایں امر جلیل از بطون بظہور انجامد کہ موت در عقب است، مبادا احکام اسلام بعد از رحلت بجا نیارند و مسلمان حقیقت را بسوزانند دیارام اگر خطے می نویسد، خطے نوشتہ خواہد شد۔"[1]

افسوس ہے کہ کسی نے مشائخ ہندوستان اور بالخصوص سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کی تبلیغی کوششوں کی تاریخ در و ئداد مرتب کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، لیکن تمام مورخین کے نزدیک ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا سب سے بڑا ذریعہ صوفیائے کرام و فقرائے اسلام ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان سلاسلِ تصوف میں سلسلہ چشتیہ اور اُس کے مشائخ کو اولیت اور اہمیت حاصل ہے، اور اس کام میں اُن کا حصہ تناسب سے زیادہ ہے۔

خدمت و اشاعتِ علم

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور اُن کے خلفاء اور اہلِ سلسلہ کو علم کی تحصیل و تکمیل کا جتنا اہتمام تھا اُسکا اندازہ حضرت خواجہ فرید الدینؒ

[1] مکتوب ۲۱ ص ۴۱

کے مقولہ اور خود حضرت خواجہ نظام الدین کے شیخ سراج الدین عثمان اودی (اخی سراج) بانی خانقاہ پنڈوہ کے ساتھ رویہ سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے انکو اس وقت تک اجازت نہیں دی جب تک کہ انھوں نے علم کی تحصیل و تکمیل نہیں کر لی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ رشد و ارشاد اور درس و تدریس اور علم کی اشاعت و ترویج دونوں اس سلسلہ کی تاریخ میں ساتھ ساتھ چلتے رہے اور یہ رفاقت دورِ انحطاط تک قائم رہی حضرت خواجہؒ کے ایک خلیفۂ اجل مولانا شمس الدین یحییٰ تھے جو اس عصر کے بہت سے علماء اور اساتذہ کے استاد تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا مشہور شعر ہے: ؎

سألتُ العلمَ من احیاک حقّا

فقال العلم شمس الدّین یحییٰ

میں نے علم سے پوچھا کہ تمھیں حقیقی حیات کس نے بخشی، اُس نے مولانا شمس الدین یحییٰؒ کا نام لیا۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مخصوص ارادت مندوں و مسترشدین میں قاضی عبد المقتدر کندی (م ۷۹۱ھ) اُن کے شاگرد رشید شیخ احمد تھانیسری (م ۸۲۰ھ) اور مولانا خواجگی دہلوی (م ۸۰۹ھ) ہندوستان کے نامور ترین علماء، استاد الاساتذہ و مجددین علم میں سے ہیں۔ قاضی عبد المقتدر اور مولانا خواجگی کے شاگرد رشید شیخ شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی (م ۸۴۹ھ) فخرِ ہندوستان اور نادرۂ روزگار تھے اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین کے نام سے ہندوستان کی علمی تاریخ میں زندۂ جاوید ہیں، اُن کی شرح کافیہ (جو شرح ہندی کے نام سے عرب و عجم میں مشہور ہوئی) کے محشیوں میں علامہ گازرونی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی جیسی بلند شخصیتیں ہیں، یہ وہی ہیں جنکی علالت کے موقع پر سلطان ابراہیم شرقی نے پانی کا پیالہ بھر کر اُن پر سے تصدق کیا اور دعا کی کہ ملک العلماء میری سلطنت کی آبرو ہیں اگر اُن کی موت مقدر ہی ہے تو اُن کے بجائے مجھے قبول کر لیا جائے۔

اسی سلسلہ کے ایک عالم جلیل مولانا جمال الاولیاء شبلی لوردی (م ۱۰۴۷ھ)

جن کے نامور شاگردوں میں مولانا لطف اللہ کوردی، سید محمد ترمذی کالپوری، شیخ محمد رشید جونپوری اور شیخ لیسین بنارسی جیسے علماء کبار و شیوخ عصر تھے مولانا لطف اللہ کوروی کے شاگرد ہندوستان کے مشہور عالم مولانا احمد امیٹھوی عرف حمید احمد اور قاضی علیم اللہ کچھندی اور مولانا علی اصغر قنوجی تھے جنھوں نے درس و تدریس کا ہنگامہ گرم رکھا اور بڑے بڑے نامور عالم و مدرس اُن کے حلقہ درس سے تیار ہو کر نکلے۔ ٹیلے والی مسجد کا شہرہ آفاق دارالعلوم جس کے مسند نشین حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی (م ۱۲۸۵ھ) تھے اسی سلسلہ سے تعلیمی روحانی نسبت رکھتا تھا خود درس نظامی (جس کی جہانگیری مسلّم ہے) کے بانی ملا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ) اور اُن کے نامور جانشین اور اہلِ خاندان اس سلسلہ سے نسبتِ روحانی رکھتے تھے، اس کے علاوہ عام طور پر بھی مشائخ چشت کا علمی ادبی ذوق، تبحر اور علمی شغف ایک تاریخی حقیقت ہے، جو حضرت نور قطب عالم، حضرت جہانگیر اشرف سمنانی، حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مکتوبات اور پنڈوہ، گلبرگہ، مانک پور، سلون وغیرہ کی خانقاہوں کی علمی سرگرمیوں اور دلچسپیوں سے عیاں ہے۔

خاتمۂ کلام

قبل اسکے کہ سلسلۂ چشتیہ کی تاریخ کا یہ صفحۂ زرّیں ختم کیا جائے، ایک تلخ حقیقت کی طرح اس کا اظہار ضروری ہے کہ زمانہ کے مرور و انقلاب کے ساتھ اس سلسلہ اور اسکے بانیانِ کرام اور اسلافِ عظام کی خصوصیتوں میں انحطاط و زوال رونما ہوا، تصوف و روحانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر سلسلہ کا آغاز جذب قوی سے ہوا، پھر اس نے سلوک اور آخر میں رسوم کی شکل اختیار کر لی، یہاں بھی جس سلسلہ کا آغاز عشق، درد و محبت، زہد و ایثار، فقر و استغنا، ریاضات و مجاہدات اور دعوت و تبلیغ سے ہوا تھا اس میں بتدریج ایسی تبدیلی ہوئی کہ آخر میں اس کے نظام کے تینوں نمایاں عناصر ترکیبی رہ گئے۔

(۱) وحدت الوجود کے عقیدہ میں غلو اس کی اشاعت کا انہماک اور اس کے باریک و دقیق مضامین

(۲) محافلِ سماع کی کثرت، وجد و رقص کا زور۔

(۳) اعراس کا اہتمام اور ان کی رونق و گرم بازاری جو شرعی حدود و قیود سے بے نیاز ہے۔

وہ اعمال و رسوم اور عقائد جن کی اصلاح کیلئے دین خالص کے یہ اولوالعزم داعی ایران و ترکستان کے دور دراز مقامات سے آئے تھے، خانقاہوں کا ایسا دستور العمل بن گئے کہ غیر مسلم آبادی کے لئے یہ ایک معمہ اور سوال بن گیا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں (جن کی اصلاح کے لئے یہ مبلغین اسلام بحر و بر طے کر کے تشریف لائے تھے) عملاً کیا فرق ہے؟ توحید کے لفظ کا استعمال اور دعوت توحید وجودی کے معنی میں محدود ہو کر رہ گئی۔ سنت اور اتباع شریعت جس پر ان مشائخ نے اتنا زور دیا تھا، اہلِ ظاہر کا شعار اور حقیقت ناشناسوں کی علامت بن کر رہ گیا، شریعت و طریقت دو الگ الگ کوچے تسلیم کئے گئے جن میں نہ صرف مغائرت تھی بلکہ تضاد، مزامیر و آلاتِ سماع جن کی مشائخِ متقدمین نے اتنی شدت سے ممانعت کی تھی، داخل طریق بن گئے، درد و عشق کی جنس جو طریقہ چشتیہ کا سرمایہ تھا اس بازار میں ایسی نایاب ہوئی کہ طالبِ صادق کو حسرت سے کہتے ہوئے سنا گیا کہ۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے

فقر جو اس طریق کا فخر تھا شانِ امیری اور شکوہِ خسروی سے تبدیل ہو گیا۔

اس سے بڑھ کر انقلاب اور تاریخ کا سانحہ یہ ہے کہ جن بندگان خدا کا مقصدِ حیات ہی خدا کے سب بندوں کا سر دنیا کے تمام آستانوں ——— سے اٹھا کر خدائے واحد کے آستانہ پر جھکانا اور "ماسوی" میں اٹکے ہوئے اور پھنسے ہوئے دلوں کو نکال کر ایک خدا سے اٹکانا تھا اور جن کی دعوت اور زندگی انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی تصویر اور ان آیات کی تفسیر تھی:۔

ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب — کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تو اس کو

والحکم والنبوۃ ثم یقول	کتاب اور دین کی فہم اور نبوت عطا فرمائے اور پھر
للناس کونوا عبادًا لی	وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تم
من دون اللہ ولکن کونوا	کی توحید کو چھوڑ کر لیکن وہ یہ کہے گا کہ تم اللہ والے
ربانیین بما کنتم تعلمون	بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب الٰہی اوروں کو بھی
الکتاب وبما کنتم تدرسون	سکھاتے ہو اور بوجہ اسکے کہ خود بھی اسکو پڑھتے ہو
ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکۃ	اور نہ وہ یہ بات بتلاوے گا کہ تم فرشتوں کو اور
والنبیین ارباباً ایأمرکم	نبیوں کو رب قرار دے لو۔ بھلا وہ تم کو کفر کی
بالکفر بعد اذ انتم مسلمون ۝	بات بتلاوے گا بعد اس کے کہ تم
(آل عمران - ع ۸)	مسلمان ہو۔

انقلاب زمانہ سے خود اُن کی ذات مطلوب و مقصود اور خود اُن کا آستانہ مسجود و معبود بن گیا۔

مخدوم الملک

شیخ شرف الدّین یحییٰ منیری

رحمۃ اللہ علیہ

(۶۶۱ھ ——— ۷۸۶ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل[1]

حالاتِ زندگی

ولادت سے بیعت و اجازت تک

خاندان احمد نام، شرف الدین لقب، مخدوم الملک بہاری خطاب، والد کا نام شیخ یحییٰ تھا جو زبیر بن عبدالمطلب کی اولاد میں تھے، اس طرح آپ کا خاندان ہاشمی قریشی ہے۔ آپ کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہ اپنے زمانہ کے بڑے علماء و مشائخ میں سے تھے۔ الخلیل[1] (شام) سے نقل سکونت کرکے بہار کے قصبہ سنبھل[2] میں قیام پذیر ہوئے، بعض مصنفین نے آپ کو شہاب الدین غوری کا ہمعصر بتایا ہے۔

---

[1] اب یہ شہر مملکت ہاشمیہ اُردنیہ کا ایک شہر ہے جو بیت المقدس سے تقریباً ۱۵، ۱۶ میل پر واقع ہے، اس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شرفاء اور صلحاء کی یہ قدیم بستی ہے، اپنی آب و ہوا کی لطافت اور اپنے ساکنین کی نرم خوئی، میزبانی اور حسنِ اخلاق میں مشہور رہا ہے۔

[2] اس وقت عام طور پر قصبہ منیر کے نام سے مشہور ہے، لیکن قدیم مآخذ و روایات سے معلوم ہوتا ہے (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

مولانا محمد تاج فقیہؒ کی ذات سے منیر اور اُسکے مضافات میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی، کچھ عرصہ آپ نے منیر میں قیام کرکے وطن کو مراجعت فرمائی اور زندگی کا بقیہ حصہ خلیل ہی میں بسر کیا۔ آپ کا خاندان بدستور منیر میں رہا۔

شیخ احمد شرف الدینؒ کے نانا شیخ شہاب الدین جگ جوتؒ سہروردی سلسلہ کے مشائخ میں تھے ــــ، آبائی وطن کا شغر تھا، ہندوستان تشریف لائے اور موضع جھلی میں قیام فرمایا جو پٹنہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کے مریدین میں سے تھے۔ زہد و ورع اور استقامت میں پایہ بلند رکھتے تھے، اور اسی وجہ سے جگ جوت (دنیا کی روشنی) کے لقب سے مشہور تھے، ان کی ایک صاحبزادی کے بطن سے شیخ احمد شرف الدینؒ اور دوسری صاحبزادی سے شیخ احمد جرم پوشؒ جیسے نامور مشائخ پیدا ہوئے[1]۔ آپ حسینی سادات میں سے تھے، اس طرح شیخ احمد شرف الدینؒ کا سلسلہ مادری سادات میں ہے۔

دصفحہ ۱۷۷ کا بقیہ حاشیہ) اسکا اصلی تلفظ مُنیر تھا فرہنگ ابراہیمی جس کے دوسرے نام شرف نامہ ابراہیمی اور شرف نامہ احمد منیری بھی ہیں اور جو ۸۶۲ھ اور ۸۷۹ھ کے درمیان کی تصنیف ہے، کے مقدمہ میں اُسکے مصنف ابراہیم قوام فاروقی نے اپنے ایک مصرع میں کتاب کا نام اسطرح نظوم کیا ہے۔" ع "شرف نامہ احمد مُنیری" یہ مصرع جب ہی موزوں ہوتا ہے جب مُنیری پڑھا جائے۔ اس کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں اس کو انگریزی میں بھی اسی طرح ضبط کیا گیا ہے یعنی مُنیری (MUNYARI) ۔۱۲

[1] سیرۃ الشرف میں ہے کہ یہ قصبہ ۵۷۶ھ میں مسلمانوں کے ہاتھ فتح ہوا۔ مصنف نے ایک قطعۂ تاریخی نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے: ؎

یافت چوں بر راجۂ منیر ظفر — دادِ امام از دین جہانے راضی ۵۷۶

ہست منقول از بزرگان سلف — سال آں دین محمد شد قوی

(بقیہ ص ۱۷۹ پر)

ولادت شعبان کے آخری جمعہ ۶۶۱ھ میں قصبہ مُنیر میں آپ کی پیدائش ہوئی "شرف آگیں" تاریخ ولادت ہے۔ آپ کے تین بھائی اور تھے: شیخ خلیل الدین، شیخ جلیل الدین اور شیخ حبیب الدین۔

تعلیم جب آپ کی عمر پڑھنے کے قابل ہوئی تو آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ اس زمانہ میں بہت سے ممالک اسلامیہ میں عام طور پر دستور تھا کہ درسی کتابوں کے متون لفظ بلفظ یاد کرائے جاتے تھے اور کچھ لغت کی مختصر کتابیں بھی، تاکہ الفاظ کا ذخیرہ بچپن سے محفوظ ہو جائے۔ شیخ نے اس طرزِ تعلیم پر اپنی بعض بعض تحریروں میں تنقید فرمائی ہے اور قوتِ حافظہ اور وقت کے اس غلط استعمال پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ بجائے قرآن مجید کے ایسی کتابیں رٹائی جاتی ہیں جو دین کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں۔ معدن المعانی کے باب ششم میں فرماتے ہیں:-

در ایام خوردگی چندیں کتابہا مارا یاد گردانیدند چنانکہ مصادر و مفتاح اللغات و جز آں در کتابہا۔ و مفتاح اللغات جزوے بیستے خواہد بود مقدار یک جلد یاد کرانیدند و ہر بار یاد تمام می شنیدند بائیست بجائے آں قرآن یاد می کرانیدند۔[1]	بچپن میں اُستادوں نے بہت سی کتابیں یاد کرائیں، مثلاً مصادر، مفتاح اللغات وغیرہ مفتاح اللغات بیس جزو کی کتاب ہوگی بقدر ایک جلد کے یاد کرائی، ہر مرتبہ زبانی سنتے تھے، اس کے بجائے قرآن مجید یاد کرانا چاہئے تھا۔

افسوس ہے کہ تذکروں میں آپ نے ابتدائی اساتذہ کے نام اور ان کتابوں اور علوم کی تفصیل نہیں ہے

(صفحہ ۱۷۸ کا بقیہ حاشیہ) اس طرح یہ ماننا پڑتا ہے کہ فتح منیر شہاب الدین غوری کی فتح ہندوستان (۵۸۸ھ) سے قبل کا واقعہ ہے کیا مسلمان غزنویوں کے عہد ہی میں بہار، بنگال کی حدود میں پہنچ گئے تھے، اور انھوں نے جا بجا اسلامی عملداری اور قبضہ کی بنیاد ڈال دی تھی؟ تاریخی حیثیت سے یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ [1] معدن المعانی مطبع شرف الاخبار ص ۴۳

جن کی آپ نے وطن میں رہ کر تحصیل کی۔ اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے نیر میں رہ کر متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور وقت کے بڑے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو گئے۔

مولانا شرف الدین ابوتوامہ سے تلمذ اور سنارگاؤں کا سفر

وطن میں رہ کر علم کی تحصیل کے جو مواقع حاصل تھے، جب آپ نے اُن سے فراغت حاصل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی علمی تکمیل و ترقی کے لئے ایک دوسرا انتظام فرمایا۔ دہلی کے اساتذہ میں سے مولانا شرف الدین ابوتوامہ جو شمس الدین التمش کے عہدِ دولت ہی سے علم و تدریس کے نظامِ شمسی کے ایک روشن ستارہ تھے۔ غالباً غیاث الدین بلبن کے عہد میں[1] رجوعِ عام اور بعض حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی بناء پر اشارۂ سلطانی سے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور اس وقت ہندوستان کی اسلامی مملکت کے آخری سرحدی شہر سنارگاؤں[2] کا قصد فرمایا۔ راستہ میں بہار سے گذرتے ہوئے آپ نے چند روز نیر میں قیام فرمایا، جو غالباً اس وقت دہلی سے سنارگاؤں جاتے ہوئے ایک کارواں سرائے اور آباد بستی تھی، اہلِ قصبہ

---

[1] اگر تسلیم کر لیا جائے کہ مولانا شرف الدین ابوتوامہ کے نیر تشریف آوری کے وقت شیخ شرف الدین احمد کم سے کم ۱۲ سال کے تھے تو یہ سنہ ۶۷۳ھ ہوگا، اس طرح یہ زمانہ غیاث الدین بلبن کا ہے جس نے سنہ ۶۶۴ھ سے لیکر سنہ ۶۸۶ھ تک سلطنت کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوتوامہؒ نے سلطان غیاث الدین بلبن کے اشارہ سے ہجرت اختیار کی تھی۔ ع

"رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند"

[2] سنارگاؤں مسلمانوں کے عہد میں مشرقی بنگال کا دارالحکومت تھا، اب یہ ایک غیر معروف مقام ہے جو کس میرسی میں پڑا ہوا ہے اور پینام (PAINAM) کے نام سے ضلع ڈھاکہ میں شامل ہے، دریا برہم پتر اُس سے دو کوس کے فاصلہ پر بہتا ہے۔ سنارگاؤں کے اطراف میں کثیر تعداد میں ویران مسجدوں کے نشانات پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ ایک بڑا اسلامی شہر تھا، یہ اُس شاہی سڑک کا منتہیٰ تھا جس کو شیر شاہ نے بنایا تھا۔ ۱۲

سِکّے اور بانٹ

تنکہ	۱۵۸
جیتل	۷۲
دانگ	۱۵۸

ساز

چنگ	۱۱۹
دف	۹۱
رباب	۱۱۹
شبابہ	۹۱

مدرسے، خانقاہیں اور کتب خانے

انڈیا آفس ۱۷۸
خانقاہ بہار ۳۱۱
خانقاہ مجیبی ۱۵۳
خانقاہ رشیدی ۱۵۳
دارالعلوم دیوبند ۴۹
درگاہ شیخ ضیاءالدین رومی ۷۶
کتب خانہ اصلاح ۳۱۲
مدرسہ معزیہ ۴۷
مرکز دعوت اصلاح و تبلیغ ۱۸
مظاہر العلوم ۴۹

سلسلے

سلسلہ جنیدیہ ۱۸۹
سلسلہ چشتیہ ۸۱، ۱۱۲، ۱۵۱، ۱۶۶، ۱۷۲، ۱۹۰، ۲۳۷
سلسلہ چشتیہ نظامیہ ۱۲۹، ۱۵۳، ۱۵۴
سلسلہ سہروردیہ ۱۷۸، ۱۸۶
سلسلہ شطاریہ ۱۹۱
سلسلہ صابریہ ۱۵۳
سلسلہ فردوسیہ ۱۸۶، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۴، ۳۱۱
سلسلہ کبرویہ ۱۸۹
سلسلہ مہدانیہ ۱۸۹، ۲۰۵

مطابع

مطبع احمدی ۱۸۱
مطبع شرف الاخبار ۱۷۹
مطبع مفید عام آگرہ ۲۳۶
مطبع نورالآفاق ۱۸۳

مرہٹ واڑہ ۱۶۴
مسجد نبوی ۲۶۰
مگدھ ۱۹۸
ملتان ۲۱، ۳۷، ۳۸، ۴۰، ۵۴
منٹگمری ۳۹
منڈھپل ۷۱
منڈھ دروازہ ۷۱
مینر ۱۷۷، ۱۸۳، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۳۸، ۲۱۱
مونگیر ۳۱۱
میاں بازار ۷۱
میدان پور ۱۷
میوات ۱۶۸

ن

نیشاپور ۱۹
نیمروز ۲۴

و

ورنگل ۸۴، ۸۵

ہ

ہانسی ۲۸، ۶۴، ۶۷، ۷۲، ۱۵۶، ۱۵۸
ہلمند ۲۴
ہمایوں کا مقبرہ ۷۵
ہمدان ۱۹
ہندوستان ۱۶، ۲۰، ۲۳، ۲۵، ۳۱
۳۴، ۳۵، ۳۷، ۴۶، ۴۸، ۶۸
۷۲، ۷۹، ۸۲، ۸۳، ۱۰۱، ۱۱۲
۱۱۸، ۱۲۸، ۱۴۱، ۱۴۷، ۱۵۱، ۱۵۳
۱۶۰، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۱
۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۱، ۱۸۴، ۱۹۰، ۱۹۱
۱۹۴، ۲۴۲
۲۹۸

شیرانہ ۲۰۱

ص

صفی پور ۱۵۲

ط

طور سیناء ۲۶۵

ع

عدن ۳۱۱

عراق ۲۰

غ

غزنین ۲۴

غزنین دروازہ ۳۷

غیاث پور ۷۰، ۷۵، ۷۶، ۸۶، ۱۰۵، ۱۴۴، ۱۶۸

ف

فتوحہ ۳۱۱

فرغانہ ۳۱

ق

قرطبہ ۲۱

قزوین ۱۹

قصور ۳۷

قطب صاحب ۳۶

قنوج ۲۵

قیصریل ۷۱

ک

کابل ۳۷

کاشغر ۱۷۸

کپوٹیکا ۱۹۸

کٹڑا ۱۸۹

کشمیر ۱۸۹

کعبہ مکرمہ ۲۵۵

کمال دروازہ ۷۴

کہنوال ۳۷، ۳۸

کیلوکھڑی ۳۲، ۷۵

گ

گلبرگہ ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۶۴، ۱۶۱، ۱۷۲

ل

لاہور ۱۲، ۳۷، ۵۳

لکھنوتی ۱۲۹، ۱۵۲

لکھنؤ ۱۸

م

مالوہ ۱۵۳

مان سرور ۲۶

مانڈو ۱۵۲

مانک پور ۱۵۲، ۱۷۲

مخدوم کنڈ ۱۹۸

مرو ۱۹

خوارزم ۱۹، ۱۸۶، ۱۸۸

ح

دکن ۱۵۳، ۱۶۲
دمشق ۶۹، ۱۰۳
دہلی ۲۱، ۲۵، ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۷، ۳۸، ۴۱، ۴۳، ۴۷، ۵۳، ۵۵، ۵۹، ۶۷، ۷۳، ۷۶، ۷۹، ۸۲، ۸۹، ۹۰، ۹۳، ۹۴، ۱۱۳، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۹، ۱۴۱، ۱۴۷، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۸، ۱۸۰، ۱۸۵، ۱۸۹، ۱۹۲، ۲۰۰، ۲۱۵، ۲۳۷
دیسنہ ۳۱۲
دیگری ۴۸
دیوگیر ۹۳، ۹۴، ۱۵۲، ۱۵۸، ۱۶۳

ڈ

ڈھاکہ ۱۸۰

ر

راج شاہی ۱۶۵
راج گیر ۱۹۷، ۲۰۰
راج گرہا ۱۹۸
رائے بریلی ۱۷
رائے پور ۴۹
رگاب دار کی سرائے ۷۱
رزم ۹۱
روہیل کھنڈ ۵۲
رے ۱۹

ز

زاہدان ۲۴
زرنج ۲۴
زنجان ۱۹
زین آباد ۱۵۲

س

سبزر ۲۴
سجستاں ۲۴
سلون ۱۵۲، ۱۷۲
سمرقند ۱۹
سنارگاؤں ۱۸۰، ۱۸۳، ۲۲۱
سندھ ۲۱
سندیلہ ۳۱۱
سومنات ۲۳
سوستان ۴۷
سیستان ۲۴

ش

شام ۹۱
شاہ آباد ۲۴۵
شیخ پورہ ۳۱۱

بغداد ۱۹، ۴۶، ۴۷، ۵۲
بنسی ۱۵۶، ۱۵۷
بنگال ۱۲۹، ۱۵۲، ۱۶۵، ۱۷۹، ۲۲۱، ۲۳۷
بہار شریف ۲۳۷
بہار ۱۵۲، ۱۷۷، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۳۸، ۳۱۱
بہیا ۱۹۷
بیت المقدس ۱۷۷، ۲۵۵

پ

پاک پتن ۳۹، ۴۵، ۱۶۷
پاکستان ۳۹
پانی پت ۱۸۴
پٹنہ ۱۷۸، ۲۳۵
پٹیالی ۷۴
پشکر ۲۶
پنجاب ۱۶۷
پنڈوہ ۱۲۹، ۱۵۶، ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۷۲
پنیار ۱۸
پونا ۱۶۴
پھلواری شریف ۱۵۳
پیران کلیر ۴۷

ت

ترائن ۲۶
ترکستان ۲۰، ۱۵۸، ۱۷۳
تلونڈی ۲۶
تلنگانہ ۸۴
تھانیسر ۲۶

ٹ

ٹھٹہ ۱۶۲
ٹیلہ والی مسجد ۱۰۲

ج

جامع میری ۸۶
جون پور ۱۵۳
جھٹلی ۱۷۸

چ

چوسہ ۲۴۵
چھپر والی مسجد ۷۱

ح

حبش ۲۶۵
حصار اندرپت ۱۰۵
حوضی رانی ۷۵

خ

الخلیل ۱۷۷، ۱۷۸
خراسان ۲۴، ۵۲، ۱۵۸

ملفوظات ۲۳۹
مناقب الاصفیاء ۸۱، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۷
۱۸۸، ۱۹۰، ۱۹۷، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۵
۲۰۶، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۴، ۲۱۵، ۳۱۱
منتخب التواریخ ۲۰، ۲۶
المنقذ من الضلال ۱۱۲
مونس المریدین ۲۳۹
مونس الفقراء ۱۵۲
مونس القلوب ۲۱۵

ن

النافع ۳۷
نزہۃ الخواطر ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۴۶، ۴۷، ۵۳
۱۵۲، ۱۸۲، ۱۸۹، ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۰۵، ۲۲۹
نفحات الانس ۲۳
نقوشِ سلیمانی ۳۱۲

و

وفات نامہ ۲۲۴، ۲۳۶

ہ

ہدایہ ۵۷
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت
۶۵، ۶۹، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۷، ۸۸
۱۲۲

مقامات و عمارات

الف

اجمیر ۲۵، ۲۷، ۳۰، ۳۲، ۳۴، ۱۶۷
اجودھن ۳۹، ۴۰، ۴۵، ۵۵، ۶۰، ۶۵
۶۶، ۶۸-۷۰، ۷۴، ۸۳
احمد آباد ۱۵۲، ۱۶۹
افغانستان ۲۴
انگلی ۲۴۷
اوچ ۴۰
اودھ ۱۴۸، ۱۵۲، ۱۵۳
اوش ۳۱
ایران ۲۰، ۲۴، ۵۲، ۱۷۳

ب

باغ حیرت ۷۵
بام ہزار ستون ۸۸، ۱۴۷
بخارا ۱۹، ۴۶، ۴۷، ۵۲
بدایوں ۵۲، ۵۳، ۵۵، ۶۰، ۶۹، ۷۱
برہان پور ۱۵۲
بشنالہ ۷۴، ۷۵

عوارف المعارف ۶۲، ۱۴۶، ۱۸۶

ف

فتاوی تاتارخانی ۱۹۵
فرہنگ ابراہیمی ۱۷۸
فوائد رکنی ۲۳۹
فوائد الفواد ۱۲، ۱۷، ۵۰، ۵۳، ۵۵، ۵۶، ۵۸، ۶۰، ۶۲، ۶۳، ۶۶، ۶۹، ۷۰، ۷۳، ۷۴، ۷۸، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۴۶، ۱۶۷، ۱۶۸
فوائد مریدین ۲۳۹

ق

قوت القلوب ۱۴۶

ک

کشاف ۱۲۶
کشف المحجوب ۱۴۶
کنز المعانی ۲۳۹

گ

گل رعنا ۱۵
گل فردوس ۱۹۳
گنج لایخفی ۲۱۵، ۲۳۹

ل

لباب الالباب ۱۵
لطائف اشرفی ۲۳۶، ۲۳۷
لطائف المعانی ۲۳۹
لوائح حضرت قاضی حمید الدین ناگوری ۱۴۶

م

مآثر الکرام ۲۷، ۲۹
مخبر الواصلین ۴۵، ۶۶
المدہش ۲۴۲
مرصاد العباد ۱۴۶
مشارق الانوار ۵۷، ۱۲۷
مشکوٰۃ ۱۳۷
مصباح الہدایت ۱۱۷
معجم البلدان ۳۱
معدن المعانی ۱۷۹، ۲۰۲، ۲۲۹
مفتاح اللغات ۱۷۹
مفصل ۱۲۶
مقاماتِ حریری ۵۷
مکتوباتِ سہ صدی ۲۴۵
مکتوبات صدی ۲۴۵
مکتوباتِ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ۲۴۵
مکتوباتِ عین القضاۃ ۱۴۶
مکتوبات کلیمی ۱۶۹

خ

خزینۃ الاصفیاء ۳۱، ۴۵، ۶۶، ۱۸۶، ۱۹۳

۱۹۴

خمسہ نظامی ۱۲۷

خوان پُر نعمت ۱۸۱، ۲۲۴، ۲۳۹

خیر المجالس ۳۹، ۸۹، ۱۳۴

د

دعوتِ اسلام ۱۶۸

راحۃ القلوب ۳۷، ۲۳۹

رسالہ در طلبِ طالبان ۲۳۹

رسالہ قشیری ۱۴۶

رسالہ کمیہ ۲۳۹

رقعات عالمگیری ۲۴۲

رقعات السلاطین ۱۶۵

ز

زاد سفر ۲۳۹

س

سراج المجالس ۵۰، ۵۴، ۷۷

سیرت سید احمد شہیدؒ ۱۷

سیرۃ الشرف ۱۷، ۱۷۸، ۱۸۲، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۳۸، ۲۳۹

سیر العارفین ۴۴، ۵۵، ۵۶، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۰

سیر الاقطاب ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۱۱۵

سیرۃ الاولیاء ۱۷، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۶، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۵۰، ۵۲، ۵۴، ۵۷، ۵۸، ۶۱، ۶۲، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۷۰، ۷۲، ۷۴، ۷۶، ۷۸، ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۸، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۷، ۹۸، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۴، ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۶۰

ش

شرح آداب المریدین ۲۳۹

شرح تعرف ۱۴۶

شرح کافیہ ۱۷۱

شرف نامہ ابراہیمی ۱۷۸

شرف نامہ احمد منیری ۱۷۸

ص

صید الخاطر ۲۴۲

ط

طبقات ناصری ۱۵، ۲۵، ۲۶

ع

عقائد اشرفی ۲۳۹

کتابیات

الف

آثار الصنادید ۷۵
آئین اکبری ۳۰
اجمیر گزیٹیر ۲۶
اجوبہ ۲۳۹
احسن التقاسیم ۲۴
احیاء العلوم ۱۴۶، ۲۸۹
اخبار الاخیار ۳۴، ۴۱، ۴۶
ارشاد السالکین ۲۳۹
ارشاد الطالبین ۲۳۹
ازالۃ الخفا ۲۴۲
افضل الفوائد ۱۲
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۵۳
انیس الغربا ۱۵۲

ب

بحر المعانی ۲۳۹
بزم صوفیہ ۴۴، ۱۴۱

ت

تاریخ دعوت و عزیمت
تاریخ فرشتہ ۲۶، ۳۲، ۳۴، ۸۸، ۹۳، ۹۴، ۱۶۰، ۱۶۴
تاریخ فیروز شاہی (ضیاء برنی) ۲۰، ۲۱، ۵۵، ۸۵، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۶
تاریخ فیروز شاہی (سراج عفیف) ۱۵۱، ۱۶۰
تاریخ مشائخ چشت ۴۹، ۱۵۱، ۱۵۶
رسالہ تبصرہ ۱۸۷
تحفہ اثنا عشریہ ۲۴۲
تحفہ غلبی ۲۳۹
ترجمہ احیاء العلوم ۱۴۶
تذکرۃ الرشید ۱۵۴
تذکرۃ العاشقین ۴۵، ۶۶
تغلق نامہ ۸۸
تمہید ابو شکور سالمی ۶۲

ث

الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ۱۲۷

ج

جغرافیۂ خلافت مشرقی ۲۴
جوامع الکلم ۱۲، ۷۳، ۱۳۱

ح

حسرت نامہ ۹۲، ۱۴۱

مولانا نظام الدین (خال زادہ مخدوم الملک) ۲۳۹
مولانا نظام مولی بہاری ۱۹۹، ۲۰۱
حاجی نظام غریب ۲۳۶
نعمت خان عالی ۲۴۲
حضرت خواجہ نقشبند ۲۰۵
حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام ۲۵۱
مولانا نور ترک ۳۸
صاحبزادہ نورالدین ۱۵۷
قاضی نورالدین ۲۳۰، ۲۳۵
حضرت نور قطب عالم ۱۵۲، ۱۶۵، ۱۷۲
خواجہ نور محمد ۱۵۱
شاہ نیاز احمد بریلوی ۱۵۱

و

شیخ وجیہہ الدین پاٹلی ۱۵۰
شیخ وجیہہ الدین یوسف ۱۵۳
سید وحید الدین رضوی ۲۳۷، ۲۳۹
قاضی جلال الدین الولوالجی ۸۹، ۹۰
حضرت شاہ ولی اللہ ۲۴۲
ولیسل دیو ۲۵

ہ

ہلال ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۵
ڈاکٹر ہنٹر ۱۹۷
ہیون سانگ ۱۹۸

شاہ معین الدین کرجوی ۱۵۳
مولانا مغیث الدین ۱۵۳
قاضی مغیث الدین بیانوی ۸۴، ۸۵
خواجہ ملک ۲۲۶، ۲۳۱
مولانا مناظر احسن گیلانی ۱۷، ۶۴، ۶۸، ۷۹، ۱۲۲
قاضی منتخب ۶۷
منور ۲۳۳، ۲۳۵
شیخ قطب الدین منور ۴۶، ۹۸، ۱۴۹، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۲۰۰
قاضی منہاج الدین جوزجانی ۱۵، ۲۵
مولانا منہاج الدین ترمذی ۳۷
خواجہ قطب الدین مودود ۲۳
خواجہ محمد موسیٰ ۴۷، ۱۲۳
مولانا روم ۱۰۳، ۲۶۷
خواجہ موید الدین کردی ۱۵۰، ۱۵۵
خواجہ موید الدین انصاری ۱۵۰
قاضی مینا ۲۳۰

ن

سلطان ناصر الدین محمود ۴۰، ۵۵۰، ۱۶۹
مولانا قطب الدین ناقلہ ۵۶
شیخ نجم الدین رازی ۱۸۸
شیخ نجم الدین صغریٰ ۳۲، ۱۹۱، ۱۹۲
خواجہ نجم الدین کبریٰ ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۹، ۲۰۵
مولانا سید نجم الہدیٰ ندوی ۱۸
شیخ نجیب الدین فردوسی ۱۸۲، ۱۸۵، ۹۴، ۱۹۷، ۲۳۷
شیخ نجیب الدین متوکل ۵۹، ۶۰، ۶۳، ۶۴، ۱۰۷
شیخ نصر الدین ۴۵
مولانا نصیر الدین جونپوری ۲۲۹، ۲۳۸، ۲۴۷
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ۱۲، ۱۵، ۱۷، ۳۶، ۳۹، ۴۰، ۴۲، ۴۴، ۴۵، ۴۸، ۵۰، ۵۲، ۵۳، ۵۷، ۶۱، ۶۴، ۶۵، ۶۸، ۷۳، ۸۲، ۸۹، ۹۷، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۹، ۱۲۲، ۱۳۱، ۱۳۵، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۶، ۱۵۲، ۱۵۸، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۰، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۳۸، ۲۳۹
خواجہ نظام الدین ۴۵
مولانا نظام الدین شیرازی ۱۵۰
شیخ نظام الدین اورنگ آبادی ۱۶۹
ملا نظام الدین ۱۷۲
مولانا نظام الدین کوہی ۲۳۰
مولانا نظام الدین ۲۳۳
مولانا نظام الدین مفتی ۲۳۳

گوتم بدھ ۱۹

حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز ۱۲، ۱۳۱، ۱۵۱

ل

مولانا لطف اللہ کوڑوی ۱۷۲

مولانا لطف الدین ۲۳۹

م

(شیخ محمد بن احمد) الماریکلی مشہور بہ کمال الدین زاہد ۵۷، ۱۲۶

اخی مبارک ۱۰۰

شیخ مبارک گوپاموی ۱۵۰

نور الدین مبارک ۵۰، ۷۰، ۷۱

شیخ مجد الدین بغدادی ۱۸۴

مجد الملک ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۱۵

تاج العارفین شاہ مجیب اللہ قادری ۱۵۳

حضرت موسیٰ علیہ السلام ۲۷۲، ۳۰۰

حضرت مریم علیہا السلام ۳۰۱

حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی ۴۹

خواجہ محمد امام ۴۷، ۱۲۳

محمد بن قاسم ثقفی ۲۱

(سلطان) محمد تغلق ۴۵، ۴۶، ۹۳، ۱۰۰، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۶۲

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی ۱۳۰، ۱۸۹، ۲۰۴، ۲۴۲، ۲۸۳، ۲۸۴

صوفی محمد حسین صاحب ۲۲۴

سلطان محمد شاہ بہمنی ۱۶۲، ۱۶۴

علامہ محمد طاہر فتنی ۱۲۷

شہاب الدین محمد غوری ۲۲، ۲۴، ۲۷، ۵۲، ۱۷۷، ۱۷۹

سید محمد کالیوی ۱۷۲

حضرت شاہ محمد بلیا ۱۰۴، ۱۵۳

محمد میوہ فروش ۷۲

سلطان محمود غزنوی ۲۲، ۲۴

شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب ۴۹

مولانا محمود صوفی ۲۳۴

مولانا محی الدین کاشانی ۹۰، ۹۲، ۱۵۰

مخلص الملک ۱۵۶

مولوی مراد اللہ صاحب ۱۸، ۳۱۱، ۳۱۲

علامہ برہان الدین مرغینانی ۵۷، ۱۲۶

شیخ شرف الدین المزوقانی ۱۸۹

بی بی مستورہ ۴۵

مولوی سید مشرف علی ندوی ۱۸

مولانا مظفر بلخی ۲۲۲، ۲۲۹، ۲۳۸، ۳۱۱

خواجہ معز الدین ۲۳۲، ۲۳۹

حضرت خواجہ معین الدین چشتی ۱۵، ۲۲، ۲۴، ۲۷، ۳۰، ۳۲، ۳۴، ۳۶، ۴۴، ۸۲، ۱۲۲، ۱۶۶، ۱۹۲

۶۰، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷
۶۸، ۷۳، ۷۴، ۸۲، ۱۰۲، ۱۱۳، ۱۲۲
۱۲۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۶۷، ۱۷۱
شیخ فریدالدین ۲۳۴، ۲۳۸
مولانا فصیح الدین ۱۰۴، ۱۵۰
مولانا فضل اللہ (ملک زادہ) ۲۳۶، ۲۳۸
فیروز تغلق ۱۵۱، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۹۵
۲۰۱، ۲۱۵
رکن الدین فیروز شاہ ۲۲۱، ۲۵۳
سلطان المشرق فیروز شاہ ۲۲۱، ۲۴۷

ق

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ۴۹
محمد قاسم (مصنف تاریخ فرشتہ) ۹۳
قاضی خاں ۲۳۲، ۲۳۹
قاضی الفاضل ۲۴۱
قتلغ خاں ۷۴
ملک قرابیگ ۸۴، ۸۵
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ۳۰ - ۳۸
۴۳، ۷۳، ۱۴۴، ۱۹۰، ۱۹۲
شیخ الاسلام سید قطب الدین احمد مدنی ۱۸۹
شیخ قطب الدین دبیر ۱۵۹، ۱۹۰
قطب الدین (مرید مخدوم الملک) ۲۳۸
شیخ قطب الدین ۲۴۷
سلطان قطب الدین (مبارک شاہ) ۸۶ - ۸۹
قطب الدین ایبک ۵۳، ۱۸۹
قطب عالم عبداللہ الحسینی ۱۵۳
مولانا قمر الدین ۲۳۸
امیر قیرک ۱۲۰

ک

مولانا کاشانی ۱۱۶
ملک کافور ۸۴
مولانا کرم الدین ۲۳۸
خواجہ کریم الدین سمرقندی ۱۵۰
حضرت کعب بن مالکؓ ۶۳
شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی ۱۵۱، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۲
علامہ کمال الدین ۱۵۱
شیخ کمال الدین ناگوری ۱۵۳
شیخ کمال الدین مالوی ۱۵۳
مولانا کمال الدین سنتوکی ۲۴۷
بابا کمال الدین جندیدی ۱۸۴
راجہ کنس ۱۶۵
جزا کنندگھم ۱۹۸
معز الدین کیقباد ۷۵، ۸۲

گ

علامہ گازرونی ۱۷۱
گنج شکر (دیکھئے حضرت خواجہ فریدالدین)

تاریخ

دعوت و عزیمت

حصّہ سوم

حضرت خواجہ مُعین الدین چشتی رح

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح

حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رح

سوانح حیات، صفات و کمالات و تجدیدی و

اِصلاحی کارنامے،

تلامذہ و منتسبین و مُسترشدین کا تذکرہ و تعارف

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

مجلس نشریاتِ اسلام

۱۔کے ۳۰ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

جملہ حقوق طباعت واشاعت پاکستان میں
بحقِ فضل ربی ندوی محفوظ ہیں۔

مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

• ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ • رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
• صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ • رکن مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
• رکن عربی اکادمی دمشق • رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
• رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ • رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
• رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
• سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
• صدر اسلامی سینٹر آکسفورڈ

نام کتاب ——— تاریخ دعوت وعزیمت
تصنیف ——— مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
طباعت ——— احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ——— ۳۳۶ صفحات
ٹیلیفون : 6601817

اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔ کے۔۲ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
حرفِ آغاز	۱۱
باب اوّل	
۱۹ ۵۱	
ہندوستان میں چشتی سلسلہ اور اسکے اکابر شیوخ	
عالم اسلام کا نیا روحانی و فکری مرکز	۱۹
اسلامی ہند کے معمار	۲۱
ہندوستان سے چشتیوں کا پہلا تعلق	۲۲
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	۲۴
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ	۳۱
حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ	۳۶
باب دوم	
۵۲ ۱۰۱	
سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ	
کے حالات و کمالات	
نام و نسب	۵۲
ابتدائی تعلیم و تربیت	۵۳
فقر و فاقہ اور والدہ کی تربیت	۵۴
شیخ کبیرؒ سے مناسبت اور قلبی کشش	۵۴
دہلی کا سفر	۵۵
دہلی میں طالبِ علمی	۵۵

مضمون	صفحہ
استاد کے محبوب	۵۶
علمی امتیاز و تفوق	۵۶
حفظ مقامات اور اس کا کفارہ	۵۷
حدیث کی اجازت	۵۷
قلبی بیچینی اور انجذاب الی اللہ	۵۸
والدہ صاحبہ کا انتقال	۵۸
والدہ کی یاد	۵۸
والدہ کا یقین و توکل	۵۸
ایک تمنائے خام	۵۹
اجودھن کی پہلی حاضری	۶۰
طالب یا مطلوب	۶۰
مربی کی خاطر	۶۰
بیعت	۶۱
سلسلۂ تعلم کا اجراء یا	
انقطاع؟	۶۱
شیخ کبیرؒ سے درس	۶۲
درس کی لذت	۶۲
خود شکنی کی تربیت	۶۲
فیصلہ کن موقع	۶۴
ایک رفیق کی ملامت	۶۵

مضمون	صفحہ
کتنے بار حاضری ہوئی	۶۶
شیخ کی نوازشیں	۶۶
رخصت اور وصیت	۶۷
ایک دعا کی درخواست	۶۷
اجودھن سے دہلی کو	۶۸
تصفیۂ حقوق	۶۹
دہلی کی قیام گاہیں	۷۰
فقر و فاقہ	۷۲
غیر کے واسطہ کے بغیر	۷۳
شیخ کبیرؒ کی وفات	۷۳
غیاث پور کا قیام	۷۴
رجوعِ عام	۷۶
فقیر و منعم	۷۷
بیداری پر پہلا سوال	۷۸
دنیا سے تنفر اور بذل و عطا	۷۸
زمین و جائداد سے پرہیز	۷۸
فقیر کا شاہی دسترخوان	۷۹
شیخؒ کی غذا	۸۱
ترتیب	۸۱
سلاطینِ عہد سے بے تعلقی	۸۱
سلطان علاء الدین کا امتحان اور عقیدت	
بادشاہ کے آنے سے معذرت	۸۴
گھر کے دو دروازے	۸۴
غمِ اسلام	۸۴
سلطان قطب الدین کی مخالفت	۸۶
اور اس کا قتل	۸۶
غیبی لنگر	۸۸
غیاث الدین تغلق کا عہد اور	
سرکاری مجلسِ مناظرہ	۸۹
مجلسِ مناظرہ کا حال حضرت	
خواجہؒ کی زبان سے	۹۲
دہلی کی تباہی	۹۳
نظام الاوقات	۹۴
امیر خسروؒ کی خصوصیت	۹۴
شبِ کی تیاری	۹۵
سحری	۹۶
صبح کے وقت	۹۶
دن میں	۹۷
دلداری و تربیت	۹۷
قربِ سفر	۹۷
خلفائے کبار کو اجازت نامے	
اور	
ان کی محبت و مواخات	۹۰
وفات کا حال	۹۸

باب سوم

۱۰۲ ——— ۱۱۲

(اخلاق وصفات)

جامع اوصاف ۱۰۲
اخلاص ۱۰۳
دشمن نوازی ۱۰۵
پردہ پوشی ونکتہ نوازی ۱۰۷
شفقت وتعلق ۱۰۸
غمخواریٔ عام ۱۰۹
چھوٹوں پر شفقت ۱۱۱

باب چہارم

۱۱۳ ——— ۱۲۵

(اذواق وکیفیات)

محبت وذوق ۱۱۳
سماع ۱۱۵
مزامیر سے نفرت وممانعت ۱۱۹
سماع میں آپ کی کیفیت ۱۲۰
ذوقِ قرآن ۱۲۲
شیخؒ سے تعلق ۱۲۳
جماعت کا اہتمام اور بلند ہمتی ۱۲۴
شریعت کی پابندی اور اتباعِ سنت کا اہتمام ۱۲۴

باب پنجم

۱۲۶ ——— ۱۳۴

(افادات وتحقیقات)

علمی پایہ ۱۲۶
علمی وادبی مناسبت ۱۲۶
حدیث وفقہ پر نظر ۱۲۷
اہمیت علم ۱۲۸
بلند علوم ومضامین ۱۲۹
علوم صحیحہ شرعیہ ۱۳۰
حلال مانعِ راہِ خدا نہیں ۱۳۰
قلب متوجہ الی اللہ کے بعد کوئی چیز مضر نہیں ۱۳۱
ترکِ دنیا کی حقیقت ۱۳۱
طاعت لازم ومتعدی ۱۳۲
کشف وکرامات حجاب راہ ۱۳۲
علوم انبیاءؑ واولیاءؒ ۱۳۲
دنیا کی محبت اور عداوت ۱۳۳
مراتب تلاوتِ قرآن ۱۳۳

باب ششم

۱۳۵ ——— ۱۵۴

(فیوض وبرکات)

تجدید ایمان وتوبۂ عام ۱۳۵
بیعت ایک عہد ومعاہدہ ۱۳۷
عموم بیعت کی حکمت ۱۳۹

مضمون	صفحہ
عمومی زندگی پر اثر	۱۴۱
عشق کا روزبازار	۱۴۶
خلفاء کی تربیت	۱۴۷
چشتی خانقاہیں	۱۴۹
مریدین باختصاص	۱۵۰
باب ہفتم	
۱۵۵ ——— ۱۷۴	
(حضرت خواجہ کی تعلیم و تربیت کے اثرات)	
آپ کے خلفاء کی دینی و اصلاحی خدمات	۱۵۵
سلاطین وقت سے بے رعبی اور حق گوئی	
کے نمونے	۱۵۶
اسلامی سلطنت کی رہنمائی و نگرانی	۱۶۰
اشاعتِ اسلام	۱۶۶
خدمت و اشاعتِ علم	۱۷۰
خاتمۂ کلام	۱۷۲
مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ	
سنہ ۶۶۱ھ ——— سنہ ۷۸۶ھ	
باب اوّل	
۱۷۵ ——— ۱۸۵	
(ولادت سے بیعت تک)	
خاندان	۱۷۷

مضمون	صفحہ
ولادت	۱۷۹
تعلیم	۱۷۹
مولانا شرف الدین ابو توامہؒ سے تلمذ	
اور سنارگاؤں کا سفر	۱۸۰
ازدواج	۱۸۲
مراجعتِ وطن	۱۸۲
سفر دہلی اور انتخابِ شیخ	۱۸۴
بیعتِ شیخ نجیب الدین فردوسی	۱۸۵
باب دوم	
۱۸۶ ——— ۱۹۵	
(ہندوستان میں سلسلۂ فردوسیہ،	
اُس کے مشائخ کبار)	
خواجہ نجم الدین کبریٰؒ	۱۸۶
ہندوستان میں اس سلسلہ کی آمد	۱۸۹
سلسلۂ فردوسیہ ہندوستان میں	۱۹۰
خواجہ بدر الدین سمرقندیؒ	۱۹۰
خواجہ رکن الدین فردوسیؒ	۱۹۳
خواجہ نجیب الدین فردوسی	۱۹۴
باب سوم	
۱۹۶ ——— ۲۰۲	
(مجاہدہ و خلوت، قیام و سکونت	
اور ارشاد و تربیت)	

مضمون	صفحہ
دہلی سے واپسی	۱۹۶
شورشِ عشق	۱۹۷
راجگیر کے جنگل میں	۱۹۷
بہار کی سکونت اور خانقاہ کی تعمیر	۱۹۹
افادہ وارشاد	۲۰۲
باب چہارم	
۲۰۵ ـــــ ۲۲۲	
(صفات وخصوصیات)	
فنائیت	۲۰۵
علوِ اخلاق	۲۱۰
رحمت وشفقت	۲۱۲
دنیا سے بے لوثی وبے تعلقی	۲۱۵
علوہمت	۲۱۶
تجرید وتفرید	۲۱۸
امر بالمعروف اور مسلمانوں کے حالات ومعاملات کی فکر	۲۲۱
اتباعِ سنّت	۲۲۲
باب پنجم	
۲۲۵ ـــــ ۲۳۹	
(وفات)	
نماز جنازہ اور تدفین	۲۳۶
اولاد واعقاب	۲۳۷

مضمون	صفحہ
ممتاز مریدین وخلفاء	۲۳۸
تصنیفات	۲۳۹
باب ششم	
۲۴۰ ـــــ ۲۴۷	
(مکتوبات)	
مکتوبات اور ان کا علمی وادبی پایہ	۲۴۰
مکتوبات کے مجموعے اور انکے مکتوب الیہ	۲۴۵
مضامین کا ماخذ	۲۴۷
باب ہفتم	
۲۴۹ ـــــ ۲۶۶	
(مقامِ کبریا)	
بے نیازیٔ سلطانِ عالم	۲۴۹
دریائے رحمت کا جوش	۲۶۱
صلائے عام	۲۶۳
کریم نکتہ نواز	۲۶۴
توبہ کی تاثیر	۲۶۶
باب ہشتم	
۲۶۷ ـــــ ۲۸۱	
(مرتبۂ انسانیت)	
ایک انقلاب انگیز دعوت	۲۶۷

مضمون	صفحہ
خالق کی نظرِ خاص	۲۶۸
امانت محبت	۲۷۰
حاصلِ وجود	۲۷۲
بارِ امانت	۲۷۳
ذرۂ خاک کا اقبال	۲۷۴
سرِّ الٰہی کا حامل	۲۷۶
مسجود و محسود	۲۷۸
دل آگاہ	۲۷۹
شکستہ تر، عزیز تر	۲۸۱
محبت کی فرمانروائی	۲۸۱
باب نہم	
۲۸۳ ——— ۲۹۵	
(تحقیقات و علوم عالیہ)	
بلند و لطیف علوم و مضامین	۲۸۳
وحدۃ الشہود	۲۸۳
تغیر صفات میں ہے نہ کہ ذات میں	۲۸۶
تیز رفتار کی حرکت نظر میں نہیں آتی	۲۸۷
خواہشاتِ نفسانی کا ازالہ مقصود نہیں	
شکستگی مقصود ہے	۲۸۹
کرامت بھی ایک بُت ہے	۲۹۱
کشوف و کرامات اور استدراج	۲۹۲
فضیلتِ خدمت	۲۹۴
نفس کی اصلاح کا معیار	۲۹۵

مضمون	صفحہ
باب دہم	
۲۹۸ ——— ۳۱۲	
(حفاظتِ دین و حمایتِ شریعت)	
ایک اصلاحی و تجدیدی کارنامہ	۲۹۸
نبوت ولایت سے افضل ہے	۲۹۹
انبیاءؑ کی ایک سانس تمام اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے	۳۰۲
انبیاءؑ کا جسم اور اولیاءؒ کا قلب	۳۰۲
شریعت کا لزوم و دوام	۳۰۲
شریعت کی پابندی ہمیشہ ضروری ہے،	۳۰۴
بقاءِ شریعت کا راز	۳۰۵
ایک بلیغ مثال	۳۰۵
علماء اور مشائخ کاملین کا اسوہ	۳۰۷
شریعت کی شرط	۳۰۹
اتباعِ محمدیؐ سے چارہ نہیں	۳۱۰
سلسلۂ فردوسیہ کی اشاعت اور اس کے بعض مرکز	۳۱۱
حضرت مخدوم صاحبؒ کے بعض دو ہے اور ہندی فقرے	۳۱۲

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

(اقبالؒ)

ز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

الحمدللہ کہ تاریخ دعوت وعزیمت کا تیسرا حصہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے دوسرے اور تیسرے حصے کے درمیان اتنا طویل وقفہ پیش آیا کہ مصنف کی طبیعت افسردہ اور شائقین مایوس سے ہو گئے۔ اس عرصہ میں مصنف کے کوتاہ قلم سے متعدد کتابیں نکلیں اور شائع ہوئیں، جتنی تاخیر ہوتی جا رہی تھی اتنا ہی یہ اندیشہ بڑھ رہا تھا کہ خدانخواستہ یہ مفید سلسلہ بہت سے قدیم مصنفین کی اہم کتابوں اور خود اپنے بعض سلسلۂ تصانیف کی طرح ناتمام نہ رہ جائے، شاید ایسا ہی ہوتا اور کم سے کم یہ کہ یہ وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا، اگر اس میں ایک قابلِ صد احترام اور واجب التعمیل اشارہ اور تقاضا شامل نہ ہوتا۔

میرے مُربّی رُوحانی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہ نے تاریخ دعوت وعزیمت کو بار بار سن کر اور بار بار اپنی مجالس میں پڑھوا کر، تصنیف اور مصنف کی عزت و ہمت

بڑھائی، ان دو جلدوں کے بعد حضرت موصوف نے تیسری جلد کا تقاضا فرمایا اور اپنے خادم کو اس کی تکمیل کی بار بار ہدایت فرمائی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں باہر سے حاضرِ خدمت ہوا، تو پہلا سوال یہ ہی فرمایا گیا کہ تیسرا حصّہ مکمل کر لیا؟ بعض مرتبہ میں نے اپنی الجھنیں عرض کیں سنتے ہی ارشاد ہوا کہ تیسرا حصّہ تو مکمل ہی کر لیجیے! پھر جب حضرت والا کو یہ معلوم ہوا کہ یہ حصّہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی قدس اللہ سرہٗ کے تذکرہ پر مشتمل ہوگا تو اپنے تعلقِ روحانی اور نسبت خاص کی بنا پر حضرت کی طرف سے اس کا اور بھی تقاضا ہوا، ادھر اس عاجز کا یہ حال ہو گیا تھا گویا اس نے قلم رکھ دیا ہے اور اس موضوع سے مناسبت جاتی رہی ہے یہاں تک کہ جون ۶۱ء میں ایک بار جب حاضرِ خدمت ہوا تو حضرت کی مجلس مبارک میں حضرت خواجہ کا وہ مجموعہ پڑھا جا رہا تھا جو افضل الفوائد کے نام سے امیر خسروؒ کی طرف منسوب ہو کر لاہور سے شائع ہوا ہے اور ایک عزیز دوست تحفۃً لائے تھے، یہ مجموعہ ایسے غیر مستند مضامین اور بے اصل روایات پر مشتمل ہے کہ اس کا سننا بھی تحقیقی اور تاریخی ذوق رکھنے والوں پر بلکہ مذاقِ سلیم پر سخت بار ہے، اس کی نسبت امیر خسروؒ کی طرف قطعاً مشکوک ہے۔ حضرت خواجہ گیسو درازؒ جنکے اور سلطان المشائخ کے درمیان صرف ایک ہی واسطہ اور وہ بھی حضرت چراغ دہلیؒ کا ہے اور جو اسی خانوادۂ عالی کے چشم و چراغ اور محرمِ اسرار ہیں۔ صاف فرماتے ہیں کہ فوائد الفواد کے علاوہ ملفوظات کے جتنے مجموعے مشہور ہیں یا دہ ہوائی ہیں[1]۔ مجلس میں یہ کتاب پڑھی

---

[1] "ملفوظ شیخ نظام الدین کہ امیر حسن شاعر جمع کردہ است آں معتبر است و ملفوظہائے دیگر کہ ازاں شیخ بمشتہ اند ہمہ باد ہوا است۔" (جوامع الکلم)

جارہی تھی، حضرت کبھی کبھی اس کے مضامین پر استعجاب کا اظہار فرماتے، نیمباز مگر دلنواز نگاہیں جو کبھی کبھی مصنف پر بھی پڑجاتیں اشارہ اشارہ میں کہتیں کہ اگر کوئی مستند کتاب موجود ہوتی تو ایسی غیر مستند کتابوں کی کیا ضرورت تھی؟ یہ نگاہ دل میں تیر کی طرح پار ہوگئی اور وہیں دل نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں اس کام کو انجام دینا ہے' اور یہ ارمغان پیش کرنا ہے۔

اس کام میں توقف ہونے کا ایک سبب راہ کی دشواریاں بھی تھیں، ہندوستان کے اولیائے کرام، داعیانِ اسلام اور مشائخ عظام کے تذکرہ میں بیشمار کتابیں لکھی گئیں، ان میں بڑی بڑی ضخیم تصنیفات بھی ہیں، لیکن جب اس عصر کا کوئی مصنف ان کے ایسے حالات جمع کرنے کے بیٹھتا ہے جن سے ان کے اصل کمالات، ان کی دینی و تبلیغی مساعی، ان کی تعلیم و تربیت کے نتائج، ان کے مزاج و مذاق پر روشنی پڑے اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے یہ حالات سبق آموز، شوق انگیز اور ہمت آفریں ہوں' اور بحیثیت ایک جلیل القدر اور کامل انسان کے ان کے حالات منظر عام پر آئیں' اور ان کی سوانح کا صحیح ڈھانچہ سامنے آجائے تو اس کو سخت مایوسی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات صدہا صفحات کی ایک کتاب سے بلکہ متعدد کتابوں کی مدد سے بھی ایک صفحہ کے بقدر بھی مواد حاصل نہیں ہوتا، عظیم ترین شخصیتوں کے تذکروں اور سوانح حیات میں اتنے بڑے بڑے خلا نظر آتے ہیں جن کو کسی قیاس اور عبارت آرائی سے بھرا نہیں جاسکتا۔ پوری پوری کتاب خوارق و کرامات، محیر العقول واقعات اور عجائبات سے بھری ہوتی ہے اور ضروری معلومات کا افسوسناک فقدان نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے مؤرخ کو (جس نے اپنی علمی اور تصنیفی ضرورت سے ہندوستان کی تاریخ کا ایسا وسیع مطالعہ کیا ہے جس کی نظیر دورِ حاضر میں ملنی مشکل ہے، اور اعیان و مشاہیر ہند کا تذکرہ آٹھ ضخیم جلدوں

میں مرتب کیا ہے[1]) اس صورتِ حال پر اس طرح شکوہ سنج پایا گیا:۔

"ملک کی بدمذاقی دیکھئے کہ ابتدا سے اب تک ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی کتاب تاریخ نویسی کے صحیح معیار پر نہیں اترتی، جس کتاب کو اٹھا کر دیکھیے معلوم ہوتا ہے کہ رزم بزم کا کوئی افسانہ ہے۔ قرناد کوس کے ذکر سے اگر کوئی صفحہ خالی ملے گا تو چنگ و رباب کے ذکر سے آپ اس کو خالی نہ پائیں گے۔ اگر مقفیٰ عبارتوں اور مسجّع فقروں کے خارزار میں آپ کا دامن الجھ گیا تو یہ بھی ملنے کا نہیں۔ ایسی حالت میں کیا توقع ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی علمی زندگی کی صحیح تصویر ایسے مرقع میں پائیں ـــــ کچھ ان بزرگوں کے حالات میں کتابیں ملتی ہیں جو کسی سلسلۂ طریقت کے ساتھ مربوط تھے، مگر اس بدمذاقی کا کچھ ٹھکانا ہے کہ آپ ان کتابوں سے ان کے نام و نسب، نشو و نما، تعلیم و تربیت طریقۂ ماندو بود اور علمی مشاغل کی نسبت تحقیق کرنا چاہیں تو ایک حرف نہ ملیگا، قرناد کوس کا تو یہاں کچھ کام نہیں، مگر چنگ و رباب یہاں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، مصنف کا سارا زور اُن کے کشف و کرامت کے بیان کرنے پر صرف ہو جاتا ہے اور اس کو اس حد تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ماوراء کوئی اور ہستی نظر آتے ہیں، وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ سوتے ہیں نہ خصائصِ انسانی سے ان کو سروکار ہے نہ علمی مشاغل سے ان کو کچھ واسطہ ہے"

---

[1] نزہۃ الخواطر عربی اتا ۸ جو پانچ ہزار شخصیتوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

ان کا صرف یہ کام ہے کہ وہ قانونِ فطرت کو ہمیشہ توڑتے رہیں اور موالید ثلاثہ و
عناصر اربعہ پر اپنی حکومت وخود مختاری کو کسی طرح قائم رکھیں۔[1]"

اس دقت کا اگر آپ عملی تجربہ کرنا چاہیں تو ہندوستان میں سلسلۂ چشت کے بانی بلکہ ایک طرح سے اس ملک میں سلسلۂ اسلامی کے بانی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور ان سے حضرت کی کوئی مختصر سوانح مرتب کرنے کی کوشش کیجئے، شاید یہ خیال ہو کہ وہ مسلمانوں کا ابتدائی عہد تھا، تصنیف وتالیف کے دور کا پورے طور پر آغاز نہیں ہوا تھا، اگرچہ یہ صحیح نہیں ہے، اور اسی دور میں ہم کو قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی کی کتاب طبقات ناصری اور نور الدین محمد عوفی کی کتاب لباب الالباب بھی ملتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ساتویں صدی کی تصنیفات ہیں، لیکن اگر اس کو کسی طرح تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائیگا کہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ (متوفی ۶۶۶ھ) ایک عظیم روحانی پیشوا اور جلیل القدر مصلح تھے جنھوں نے اپنے زمانہ کو متاثر کیا اور ایک ایسے شہر میں زندگی گذاری جو اپنے عہد میں ہندوستان کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا، سیاسی حالات میں اعتدال واستقرار بھی پیدا ہو چکا تھا، لیکن اس عظیم الشان شخصیت کی سوانح نگاری اور اس کے کارناموں کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے مواد کی بے حد کمی ہے، مگر خوارق وتصرفات اور کشف و کرامات کے واقعات کی کوئی کمی نہیں۔

اس لحاظ سے حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت مخدوم الملک

---

[1] یاد ایام (تاریخ گجرات) ص۵۸ و ص۵۹ از مولانا حکیم سید عبد الحیؒ مصنف نزہۃ الخواطر و گل رعنا (م ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء)

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ جو آٹھویں صدی کی دو نامور شخصیتیں اور عظیم الشان روحانی مربی اور مصلح ہیں، خاص امتیاز و انفرادیت رکھتے ہیں، کئی صدیوں تک کسی شیخِ طریقت اور کسی دینی شخصیت کے حالات اتنی روشنی میں نہیں ہیں جتنے ان دونوں بزرگوں کے۔ یہ مواد اس لحاظ سے بھی خصوصیت رکھتا ہے کہ وہ ان حضرات کے ملفوظات اور مکتوبات سے ماخوذ ہے، یا معاصر تاریخوں اور ان کے خدام و مریدین کی کتابوں سے، اس لحاظ سے مؤرخ کو یہاں کم سے کم دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انتخاب و تحقیق کا کام یہاں بھی ضروری ہے کہ واقعات و بیانات میں سخت انتشار و تضاد نظر آتا ہے۔

لیکن ان دونوں شخصیتوں کے انتخاب کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان سے متعلق تاریخی مواد آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے، یہ بات اور بھی بہت سی شخصیتوں کو حاصل ہے، اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ہندوستان میں (جو ساتویں صدی کے بعد سے عالمِ اسلام کا مرکزِ اعصاب اور احیا و تجدید کی تحریکوں کا منبع ہے) ان دونوں حضرات نے روحانی و اصلاحی تحریک کی قیادت کی اور اپنے زمانہ اور بعد کی نسلوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

حالات و تعلیمات کے انتخاب میں مصنّف نے ہمیشہ ان اجزاء و مضامین کو اہمیت دی ہے جو اس نسل کے لئے مفید، سبق آموز، قابلِ تقلید، عام فہم اور دلنشیں ہوں اور جن سے غلط فہمی اور غلط روی کا کم سے کم اندیشہ ہو، وہ خود بھی فلسفۂ الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق سے کم مناسبت رکھتا ہے اور اپنے قارئین کو بھی اس امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتا، اس کے نزدیک ایمان و یقین، عشق و محبّت، درد و سوز، جذبۂ اتباعِ سنّت، عزیمت، علوِ ہمّت، ذوقِ دعوت و تبلیغ، اصلاحِ اعمال و اخلاق اور صحیح علوم و دینی حِکَم و معارف ان بزرگوں کا

اصل جوہر اور ان کی سوانح حیات کا اصل پیام ہے۔ راقم سطور نے سیرت سید احمد شہیدؒ کے مقدمہ میں اپنے مسلک کی معذرت اور وضاحت کرتے ہوئے ایک شعر لکھا تھا جو صورتِ حال کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، اسی کا اعادہ یہاں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ؎

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے
جو چُبھے دل میں، وہی تنکے لئے

شاید مصنّف کی دوسری ذمہ داریاں اور نہ ختم ہونے والے مشاغل اتنی جلدی کتاب کی تکمیل کی مہلت نہ دیتے اور اس میں مزید تاخیر ہوتی، مگر اپنے وطن (رائے بریلی) کی سُئی ندی کے سیلاب نے ایک گاؤں (میدان پور) میں محصور کر کے اس کا سامان فراہم کر دیا کہ جو کام مہینوں میں ہوتا وہ خدا کی مدد سے چند ہفتوں میں ہو گیا۔ وللہ جنود السمٰوات والارض۔

مصنّف کا اخلاقی فرض اور احسان شناسی ہے کہ وہ اپنے محسنین و معاونین کا شکریہ ادا کرے۔ قدیم مآخذ میں مصنّف سب سے زیادہ سیر الاولیاء کے مصنّف امیر خورد اور فوائد الفواد کے مصنّف امیر حسن علاء سنجری کا ممنونِ احسان ہے کہ انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی سوانح حیات و تعلیمات کا سب سے زیادہ مفصل اور مستند مواد فراہم کیا۔ حضرت مخدوم الملک بہاریؒ کے حالات میں سیرۃ الشرف سے بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی اور اس سے قدیم تر مآخذ کا پتہ چلا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی تصنیفات اور مضامین ہمیشہ کی طرح بڑے مفید اور مددگار ثابت ہوئے، کاش ان کو دونوں حضرات کی مکمل سوانح حیات مرتب کرنے کا موقع ملتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس موضوع سے فطری مناسبت اور ذوق اور تاریخ ہندوستان کا وسیع علم عطا فرمایا تھا، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی بیش قیمت تصنیف نزہۃ الخواطر نے حسب معمول تاریخ و تذکرہ

کے ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا کام دیا اور مصنف نے اس سے اس طرح مدد لی اور بار بار رجوع کیا جیسے کوئی طالب علم لغت اور ڈکشنری سے بار بار مدد لیتا ہے اس موضوع پر وسیع مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کی نظر کتنی وسیع وعمیق تھی اور ان کا انتخاب وہذاق کتنا پاکیزہ اور شائستہ ہے۔

اپنے معاونین میں ناچیز مصنف جناب مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی دسنوی اور عزیز گرامی مولوی مراد اللہ صاحب منیری ندوی کا ممنون ہے جنھوں نے حضرت مخدوم الملکؒ کی سوانح حیات اور تصنیفات میں سے بعض نادر چیزیں فراہم کیں۔ عزیزی مولوی شبیر عطا ندوی سلمہٗ (جن کو تاریخی وعلمی ذوق اپنے نامور والد سے ورثہ میں ملا ہے) سے بھی بعض ضروری معلومات کے حصول میں مدد ملی۔ عزیز سعید مولوی سید مشرف علی ندوی بھی مصنف کے شکریہ کے بڑے مستحق ہیں۔ مصنف نے کتاب کا بڑا حصہ املا کیا اور آں عزیز نے بڑی ہمت اور محنت سے لکھا۔ مولوی اقبال احمد صاحب اعظمی بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بھی وقتاً فوقتاً مدد کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں اور عزیزوں کو جزائے خیر عطا فرمادے اور ان کے عمل کو قبول کرے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا، وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ

ابوالحسن علی

مرکز دعوت اصلاح وتبلیغ

لکھنؤ

۱۱ صفر ۱۳۸۲ھ
۲۴ جولائی ۶۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

ہندوستان میں چشتی سلسلہ اور اُسکے اکابر شیوخ

عالمِ اسلام کا نیا رُوحانی وفکری مرکز

چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اس صدی کے آخر میں وسیع اسلامی دنیا میں ایک ایسے نئے وسیع ملک کا اضافہ ہو رہا تھا جو قدرتی خزانوں اور انسانی صلاحیتوں سے مالا مال تھا اور جس کے لئے مستقبل قریب میں اسلامی دعوت کا عالمگیر مرکز اور اسلامی علوم کا محافظ وامین بننا مقدر ہو چکا تھا۔

اس صدی کے اوائل میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالمِ اسلام پر مور وملخ کی طرح یورش کی، ملک کے ملک ان کی بربریت اور وحشیانہ مظالم سے تاراج اور بڑے بڑے نامی گرامی شہر جو کبھی علم وتہذیب کے علمبردار اور مدارس وخانقاہوں سے یکسر گلزار ہو رہے تھے بے چراغ ہو گئے شہروں کا امن وسکون، زندگی کا نظم ونسق اور شرفاء کی عزت وناموس خاک میں مل گئے، بخارا، سمرقند، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم اور بالآخر مرکزِ خلافت دارالسلام بغداد اس فتنۂ جہاں سوز

کی لپیٹ میں آگیا اور قدیم تہذیب کا مدفن بن کر رہ گیا۔ اس بلائے ناگہانی سے عالم اسلام کی چولیں ہل گئیں اور پوری قدیم اسلامی دنیا پر سیاسی زوال اور فکری و علمی اضمحلال کے سیاہ بادل چھا گئے۔ اس وقت اس پورے عالم اسلام میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جو اس فتنۂ عالم آشوب سے محفوظ رہ گیا تھا۔ یہاں تازہ دم، قوی اور پرجوش ترکی النسل خاندانوں کی حکومت تھی، جو اُن تاتاریوں اور مغلوں سے بخوبی پنجہ آزمائی کر سکتے تھے اور اپنی ایمانی قوت اور نئے اسلامی جوش کی بنا پر جنگی قوت اور شجاعت میں نہ صرف اُن کے حریف بلکہ ان سے فائق تھے، تاتاری اور مغل بار بار ہندوستان پر حملے کرتے رہے اور پسپا ہوتے رہے، صرف سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں چنگیزی مغلوں نے پانچ بار ہندوستان پر حملہ کیا، پہلا حملہ ۶۹۶ھ میں ہوا، چوتھے اور پانچویں حملے میں سلطان کی طرف سے ملک تغلق (ملک غازی) نے جوہرِ مردانگی دکھائے اور مغلوں کو اس طرح شکستِ فاش دی کہ :-

"دراں روز بار مغول را ہوس ہندوستان بردل سرد شد، و دندانِ طمع کند گشت[1]" (اس دن سے مغلوں کی ہندوستان کی ہوس سرد ہوگئی، اور اُن کے دندان حرص و آز ہمیشہ کے لئے کھٹے ہو گئے)۔

ان خصوصیات کی بنا پر عالم اسلام کے بہترین خاندان جن کو اپنا ناموس اور ایمان عزیز تھا اور بہترین دل و دماغ جو اپنے بدقسمت وطن میں سکون و اطمینان سے محروم ہو گئے تھے، ہندوستان کے جدید دارالامن اور دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئے۔ لائق ترین انسانوں اور شریف ترین خاندانوں کا یہ سیلاب ایران، ترکستان و عراق کی طرف سے بار بار

---

[1] منتخب التواریخ ص۱۸۶ و تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی ص۲۵۱ و ص۳۰۲ و ص۳۲۰ و ص۳۲۳ ۔

امنڈتا رہا اور ان کی وجہ سے دہلی ایک بین الاقوامی شہر اور رشکِ بغداد و قرطبہ بن گئی، نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کے دوسرے شہر اور قصبات شیراز و یمن کی ہمسری کرنے لگے۔ مورخینِ ہندوستان ضیاء الدین برنی وغیرہ جب ان شریف و نجیب خاندانوں، اساتذۂ وقت، علماء نامدار اور مشائخ کبار کی فہرست سناتے ہیں جو فتنۂ تاتار میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے اور ہنگامۂ درس و تدریس اور ارشاد و تلقین گرم کئے ہوئے تھے، نیز جنھوں نے سلطنت کی نازک ترین ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں اور ملک کی زیب و زینت کا باعث تھے، تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالمِ اسلام کا جوہر شرافت و فضیلت یہیں آگیا تھا۔[1]

اس انقلاب سے ہندوستان نہ صرف عالمِ اسلام کا ایک اہم حصہ بن گیا تھا، بلکہ تاریخ کا صاف اشارہ تھا کہ وہ اسلام کی فکری و روحانی قوت، علمی تحریکات اور احیاء و تجدید کا نیا مرکز بن رہا ہے، اور فکرِ اسلامی اور دعوت و عزیمت کے مورخین کو اب مسلسل کئی صدیوں تک اپنی توجہ اسی پر مرکوز کرنی پڑے گی۔

اسلامی ہند کے معمار

اسلامی دنیا کے لئے ہندوستان کی دریافت اور یافت "نئی دنیا" کی دریافت سے کم انقلاب انگیز اور عہد آفریں واقعہ نہ تھا، اگرچہ پہلی صدی ہجری ہی میں یہاں اسلام کے حوصلہ مند دستے آنے شروع ہو گئے تھے اور ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے سندھ سے ملتان تک کے علاقہ کو اپنی شمشیر و اخلاق سے تسخیر کر لیا تھا، اور اس برِ صغیر (ہند) میں جا بجا داعیان اسلام کے مرکز و خانقاہیں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح قائم ہو چکی تھیں، جیسے ع

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی ص۱۱۱ و ص۱۱۲

لیکن حقیقتاً ہندوستان کی فتح کا سہرا سکندرِ اسلام سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کے سر اور مستحکم و مستقل اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین محمد غوری (م ۶۰۲ھ) کے حصے میں تھی اور آخری طور پر اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح حضرت خواجۂ بزرگ شیخ الاسلام معین الدین چشتیؒ (م ۶۲۷ھ) کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

ہندوستان کی فتح سے پہلے اسلام کے چاروں مشہور روحانی سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ وجود میں آچکے تھے اور عرصہ سے پھل پھول رہے تھے، اپنے اپنے وقت پر ان میں سے ہر ایک کا فیض ہندوستان کو پہنچا اور ہندوستان کی اسلامی تعمیر و تشکیل میں سب کا حصہ ہے۔ شکر اللہ مساعیہم لیکن ہندوستان کی روحانی فتح اور اس سرزمین پر اسلام کا پودا نصب کرنے کے لئے (جس کے سایہ اور پھل سے ایک عالم مستفید ہونے والا تھا) حکمتِ الٰہی نے چشتی سلسلہ کو انتخاب فرمایا۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ۔

ان اسرارِ الٰہی سے قطع نظر جن کو ہماری کوتاہ نظر نہیں پا سکتی، چشتیوں پر اس ملک کا حق ہمسائگی بھی تھا، ان کا سلسلہ اس ملک کے ہمسایہ ملک ایران میں فروغ پا رہا تھا، اپنے دردمند مزاج اور نسبتِ عشقیہ کی بنا پر بھی جو سلسلۂ چشتیہ کا سرمایہ ہے اس سلسلہ کو ہندوستان کا دل جیت لینا اور اس کو اپنی محبت کا اسیر اور عشقِ الٰہی کا نخچیر بنا لینا آسان تھا کہ زمانۂ قدیم سے محبت و درد اِس سرزمین کے خمیر میں ہے۔

ہندوستان سے چشتیوں کا پہلا تعلق

غرض ان معلوم و نامعلوم حکمتوں کی بنا پر قدرت الٰہی نے ہندوستان میں اسلام کے تعارف اور اشاعت کے لئے اس سلسلہ کو انتخاب فرمایا اور چشتیوں کو ہندوستان کی طرف رُخ کرنے کا اشارۂ غیبی ہوا۔ سب سے پہلے جس چشتی شیخ نے ہندوستان کی طرف عنانِ عزیمت

موڑی وہ خواجہ ابو محمد[1] چشتی تھے، جن کی دعائیں اور بابرکت ذات سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی پشت پناہ تھی، مولانا جامی "نفحات الانس" میں لکھتے ہیں:۔

وقتے کہ سلطان محمود بہ غزو سومنات[2]	جس وقت سلطان محمود سومنات کی طرف
رفتہ بود خواجہ را در واقعہ نمودند کہ	گیا ہوا تھا خواجہ ابو محمد کو اشارۂ غیبی
بمددگاری وے باید رفت در سن ہفتاد	ہوا کہ اس کی مدد کیلئے جائیں، وہ ستر برس
سالگی با در ویشے چند متوجہ شد چوں	کی عمر میں چند درویشوں کیساتھ روانہ
آں جا رسید بہ نفس مبارک خود با مشرکان	ہوئے اور وہاں پہنچ کر بنفس نفیس
وعبدۂ اصنام جہاد کرد[3]	جہاد میں شرکت فرمائی۔

---

[1] خواجہ ابو محمد چشتی (م ۴۰۹ھ یا ۴۱۱ھ) خواجہ ابو احمد کے فرزند و خلیفہ تھے جو خواجہ ابو اسحاق شامی کے خلیفۂ اعظم اور خواجہ ناصر الدین ابو یوسف کے شیخ و مرشد تھے، خواجہ ناصر الدین ابو یوسف، خواجہ قطب الدین مودود کے شیخ ہیں، اور وہ حاجی شریف زندنی کے۔ حاجی شریف زندنی کے خلیفہ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ اُن کے خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔

[2] سلطان محمود نے سومنات پر حملہ ۴۱۶ھ میں کیا، اگر خواجہ ابو محمدؒ کا سنہ وفات مذکورۂ بالا صحیح ہے تو اس سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا، غالباً مولانا جامی کی مراد حملۂ ہندوستان سے ہے، انھوں نے اسکو حملۂ سومنات سے تعبیر کیا ہے کہ ہندوستان سے باہر سب سے زیادہ اسی کارنامہ کی شہرت ہوئی۔ سومنات پر حملہ کرنے سے پہلے ہندوستان پر محمود کے ۸ حملے ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی حملے میں (اغلب ہے کہ پہلے حملے میں) شیخ ابو محمدؒ ساتھ رہے ہوں گے۔

[3] نفحات الانس ص ۲۲۳

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

لیکن جس طرح محمود کی سیاسی فتح کی تکمیل اور اسلامی سلطنت کے استحکام و استقلال کی سعادت سلطان شہاب الدین غوری کیلئے مقدر تھی، خواجہ ابو محمد چشتیؒ کے کام کی تکمیل اور اسلام کی عمومی اشاعت اور اسلامی مرکزِ رشد و ہدایت کا قیام اسی سلسلہ کے ایک شیخ، شیخ الشیوخ خواجہ معین الدین سجزیؒ[1] کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔

---

[1] خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اصل نسبت سجزی ہے، جو کاتبوں کی غلطی اور بولنے والوں کی غلط فہمی سے "سنجری" بن گیا۔ قدیم مسودات و اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں سَجَزی ہی لکھا اور بولا جاتا تھا۔ سَجَزی نسبت سجستان کی طرف ہے۔ قدیم جغرافیہ نویس عام طور پر اسکو خراسان کا ایک حصہ مانتے ہیں، موجودہ زمانے میں اس کا اکثر حصہ ایران میں، شامل ہے اور باقی افغانستان میں۔

اس علاقہ کا پایۂ تخت زرنج تھا جس کے کھنڈر اب زاہدان کے قریب پائے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ میں سجستان کے حدود غزنین تک تھے۔ (احسن التقاسیم)

بعض جغرافیہ دانوں کے نزدیک سَجَز، سجستان کے ایک خاص مقام کا نام ہے، جس کی طرف نسبت سَجَزی آتی ہے۔ کبھی کبھی پورے سجستان کی طرف بھی سجزی کہہ کر نسبت کرتے ہیں۔

جغرافیہ خلافت مشرقی کے مصنف جی بی اسٹرینج نے ۳۰ صفحوں میں سجستان کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیستان فارسی لفظ سنگستان سے ماخوذ ہے، عرب اسے سجستان کہتے ہیں۔ اس ملک کی زمین نشیب میں ہے اور جھیل زرہ کے گرد اور اسکے مشرق میں واقع ہے، دریائے ہلمند اور جس قدر دریا اس جھیل میں گرتے ہیں، ان سب کے ڈیلٹا اسی زمین میں پڑتے ہیں۔

فارسی میں سیستان کو نیمروز یا جنوبی ملک بھی کہتے ہیں اور جنوبی ملک کہنے کی وجہ یوں بیان ہوئی ہے کہ سیستان خراسان کے جنوب میں واقع ہے ص ۵۰۳ و ص ۵۰۴

قدیم تر مورخین (جن میں طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی بھی شامل ہیں جو حضرت خواجہ کے کمسن معاصر ہیں[۱]) کا بیان ہے کہ حضرت خواجہؒ سلطان شہاب الدین غوری کے اس لشکر کے ساتھ تھے جس نے والی اجمیر رائے پتھورا (پرتھوی راج)[۲] کو شکست دی اور ہندوستان کی فتح کی

---

[۱] قاضی صاحب کی ولادت ۵۸۹ھ میں ہوئی۔ ۱۲

[۲] پرتھوی راج یا رائے پتھورا (۱۱۷۵ - ۱۱۹۲ء) سومیشور کا بیٹا تھا، جو اجمیر کے چوہان حکمراں خاندان کے بانی "اروناراجہ" کا فرزند اور اس خاندان کے نامور فرمانروا دگرہ راجہ عرف ولیل دیو کا بھائی تھا۔ "سومیشور" کا دہلی کے تومر راجپوت حکمراں خاندان اور اجمیر کی چوہان شاخ پر یکساں اقتدار تھا، سومیشور دہلی کے آخری تومر فرمانروا انند پال (انگ پال) کا داماد تھا اور اس رشتہ سے پرتھوی راج دہلی کے آخری فرمانروا کا نواسہ ہوتا تھا۔ انند پال کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس نے پرتھوی راج کو متبنیٰ کیا تھا، اس کے انتقال پر دہلی کی سلطنت پرتھوی راج کے حصہ میں آئی اور اجمیر کی سلطنت اس نے اپنے باپ سومیشور سے وراثت میں پائی، اس طرح وہ راجپوتوں کی دو طاقتور مرکزی سلطنتوں دہلی و اجمیر کا مالک ہوا، چونکہ اجمیر سے اس کا آبائی اور وطنی تعلق تھا اور وہ اس کی دادھیالی گدی تھی، اس لئے اغلب ہے کہ اس کا زیادہ تر قیام اجمیر میں رہتا تھا، اس وجہ سے اجمیر اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی مرکز تھا۔ پرتھوی راج اپنی ذات سے بڑا حوصلہ مند، منچلا فنون سپہ گری میں طاق اور بہادر راجپوت تھا، اس نے بہت سی جنگوں میں نمایاں فتوحات حاصل کیں، جنھوں نے ایک صدی تک اس کے نام کو زندہ اور روشن رکھا۔ قنوج کے راجہ جے چند کی بیٹی کو "سویمبر" سے لے آنے کی وجہ سے وہ ان داستانوں اور نظموں کا ہیرو بن گیا جو اب تک شمالی ہند میں گائی اور پڑھی جاتی ہیں، وہ اپنی سپہ گری، حوصلہ مندی اور فتوحات کی بنا پر ہندوستان کے دورِ آخر کے بہادر راجپوتوں اور طاقتور رہنماؤں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے لیکن اس کی آخری شکست نے اسکی عظمت پر پردہ ڈال دیا، اور تاریخ ہند نے اس کا قصور معاف نہیں کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تکمیل کی، اس فتح میں ان کی دعاؤں، توجہات اور روحانیت کا بہت بڑا حصّہ تھا[1]۔

بعد کے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نے شہاب الدین غوری کے حملوں کے درمیان (جو ۵۷۹ھ سے ۶۰۲ھ تک جاری رہے) ابتدائے سنین ہی میں اجمیر میں جو اسوقت راجپوت طاقت وحکومت اور ہندو مذہب و روحانیت کا بہت بڑا مرکز[2] تھا) قیام اختیار

(صفحہ ۲۵ کا بقیہ حاشیہ) ۱۱۹۱ء (۵۸۷ھ) میں جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا، پرتھوی راج نے ترائن (حال تلونڈی) کے مقام پر جو تھانیسر سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ایک منظم فوج کے ساتھ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سلطان کو شکست فاش دی۔ اگلے سال ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ میں سلطان نے بڑی تیاری اور نئے عزم کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ دوبارہ حملہ کیا، پرتھوی راج تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی میدان میں لایا، ۱۵۰ راجپوت راجگان اپنی فوجوں کے ساتھ تھے۔ پرتھوی راج نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ اور اس طرح راجپوتوں کی آزاد سلطنت اور ہندوستان کی قدیم فرمانروائی کا خاتمہ ہوا۔

(پروفیسر الیشوری پرشاد اور دوسرے مورخین باختصار)

---

[1] طبقات ناصری ص۳۰۰ + فرشتہ ص۵۷ + منتخب ص۵۰۔

[2] اجمیر سے ۷ میل شمال پشکر، ایک مشہور مذہبی تیرتھ گاہ تھی جس کی یاترا کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے، اسکی جھیل کو جو مذہبی تقدس حاصل تھا اس میں صرف مان سروور کی جھیل اس کی ہمسری کر سکتی ہے۔ پشکر کی جھیل کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ برہما نے یہاں یگ کیا اور یہاں پر سرسوتی اپنے پانچ دھاراؤں سے پرکٹ ہوتی ہیں۔ (اجمیر ڈسٹرکٹ گزیٹیر ص۱۸)

فرمالیا تھا۔ ابھی غوری کے حملوں نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور اسکی ترکتازیاں شمالی مغربی ہندوستان تک محدود تھیں کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کردیا، رائے پتھورا نے کسی مسلمان کو (جو غالباً اُس کے دربار سے متعلق تھا) اذیت پہنچائی، حضرت خواجہؒ نے اس کی سفارش کی۔ پتھورا نے متکبرانہ اور توہین آمیز جواب دیا اور کہا کہ "یہ شخص یہاں آیا ہوا ہے اور ایسی اونچی اونچی باتیں کہتا ہے جو کسی نے نہ دیکھیں نہ سنیں۔ حضرت خواجہ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ "ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کرکے (محمد غوری کو) دے دیا۔" اس کے بعد ہی محمد غوری نے حملہ کیا، پتھورا نے مقابلہ کیا، اور شکست کھائی[1]

بہرحال واقعہ کی جو ترتیب ہو اس میں شک نہیں کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے محمد غوری کے حملوں کے درمیان اور اسلامی سلطنت کی عمومیت و استحکام سے پیشتر ہندوستان کے قلب اور قدیم ہندوستان کے عظیم سیاسی و روحانی مرکز اجمیر کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا، یہ فیصلہ ان کی اولوالعزمی عالی ہمتی اور جرأت ایمانی کا ایسا تابناک کارنامہ ہے جس کی مثالیں صرف پیشوایانِ مذاہب اور فاتحین عالم کی تاریخوں میں مل سکتی ہیں۔ ان کے استقلال و اخلاص، ان کے توکل و اعتماد، ان کے زہد و قربانی اور انکے درد و سوز کی وجہ سے ہندوستان کے لئے دارالاسلام بننے کا فیصلہ کردیا اور جو سرزمین ہزاروں برس صحیح یقین اور صحیح معرفت سے محروم اور توحید کی صدا سے ناآشنا تھی وہ علماء و اولیاء کی سرزمین اور علوم اسلامیہ اور کمالاتِ دینیہ کی محافظ و امین بن گئی اور اس کی فضائیں اذانوں سے اور دشت و جبل اللہ اکبر کی صداؤں سے اور اسکے شہر و دیار قال اللہ و قال الرسول کے نغموں سے ایسے گونج گئے کہ صدیوں سے عالم اسلام گوش برآواز ہے۔ ع جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۲۷، آثار الکرام

سیر الاولیاء کے مصنف نے بڑی صداقت و بلاغت سے لکھا ہے:۔

مملکت ہندوستان تا حد برآمدن آفتاب
ہمہ دیارِ کفر و کافری و بت پرستی بود،
و متمردان ہند ہر یکے دعوائے انا ربکم الاعلیٰ
می کردند و خدائے را جل و علا شریک میگفتند
و سنگ و کلوخ و دار و درخت و ستور و گاؤ
سر گیں آں را سجدہ می کردند و ظلمت کفر
قفل دل ایشاں مظلم و محکم بود۔ ؎
ہمہ غافل از حکم دین و شریعت
ہمہ بے خبر از خدا و پیمبر
نہ ہرگز کسے دیدہ ہنجار قبلہ
نہ ہرگز شنیدہ کسی اللہ اکبر
وصول قدم مبارک آں آفتاب اہل
یقیں کہ بہ حقیقت معین الدین بود ظلمت ایں دیار
بنور اسلام روشن و منور گشت۔ ؎
از تیغ او بجائے صلیب و کلیسا
در دار کفر مسجد و محراب و منبر است
آنجا کہ بود نعرہ و فریاد مشرکاں
اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر است

ملک ہندوستان اپنے آخری مشرقی
کنارہ تک کفر و شرک کی بستی تھی، اہلِ
تمرد "انا ربکم الاعلیٰ" کی صدا لگا رہے تھے
اور خدا کی خدائی میں دوسری ہستیوں کو
شریک کرتے تھے، اور اینٹ، پتھر،
درخت، جانور، گائے و گوبر کو سجدہ کرتے تھے
کفر کی ظلمت سے ان کے دل تاریک اور
مقفل تھے، سب دین و شریعت کے حکم سے
غافل، خدا و پیمبر سے بے خبر تھے، نہ کسی نے
کبھی قبلہ کی سمت پہچانی، نہ کسی نے
اللہ اکبر کی صدا سنی، آفتاب اہل یقین
حضرت خواجہ معین الدینؒ کے قدم مبارک
کا اس ملک میں پہنچنا تھا کہ اس ملک
کی ظلمت نور اسلام سے مبدل ہو گئی
ان کی کوشش و تاثیر سے جہاں شعائرِ
شرک تھے وہاں مسجد و محراب و منبر نظر
آنے لگے، جو فضا شرک کی صداؤں سے
معمور تھی، وہ نعرۂ اللہ اکبر سے گونجنے لگی۔

هر که ازیں دیار مسلمان شد و تا روز قیامت
مسلمان خواهد شد او و فرزندان الیشاں تا
توالدوا تناسلوا است مسلمان خواهند
بود و آں طائفہ را کہ بہ تیغ اسلام از
دار حرب در دار اسلام خواهند آورد
الی یوم القیمۃ مثوبات آں ببارگاہ
باجاہ شیخ الاسلام معین الدین سجزی
قدس اللہ سرہ العزیز متابعت حضرت
او واصل و متواصل خواهند بود
انشاء اللہ العزیز۔

اس ملک میں جس کو دولتِ اسلام ملی
اور قیامت تک جو بھی اس دولت سے
مشرف ہوگا نہ صرف وہ بلکہ اس کی
اولاد در اولاد، نسل در نسل سب انکے
نامۂ اعمال میں ہوں گے اور اس میں
قیامت تک جو بھی اضافہ ہوتا رہیگا اور
دائرۂ اسلام وسیع ہوتا رہے گا قیامت
تک اس کا ثواب شیخ الاسلام معین الدین حسن
سجزی کی روح کو پہنچتا رہے گا۔

اس طرح ہندوستان اور ہندوستان میں جو کچھ خدا کا نام لیا اور اسلام کا کام کیا گیا وہ سب چشتیوں اور ان کے مخلص و عالی ہمت بانیِ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حسنات اور کارناموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک پر اس سلسلہ کا حق قدیم ہے، مولانا غلام علی آزاد نے صحیح لکھا ہے:۔

لاشک بزرگان چشت عنبر سرشت را
حقی است قدیم بر ولایت ہند۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ بزرگانِ
سلسلۂ چشت کا ملک ہندوستان پر حق قدیم ہے

اور صاحب سیر الاقطاب کا یہ لکھنا بھی صحیح ہے:۔

---

[1] سیر الاولیاء ص۴۷ [2] مآثر الکرام ص۷

بہ ہندوستان بہ یمن قدوم میمنت لزومش	ہندوستان میں انکے دم قدم کی برکت سے
طریقۂ اسلام ظاہر گشت و سیاہی کفر و	اسلام کی اشاعت ہوئی اور کفر کی ظلمت
شرک از عرصۂ روزگار بزدود[1] ــــ	یہاں سے کافور ہوئی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حیات ہی میں ہندوستان کی سیاسی مرکزیت اور اقتدار اجمیر سے دہلی منتقل ہو گیا، اور اجمیر نے اپنی اہمیت بہت کچھ کھو دی۔ خواجہ بزرگؒ نے دہلی میں اپنے جانشین و خلیفۂ اعظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بٹھایا اور خود اجمیر ہی میں مقیم رہے جہاں تبلیغ و ارشاد اور تعلیم و تربیت اور مشغولی بحق میں اپنی بقیہ زندگی پوری کر دی، کسی قدیم تاریخی ماخذ میں ان تبلیغی مساعی کی تفصیلات اور ان کے نتائج و اثرات کا مستند و معیّن طریقہ پر تذکرہ نہیں ملتا۔ عام طور پر اتنا ذکر کیا جاتا ہے کہ کثیر و عظیم تعداد میں بندگانِ خدا نے ان سے ایمان و احسان کی دولت پائی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے ــــ ابو الفضل "آئینِ اکبری" میں لکھتا ہے:۔

عزلت گزیں باجمیر شد و فراواں چراغ	اجمیر میں عزلت گزیں ہوئے اور اسلام
برافروخت، واندم کبرائے او گرد ہا گرد	کا چراغ بڑی آب و تاب سے روشن کیا، انکے
مردم بہرہ ور گرفتند	انفاسِ قدسیہ سے جوق در جوق انسانوں نے ایمان
	کی دولت پائی۔

تقریباً نصف صدی ارشاد و تلقینِ اسلام کی اشاعت اور داعیان اسلام و اہلِ قلوب کی

---

[1] سیر الاقطاب ص۱۰۱

[2] آئینِ اکبری (سر سید ایڈیشن) ص۳۷

کی تعلیم و تربیت اور یادِ حق میں سرگرمی کے ساتھ مشغول رہ کر ۹۰ سال کی عمر میں سنہ ۶۲۷ھ[1] میں اس وقت رحلت فرمائی جب ہندوستان میں ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا جڑ پکڑ چکا تھا اور دار الحکومت دہلی میں ان کا جانشین و تربیت یافتہ شیخ وقت (خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ) ارشاد و ہدایت کے کام میں سرگرم و منہمک تھا اور ان کا عقیدتمند و حلقہ بگوش سلطان شمس الدین التمش اسلامی حکومت کی توسیع و استحکام اور عدل گستری و خلق پروری میں مشغول تھا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

خواجہ قطب الدین بختیارؒ قصبۂ اوش[2] (ماوراء النہر) میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، والدہ ماجدہ نے تربیت کی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے، مولانا ابو حفص اوشیؒ سے تعلیم حاصل کی، پھر بغداد کا سفر کیا، وہاں اُس خضر طریقت سے ملاقات و ملازمت کا شرف حاصل ہوا جس کی رہبری سے کمال و تکمیل کے مدارج تک پہنچنا مقدر تھا اور جس کے ہاتھوں اور جس کی شرکت میں اسلام میں ہندوستان کا "چشمۂ حیواں" جاری ہونا تھا۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ کی تاریخی و بابرکت مسجد میں ممتاز و جلیل القدر علماء و شیوخ کی موجودگی میں خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے، ہندوستان تشریف لائے اور اپنے شیخ کے حکم و ہدایت سے دہلی کو اپنا مستقر بنایا جو نوخیز و وسعت پذیر اسلامی سلطنت کا دار الحکومت تھا، اور جو ایک طرف عالی ہمت مسلمانوں

---

[1] سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ عام طور پر تین سنہ لکھے گئے ہیں: ۔سنہ ۶۲۷ھ، سنہ ۶۳۲ھ، سنہ ۶۳۳ھ صاحب سیر الاقطاب نے "آفتابِ ملکِ ہند" سے سنہ وفات سنہ ۶۳۳ھ استخراج کیا ہے، صاحب خزینۃ الاصفیاء نے بھی یہی سنہ وفات مانا ہے۔ ۱۲

[2] یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ وہ فرغانہ کے نواحی میں ایک بڑا شہر ہے۔

بادشاہوں کی قدر دانی وجوہر شناسی کی وجہ سے ، دوسری طرف تاتاری حملوں کی بناء پر علماء و شرفاء و اہلِ کمال کا ملجاء و ماویٰ بن گیا تھا، اور عالمِ اسلام کا جوہر وہاں منتقل ہو رہا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش نے شایان شان پذیرائی کی، آپ نے دربار سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہ کیا اور سلطان کی کسی پیشکش (دیہہ وجاگیر) کو قبول نہ فرمایا، اور پہلے کیلوکھری میں، پھر ملک عزالدین کی مسجد کے قریب فقیرانہ و درویشانہ زندگی اختیار کی[1]، سلطان برابر عقیدت کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور اس کی عقیدت برابر ترقی کرتی رہی، اہل شہر کا ایسا رجوع عام ہوا کہ شیخ الاسلام وقت شیخ نجم الدین صغریٰ کو کبیدگی اور شکایت پیدا ہو گئی حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے خلیفہ کی ملاقات کے لئے دہلی تشریف لائے تو شیخ نجم الدینؒ نے جو اُن کے قدیم دوست تھے شکایت کی۔ حضرت خواجہؒ نے اپنے مرید رشید سے فرمایا:—

بابا بختیار ہم یکبار چنیں مشہور شدی کہ	بابا بختیار اتنی جلدی ایسے مشہور ہو گئے
خلق از دست تو شکایت کردن گرفت	کہ بندگان خدا کو تم سے شکایت
ازیں جا برخیز و در اجمیر برو و بنشین	پیدا ہونے لگی۔ یہاں سے چلو اور اجمیر جاؤ وہاں
من پیش تو بالیستم[2]	قیام اختیار کرو، میں تمہارے سامنے (خادم) کھڑا ہونگا۔

شیخ نے وہ ارشاد فرمایا جو ایک ایسے عالی مرتبت شیخ کو فرمانا چاہیئے جو کمالِ اخلاص و ربانیت کو پہنچ چکا تھا، مردانِ راہ و واصلینِ بارگاہ ادنیٰ مخلوق کی شکایت و آزردگی کو گناہ سمجھتے ہیں، چہ جائیکہ شیخ الاسلام کی کبیدگی کو، پھر آپ مرکزِ اسلام میں انتشار و پراگندگی کو کو پسند نہیں کرتے تھے جس کا اس رنجش سے خطرہ تھا، آپ نے لطیف طریقہ پر یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ اگر یہاں کے اہلِ فضل تمہاری قدر و منزلت اور مقام سے واقف نہیں تو

---

[1] فرشتہ ص ۷۲۰ ج ۲ [2] سیر الاولیاء ص ۵۴

میں واقف ہوں، اور یہ کہ یہاں خادم و مخدوم و شیخ و مرید کا کوئی امتیاز نہیں، وہاں تم مخدوم رہو گے، میں خادمانہ ۔ خواجہ قطب الدینؒ نے وہی جواب دیا جو ایک مرید رشید کو دینا چاہیے عرض کیا:۔

مخدوم مرا چہ محل آں باشد کہ پیش — مخدوما! میں تو آپ کے سامنے کھڑے
مخدوم توائم ایستاد فکیف بنشستیم[1] — ہونے کا بھی اہل نہیں، بیٹھنے کی کیا مجال؟

شیخ نے اجمیر چلنے کا حکم دیا اور مرید صادق بے چون و چرا اور بلا تامل تیار ہو گیا، لیکن جب شہر کے باہر قدم نکالا تو شیخ کو معلوم ہو گیا کہ یہ مقبولیت و ہر دلعزیزی من جانب اللہ ہے اس میں نفسانیت و انانیت کو دخل نہیں، اور یہ کہ ان کے مرید رشید نے ساری دہلی کو اپنا عاشق و پروانہ بنا لیا ہے۔

شیخ قطب الدین ہمراہ شیخ روانہ اجمیر گردید — خواجہ قطب الدین اپنے شیخ کے ساتھ اجمیر
ازیں مقدمہ در تمام شہر دہلی شور افتاد ہمہ — روانہ ہوئے، اس اطلاع سے شہر دہلی میں
اہل شہر مع سلطان شمس الدین دُنبال — ایک شور برپا ہو گیا۔ اہل شہر مع سلطان
برآمدند، و ہر جا شیخ قطب الدین قدم — شمس الدین شہر سے نکلکر آپ کے پیچھے ہو لئے، جہاں
می گذاشت خلائق خاک آں زمین بہ تبرک — خواجہ قطب الدین کا پاؤں پڑتا تھا، لوگ خاک
بر می داشت و نہایت اضطراب و زاری[2] نمودند۔ — کو تبرک بنا کر اٹھا لیتے تھے۔ لوگ بڑے بیقرار
اور آہ و زاری میں مصروف تھے۔

ایک دل کو خوش کرنے کے لیے اور ایک جزئی مصلحت کی خاطر لاکھوں خدا کے بندوں کے دل کو رنجور و زخمی کرنا جائز نہ تھا۔ مرشد نے مرید رشید کو اجمیر لیجانے کا ارادہ فسخ کیا اور فرمایا:

---

[1] سیر الاولیاء ص۵۴ [2] ایضاً ص۵۴

بابا بختیار[1] درین مقام باش کہ خلائق از بیرون آمدن تو در اضطراب و خراب است رواندارم کہ چندیں دلہا خراب و کباب باشند، برو ایں شہر را در پناہ تو گذاشتیم[2]۔

بابا بختیار! تم یہیں رہو، اسلئے کہ خدا کی اتنی مخلوق تمہارے باہر جانے سے تباہ حال ہے میں اس کو جائز نہیں سمجھتا کہ اتنے دل دکھائے اور جلائے جائیں۔ جاؤ ہم نے اس شہر کو تمہاری پناہ میں چھوڑا۔

سلطان شمس الدین نے جس کا دارالحکومت اس نعمت سے محروم ہوا جارہا تھا، شیخ کا شکریہ ادا کیا اور خواجہ قطب الدین شہر دہلی واپس آئے اور خواجہ معین الدینؒ اجمیر واپس ہوئے۔

خواجہ قطب الدینؒ نے دہلی واپس آکر اور اپنے بوریائے فقر پر بیٹھ کر سرگرمی سے ارشاد و تربیت کا کام انجام دینا شروع کیا۔ انھوں نے "سرکار و دربار" سے ضابطہ کا کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ صرف اسکو اپنی زندگی کا اصول بنایا بلکہ اپنے سلسلہ کا اصول بنا دیا کہ فقر و استغنا کے ساتھ اور "دربار" سے دور رہ کر اپنا کام کرنا ہے، لیکن اس بے تعلقی و بے نیازی کے باوجود عوام و خواص اور شاہ و گدا سب ان کے عقیدتمند و حلقہ بگوش تھے۔

جملگی عالم از صدور و ائمہ بہ دعاگوئی روئے نہادند[3]

ساری دنیا، اعیان و اکابر دعاگوئی اور نیازمندی میں مصروف تھے۔

سلطان شمس الدین ہفتہ میں دو بار حاضری دیتا اور اخلاص و عقیدت کا اظہار کرتا[4]۔ دہلی میں جو نہ صرف ہندوستان کا دارالحکومت بلکہ عالمِ اسلام کی نئی طاقت اور دعوت و تجدید اسلام کا نیا مرکز تھا اور جہاں عالم اسلام کے ممتاز ترین علماء و اساتذہ، سادات و شرفاء اور مشائخ و اہلِ

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۵۵) [2] اخبار الاخیار (ص ۲۶) [3] تاریخ فرشتہ (ص ۱۹)

سلسلہ اور دنیائے اسلام کے بہترین دل و دماغ جمع تھے، اشاعت طریق و تربیت قلوب اور نئی ابھرتی ہوئی اسلامی سلطنت کی رہنمائی کا کام اپنے دامنِ فقر و استغنا کو ذرہ برابر آلودہ اور تر کئے بغیر انجام دینا بڑا نازک اور مشکل تھا اور اس کے لئے پہاڑ کی سی استقامت اور ہوا کی سی سُبک روی اور سُبک گامی کی ضرورت تھی۔ جس سے کسی شیشے کو ٹھیس نہ لگے۔ خواجہ صاحب نے بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس نازک اور دشوار کام کو انجام دیا، ان کو اس خدمت کے لئے طویل زمانہ نہیں ملا اپنے شیخ کے بعد تو مشکل سے ۴، ۵ سال وہ زندہ رہے، لیکن ان کی ذات سے ہندوستان میں نہ صرف سلسلہ چشتیہ کی بنیاد پڑ گئی، بلکہ جن مقاصد عالیہ کے لئے حضرت خواجہ معین الدینؒ نے ہندوستان کو اپنے قیام اور کام کے لئے انتخاب کیا تھا وہ صدیوں کے لئے محفوظ ہو گئے۔

ابھی ان کی عمر ۵۰ سال یا اس سے کچھ اوپر ہوئی تھی کہ عشق و محبت الٰہی کی وہ آگ جس کو انھوں نے صبر و ضبط کے فانوس میں مقید اور ہدایت و تربیتِ خلق کی مصلحت سے مغلوب کر رکھا تھا بھڑکی اور جذبِ الٰہی کا غلبہ ہوا ــــ ؎

صدائے تیغ تو آمد بہ بزم زندہ دلاں
کدام سر کہ در و ذوق ایں سرود نماند

ایک مرتبہ شیخ علی سکزیؒ[2] کی خانقاہ میں مجلس سماع گرم تھی۔ قوال نے شعر پڑھا ؎

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

---

[1] اگر حضرت خواجہ معین الدینؒ کا سنہ وفات ۶۲۷ھ بھی تسلیم کر لیا جائے تو خواجہ قطب الدینؒ کو ان کے بعد صرف ۶ سال ملتے ہیں۔ [2] بعض تذکروں میں سجزی درج ہے۔ ۱۲

خواجہ قطب الدینؒ پر وجد طاری ہوگیا، خانقاہ سے قیام گاہ پر تشریف لائے، وہی مدہوشی اور تحیر کا عالم تھا، اسی شعر کی فرمائش تھی، فرمائش کی تعمیل کی جاتی تھی۔ چار شبانہ روز عالمِ تحیر میں رہے، لیکن جب نماز کا وقت آتا ہوش آجاتا، نماز ادا کرتے، پھر اسی شعر کی فرمائش کرتے، شعر پڑھا جاتا اور عالم تحیر میں چلے جاتے۔ پانچویں رات کو انتقال کیا[1]۔ یہ واقعہ ۶۳۳ھ[2] کا ہے۔

انتقال سے پہلے عید کے روز عیدگاہ سے قیام گاہ کی طرف واپس آرہے تھے کہ ایک ایسے میدان سے گزر ہوا جہاں کوئی قبر یا آبادی نہ تھی، خواجہ وہاں ٹھہر گئے اور دیر تک کھڑے رہے کسی خادم نے عرض کیا کہ عید کا دن ہے اور خلقت منتظر، آپ نے یہاں کیوں توقف فرمایا؟" ارشاد ہوا۔ مرا ازیں زمیں بوئے دلہا می آید" (مجھے یہاں سے دلوں کی خوشبو آتی ہے) دوسرے وقت زمین کے مالک کو بلا کر اپنے صرف خاص سے اسکو خرید فرمایا اور اس کو اپنے دفن کیلئے تجویز کیا، وہیں مدفون ہوئے[3]۔

حضرت خواجہؒ کے خلفاء کی تعداد (جن کے نام تذکرہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں) ۹، ۱۰ سے کم نہ تھی، لیکن آپ کی جانشینی اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کے کاموں اور مقاصد کی تکمیل و توسیع کی سعادت حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے حصے میں آئی۔

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ

جس طرح حضرت خواجہ معین الدینؒ ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے مؤسس ربانی ہیں خواجہ فرید الدینؒ اس کے مجدد اور اس سلسلہ کے آدم ثانی ہیں۔ آپ ہی کے دو خلفاء سلطان المشائخ

---

[1] سیر الاولیاء بروایت حضرت خواجہ نظام الدینؒ

[2] بعض تذکروں میں ۶۳۴ھ بجائے ۶۳۳ھ کے۔

[3] سیر الاولیاء بروایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ (ص ۵۵)۔ اب یہ جگہ قطب صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۲

حضرت خواجہ نظام الدین دہلویؒ اور حضرت شیخ علاء الدین علی صابر پیران کلیریؒ کے ذریعہ یہ سلسلہ ہندوستان میں پھیلا اور ان کے خلفاء و اہل سلسلہ کے ذریعہ اب بھی زندہ و قائم ہے ع

خم و خمخانہ با مہر و نشان است

حضرت خواجہؒ کا نام مسعودؒ لقب فرید الدین تھا، عام طور سے گنج شکر کے لقب سے مشہور عالم[1] ہیں، آپ نسباً فاروقی ہیں، جد بزرگوار قاضی شعیب تاتاریوں کے ہنگامہ میں کابل سے لاہور تشریف لائے، کچھ عرصہ قصور میں قیام فرمایا، قصبہ کہنیوال کی قضاۃ و جاگیر عطا ہوئی۔ یہیں ۵۶۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، صغر سنی میں ملتان کا سفر کیا جو اُس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا علمی و دینی مرکز تھا، شہر کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ کی کتاب "النافع" پڑھی، وہیں ۵۸۴ھ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی زیارت ہوئی اور ان سے بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ شیخ فرید الدینؒ آپ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تعلیم کے سلسلہ کو خیرباد کہہ کر ہمرکاب ہو جانے کا عزم کیا۔ شیخ کامل نے منع کیا اور تکمیل کی ہدایت کی۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جاکر علوم کی تکمیل کی[2]۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد شیخ کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ شیخ نے ان کے قیام کے لئے غزنین دروازہ کے پاس ایک جگہ منتخب کی، جہاں وہ ریاضت و مجاہدے میں مشغول ہو گئے۔ سلوک

---

[1] اس لقب کی حقیقت و تاریخ میں مختلف اقوال ہیں، یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔

[2] راحت القلوب میں جو آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس سفر اور دوسری سیاحتوں کی بڑی تفصیل موجود ہے، لیکن چوں کہ اس کتاب کی نسبت صحیح نہیں ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا گیا۔ بعض دوسری کتابوں میں بھی بعض دوسری تفصیلات ہیں۔ ۱۲

کی تکمیل کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے اور شیخ کی اجازت سے ہانسی میں قیام اختیار کیا جوان کے مخلص (جو بعد میں خلفائے کبار میں ہوئے) شیخ جمال الدین خطیب ہانسی کا وطن تھا۔ شیخ کا انتقال ہوا تو وہ ہانسی میں تھے، انتقال کے تیسرے روز دہلی پہنچے، مزار شیخ پر فاتحہ پڑھی۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے شیخ کی وصیت کے مطابق ان کا خرقہ اور دوسری امانتیں سپرد کیں، یہ گویا جانشینی کا اعلان تھا۔ شیخ نے دوگانہ پڑھ کر اس کو زیب تن کیا اور شیخ کی جگہ پر بیٹھے۔

دہلی کی آمد اور شیخ کی جانشینی کا تیسرا روز تھا کہ ہانسی سے آپ کا ایک آشنائے قدیم و معتقد سرمنگا نامی آپ کے اشتیاق میں دہلی آیا۔ خادموں نے اندر جانے نہیں دیا۔ معتقدین و خدام کے ہجوم سے اس درویش کو ملاقات میسر نہ آئی، منتظر تھا کہ ایک روز شیخ باہر تشریف لائے سرمنگا قدموں پہ گر گیا اور رو کر کہا کہ جب تک آپ ہانسی میں تھے آسانی اور بے تکلفی سے مل لیا کرتا تھا، اب یہاں ہم جیسے غریبوں کا کام نہیں! شیخ کے دل پر چوٹ لگی اور سمجھے کہ تنبیہ غیبی ہے، دہلی میں سکون اور عوام و فقرا سے ملنے جلنے کا موقع نہیں۔ اپنی مزید تکمیل ترقی مطلوب تھی۔ آپ نے اسی وقت اپنے دوستوں سے کہا کہ میں ہانسی جاؤں گا۔ حاضرین نے عرض کیا کہ شیخ قطب الدینؒ نے تو آپ کو اس جگہ بٹھایا ہے۔ آپ کہاں جاتے ہیں؟ فرمایا کہ "پیرؒ نے اپنی امانت سپرد کر دی ہے، شہر میں رہوں یا بیابان میں وہ ساتھ ہے"[1]۔

ہانسی کا قیام اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہاں سکون اور گمنامی رہے گی۔ یہاں خواجہ قطب الدینؒ کے ایک مرید مولانا نور ترک کی وجہ سے (جنھوں نے اہل ہانسی کو آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کر دیا) آپ کی شہرت ہو گئی اور خلق نے ہجوم کیا۔ آپ نے کہنیوال کا رخ کیا جو

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۷۲)

وطن قدیم تھا۔ کہنیوال ملتان سے قریب تھا، اور اُن کی شہرت اور عظمت کا آوازہ اَب دُور دُور بلند ہو رہا تھا، آپ نے اجودھن[1] کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا، اور ارشاد ہوا کہ:۔ وہاں کے لوگ دیر اعتقاد اور نا آشنا ہیں اور جگہ بھی غیر معروف ہے، لیکن یہاں بھی بہت جلد رجوع شروع ہو گیا اور خلائق نے ہر طرف سے ہجوم کیا۔ آفتاب شہرت و عظمت نصف النہار پر تھا اور اس کی شعاعیں دور دور پہنچ رہی تھیں اور طالبین خدا کے قلوب کو گرم کر کے کھینچ کھینچ کر لا رہی تھیں۔ تھوڑے دنوں میں مرجعیت یہاں تک بڑھی کہ آنے والوں کا سلسلہ ختم ہونے کو نہ آتا، آدھی رات تک دروازے کھلے رہتے۔

ابتدائے قیام میں عرصہ تک نہایت تنگی اور عُسرت و فقر و فاقہ کے ساتھ زندگی گذاری، پیلو کے پھل ابال لئے جاتے اور ان میں کچھ نمک ڈال کر فقراء کو تقسیم کر دیئے جاتے اور خود بدولت اپنے مہمانوں اور خادموں کے ساتھ تناول فرماتے۔ توکل و تجرید کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ افطار کیلئے لقمہ اٹھایا، فرمایا: اس میں کچھ بے اصولی معلوم ہوتی ہے؟ خادم نے عرض کیا کہ: نمک نہ تھا، ایک دانگ کا نمک قرض لیکر ڈال دیا۔ فرمایا:۔ تم نے بے اصولی کی، میرے لئے اس کا کھانا روا نہیں[2]۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حال ہوا کہ دن رات مطبخ شاہی گرم رہتا اور آدھی رات گئے تک کھانے والوں کا سلسلہ رہتا، جو آتا اس خوانِ نعمت سے حصّہ پاتا۔ جو شخص بھی آتا کسے باشد اپنا حصّہ پاتا[3]۔

شفقت و دلداری سب کے ساتھ یکساں تھی۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ: عجیب قوّت اور عجیب طرزِ زندگی تھا جس کا تحمّل کسی سے ہونا آسان نہیں، نئے آنے والے جو کبھی نہیں آئے اور برسوں کے ساتھ رہنے والے سب سے یکساں لطف و مہربانی اور توجّہ و التفات کے ساتھ پیش

---

[1] اجودھن کو اَب پاک پٹن کہتے ہیں، اور وہ ضلع منٹگمری (پاکستان) کا ایک قصبہ ہے۔ ۱۲

[2] سیر الاولیاء، (صـ۶۶) [3] ایضاً (صـ۶۴)۔

آتے، مولانا بدرالدین اسحٰق فرماتے ہیں کہ:۔ میں خادمِ خاص تھا، جو بات کہنی ہوتی مجھ سے فرماتے تھے، خلوت وجلوت میں یکساں حال تھا، ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔ برسوں خدمت کرنے اور ساتھ رہنے کے باوجود کوئی تفاوت نہ دیکھا۔[1]

ایک بار سلطان ناصرالدین محمود کا پورا لشکر جو بادشاہ کے اوچ اور ملتان کے سفر میں ہمرکاب تھا، خواجہؒ کی زیارت کیلئے اجودھن حاضر ہوا۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ اس کا حال بیان کرتے ہیں کہ:۔

"ہجوم قابو سے باہر تھا، آخر کار خدام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حضرت خواجہؒ کے پیرہن کی آستین بالا خانہ سے لٹکا دی۔ اہلِ لشکر آتے تھے اور اس کو بوسہ دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ آستین تار تار ہو گئی۔ مجبوراً آپ مسجد میں تشریف لائے اور خدام سے فرمایا کہ:۔ میرے گرد حلقہ بنا لو، کوئی اس حلقہ کے اندر نہ آنے پائے۔ لوگ آتے تھے اور حلقہ کے باہر کھڑے ہو کر سلام کر کے رخصت ہو جاتے تھے۔ اچانک ایک بوڑھا فراش حلقہ توڑ کر اندر آ گیا اور شیخ کے پاؤں پر گر گیا۔ پاؤں پکڑ کر بوسہ لیا اور کہا:۔ "شیخ فریدؒ! تنگ آ گئے؟ اللہ تعالیٰ کے اِس انعام کا اس سے زیادہ شکریہ ادا کرو۔" شیخ نے یہ سُن کر نعرہ مارا اور اس فراش کو بہت نوازا اور اس سے معذرت کی۔"[2]

سلطان ناصرالدین نے خود حاضری کا قصد کیا، نائبُ السّلطنت غیاث الدّین بلبن نے جو ہمرکاب تھا، عرض کیا کہ:۔ لشکر بہت ہے اور اجودھن ایک بے آب و گیاہ مقام ہے، اگر فرمان ہو تو میں خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور جہاں پناہ کی طرف سے معذرت اور ہدیہ و فتوح پیش کروں چنانچہ کچھ نقد اور چار گاؤں کا فرمان لیکر حاضر ہوا اور نقد اور فرمان پیش کیا۔ شیخؒ نے فرمایا: "یہ کیا ہے؟" غیاث الدین نے کہا کہ: "یہ کچھ نقد ہے اور یہ جاگیر کا فرمان سلطانی۔" شیخ نے تبسم فرمایا، اور کہا کہ:۔

---

[1] سیر الاولیاء (ص۶۵) [2] ایضاً (ص۷۹)

نقد تو ہم کو دے دو اور فرمان واپس لے جاؤ کہ اس کے طالب بہت ہیں، یہ کہہ کر ساری رقم اُسی وقت درویشوں میں تقسیم کر دی[1]

سلطان غیاث الدین حضرتؒ سے معتقدانہ تعلق رکھتا تھا، دہلی کی سلطنت کا حصول بھی حضرتؒ کی دُعا اور محبّت کا نتیجہ سمجھتا تھا اور خدّام کی خدمت کو اپنی سعادت تصوّر کرتا تھا، حضرت خواجہؒ نے ایک مرتبہ ایک شخص کے اصرار سے ایک سفارشی رقعہ لکھا جو سفارش و بے نیازی کا عجب مجموعہ ہے، فرماتے ہیں:-

"میں اِس شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اگر آپ اس کو کچھ دینگے تو حقیقی عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوگا اور آپ مشکور ہوں گے اور اگر آپ نہ دیں گے تو اس کا مانع اللہ تعالیٰ ہوگا، آپ معذور ہوں گے۔"[2]

حضرت شیخ فریدالدینؒ کے اپنے نامور معاصرین اور دوسرے سلسلہ کے مشائخ کبار سے دوستانہ و برادرانہ تعلقات تھے اور ان کے پورے مرتبہ شناس اور قدردان تھے۔ شیخ الاسلام شیخ بہاءالدینؒ زکریا ملتانیؒ جو سلسلۂ سہروردیہ کے نامور شیخ اور ہندوستان کے عظیم ترین روحانی پیشواؤں اور داعیوں میں گذرے ہیں[3] ان کے ہم عصر تقریباً ہم عمر تھے۔ دونوں کے بڑے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے اور آپس میں بہت دلچسپ اور بے تکلفی کی خط و کتابت ہوتی تھی۔ شیخ فریدالدینؒ شیخ بہاءالدینؒ کو "شیخ الاسلام" کے لقب سے مخاطب

---

[1] سیر الاولیاء ص۷۹ و ص۷۰ - ۱۲ [2] اخبار الاخیار - اصل رقعہ فصیح عربی میں ہے - ۱۲

[3] شیخ الاسلام شیخ بہاءالدین زکریا کی ولادت ۵۶۶ھ کی ہے، اور شیخ کبیر کی ولادت ۵۶۹ھ کی ۱۲

کرتے تھے۔ دونوں کے خلفاء اور مریدین بھی آپس میں ایک دوسرے سے بڑے خلوص و محبت سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کا اعتراف اور بزرگ داشت کرتے تھے۔ شیخ الاسلامؒ کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ، اور شیخ کبیرؒ کے خلیفہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے درمیان بڑی محبت اور گہرا تعلق تھا۔

حضرت خواجہ فریدالدینؒ کی زندگی کا اصل جوہر اور معاصرین میں ان کا امتیاز وہ ذوق و شوق اور درد و عشق اور جذب الٰہی و خدا مستی ہے جس نے حضرت خواجہ نظام الدین و حضرت علاء الدین علی صابر جیسے عاشقوں اور دردمندوں کی تربیت کی، اور جو اجودھن کی اس دکان عشق کا خاص سود اتھا۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ ایک روز کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ شیخ کبیرؒ (حضرت خواجہ فریدالدینؒ) حجرے میں تھے، سر برہنہ تھا اور چہرے کا رنگ متغیر، حجرے میں والہانہ کیفیت میں پھرتے تھے اور یہ اشعار پڑھتے تھے ؎

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم — خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصودِ خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم از برائے تو زیم

(میری آرزو ہے کہ ہمیشہ آپ ہی کا ہو کر جیوں، خاک ہو جاؤں اور آپ کے قدموں کے نیچے زندگی گذرے، مجھ مسکین و بیچارے کا دونوں جہاں میں مقصود آپ ہی ہیں آپ ہی کے لئے جیتا ہوں، آپ ہی کے لئے مرتا ہوں)۔

یہ شعر پڑھ کر سجدے میں سر رکھ دیتے تھے، پھر یہی شعر پڑھتے تھے اور حجرے کا چکر لگاتے تھے، پھر سجدے میں پڑ جاتے تھے، دیر تک یہی کیفیت رہی[1]۔

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۳۳

خشیت و رقّت کا بڑا غلبہ تھا، کوئی عبرت انگیز و رقّت خیز بات سنتے یا مجلس میں کوئی عاشقانہ شعر پڑھا جاتا یا کسی بزرگ کا کوئی واقعہ سنتے تو بے اختیار روتے، بعض اوقات ہاڑیں مار مار کر روتے، ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، قرآن مجید کے حفظ کا اہتمام اور تلاوت کا بڑا ذوق تھا اور دونوں چیزیں (روزہ اور حفظِ قرآن) کی اپنے خلفائے خاص و مریدانِ با اختصاص کو وصیت و تاکید فرماتے تھے۔ سماع کا بڑا ذوق تھا۔ کسی نے کہا کہ علماء کو اس میں اختلاف ہے، فرمایا:۔

سبحان اللہ یکے سوخت و خاکستر شد — سبحان اللہ! ایک جلا بھی اور راکھ بھی
دیگرے ہنوز در اختلاف است[2]۔ — ہو گیا دوسرا ابھی اختلاف ہی کر رہا ہے۔

ساری زندگی کا اصول اہلِ دول و ارباب حکومت سے بے تعلقی، کنارہ کشی، اخفائے حال اور درویشانہ زندگی تھا۔ اپنے مشائخ کرام کا مسلک جان کر اور اسی میں خلوص کی حفاظت[1] و طریقہ کی اشاعت کا راز سمجھ کر اس روش پر سختی اور مضبوطی سے قائم تھے، ان کے ایک برادرِ طریقت شیخ بدر الدّین غزنویؒ نے (جو حضرت خواجہ قطب الدّین کے خلفائے کبار میں سے تھے) بعض اعیانِ سلطنت سے خصوصی تعلق رکھا تھا اور اُس نے ان کے لئے دہلی میں خانقاہ تعمیر کی تھی اور ان کی مخصوص طریقے پر خدمت کرتا تھا۔ انقلاب روزگار سے جب وہ امیر عتاب شاہی میں آیا تو شیخ کو بھی زحمت و کلفت پیش آئی، آپ نے شیخ کبیرؒ سے دُعا کی درخواست کی۔ شیخ نے جواب میں لکھا کہ:۔

"جو اپنی روش پر چلے گا وہ ضرور ایسی حالت میں گرفتار ہوگا، جس سے ہمیشہ بے چین رہیگا، آپ تو پیرانِ پاک کے معتقدین میں ہیں، پھر اُن کی رَوش کے خلاف خانقاہ کیوں بنوائی، اور اس میں کیوں بیٹھے؟ حضرت خواجہ قطب الدینؒ

---

[1] ملاحظہ ہو حالات حضرت سلطان المشائخؒ - ۱۲۔ [2] سیر الاولیاء ۱۲۔

اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کا تو یہ طریقہ اور روش نہیں تھی کہ اپنے لئے خانقاہ بنا کر دکان جمائیں، ان کا شیوہ تو گمنامی و بے نشانی تھا[1]۔

ان کے اس طبعی ذوق کی وجہ سے باوجود رجوعِ عام اور امراء خواص کی عقیدت کے انتقال سے پہلے پھر عسرت اور تنگی کا دور شروع ہو گیا، سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے فرمایا کہ:۔

"حضرت شیخ شیوخ العالم کو آخر عمر میں کہ انتقال کا زمانہ قریب تھا تنگی پیش آئی، میں ماہ رمضان میں موجود تھا، اتنا تھوڑا کھانا آیا کرتا تھا کہ موجود لوگوں کو کافی نہ ہوتا تھا۔ کسی رات بھی میں نے ان دنوں سیر ہو کر کھانا نہ کھایا، سامان بھی جو دیکھنے میں آتا تھا بہت معمولی اور برائے نام تھا، میں جب رخصت ہونے لگا تو حضرتؒ نے خرچ کے لئے مجھے ایک سلطانی[2] عطا فرمایا۔ اس روز مولانا بدر الدین الدین اسحٰق کے ذریعہ پیغام پہنچا کہ آج توقف کریں کل جائیں، جب افطار کا وقت ہوا تو حضرت شیخؒ کی خدمت میں گیا اور میں نے عرض کیا کہ حضرتؒ کی بارگاہ سے مجھے ایک سلطانی عطا ہوا تھا اجازت ہو تو اس سے کچھ کھانے کا انتظام کر لیا جائے؟ حضرت نے اجازت مرحمت فرمائی اور بڑی دعائیں دیں[3]"

صاحب سیر الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی روایت سے وفات کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

---

[1] سیر العارفین ص۸۵ ماخوذ از بزم صوفیہ [2] سکہ (غالباً اس وقت کا روپیہ)
[3] سیر الاولیاء ص۶۶

"محرم کی پانچ تاریخ کو بیماری میں شدّت ہوئی۔ عشاء کی نماز جماعت سے ادا کی، نماز کے بعد بیہوشی طاری ہوگئی۔ ایک گھڑی کے بعد ہوش آیا تو دریافت کیا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ پڑھ لی ہے۔ فرمایا دوبارہ پڑھ لوں کیا خبر کیا ہو؟ دوبارہ نماز پڑھی اور پھر بیہوش ہوگئے۔ اس مرتبہ بیہوشی زیادہ سخت اور طویل تھی، پھر ہوش آیا اور پوچھا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی؟ عرض کیا گیا کہ دو بار پڑھ چکے ہیں، فرمایا کہ ایک بار اور پڑھ لوں، کون جانے کیا ہو؟ تیسری مرتبہ پھر پڑھی۔ اسکے بعد واصل بحق ہوئے[1]۔

تاریخ وفات ۵ محرم روز سہ شنبہ ۶۶۴ھ ہے۔ اجودھن (پاک پٹن) میں مدفون ہوئے، بعد میں سلطان محمد تغلق نے گنبد تعمیر کیا۔

حضرت خواجہؒ کے پانچ فرزند اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ فرزندوں کے نام یہ ہیں۔ شیخ نصرالدین نصراللہ، شیخ شہاب الدین، شیخ بدرالدین سلیمان، خواجہ نظام الدین، شیخ یعقوب۔ صاحبزادیوں کے نام: بی بی مستورہ، بی بی فاطمہ، بی بی شریفہ۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۸۹ [2] صاحب سیرۃ الاولیاء نے متعدد مقامات پر ۶۶۹ھ کے ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو حضرت خواجہؒ کی زندگی سے متعلق ہیں۔ بعض مقامات پر حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی تحریر کا حوالہ ہے کہ حضرت خواجہؒ نے مجھ سے یہ فرمایا، فلاں ہدایت کی۔ اگر ان سنین کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو سنہ وفات ۶۶۴ھ جو عام طور پر مشہور اور زیادہ تر کتابوں میں مذکور ہے مشکوک ہو جاتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ حضرت خواجہؒ کی وفات اسکے بعد ہوئی، بعض دوسری کتابوں میں بعد کے سنین درج ہیں، ان میں قرین قیاس ۶۷۰ھ ہے جو خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین درج ہے۔ ۱۲

حضرت خواجہؒ کی وفات کے بعد ان کے تیسرے صاحبزادے شیخ بدرالدین سلیمانؒ باپ کے سجادہ پر بیٹھے ان کے فرزند و سجادہ نشین شیخ علاءالدین اجودھنی تقدس و اتقا میں مشہور تھے۔ محمد تغلق بھی ان کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گیا تھا[1]۔ اللہ تعالیٰ نے روحانی سلسلہ کی طرح حضرت خواجہؒ کی اولاد اور خاندان کو بھی بڑی برکت عطا فرمائی، ہندوستان کے مختلف حصوں میں یہ خاندان آباد ہے اور بالعموم فریدی کہلاتا ہے۔

حضرت خواجہ کے خلفاء میں پانچ حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔ شیخ جمال الدینؒ ہانسویؒ، شیخ بدرالدین اسحٰقؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ علی احمد صابرؒ اور شیخ عارفؒ۔

شیخ جمال الدین (احمد بن محمد) خطیب ہانسوی حضرت خواجہ کے بڑے عزیز خلیفہ و معتمد خاص تھے۔ انھیں کی خاطر حضرت خواجہ نے ۱۲ سال ہانسی میں قیام فرمایا تھا۔ آپ جب کسی کو خلافت نامہ لکھ کر دیتے تھے تو فرماتے تھے کہ ہانسی جاکر شیخ جمال الدین کو دکھا دینا اگر شیخ جمال الدین صاد فرماتے تو آپ بھی اسکو قبول کرتے، اگر وہ صاد نہ کرتے تو آپ بھی نامنظور فرماتے اور فرماتے کہ جمال کا پھاڑا ہوا سیا نہیں جا سکتا۔ فرماتے تھے کہ جمال میرا جمال ہے۔

شیخ جمال الدین نے اپنے شیخ کی زندگی میں ۶۵۹ھ میں انتقال کیا۔ شیخ قطب الدین منورؒ (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے عزیز خلیفہ) ان کے پوتے ہیں۔

شیخ بدرالدین اسحٰق بن علی سادات بخارا میں سے تھے۔ حضرت خواجہ فریدالدینؒ کے نیلسفہ، خادم اور داماد تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ ان کی بڑی عزت کرتے تھے، اپنے شیخ کی

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۹۶

[2] تذکرۃ الخواطر، ماخوذ از سیر الاولیاء و اخبار الاخیار وغیرہ

صحبت و تعلیم کا نمونہ تھے۔ آنکھیں ہمیشہ پُر آب رہتی تھیں، رقت کا بڑا غلبہ تھا جس سے ضعفِ بصارت ہوگیا تھا، کسی نے کہا کہ آپ ذرا آنسو روکیں تو میں آپ کے استعمال کے لئے سرمہ بنادوں فرمایا کہ آنکھوں پر میرا قابو نہیں، ان کی عبادت و ریاضت کو دیکھ کر شیخ کبیرؒ کی یاد تازہ ہوتی تھی، نہایت جید الاستعداد اور فاضلِ اجل تھے۔ مدت تک دہلی کی مشہور درسگاہ مدرسۂ معزیہ میں درس دیا، تکمیلِ علم کیلئے بخارا تک کا سفر کیا، فارسی و عربی میں بے تکلف آبدار شعر کہتے تھے، مضامینِ علمیہ کو نظم کرنے کی خاص قدرت تھی، صرف کے مسائل میں ایک منظوم رسالہ ہے۔ خواجہ محمد امام اور خواجہ محمد موسیٰ جو حضرت خواجہ نظام الدین اودلیاء کے امامِ نماز تھے، انھیں کے صاحبزادے تھے، ۱۰ جمادی الاخریٰ سنہ ۶۹۰ھ میں وفات پائی

شیخ عارف کو حضرت خواجہؒ نے خلافت دے کر سیوستان روانہ کیا تھا، انھوں نے حضرت خواجہؒ کو خلافت نامہ واپس کیا اور عرض کیا کہ یہ کام بہت نازک ہے، یہ مسکین اس کارِ عظیم کا اہل نہیں، مجھے آپ کی دعا اور عنایت کافی ہے، پھر آپ کی اجازت سے حج بیت اللہ کو گئے اور واپس نہ آئے۔[۱]

شیخ کبیر علاء الدین علی بن احمد صابر نسباً اسرائیلی تھے، ترک و تجرید اور زہد و مجاہدہ میں ان کی نظیر نہ تھی، پیران کلیر میں عرصہ تک عبادات و افادہ میں مشغول رہ کر ۱۳ ربیع الاول سنہ ۶۸۹ھ یا سنہ ۶۹۰ھ میں وفات پائی حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی آپ ہی کے خلیفہ تھے۔[۲]

---

[۱] نزہۃ الخواطر ۱ [۲] سیر الاولیاء ص ۱۸۴ و ص ۱۸۵

[۳] نزہۃ الخواطر ۱۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیخ علی احمد صابر کے حالات سے معاصر تذکرے اور تاریخیں خاموش ہیں۔ سیر الاولیاء میں امیر خورد نے ان کا تذکرہ ضمناً اس طرح کیا ہے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (بقیہ ص ۴۸ پر)

سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدینؒ پہلے چشتی شیخ ہیں جن کے اثرات ان کی زندگی میں سارے ہندوستان میں پھیلے اور جنھوں نے ہندوستان کے اسلامی معاشرہ اور ہر طبقہ کو متأثر کیا اور حکومت سے لیکر عوام و غربا تک کو اپنے حلقۂ عقیدت و اثر میں لیا، اسی کے ساتھ وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) ——— کو شبہ ہے کہ یہ حضرت شیخ علی احمد صابر پیران کلیری کا تذکرہ ہے یا اسی نام کے کسی اور بزرگ کا، امیر خورد لکھتے ہیں:—

بندہ از خدمت والد خود رحمۃ اللہ علیہ سماع	بندہ نے اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے
دارد کہ درویشے بود بزرگ صاحب نعمت کہ	کہ ایک عالی مرتبہ درویش تھے جن کو شیخ علی صابر
او را شیخ علی صابر گفتندے و در درویشی قدمے	کہتے تھے، درویشی میں راسخ اور صاحب
ثابت و نفسے گیرا داشت و ساکن قصبہ دیگری بودے	نسبت و تاثیر قصبہ دیگری کے رہنے والے تھے۔
و پیوندے بخدمت شیخ نشیوخ العالم فرید الحق	حضرت شیخ فرید الدینؒ سے نسبت ارادت
والدین قدس سرہ العزیز داشت و او را از خدمت	رکھتے تھے، اور آپ نے انکو اجازت بیعت
شیخ نشیوخ العالم اجازت بیعت بود (ص ۱۸۵)	دے رکھی تھی۔

معاصر یا زمانہ قریب کے تذکروں میں خواہ ان کا تذکرہ بالکل نہ ہو یا سرسری و مختصر ہو ان کے سلسلہ کے مشائخ کبار کے حالات ان کا علو شان، ان کے علوم و مقامات، اہل بصیرت کا اس سلسلہ کی مقبولیت پر اتفاق اور عالم میں اسکے فیوض و برکات و آثار شاہد ہیں کہ بانیٔ سلسلہ نہایت عالی مقام، عالی نسبت اور عند اللہ مقبول تھے، اس سے بڑھ کر خود تاریخ کی شہادت بھی نہیں ہو سکتی اور نہ یہ تاریخ کی پہلی غفلت اور چوک ہے، زمانۂ سابق میں بھی بہت سی باکمال شخصیتیں تاریخ کی تیز نگاہوں سے بچ گئیں اور زاویہ خمول میں رہیں۔

اس سلسلہ (صابریہ چشتیہ) میں بڑے نامور مشائخ عارف و محقق و مصلح پیدا ہوئے مثلاً حضرت مخدوم احمد عبد الحق ردولویؒ

ہندوستان کے پہلے شیخ طریقت اور مرشدِ روحانی ہیں جن کے حالات سب سے زیادہ تفصیل و وضاحت اور استناد کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے مشائخ نے نہ کوئی تصنیف کی نہ ان کے خلفاء نے اپنے شیخ کے ملفوظات و حالات جمع کئے، نہ انھوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات و حالات کا کوئی مجموعہ تیار کیا[1]، لیکن ان کے ملفوظات و حالات جمع کرنے کا

(صـ۴۷ کا بقیہ حاشیہ) جن کی ذات بابرکات کو بعض اہل نظر نے نویں صدی کا مجدد بھی شمار کیا ہے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، بانی دارالعلوم دیوبند) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، ہمارے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ سے حفاظت و تجدید دین کا عالمگیر کام لیا، اور اس وقت سب سے زیادہ وسیع متحرک و فعال یہی سلسلہ ہے، دارالعلوم دیوبند و مظاہر العلوم کی تعلیمی خدمت اور مولانا تھانوی کی تصنیفات و مواعظ سے اور پھر آخر میں مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک دعوت و تبلیغ سے اس سلسلہ کے فیوض عالمگیر ہوئے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تاریخ چشت مشائخ میں صحیح لکھا ہے کہ:

"گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاسؒ نے کیا تھا۔" (صـ۲۳۴)

آج بھی رائے پور میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کی خانقاہ سلسلہ چشتیہ کی قدیم خانقاہوں کی یکسوئی، سرگرمی، یادِ حق کی مشغولی اور درد و محبت کی یاد تازہ کرتی ہے (افسوس ہے کہ حضرت کی وفات کے بعد یہ خانقاہ بھی گزشتہ خانقاہوں کی فہرست میں شامل ہوگئی، کل شئ ھالک الا وجھہ۔ ع

عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

---

[1] حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات خیر المجالس میں ہے۔ فرمایا میرے حضرت (بقیہ صـ۵۰ پر)

خاص اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلہ میں دو بڑے قیمتی و مستند ماخذ ہیں، ایک فوائد الفواد جو امیر حسن علا سجزی (م ۷۳۷ھ) کی تالیف ہے حضرت خواجہ نے اسکو لفظاً لفظاً سنا اور تحسین فرمائی اور حضرت خواجہؒ کے اصحاب و خدام نے اسکی صحت کو عام طور پر تسلیم کیا اور حرز جاں بنایا[1]۔ دوسرا سیر الاولیاء جو امیر خورد سید محمد مبارک علوی کرمانی (م ۷۷۵ھ) کی تصنیف ہے، امیر خورد خورد سالگی میں حضرت خواجہ سے بیعت ہوئے اور ان کی صحبت کی سعادت حاصل کی، پھر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے رجوع کیا۔ ان کے والد نور الدین مبارک بن سید محمد کرمانی (م ۷۴۹ھ) حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے رفیق قدیم اور مخلص و بے تکلف دوستوں میں تھے، اس کتاب میں زیادہ تر ان سے روایت ہے۔ اپنے شیخ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے بھی سنی ہوئی بہت سی باتیں درج ہیں، اپنے چشم دید حالات اور سنے ہوئے ملفوظات بھی ہیں، حضرت خواجہؒ کے حالات و سوانح اور ان کے خلفاء کبار کے حالات و کمالات کا یہ مفصل و مستند ذخیرہ ہے۔ ان دو کتابوں کی وجہ سے خاص طور پر حضرت خواجہؒ کے حالات، ذوق، رجحانِ طبع، تعلیم و تربیت کے طریقے، اصلاحی و تبلیغی کوشش، ان کے فیوض و برکات اور اثرات محفوظ ہو گئے اور تاریخ کی روشنی اور گرفت میں آ گئے۔

(صفحہ ۴۹ کا بقیہ حاشیہ)

پیر و مرشد جناب سلطان الاولیاء قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے تھے، میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی اس واسطے کہ خدمت شیخ الاسلام حضرت فرید الدین اور شیخ الاسلام حضرت مولانا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور باقی خواجگان چشت وغیرہ مشائخ جو داخل ہمارے شجرے میں ہیں کسی نے کوئی تصنیف نہیں کی۔

(سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس)

[1] اس میں ۳ر شعبان سے ۹ر شعبان تک کی مختلف مجالس کے ملفوظات ہیں۔

اسی شخصیت کی عظمت و تاثیر اور حالات و مآخذ کی سہولت کی وجہ سے دعوت و عزیمت کی ایک مرکزی اور عہد آفریں شخصیت کی حیثیت سے ان کی ذات کو انتخاب کیا گیا، کتاب کے آئندہ ابواب اسی اجمال کی تفصیل کے لئے ہیں۔

باب دوم

سُلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدّینؒ

حالات و کمالات

نام و نسب محمد نام نظام الدین لقب و عرف عام، والد ماجد کا نام احمد بن علی سادات حسینی میں سے تھے، نانہال بھی سادات میں تھا، دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب دونوں ہم جد تھے اور دونوں بخارا سے آکر کچھ مدّت لاہور رہے، وہاں سے بدایوں آئے۔

سنہ ۶۳۶ھ میں بدایوں میں آپ کی ولادت[1] ہوئی، بدایوں (قدیم بداؤں) شرفا و سادات کا قدیم مسکن تھا، بہت سے ساداتِ کرام اور مشائخ عظام نے ایران و خراسان سے آکر یہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔[2]

---

[1] صاحب سیر الاولیاء نے آپ کی عمر شریف کا حساب لگا کر اس سنہ کی تعیین کی ہے۔ ۱۲

[2] بداؤں روہیل کھنڈ میں دریائے سوکھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اُس زمانہ میں بہت آباد (بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

ابتدائی تعلیم و تربیت

حضرت نظام الدین پانچ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ماجدہ نے جو اپنے وقت کی ایک بڑی صالحہ اور باخدا خاتون تھیں، اس دُرِّ یتیم کی پرورش اور دینی و اخلاقی تربیت کا مردانہ ہمت اور پدرانہ شفقت کے ساتھ اہتمام کیا۔ کتابیں پڑھنے کے قابل ہوئے تو مولانا علاء الدین اصولی[1] کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فقہ کی ابتدائی کتابوں تک ان سے تعلیم حاصل کی، قدوری ختم کی تو مولانا علاء الدین نے فرمایا کہ مولانا نظام الدین اب دستارِ فضیلت باندھو۔ والدہ صاحبہ سے آکر کہا کہ استاد نے دستار بندی کا حکم فرمایا ہے، میں دستار کہاں سے لاؤں؟ والدہ صاحبہ نے کہا:۔ بابا خاطر جمع رکھو۔ میں اس کی تدبیر کروں گی چنانچہ روئی

(صفحہ ۵۲ کا بقیہ حاشیہ) اور پُر رونق مقام تھا اور دہلی کے لئے سرحدی شہر کا کام دیتا تھا، چنانچہ پرانی دہلی کے ایک دروازہ کا نام دروازۂ بداؤں تھا۔ (نزہۃ الخواطر)۔

قلعۂ بداؤں کے موجودہ کھنڈر اس کی عظمت اور استحکام کا پتہ دے رہے ہیں۔ ۱۱۹۶ء میں سلطان محمد غوری کے جرنیل قطب الدین ایبک نے اسے فتح کیا اور اپنے غلام ملک شمس الدین کو امیر بداؤں مقرر کیا۔ التمش نے یہاں ۱۲۲۲ء میں ایک خوبصورت اور وسیع مسجد تعمیر کرائی جو اب بھی موجود ہے۔ اس مقام کی اہمیت کا مزید ثبوت درکار ہو تو وہ اس سے ملتا ہے کہ دہلی کے دو بادشاہ التمش اور اس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ دونوں تخت نشینی سے پہلے بداؤں کے گورنر رہ چکے تھے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا بذیل بداؤں) منقول از مقالاتِ دینی و علمی، مولوی محمد شفیع صاحب ایم، اے۔ (جلد اول صفحہ ۲۴۱)۔ ۱۲

[1] مولانا علاء الدین علی الاصولی شیخ جلال الدین تبریزی کے مریدین میں تھے اور اپنے شیخ کے نقش قدم پہ اخفاء حال کا بڑا اہتمام تھا، صبر و رضا کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور اوقات عزیز کو افادہ و عبادت میں مشغول و معمور رکھتے تھے۔ (نزہۃ الخواطر بحوالہ فوائد الفواد)۔

خرید کر اسکو کتوایا اور بہت حلیہ پگڑی تیار کر کے دی[1]۔ والدہ صاحبہ نے اس تقریب میں علماء و صلحاء وقت کی دعوت کی، خواجہ علی مرید شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ایک پیچ باندھا اور حاضرین مجلس نے علمِ نافع اور تکمیل کی دعا کی[2]۔

فقر و فاقہ اور والدہ کی تربیت

اس چھوٹے سے شریف گھرانے میں جو سایۂ پدری سے محروم تھا فقر و فاقہ کوئی نئی بات نہ تھی حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ والدہ کا معمول تھا کہ جس روز ہمارے گھر کچھ پکانے کو نہ ہوتا تو فرماتیں کہ آج ہم سب خدا کے مہمان ہیں۔ مجھے یہ بات سن کر بڑا ذوق آتا۔ ایک دن کوئی خدا کا بندہ ایک تنکہ غلہ گھر میں دے گیا، چند دن متواتر اسی سے روٹی ملتی رہی، میں تنگ آگیا اور اس آرزو میں رہا کہ والدہ صاحبہ کب یہ فرمائیں گی کہ ہم سب خدا کے مہمان ہیں، آخر وہ غلہ ختم ہوا اور والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ آج ہم خدا کے مہمان ہیں، یہ سنکر مجھے ایسا ذوق اور ایسا سرور حاصل ہوا کہ بیان میں نہیں آسکتا[3]۔

شیخ کبیر سے مناسبت اور قلبی کشش

حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا۔ بارہ سال کا رہا ہوں یا کچھ کم زیادہ، اس وقت میں لغت پڑھتا تھا۔ ایک شخص جو ابوبکر خرّاط کے نام سے مشہور تھا، ابوبکر قوال بھی کہتے تھے میرے استاد کے پاس آیا، وہ ملتان ہو کر آرہا تھا، اس نے بیان کیا کہ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے پاس سے آرہا ہوں، اس نے ان کے فضائل و مناقب بیان کرنے شروع کئے کہ وہاں کے لوگ ایسے ذاکر، شاغل ہیں اور اوراد و نوافل کا ایسا انہماک ہے اور ذکر کی ایسی فضا ہے کہ مائیں اور لونڈیاں بھی چکی چلاتے وقت ذکر میں مشغول رہتی ہیں، اسی طرح کی اور بہت سی خصوصیتیں بیان کرتا رہا، مگر کوئی چیز

---

[1] سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس ص۱۴۵ [2] ایضاً ص۹۶ [3] سیر الاولیاء (ص۱۱۳)

[4] شیخ کبیر سے مراد اس کتاب میں ہر جگہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی ذات ہے۔ ۱۲

میرے دل میں نہ جمی، اسکے بعد اس نے بیان کیا کہ وہاں سے اجودھن آیا، وہاں میں نے ایسا بادشاہ دین دیکھا اور اس نے شیخ الاسلام شیخ فریدالدینؒ کا تذکرہ کیا، یہ سنتے ہی میرے دل کو بے اختیار کشش ہوئی، اور ان کی محبت و ارادت میرے دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ مجھے ان کا نام لینے میں مزا آنے لگا، اور میں ہر نماز کے بعد مزے لیکر ان کے نام کی رٹ لگاتا۔[1]

دہلی کا سفر سولہ سال کی عمر میں حضرت خواجہ بدایوں سے دہلی آگئے۔[2]

دہلی میں طالب علمی آپ نے دہلی آکر طالب علمی کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ مدت تین چار سال کی تھی، دہلی میں اس وقت بڑے نامور اساتذہ جمع تھے۔ یہ سلطان ناصرالدین محمود کا عہدِ حکومت اور غیاث الدین بلبن کا عہدِ وزارت تھا اور مولانا شمس الدین خوارزمی جو کہ مستوفی الممالک ہوکر شمس الملک کے لقب سے مشہور روزگار ہوئے استاذ الاساتذہ کی حیثیت رکھتے تھے سلطنت کے ایک اہم ترین عہدے کی ذمہ داری اور مشغولیت کے ساتھ اس زمانے کے علماء کی طرح درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا،

---

[1] سیر الاولیاء (ص۱۰۱) فوائد الفواد (ص۱۴۹)

[2] یہ سیر الاولیاء کا بیان ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ تین چار سال دہلی میں طالب علمی کرنے کے بعد خواجہ صاحب اجودھن گئے اور حضرت خواجہ فریدالدین سے بیعت کی، بیعت کے وقت آپنے اپنی عمر بیس سال بیان کی ہے (سیر الاولیاء ص۱۰۱) اس لئے سیر العارفین کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ آپ پچیس سال کی عمر میں بدایوں سے لاہور تشریف لے گئے۔

[3] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از قاضی ضیاءالدین برنی (ص۱۱۳) - ۱۲

[4] یہ صدر محاسب یا اکاؤنٹنٹ جنرل کا عہدہ تھا اور بہت بڑے علماء کو دیا جاتا تھا۔

حضرت خواجہؒ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔

اُستاد کے محبوب مولانا شمس الدین کو حضرتؒ سے تعلق خاص تھا، اور وہ ان کے محبوب ترین شاگرد تھے، آپ جس حجرۂ خاص میں مطالعہ فرماتے تھے اس میں کسی شاگرد کو آنے کی اجازت نہیں تھی، مگر حضرت خواجہؒ اور ان کے دو رفیق[۲] مولانا قطب الدین ناقلہ اور مولانا برہان الدین باقی اس قانون سے مستثنیٰ تھے۔[۱]

خواجہ شمس الملک کی عادت تھی کہ اگر کوئی شاگرد ناغہ کر دیتا تھا یا دیر سے آتا تھا تو فرماتے تھے کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا تھا کہ آپ نہیں آئے؟ حضرت خواجہ نے خود یہ قصہ بیان کرتے ہوئے تبسم فرمایا اور کہا کہ اگر کسی سے مزاح فرماتے تو کہتے کہ مجھ سے کیا قصور ہوا کہ آپ نہیں آئے تاکہ میں پھر وہی قصور کروں لیکن مجھ سے ناغہ ہو جاتا یا دیر میں جاتا تو میرے جی میں آتا کہ آج مجھ سے بھی یہی فرمائیں گے لیکن آپ مجھے دیکھ کر یہ شعر پڑھتے۔[۲]

آخر کم از آنکہ گاہ گاہے آئی و بما کنی نگاہے

اس کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب آبدیدہ ہو گئے اور سب سننے والوں پر رقت طاری ہو گئی اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اپنے حجرے میں اپنے ساتھ بٹھاتے، میں ہزار معذرت کرتا مگر منظور نہ فرماتے۔[۲]

علمی امتیاز و تفوق حضرت خواجہ نے اپنی ذہانت، مناسبت خداداد اور محنت سے اپنے رفقاء کے درمیان علمی امتیاز اور تفوق پیدا کر لیا۔ علمی مباحثوں اور سوال و جواب میں (جو قدیم نظامِ تعلیم کا ایک اہم جزو اور علمی استعداد و ذکاوت کی علامت سمجھی جاتی تھی) آپ کی طلاقت لسانی اور قوتِ استدلال کا ایسا اظہار ہوا کہ آپ جس علمی مسئلہ پر بحث کرتے طلبہ لاجواب ہو جاتے

---

[۱] سیر العارفین - ۱۲ [۲] فوائد الفواد ص ۶۸

اور محفل پر آپ کے علم و ذہانت کا سکہ بیٹھ جاتا، چنانچہ آپ کے ساتھی آپ کو مولانا نظام نجاتؔ اور مولانا نظام الدین محفل شکن کے لقب سے پکارنے لگے۔[1]

حفظِ مقامات اور اس کا کفارہ

اس زمانہ کے نصاب میں مقامات حریری داخل درس تھی عام طور پر طلبہ سمجھ لینے اور اس کے مشکل الفاظ و مفردات کے یاد کر لینے پر اکتفا کرتے تھے، لیکن حضرت خواجہؒ نے اپنے علمی ذوق اور بلند ہمتی سے اس کے چالیس مقامے حفظ کئے، بعد میں اس کے کفارے میں حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" حفظ کی۔[2]

حدیث کی اجازت

آپ نے حدیث اپنے زمانہ کے مشہور محدث شیخ محمد المارکلی مشہور کمال الدین زاہد (م ۶۸۴ھ) سے پڑھی جو مصنف مشارق الانوار علامہ حسن ابن محمد الصغانی کے براہ راست شاگرد تھے۔ فقہ میں ان کو بیک واسطہ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین المرغینانی سے تلمذ تھا، آپ نے ان سے "مشارق الانوار" کا درس لیا اور حدیث کی اجازت حاصل کی۔[3]

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۰۱)　　[2] ایضاً

[3] سیر الاولیاء (ص ۱۰۵) اجازت نامہ جو عربی میں ہے اور سیر الاولیاء میں بلفظہ منقول ہے، ۲۳ ربیع الاول ۶۷۹ھ تاریخ درج ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اجازت نامہ آپ کو جب حاصل ہوا ہے اس وقت آپ کی عمر (سنہ ولادت ۶۳۶ھ کے حساب سے) ۴۳ سال تھی اور یہ واقعہ شیخ کبیر کی وفات (۶۶۴ھ) کے تیرہ سال کے بعد اور اس وقت کا ہے جب آپ مسند ارشاد و تربیت پر متمکن تھے اور آپ کی شہرت دور دور پہونچ چکی تھی۔ اجازت نامہ میں آپ کے لئے الشیخ الامام العالم الناسک السالک اور مقبول المشائخ الکبار منظور العلماء الاخیار الابرار" کے الفاظ ہیں اس لقب و شہرت میں حدیث کی تکمیل اور حصول اجازت سے آپ کے علمی ذوق اور علو ہمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قلب کی بیچینی اور انجذاب الی اللہ

حضرت خواجہ اگرچہ پورے انہماک کے ساتھ طلبِ علم میں مشغول تھے اور ان کی بلند ہمتی اور غربت اس سلسلہ میں کسی کسلمندی اور تساہل کی روادار نہ تھی لیکن دل کسی اور چیز کو ڈھونڈھتا تھا، اس بحث و مباحثہ اور علوم ظاہری کی فضا میں ان کی طبیعت متوحش ہو جاتی تھی، ایک دن فرمایا کہ ایام جوانی میں کہ جب لوگوں کیساتھ نشست و برخاست رکھتا تھا ہمیشہ دل پر گرانی رہتی تھی اور دل ہی دل میں کہتا تھا کہ میں کب ان لوگوں کے بیچ میں سے چلا جاؤں گا۔ اگرچہ یہ سب پڑھنے پڑھانے والے لوگ تھے اور ہمیشہ علمی بحث و مباحثہ میں مشغول رہتے تھے، لیکن اکثر میری طبیعت متوحش ہو جاتی اور میں دوستوں سے کہتا کہ میں ہمیشہ تمہارے درمیان نہیں رہوں گا، میں کچھ دن تمہارے یہاں مہمان ہوں، امیر حسن علا سجزی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یہ حضرت شیخ الاسلام فریدالدینؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے کا قصہ ہے۔ فرمایا: "ہاں!"

والدہ صاحبہ کا انتقال

دہلی کے قیام میں حضرت خواجہ کی والدہ ماجدہ نے انتقال فرمایا۔

والدہ کی یاد

ایک روز عرصہ کے بعد حضرت خواجہ نے اپنی والدہ کے انتقال کا ذکر کیا، ذکر کرتے ہوئے اتنا گریہ طاری ہوا کہ جو کچھ فرماتے تھے پورے طور پر سننے میں نہیں آتا تھا۔ اسی حالت میں یہ شعر پڑھا ؎

افسوس دلم کہ ہیچ تدبیر نکرد　　بہائے وصال را بہ زنجیر نکرد[1]

والدہ کا یقین و توکل

حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں:- ایک دن نیا چاند دیکھ کر حاضر ہوا اور قدمبوسی کی اور نئے چاند کی مبارکباد معمول کے مطابق پیش کی، فرمایا کہ:- آئندہ مہینہ کے چاند کے موقع پر کس کو قدمبوسی کرو گے؟ میں سمجھ گیا کہ انتقال کا وقت قریب ہے، میرا دل

---

[1] فوائد الفواد (ص ۴۷)

بھر آیا اور میں رونے لگا۔ میں نے کہا کہ:۔ مخدومہ! مجھ غریب کو آپ کس کے سپرد کرتی ہیں؟ فرمایا:۔ اس کا کل جواب دونگی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس وقت کیوں نہیں جواب دیتیں۔ یہ بھی فرمایا کہ: جاؤ آج رات شیخ نجیب الدین کے یہاں رہو، ان کے فرمانے کے مطابق میں وہاں گیا۔ آخر شب میں صبح کے قریب خادمہ دوڑتی ہوئی آئی کہ بی بی تم کو بلا رہی ہیں۔ میں ڈرا اور میں نے پوچھا خیریت ہے؟ کہا ہاں، جب میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ:۔ کل تم نے مجھ سے ایک بات پوچھی تھی۔ میں نے اس کا جواب دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں اس کا جواب دیتی ہوں غور سے سنو! فرمایا تمہارا دایاں ہاتھ کون سا ہے، میں نے ہاتھ سامنے کر دیا میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: خدایا! اس کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔ یہ کہا اور جاں بحق تسلیم ہوئیں، میں نے اس پر خدا کا بہت شکر کیا اور اپنے دل میں کہا کہ اگر والدہ ہوتے اور موتیوں سے بھر لیوا ایک گھر چھوڑ کر جاتیں تو مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی۔

ایک تمنائے خام

اس وقت دار الحکومت دہلی کی پوری فضا خاص طور پر طلبہ اور علماء کے حلقے قضا و افتاء کے تذکروں، ان منصبوں پر علماء کی تقرری اور قاضیوں اور مفتیوں کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کے قصوں سے معمور و گرم تھے۔ حضرت خواجہؒ اپنی فطری سعادت اور اعلیٰ روحانی استعداد کے باوجود اس وقت کم سن اور نوجوان تھے۔ علمی امتیاز اور معاشی تنگ حالی کے ساتھ اگر ان کے دل میں بھی کسی جاہ و منصب کا ولولہ اور امنگ پیدا ہوتی تو فطرت انسانی کے کچھ خلاف نہیں۔ آپ نے ایک دن شیخ نجیب متوکلؒ سے عرض کیا کہ دعا کیجئے کہ میں قاضی ہو جاؤں۔ شیخ نجیب الدین خاموش رہے اور کچھ نہ فرمایا۔ حضرت خواجہ سمجھے کہ انھوں نے سنا نہیں۔ دوبارہ ذرا بلند آواز سے فرمایا کہ:۔ دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ کہیں کا قاضی ہو جاؤں۔ شیخ نے فرمایا:۔ قاضی مت ہو کچھ اور چیز ہو۔[2]

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۵۱)

[2] فوائد الفواد

اجودھن کی پہلی حاضری

حضرت خواجہؒ اجودھن حاضر ہونے سے پہلے دہلی میں شیخ کبیر کے برادرِ حقیقی خواجہ نجیب الدین متوکل سے متعارف ہو چکے تھے اور کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہنا بھی ہوا تھا، ان کی صحبت اور گفتگو نے شیخ کبیر کے ساتھ محبت کی اس چنگاری میں جو کمسنی اور بدایوں کے قیام ہی سے طبیعت میں ودیعت تھی، اشتعال و حرکت پیدا کر دی آپ نے شیخ کبیر کی خدمت میں حاضری کا عزم کر لیا اور بالآخر آپ انکی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

طالب یا مطلوب؟

اپنی اس ملاقات اور پہلی حاضری کا حال خود ہی بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ میں جب شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا۔ ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ　　سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

میں نے چاہا کہ پائے بوسی کے اشتیاق کو جو عرصۂ دراز سے بیچین کئے ہوئے تھا ذرا تفصیل سے بیان کروں، لیکن شیخ کے رعب و جلال سے زبان اور قوتِ گویائی نے ساتھ نہ دیا، اتنا ہی کہہ سکا کہ قدمبوسی کا سخت اشتیاق تھا۔ شیخ نے جب دیکھا کہ میں اتنا مرعوب ہوں تو فرمایا:۔ "لِکُلِّ دَاخِلٍ دَهشة"، ہر نئے آنے والے پر رعب ہوتا ہی ہے۔[1]

مرید کی خاطر

شیخ کبیرؒ نے حضرت خواجہ کی بڑی خاطر فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ اس پردیسی طالب علم کے لئے جماعت خانہ میں چارپائی بچھائی جائے حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ جب چارپائی بچھ گئی تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ہرگز اس چارپائی پر آرام نہ کروں گا، کتنے معزز مسافر کتنے حافظ کلام اللہ کتنے عاشقانِ خدا زمین پر

---

[1] فوائد الفواد (ص ۳۱)

سورہے ہیں، میں چارپائی پہ کیسے لیٹوں ؟ یہ خبر منتظم خانقاہ مولانا بدرالدین اسحٰق کو پہنچی، انھوں نے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ تمھیں اپنے دل کی کرنا ہے یا شیخ کے ارشاد کی تعمیل۔ میں نے عرض کیا کہ شیخ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا، فرمایا کہ جاؤ چارپائی پر سوؤ۔[1]

بیعت

اسی حاضری میں کسی وقت حضرت خواجہ جس ارادے سے آئے تھے، اس کی تکمیل کی اور شیخ کبیر سے بیعت ہوگئے، اس وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔[2]

سلسلۂ تعلیم کا اجرا یا انقطاع ؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ کی کچھ کتابیں ابھی باقی تھیں، جذب و شوق کا تقاضا تھا کہ اب اس سلسلہ کو ختم کیا جائے اور علمِ حقیقی اور معرفت حقیقی میں صرف کیا جائے جو پیدائش کا اصل مقصد اور یہاں کی حاضری کی غرض و غایت ہے۔ گویا سعدیؒ کا یہ شعر حسب حال تھا۔ ؎

سعدی بشوے لوح دل از نقش غیر دوست
علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است

تعلیم و تعلم کا طول طویل سلسلہ پہلے بھی قلب حساس اور روح بیدار پہ بار تھا لیکن اسکو ایک ضرورت سمجھ کر اور اسلئے بھی کہ کوئی دوسرا راستہ سامنے نہ تھا، اختیار کیا تھا، اب جبکہ یقین کا سرِ رشتہ اور علمِ حقیقی کا سرچشمہ مل گیا اس سلسلۂ دراز کا جاری رکھنا طبیعت پہ سخت بار تھا اور زبانِ حال کہہ رہی تھی ؎

میری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم، نخیل بے رطب

لیکن جس شیخ کامل سے تعلق پیدا کر لیا تھا وہ جذبِ کامل کے ساتھ خود بھی کامل العلم تھا اور طریقت کیلئے بقدر ضرورت علمِ ظاہر کو ضروری سمجھتا تھا، خود اسکے شیخ نے یہی ہدایت اسکو کی تھی، پھر مولانا نظام الدین سے ارشاد و تربیت کا جو کام لینا تھا اس کی نازک ذمہ داریوں کو

---

[1] سیر الاولیاء (صفحہ ۱۰۶) [2] ایضاً صفحہ ۱۶ [3] فوائد الفواد صفحہ ۵

ادا کرنے کے لئے علم راسخ کی ضرورت تھی، یوں بھی صاحب نظر شیخ طالب کی مناسبت کو دیکھتے ہیں حضرت خواجہ نے بیعت کے بعد فرمایا کہ میں تعلیم ختم کردوں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاؤں؟ شیخ کبیرؒ نے فرمایا کہ میں کسی کو تعلیم سے نہیں چھڑاتا، وہ بھی کرو یہ بھی کرو، دیکھو کیا چیز غالب آتی ہے؟ یہ بھی فرمایا کہ: درویش کو تھوڑا علم بھی چاہیئے[1]۔

شیخ کبیرؒ سے درس

شیخ کبیر کی یہ خصوصی عنایت اور اختصاص تھا کہ آپ نے حضرت خواجہ کو بنفس نفیس بعض چیزیں پڑھانا شروع کیں۔ فرمایا کہ: نظام تم کو کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی ہوں گی، چنانچہ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی تصوف کی مشہور کتاب عوارف المعارف کا درس شروع کیا اور چھ باب اس کے پڑھائے، اسکے علاوہ تمہید ابو شکور سالمی بھی اول سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی، مزید برآں تجوید کی تعلیم بھی دی، اور چھ پارے کامل تجوید کیساتھ پڑھائے[2]

درس کی لذت

حضرت خواجہ زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اس درس کی لذت کو یاد فرماتے رہے، فرماتے تھے کہ عوارف کے درس میں جو حقائق اور نکات حضرتؒ کی زبان سے سنے وہ پھر کبھی سننے میں نہ آئیں گے، بیان کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت تقریر فرماتے تھے تو یہ آرزو ہوتی تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آجاتی تو بڑا اچھا ہوتا[3]۔

خود شکنی کی تربیت

عوارف کا جو نسخہ درس کے وقت شیخ کبیر کے ہاتھ میں ہوتا تھا وہ کچھ سقیم بھی تھا اور خط بھی باریک تھا، چند ہی اسباق کے بعد ایک ایسا مقام آیا جہاں شیخ کو کچھ دیر تامل رہا، خواجہ نے سادگی اور نوعمری

---

[1] سیر الاولیاء (صـ۱۰۷)۔ [2] ایضاً صـ۱۰۶ [3] فوائد الفواد صـ۷۵

میں کہا کہ میں نے شیخ نجیب الدین متوکل کے پاس ایک اور نسخہ دیکھا تھا، وہ نسخہ صحیح تھا، شیخ نے فرمایا:۔ "درویش را قوتِ تصحیحِ نسخہ سقیم نیست"۔ (فقیر کو سقیم نسخہ کی تصحیح کی طاقت نہیں) بار بار شیخ نے یہ فقرہ دہرایا، خواجہ فرماتے ہیں کہ شروع میں تو مجھے خیال نہ آیا لیکن بار بار شیخ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تو سبق کے دوسرے ساتھی مولانا بدر الدین اسحٰق نے بتلایا کہ خطاب تمھاری طرف ہے، حضرت خواجہ کے ہوش اڑ گئے، فرماتے ہیں کہ "سر بر ہنہ کردم و در پائے شیخ افتادم" کہتے جاتے تھے۔ نعوذ باللہ میرا اس سے حضرت پر تعریض کرنا ہرگز مقصود نہ تھا، خواجہ فرماتے ہیں میں نے ہر چند معذرت کی، لیکن حضرت کا ملالِ خاطر نہ گیا۔ فرماتے ہیں میں اُٹھ گیا، لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ وہ دن جیسا مجھ پر گذرا اور جس حزن و غم کا پہاڑ مجھ پر ٹوٹا شاید کبھی کسی شخص کو ایسا کبھی پیش آیا ہو۔ سراسیمہ و پریشان باہر آیا، ایک مرتبہ تو یہ جی چاہا کہ کنویں میں گر کر جان دے دوں لیکن کچھ سوچ کر باز رہا، اسی پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں جنگل کو نکل گیا اور بہت رویا۔

شیخ کبیرؒ کے ایک صاحبزادے شہاب الدین نامی سے خواجہ کا خاص میل ملاپ تھا، انھوں نے شیخ کبیرؒ سے خواجہ کا یہ حال کہا جو مقصود تھا پورا ہو چکا تھا، حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔ "آمدم سر بر قدم مبارک آوردم" معافی ہوئی۔ دوسرے روز طلب فرمایا اور ارشاد ہوا: یہ سب میں نے تمھاری تکمیل حال کیلئے کیا، پیر شاطر مرید ہوتا ہے۔ اس ارشاد کے بعد خلعت و کسوتِ خاص سے سرفراز فرمایا گیا۔[1]

---

[1] فوائد الفواد (ص۳۷) یہاں پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ شیخ کامل نے تلمیذ رشید کی ایک معمولی سی اطلاع اور معروض پر اتنی برافروختگی اور آزردگی کا اظہار فرمایا، اسلئے کہ جیسا کہ خود شیخ کے جملہ سے معلوم ہوتا ہے یہ سب آزردگی بہ تکلف اور طالب رشید کی ترقی باطنی اور خود شکنی کے لئے ہے۔ شیخ مجتہد و مخلص اسکے لئے اپنے مختلف ذرائع اختیار کر سکتا ہے اور اس کے لئے کسی تقریب و موقع کا بھی انتخاب کر سکتا ہے، حضرت کعب بن مالک کے ابتلا کے واقعہ سے اور انکو اس کوتاہی پر جو ان سے بلا ارادہ سرزد ہوئی تھی جو سرزنش کی گئی اور انکے ساتھ جو رویہ اختیار کیا (البقیہ ص۶۴ پر)

فیصلہ کن موقع

حضرت خواجہ نظام الدین کے لئے وہ وقت جب شیخ کبیر ان کے صرف اتنا کہہ دینے پر کہ: "میں نے شیخ نجیب الدین کے پاس ایک بہتر نسخہ دیکھا ہے"۔ اپنی کبیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، ایک بڑا نازک وقت تھا، بظاہر اس معصوم جملہ اور اطلاع پر کہ: "میں نے آپ ہی کے بھائی کے پاس ایک بہتر نسخہ دیکھا ہے" اتنی ناراضگی اور احتجاج کی ضرورت نہ تھی لیکن شیخ کامل کو ایک ایسے طالب علم سے جس کو اس کا جانشین بننا تھا اور لوگوں کی خود شکنی کی تربیت کرنی تھی، اتنی خود بینی بھی گوارا نہ تھی، پھر اس مسترشد کو کمال حال کے جس مقام تک پہونچانا تھا اسکے لئے اضطرار و اضطراب، شکستہ دلی و شکستگی کی خاص کیفیت پیدا کرنی مقصود تھی، لیکن ایک ذہین اور صاحب استعداد نوجوان کیلئے جو اپنی علمی تکمیل کر چکا تھا، یہ وقت بڑا نازک اور فیصلہ کن تھا اور اسی پر اس کے مستقبل کا انحصار تھا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے صحیح لکھا ہے: —

"صادق و کاذب طلب میں امتیاز کا وقت آگیا۔ دنیا دیکھ رہی تھی اب مولانا نظام الدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ کیا مولانا نجّاث اور محفل شکن ہی کے لقب کو لیکر دنیا سے واپس چلے جائیں گے؟ جیسے لاکھوں ہی نجاث و محفل شکن آئے اور چلے گئے، یا مشائخ کے سلطان کا جو تخت خالی ہے اس پر قدم رکھنے کی ہمت کرتے ہیں، اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہوتی ہے، ورنہ سچ یہی ہے۔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

چند کلیاں جواب تک ان کے ہاتھ میں تھیں وہ پھینک دی گئیں اور اپنی تنگ دامانی

(۶۳ کا بقیہ حاشیہ) اور کرایا گیا اس سے بھی روشنی اور رہنمائی حاصل کیجا سکتی ہے۔ ۱۲

کے علاج کے آخری فیصلہ پر وہ ڈٹ گئے۔ ظرف کے چھوٹے ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ بھلا میرا کیا قصور، میں نے غلطی ہی کیا کی ہے، ایک اچھے نسخہ کا علم تھا، اس کا اظہار کیا گیا تھا پھر اس پاتی برہمی کے کیا معنی؟ یہی شوشہ اگر سامنے آجاتا وہی لمبی لکیر بن سکتا تھا۔ اتنی لمبی کہ شیطان کی آنت بھی اس سے چھوٹی ہو۔ بڑھاپے میں دماغی توازن صحیح نہیں رہا ہے، مزاج میں تندی اور غصہ سے آگے بڑھ کر اسی کو "نفسانیت" کا ثبوت بھی قرار دیا جاسکتا تھا بلکہ دین کی آڑ لیکر سلطان جی چاہتے تو "اسوۂ حسنہ نبویہ" کے معیار پر شیخ کبیر کے اس طرز عمل کو کھوٹا بتا کر لوگوں کو دکھا سکتے تھے، لیکن ظاہر ہے وہ اپنا علاج کرانے آئے تھے، شیخ کبیر کی کمزوریوں کا علاج اجودھن آنے سے مقصود نہ تھا، اس کو طے کر چکے تھے کہ یہ معالج طبیب ہے، اس کے بعد تنقید کا حق ان کے لیے باقی ہی کب رہا تھا۔[1]

ایک رفیق کی ملامت

خواجہ فرماتے ہیں کہ میں شیخ کبیر کی خدمت میں اجودھن حاضر تھا، ایک عالم بھی جو میرے دوست اور ہم درس تھے اور ہم دونوں ایک ساتھ مذاکرہ کرتے تھے، اجودھن آئے، انھوں نے جب مجھے پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھا تو بڑی حیرت و تاسف سے مجھ سے کہا: "مولانا نظام الدین تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے اگر تم شہر میں درس و تدریس کی خدمت میں مشغول رہتے تو مجتہد زمانہ ہوتے اور بڑی شان و شوکت سے رہتے"۔ میں نے اپنے دوست کی یہ بات سنی اور ان سے معذرت کر دی، اسکے بعد جب میں شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے خود بخود فرمایا کہ: نظام! اگر تمہارا کوئی دوست تمھیں ملے اور تم سے کہے کہ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے اور تعلیم و تعلم کا وہ سلسلہ کیوں چھوڑ دیا

---

[1] "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" ج ۲ ص ۹۴-۹۵

جو فارغ البالی اور خوشحالی کا ذریعہ بنتا، اور یہاں اس حال میں کیوں ہو، تو تم اسکا کیا جواب دوگے؟ میں نے عرض کیا کہ جو ارشاد عالی ہو وہی کہدونگا۔ فرمایا اگر کبھی کوئی ایسا سوال کرے تو یہ شعر پڑھ دینا ؎

نہ مہر ہی تو مرا راہ خویش گیرد و رد ترا سلامتی بادا مرنگونساری

اس کے بعد حکم ہوا کہ خانقاہ کے مطبخ سے مختلف قسم کے کھانے ایک خوان میں اپنے سر پہ رکھ کر اس رفیق کے پاس لے جاؤ۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ میرے دوست نے جب یہ منظر دیکھا تو روتا ہوا دوڑا اور میرے سر سے خوان اتارا اور کہنے لگا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ میں نے سارا قصہ سنایا، اس نے یہ سنکر کہا کہ تمہارے شیخ ایسے ہیں کہ انھوں نے تم کو بے نفسی کے اس مقام پر پہنچا دیا ہے، مجھے بھی ان کی خدمت میں لے چلو، جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو اپنے ملازم سے کہا کہ یہ خوان اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ چلو، میں نے کہا کہ نہیں، جیسے میں یہ خوان اپنے سر پہ رکھ کر لایا ہوں ویسے ہی سر پہ رکھکر لیجاؤنگا، غرض ہم دونوں خدمتِ بابرکت میں پہنچے اور ہمارے دوست نے حضرت کے ہاتھ پہ بیعت و توبہ کی اور آپکے حلقۂ خدام میں داخل ہوئے[1]۔

کتنے بار حاضری ہوئی؟

حضرت خواجہ شیخ اکبر کی زندگی میں تین بار اجودھن حاضر ہوئے پہلی یا کسی اور حاضری میں خلافت سے مشرف ہوئے تذکروں میں اسکی صراحت نہیں ہے[2]

شیخ کی نوازشیں

ایک حاضری میں ایک دن ۲۵ جمادی الاولیٰ کو نماز[3] جمعہ کے بعد طلبی ہوئی، شیخ کبیر نے اپنا لعابِ دہن حضرت خواجہ کے دہن میں ڈالا، قرآنِ مجید کے حفظ کی وصیت فرمائی، فرمایا کہ خدا نے دین و دنیا تم کو دی، یہاں سب کچھ یہی ہے، دہلی کی طرف روانہ کیا اور فرمایا:۔۔۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۳۹ و ص ۲۴۰ [2] فوائد الفواد (ص ۴۳)

[3] یہاں سیر الاولیاء میں سنہ تسع وستین وستمائۃ (۶۶۹ھ) یا تو غلط درج ہو گیا ہے اور تسع وخمسین ۵۹ مراد ہے اسلئے کہ شیخ کبیر کی وفات کا سنہ سیر الاولیاء وغیرہ میں ۶۶۴ھ ہے یا پھر تسلیم کیا جائے کہ آپکا سنہ وفات ۶۶۷ھ ہے جیسا کہ خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین درج ہے بہرحال سیر الاولیاء کے سنین میں تضاد ہے

"برو ملکِ ہند گیر" نظرۃ منک تکفینی[1]

رخصت و وصیت

فرمایا کہ دہلی جانا تو مجاہدہ میں مشغول رہنا، بیکار رہنا کچھ نہیں (نفلی) روزہ رکھنا نصف سال ہے، دوسرے اعمال نماز و حج (نفلی) نصف راہ۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ خلافت نامہ لکھ کر دیا اور ہدایت کی کہ مولانا جمال الدین کو ہانسی میں اور قاضی منتجب کو دہلی میں دکھا دینا، ارشاد ہوا کہ تم ایک سایہ دار درخت ہو گے جس کے سایہ میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی، استعداد کی ترقی کے لئے مجاہدہ کرتے رہنا۔

حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ ہانسی میں شیخ جمال الدین کو خلافت نامہ دکھایا، بڑا اظہارِ مسرت کیا اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس[2]

ایک دعا کی درخواست

اسی حاضری میں یکم شعبان کو حضرت خواجہ کی طرف سے شیخ کبیر کی خدمت میں اس دعا کی درخواست پیش کی گئی کہ:- خلق کے در بدر نہ پھرنا پڑے، درخواست قبول ہوئی اور دعا فرمائی گئی۔[3]

ایک موقع پر فرمایا گیا کہ میں نے اللہ سے تمہارے لئے تھوڑی سی دنیا مانگ لی ہے، خواجہ فرماتے ہیں کہ میں یہ سن کر متفکر ہوا کہ بڑے بڑے لوگ دنیا کے سبب سے فتنہ میں پڑ گئے میرا کیا حال ہوگا، شیخ نے فوراً ہی فرمایا کہ تم فتنہ میں نہیں پڑو گے۔ خاطر جمع رکھو۔ اب مجھے اطمینان ہوا۔[4]

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۲۳) [2] ایضاً ص ۱۱۶ و ص ۱۱۷ اس موقع پر سیر الاولیاء میں جو ۶۶۹ھ پھر دیا گیا ہے اسکے متعلق اوپر گفتگو ہو چکی ہے۔ ۱۲ [3] سیر الاولیاء ص ۱۲۳۔ [4] ایضاً ص ۱۳۲

اجودھن سے دہلی کو

خواجہ نظام الدینؒ اب اپنے مرشد و مربی سے رخصت ہو کر ہندوستان کی تسخیر روحانی اور خلق خدا کے ارشاد و تربیت اور تبلیغ و ہدایت کی عظیم و مقدس مہم پر روانہ ہوئے۔ یہ ایک فقیر بے نوا تھا جو ہندوستان بلکہ ساتویں صدی ہجری کے عالم اسلام کی سب سے مستحکم اسلامی دارالسلطنت کو جا رہا تھا۔ اس کے پاس اخلاص، اعتماد علی اللہ اور استغنا عن الخلق کے سوا کوئی زادِ راہ اور کوئی ہتھیار و سلاح نہ تھا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے خوب لکھا ہے:۔

"ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دارالسلطنت دہلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں نیچے سے اوپر تک بیشمار جھوٹے آلہہ پرا جائے بیٹھے ہیں، ان میں وہ بھی ہے جسکی زبان کی معمولی حرکت لوگوں کے تن سر سے جدا کر دیتی ہے وہ بھی ہیں جن کی نیازمندی خاک سے اٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے۔ گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے، مناصب بٹ رہے ہیں، روپے لٹائے جا رہے ہیں، گودیں بھر رہی ہیں اور جن جن ذرائع سے یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجودھن جانے سے پہلے دہلی کی علمی محفلوں کی محفل شکنی میں ان کی عام شہرت ہو چکی ہے، کچھ نہیں تو قضا کے عہدے سے لیکر شیخ الاسلامی و صدر جہانی کی خدمات تک کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پا رہے ہیں، لیکن اب خالق کی صورت میں جو الٰہ ان کو مل چکا تھا، سینہ اُسی کے وزن سے اتنا معمور تھا کہ کسی مخلوق کی کوئی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی، قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی جس کا اظہار وہی کبھی کبھی ان مشہور تیز الفاظ میں فرمایا کرتے تھے:۔

"ایمان کس تمام نہ شود تا ہمہ خلق — در نزدیکی او ہم چو پشک شتر نہ نماید"[1]

---

[1] سیر الاولیاء ص۱۵۵

مجلسِ مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لئے ساری ساری رات نماز پڑھتا تھا؛ اپنی انھیں نمازوں کو نگاہِ خلق میں حصولِ عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ جامع ملفوظات راوی ہیں کہ:-

دریں میاں خواجہ ذکر اللہ بالخیر
چشم پر آب کردہ برلب مبارک راند
بسوز اوّل شیخ الاسلامی را، پس
خانقاہ را، بعد ازاں خود را[1]

یہ سُنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں
آنسو آ گئے اور فرمایا کہ پہلے شیخ الاسلامی
کو جلاؤ، پھر آگ لگاؤ خانقاہ کو،
پھر اپنی خودی کو جلا کر خاک کر دو۔

الغرض اس شان کے ساتھ سب کچھ جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے ..... اور جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی اسی کے پایۂ تخت میں آپ پہونچ گئے۔[2]"

تصفیۂ حقوق

شیخ کبیرؒ نے ارادت و خلافت کے ساتھ کئی بار یہ تاکید کی تھی کہ مخالفین کو خوش کرنے کی پوری کوشش کرنا اور اہلِ حقوق کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا۔ خواجہ فرماتے ہیں کہ میں جب دہلی چلا تو مجھے یاد آیا کہ مجھے ۲۰ جیتل[3] ایک شخص کے دینے ہیں، اور ایک کتاب میں نے کسی سے مستعار لی تھی وہ کھو گئی ہے، میں نے بدایوں کے قیام میں یہ عزم کر لیا تھا کہ میں جب دہلی پہنچوں گا

---

[1] فوائد الفواد (ص ۲۳)

[2] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (ص ۱۵)

[3] جیتل یا چیتل تانبہ کا ایک سکہ تھا، ایک تنکہ کے (روپیہ) چونسٹھ جیتل اور ایک جیتل کے چار فلوس یعنی دھیلے تھے

تو اِن اہل معاملہ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا، جب میں اجودھن سے دہلی واپس آیا تو جس شخص کے بیس جیتل مجھے دینے تھے وہ بزاز تھا، میں نے اس سے کپڑا خریدا تھا، کسی وقت بیس جیتل میرے پاس جمع نہیں ہوئے کہ میں اسکو پہنچا دیتا، معاش کی بڑی تنگی تھی، کبھی پانچ جیتل ہاتھ آئے، کبھی دس، ایک مرتبہ دس جیتل ملے میں اُس بزاز کے دروازہ پر پہنچا، اسکو آواز دی، وہ باہر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تمھارے بیس جیتل میرے ذمہ ہیں، ایک مرتبہ تو مجھے دینے کی مقدرت نہیں، یہ دس جیتل لایا ہوں، اس کو لے لو، دس انشاء اللہ اسکے بعد پہنچا دوں گا۔ اس شخص نے یہ سنکر کہا کہ ہاں معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کے پاس سے آرہے ہو، اس نے وہ دس جیتل تو لے لئے اور کہا کہ میں نے دس جیتل معاف کئے۔

اس کے بعد میں اس شخص کے پاس گیا جس کی کتاب میں نے لی تھی، اس نے مجھے پہچانا نہیں، میں نے کہا کہ صاحب میں نے آپ سے ایک کتاب مستعار لی تھی، وہ کھو گئی، اب میں اس کی نقل تیار کر کے آپ کو دوں گا، میں بالکل اسی طرح لکھوا کر آپ کو پہنچا دوں گا۔ اس شخص نے کہا کہ ہاں تم جہاں سے آرہے ہو وہاں کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے، اسکے بعد اس نے کہا کہ میں نے وہ کتاب تم کو بخشی لیے

دہلی کی قیام گاہیں

خواجہ صاحبؒ اہل دہلی بلکہ اہل ہند کی خدمت کے لئے جب دہلی پہنچے تو باوجود اس کے کہ دہلی کا کوچہ کوچہ محلوں اور ایوانوں سے آباد تھا اور روز نئی نئی عمارتیں بن رہی تھیں، خواجہ صاحبؒ کے قیام کا کوئی ٹھکانا نہ تھا جب تک کہ غیاث پور کا قیام اختیار نہیں فرمایا، آپ نے اتنی قیامگاہیں اختیار کیں اور اتنے مقامات تبدیل کئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں اس فقیر کے لئے اپنا درویشانہ سامان رکھنے اور اپنا بوریہ بچھانے کے لئے جگہ نہیں تھی۔

سیر الاولیاء کے مصنف میر خورد اپنے والد سید مبارک محمد کرمانی کی زبانی جو حضرت خواجہؒ کے دوست

لے فوائد الفواد (صـ۱۴)

اور رفیق تھے، اس نقل مکانی کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو ناظرین کی عبرت کے لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔ سید مبارک محمد کرمانی فرماتے ہیں:۔

"جتنے سال سلطان المشائخ شہر دہلی میں رہے کوئی مکان آپ کی ملکیت میں نہ تھا اور ساری عمر آپنے کوئی جگہ اپنے اختیار سے انتخاب نہیں فرمائی۔ جب آپ بدایوں سے آئے تو سرائے میاں بازار میں جس کو نمک کی سرائے بھی کہتے ہیں، اُترے، والدہ اور ہمشیرہ کو وہاں رکھا اور خود ایک قواس (کمان گیر) کی بارگاہ میں جو سرائے مذکور کے سامنے تھی، مقیم ہوئے۔ امیر خسروؒ کا بھی اسی محلہ میں مکان تھا کچھ عرصہ کے بعد والدہ عرض کا مکان خالی ہوا، اس کے لڑکے علاقوں میں چلے گئے۔ امیر خسروؒ کی معرفت جو والدہ عرض کے نواسے تھے سلطان المشائخ کو یہ مکان قیام کے لیے مل گیا، آپ دو سال اس مکان میں رہے، یہ مکان شہر پناہ کے متصل منڈوہ دروازہ و مندھ پل کے نزدیک تھا، اس طرح سے کہ شہر پناہ کا بُرج اس عمارت کے اندر آ گیا تھا، مکان کے ایوان و رواق بڑے بلند اور شاندار تھے۔ اس عرصہ میں والدہ عرض کے لڑکے آ گئے، سلطان المشائخ کو اس مکان سے منتقل ہو جانا پڑا، آپ کی کتابیں جن کے سوا کوئی اور سامان نہ تھا ہم سروں پر رکھ کر چھپر والی مسجد میں (جو سراج بقال کے سامنے تھی) لے آئے۔ دوسرے روز سعد کاغذی نے جو شیخ صدرالدین کے مریدین میں تھے، یہ قصہ سنا اور سلطان المشائخ کے پاس آ کر بڑی عزت و توقیر اور خوشامد سے اپنے مکان پر لے گیا۔ بالاخانہ پر ایک بہت اچھی بارگاہ بنی ہوئی تھی، وہاں آپ کو ٹھہرایا۔ سلطان المشائخ ایک مہینہ وہاں ٹھہرے، اسکے بعد وہاں سے بھی اُٹھے، رکابدار کی سرائے میں جو قیصر پُل کے

منتقل تھی۔ سرائے کے درمیان ایک مکان تھا، وہاں مقیم ہوئے۔ ایک مدت کے بعد وہاں سے بھی منتقل ہو کر شادی گلابی کے مکان میں جو محمد میوہ فروش کی دکانوں کے درمیان واقع تھا، قیام اختیار کیا۔ اس درمیان میں شمس الدین شرابدار[1] کے لڑکے اور اعزہ جو آپ کے معتقد تھے آپ کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ شمس الدین شرابدار کے مکان میں لے آئے۔ کئی سال سلطان المشائخ اس مکان میں رہے۔ اس مکان میں بڑی راحت اور سکونِ خاطر میسر آیا۔[2]

فقر و فاقہ

خواجہ صاحب دہلی تشریف لائے تو ابتلا و تربیت کا وہ دور شروع ہوا جو اس راہ کے ان سالکوں کو جو آگے چل کر مرجع خلائق و سرچشمۂ فیوض بنتے ہیں عادتاً پیش آیا کرتا ہے، یہ وہ وقت تھا کہ سارے ہندوستان کی دولت اور زر و جواہر دہلی امنڈ کر آرہے تھے اور ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ایک جیتل میں دو سیر میدے کی پکی پکائی روٹیاں مل جاتی تھیں اور دو جیتل میں ایک من خربوزہ آجاتا تھا، لیکن خواجہ صاحب کے فقر و فاقہ کا یہ حال تھا کہ فرماتے ہیں کہ:- میرے پاس ایک دانگ بھی نہ ہوتا کہ اس سے میں روٹیاں خرید کر خود کھاؤں اور والدہ و ہمشیرہ اور گھر کے ان لوگوں کو کھلاؤں جو میری کفالت میں تھے، خربوزہ کی اس ارزانی و فراوانی کے باوجود پوری پوری فصل گذر جاتی اور خربوزہ چکھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اپنے اس حال میں خوش رہتا اور آرزو کرتا کہ جتنی فصل باقی ہے وہ بھی گذر جائے اور میں اسی حال میں رہوں۔[3]

---

[1] بادشاہ کو پانی پلانے کا عہدہ - ۱۲

[2] سیر الاولیاء (ص ۱۰۸)

[3] سیر الاولیاء (ص ۱۱۳)

غیر کے واسطہ کے بغیر

اسی زمانہ میں جبکہ آپ شہر پناہ کے اس برج میں مقیم تھے جو مندہ دروازہ کے متصل ہے، کئی روز گذر گئے اور کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں آئی۔ ایک طالبعلم کو اس کا علم تھا کہ کئی روز سے حضرت کو فاقہ ہے، اس طالبعلم نے بعض ہمسایوں کو جو نوربافت تھے اس کی اطلاع کی، وہ کھانا تیار کرکے لائے۔ کھانے کیلئے ہاتھ دھلاتے وقت کھانا لانے والوں میں سے ایک بولا خدا طالبعلم کا بھلا کرے کہ اسنے ہمیں خبر کردی۔ خواجہ نے ہاتھ روک لئے اور فرمایا:۔ کیا خبر کی؟ اس نے کہا کہ:۔ فلاں طالبعلم نے ہمیں بتلایا کہ کہ آپ کئی روز سے فاقہ سے ہیں، چنانچہ ہم یہ کھانا تیار کرکے لائے۔ آپنے فرمایا: معاف رکھو۔ کتنی ہی ان لوگوں نے کوشش کی، آپ نے کھانا قبول نہیں کیا۔[1]

شیخ کبیرؒ کی وفات

آخری بار آپ شیخ کبیرؒ کی خدمت میں تین چار مہینے قبل گئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ:۔ ۵ محرم کو شیخ کبیرؒ نے وفات پائی اور شوال کے مہینہ میں مجھے حضرت نے دہلی بھیجدیا۔ بیماری کی ابتدا ہوچکی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا اور آپ بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ رہے تھے، ایک روز کہیں سے خربوزہ آیا تھا، خربوزہ کاٹ کر میں نے شیخ کے سامنے رکھا شیخ نے تناول فرمایا اور ایک قاش مجھے عنایت فرمائی۔ میرے دل میں آیا کہ یہ دولت اب کب ملیگی کہ اپنے دست مبارک سے مجھے عنایت فرمارہے ہیں، میں کھالوں اور دو مہینے مسلسل روزے رکھکر (فرض روزہ توڑ دینے) کا کفارہ ادا کردونگا۔ فرمایا کہ نہیں نہیں میرے لئے تو شریعت کی اجازت ہے، تمہارے لئے جائز نہیں۔[2]

فرمایا کہ انتقال کے وقت مجھے یاد فرمایا اور فرمایا کہ: نظام الدین تو دہلی میں ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ میں بھی اپنے شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی رحلت کے وقت حاضر نہ تھا، ہانسی میں تھا۔ فوائد الفواد

---

[1] جوامع الکلم (ملفوظات حضرت خواجہ سید محمد گیسو درازؒ) ص ۲۹۶ [2] سنہ ۶۶۴ھ [3] فوائد الفواد (ص ۵۳)

میں ہے کہ یہ تذکرہ کرتے وقت آپ پر ایسا گریہ طاری ہوا کہ تمام حاضرین کے دل متاثر ہوئے۔[1]

وفات کے بعد آپ اجودھن حاضر ہوئے۔ مولانا بدرالدین اسحٰق نے شیخ کبیرؒ کی وصیت کے مطابق جامہ مصلّٰے اور عصا سپرد کیا جو حضرت خواجہ کو دینے کے لئے شیخ کبیرؒ نے مولانا نے کے حوالہ کیا تھا۔[2]

غیاث پور کا قیام

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک روز آپ نے شہر کے شور و شر کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ ابتدائی زمانہ میں بھی میرا شہر میں دل نہیں لگتا تھا۔ ایک روز قتلغ خاں کے حوض پر تھا، ان دنوں میں قرآن مجید یاد کر رہا تھا، وہاں ایک درویش یادِ خدا میں مشغول تھا۔ میں اسکے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں؟ انھوں نے کہا:۔ ہاں! میں نے کہا: اپنی مرضی سے اس شہر میں رہتے ہیں؟ اس نے کہا: یہ بات تو نہیں ہے۔ اسکے بعد اس درویش نے واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک اچھے درویش کو دیکھا، بیرون کمال دروازہ، اس احاطہ میں جو لبِ خندق ہے اس دروازے کے قریب ایک بلند زمین ہے جس پر شہداء کی چار دیواری بنی ہوئی ہے، وہ درویش بیٹھا ہوا ہے۔ اس درویش نے مجھ سے کہا کہ اگر ایمان کی خیر چاہتے ہو تو اس شہر سے چلے جاؤ۔ میں نے اسی وقت سے اس شہر سے چلے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیکن موانع پیدا ہوتے رہے، آج پچیس سال ہو گئے کہ میرا ارادہ باقی ہے لیکن جانے کی نوبت نہیں آتی۔ حضرت خواجہ نے یہ حکایت بیان کر کے فرمایا کہ میں نے جب اس درویش کی یہ بات سنی تو اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ میں اس شہر میں نہ رہوں گا۔ کئی جگہ کا خیال آتا تھا کہ میں وہاں چلا جاؤں۔ کبھی دل میں آتا تھا کہ قصبہ پٹیالی[3] چلا جاؤں، وہاں ان دنوں ایک ترک تھا۔ کبھی دل کرتا تھا کہ بشنالہ جاؤں، وہ ایک پاک صاف جگہ ہے، چنانچہ

---

[1] فوائد الفواد ص ۵۳ [2] سیر الاولیاء، ص ۱۲۲

[3] ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے جو حضرتؒ کا ننہال یہیں تھا اور اسی تقریب سے وہ وہاں رہتے تھے۔ ۱۲

بشنالہ چلا گیا، تین روز وہاں رہا، کوئی مکان نہیں ملا، نہ کرایہ کا نہ بقیمت، ان تین دنوں روزانہ کسی ایک کا مہمان رہتا تھا، جب وہاں سے واپس آیا تو یہی خیال لگا رہا کہ ایک روز حوض رانی کی طرف گیا ہوا تھا، وہاں ایک باغ میں جس کو "باغِ حیرت" کہتے ہیں، اللہ سے مناجات کی۔ طبیعت متوجہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ خداوندا! میں اس شہر سے چلا جانا چاہتا ہوں، لیکن کوئی جگہ اپنی مرضی سے اختیار نہیں کرونگا جہاں آپ کی مرضی ہو وہاں چلا جانا چاہتا ہوں، اس درمیان میں ایک غیبی آواز "غیاث پور" کے نام کی آئی۔ میں نے کبھی غیاث پور دیکھا نہیں تھا، اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ غیاث پور کہاں ہے، میں نے جب آواز سنی تو ایک دوست کے پاس گیا۔ وہ دوست ایک نیشاپوری نقیب تھا، جب میں اس کے گھر گیا اور اسکو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ غیاث پور گیا ہوا ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ وہی غیاث پور ہے، الغرض غیاث پور آیا، اس وقت تک یہ مقام ایسا آباد نہیں تھا، ایک غیر معروف جگہ تھی، آدمی بھی کم تھے۔ میں آیا، میں نے وہاں سکونت اختیار کرلی، جب کیقباد[1] نے کیلوکھری کو اپنی فرودگاہ بنایا تو وہاں ہجوم خلائق ہوا۔ امراء اور اعیانِ سلطنت اور ان کے متعلقین کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ جب میں نے یہ اژدحام دیکھا تو اپنے دل میں کہا کہ اب یہاں سے بھی چلا جانا چاہیئے، اسی خیال میں تھا کہ ایک بزرگ کا جو میرے استاد بھی تھے، شہر میں انتقال ہوا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب میں ان کے فاتحہ میں جاؤں گا تو پھر کسی طرف کا قصد کروں گا، اپنے دل میں اس کو طے کرلیا۔ اسی روز نماز عصر کے وقت ایک جوان آیا حسین لیکن نحیف، خدا جانے مردانِ غیب میں سے

---

[1] سلطان معزالدین کیقباد (۶۸۶ھ، ۶۸۸ھ) بغراخاں کا لڑکا اور غیاث الدین بلبن کا پوتا تھا، ۳ سال حکومت کی۔ ۱۲

[2] سرسید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں: معزالدین کیقباد نے ۶۸۶ھ میں ایک قلعہ بنوایا اور کیلوکھری اسکا نام لکھا اگرچہ اس قلعہ کا اب نشان نہیں لیکن اسی جگہ ہمایوں کے مقبرے کے پاس موضع کیلوکھری موجود ہے اور دس پانچ جھونپڑے موجود ہیں ۱۲
(آثار الصنادید باب ۳، ص ۴)

تھا یا کون تھا، اس نے آتے ہی مجھے خطاب کر کے یہ شعر پڑھا۔ ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی کہ انگشت نمائے جہاں خواہی شد

(جس روز خدا نے تم کو چاند بنایا تھا، اسی روز سمجھنا چاہیئے تھا کہ ساری دنیا کی انگلیاں تمھاری طرف اٹھیں گی)

حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اس نے کچھ اور باتیں بھی کہیں جس کو میں نے لکھ لیا ہے، اسکے بعد اس نے یہ کہا کہ پہلی مرتبہ آدمی کو مشہور نہیں ہونا چاہیئے، اور جب کوئی شخص مشہور ہو جائے تو پھر ایسا بننا چاہیئے کہ کل روزِ قیامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ کیا ہمت و حوصلہ ہے کہ خلقِ خدا سے بھاگ کر گوشہ گیری اختیار کی جائے اور یادِ خدا میں مشغول ہوا جائے۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ قوت و حوصلہ کی بات تو یہ ہے کہ مخلوق کے باوجود یادِ خدا میں مشغول ہو۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کچھ کھانا لا کر اسکے سامنے رکھا، اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا، اسی وقت میں نے اپنے دل میں نیت کی کہ میں یہیں رہوں گا جب میں نے یہ نیت کر لی، تو اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور چلا گیا۔[1]

رجوعِ عام

غیاث پور کے دورانِ قیام میں خلقِ خدا اور طالبین کا رجوع شروع ہوا اور فتوحات کا دروازہ کھل گیا

تذکروں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ غیاث پور میں کتنی مدت گزرنے کے بعد آپ کی ذات بابرکات کو مرجعیت، اور غیاث پور کی خانقاہ کو شہرت عام حاصل ہوئی۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ غیاث پور کا قیام اختیار کرنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک عسرت اور بے اسبابی کا دور گذرا، یہانتک کہ ایک عرصہ

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۲۹

تک آپ سخت گرمیوں اور لو دھوپ کے زمانہ میں جامع مسجد کو جو خاصہ فاصلہ پر تھی جمعہ کے دن پیادہ پا تشریف لیجاتے تھے، یہاں تک کہ اس "عُسر" کے بعد "یسر" کا دور[1] آگیا اور وہ رجوع عام شروع ہوا کہ اسکے سامنے سلاطینِ دہلی کے درباروں کی عظمت ماند پڑگئی، امیر خسروؒ کے ان اشعار کی تصویر سامنے آگئی۔

ے در حجرۂ فقر بادشاہی — در عالم دل جہاں پناہی
شاہنشہے بے سریر و بے تاج — شاہانش بہ خاک پائے محتاج

فقیر و منعم

صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ:- وارد و صادر میں سے پردیسی ہو یا شہری جو آتا اور سعادت[2] قدمبوسی حاصل کرتا کسی کو محروم نہ فرماتے، پوشاک، نقد، تحائف جو بھی خدا بھیجتا سب ہی ان آنے جانے والوں پر صرف ہوتا، جو بھی آتا اور جس وقت بھی آتا محروم نہ جاتا[3]

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا:-

"فتوحات کا یہ حال تھا کہ دولت کا دریا آگے دروازے کے بہتا تھا، کوئی دن فتوحات سے خالی نہ ہوتا، صبح سے شام تک لوگ آتے بلکہ عشا تک، مگر لینے والے لانے والوں سے زیادہ ہوا کرتے اور جو کچھ کوئی لاتا اس سے زیادہ حضرتؒ کی عنایت سے پاتا۔"[4]

---

[1] انّ مع العسر یُسرًا - ان مع العسر یُسرا ـــ بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے، بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ ۱۲

[2] سیر الاولیاء۔

[3] سراج المجالس (ترجمہ خیر المجالس) ملفوظات حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ (صـ۲۰۲)

بیداری پر پہلا سوال

عادتِ مبارک تھی کہ جب قیلولہ سے اٹھتے تو دو باتیں سب سے پہلے پوچھتے، ایک یہ کہ زوال ہوگیا۔ دوسرے یہ کہ کوئی آیا تو نہیں، تاکہ اسکو انتظار نہ کرنا پڑے[1]۔

دنیا سے تنفّر اور بذل وعطا

دنیا کا جس قدر رجوع بڑھتا گیا اتنی ہی طبیعت اس سے متنفر ہوتی گئی، اکثر گریہ فرماتے، جتنی بڑی فتوحات ہوتیں اتنی ہی زیادہ گریہ کرتے اور اتنی ہی زیادہ کوشش فرماتے کہ جو کچھ آیا ہے جلد تقسیم ہو جائے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آدمی کو بھیجکر ہدایت فرماتے کہ جو کچھ ہو تقسیم کر دیا جائے، جب سب تقسیم ہو جاتا اور ضرورتمندوں کو پہنچ جاتا تو سکونِ خاطر ہوتا۔ ہر جمعہ کو حجروں اور انبار خانوں کو اس طرح خالی کرا دیتے جیسے جھاڑو دے دی گئی ہو، اس کے بعد مسجد جاتے، اگر بادشاہوں یا شہزادوں میں سے کوئی آستانہ پر حاضر ہوتا اور ان کی نذر اور آمد آمد کی خبر پہونچتی تو ٹھنڈی سانس بھر کر فرماتے کہ: کہاں آئے ہیں، فقیر کا وقت غارت کرتے ہیں[2]۔

زمین و جائداد سے پرہیز

امیر حسن علا سنجری فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حاضر تھا، ان دنوں میں ایک امیر نے باغ اور بہت سی زمین اور اسکے ساز و سامان کی دستاویز حضرتؒ کی خدمت میں بھیجی تھی اور اپنی عقیدت و اخلاص کا اظہار کیا تھا، حضرتؒ نے قبول نہ فرمایا، متبسم ہوکر فرمایا کہ اگر میں اسکو قبول کروں تو پھر لوگ کہا کرینگے کہ شیخ باغ کی سیر کو گئے ہیں اور اپنی کھیتی اور زمین دیکھنے تشریف لے گئے ہیں۔ میرے کام سے اس کو کیا مناسبت؟ میرے بزرگوں اور مشائخ میں سے کسی نے زمین و جائداد قبول نہیں کی[3]۔

---

[1] سیر الاولیاء ص۱۲۶ ۔ [2] ایضاً ص۱۲۹ [3] فوائد الفواد (ج ۱) ص۹۹

فقیر کا شاہی دسترخوان

خود دائم الصوم تھے، لیکن دونوں وقت شاہی دسترخوان لگتا اور انواع و اقسام کے کھانے وافر مقدار میں چُنے جاتے، امیر و غریب، شاہ و گدا، شہری و پردیسی، صالح و گناہگار کسی کی تفریق نہ تھی، سب ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے، لے جانے کی بھی اجازت تھی۔ بعض لوگ کھاتے اور باندھ کر بھی لے جاتے، یہ شاہی دسترخوان اپنی نوعیت میں یکتا تھا۔ اسی دسترخوان پر بیٹھ کر سیکڑوں ہزاروں غربا کو وہ کھانے نصیب ہوتے جن کے انھوں نے نام ہی نام سنے تھے، بڑے بڑے امرا، درباراور اعیان سلطنت کو بھی اس دسترخوان پر حاضری کی آرزو ہوتی تھی اور اس کھانے کی لذت کو وہ یاد کرتے تھے، ہدایت وارشاد اور سلوک و تربیت کے فیض عام کے علاوہ (جس کا ہر وقت دروازہ کھلا رہتا تھا) حضرت خواجہؒ کا یہ بھی فیض تھا جو دلّی میں اپنی پوری روانی کے ساتھ جاری تھا اور جو ہزاروں بندگانِ خدا کی پرورش کا ذریعہ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی نے درویش کے اس خوانِ "سلطانی" کا ذکر کرتے ہوئے خوب لکھا ہے:۔

> "آج جن چیزوں پر ایوانِ نعمت کے قصّوں کے ساتھ غریبوں کا دکھڑا رویا جاتا ہے، گویا یہ بھی ایک قسم کی حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چُورن ہے ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیۂ اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار دہ دربار تھا جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے۔ خود سلطان المشائخؒ کا کیا حال تھا، گذر چکا کہ ولی عہد سلطنت خضر خاں تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا۔ علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا، لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جسمیں اسے بھی باگزاری داخل کرنی پڑتی تھی"[1]

---

[1] نظامِ تعلیم (ص ۲۱۴)

یہی خانقاہیں تھیں جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غربا، فقرا تک ان کا حصہ پہنچ جاتا تھا، اور یہی مطلب ہے اس مشہور نقرہ کا کہ :-

"مالِ صوفی سبیل است"[1]

غربت و امارت کا یہ سنگم یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امرا و غربا دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے اس سے غریب اور حاجتمند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی علاقہ ایسا ہوگا جہاں

توخذ من اغنیاءھم — انکے دولتمندوں سے لیا جائے اور ان کے

وترد علیٰ فقراءھم — ضرورتمندوں کو پہونچا دیا جائے۔

کے نبوی فرمان کی تعمیل میں ارباب صدق و صفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا، خصوصاً جن بزرگوں کا کسی خاص وجہ سے امرا اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا، یوں سمجھئے کہ غربا کی قسمت جاگ اٹھتی تھی[2]۔

اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھئے اور اس پر غور کیجئے، آپ کو نظر آئے گا کہ امرا اور غربا کے درمیان ان بزرگوں کا وجود باجود حلقۂ اتصال بنا ہوا تھا ——

اور میرا خیال ہے کہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسری اغراض رکھتے تھے ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں، بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں، بلکہ ان ہی کے

---

[1] نظام تعلیم (ص۲۱۴) [2] ایضاً (ص۲۲۰)

ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو۔"[1]

شیخ کی غذا

شیخ خود کھانے میں شریک ہوتے، لیکن اس شاہی دسترخوان پہ جس پر انواع و اقسام کے کھانے اور الوانِ نعمت ہوتے، ان کی غذا عام طور پر ایک یا آدھی روٹی اور کچھ کریلہ وغیرہ کی سبزی یا تھوڑے سے چاول ہوتے۔[2] آپ کے ایک مرید باختصاص مولانا شمس الدین یحییٰ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں:-

"میں ایک مرتبہ دسترخوان پہ موجود تھا افطار کے وقت میری نظر سلطان المشائخ پر تھی، میں نے دیکھا کہ کھانا شروع ہونے کے وقت آپ نے لقمہ لینے کے لئے جو ہاتھ پیالہ کی طرف بڑھایا تھا وہ آخر تک وہیں رہا، منھ تک آنے کی نوبت نہ آئی کہ دسترخوان بڑھا دیا گیا۔"[3]

ترتیب

دسترخوان پر بیٹھنے کا قاعدہ اور ترتیب یہ تھی کہ سب سے آگے مخدوم زادگان (مرشد سے نسبتِ قرابت رکھنے والے) ہوتے، پھر علماء، پھر رؤسا، و اشراف[4]

سلاطین عہد سے بے تعلقی

سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد سلطنتِ ہندوستان کی دینی رہنمائی بلکہ سلطنتِ اسلامی کی تاسیس، اسلامی معاشرہ کی اصلاح اور اس میں روحانیت و انابت کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ ابتدا ہی سے سلاطین وقت سے بے تعلقی کے اصول پر پڑی تھی، اور یہ اس سلسلہ کا ایک شعار اور مشائخ چشتیہ کا مقدس ترکہ اور امانت بن گئی تھی۔ مشائخ چشت نے اس "شیشہ و آہن" کو جمع کرنے میں اپنا پورا کمال دکھا دیا تھا۔ ایک طرف وہ دربار کے غلط رجحانات کی اصلاح اور وقت کے فتنوں کے استیصال سے غافل اور عدم

---

[1] نظامِ تعلیم ص ۲۲۸ [2] سیر الاولیاء ص ۱۲۵ [3] ایضاً ص ۱۲۵ [4] ایضاً ص ۲۰۲

اسلام سے خالی اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل سے بے فکر نہ تھے، دوسری طرف وہ ایک اصول اور عقیدے کے طور پر یہ طے کر چکے تھے کہ ان کو دربار سے براہ راست کوئی تعلق رکھنا نہیں ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے لیکر خواجہ نظام الدین تک یہ گویا ایک طے شدہ حقیقت تھی کہ ان کو دربار میں جانا ہے اور نہ سلاطینِ وقت سے ملاقات کرنی ہے، اس اصول پر یہ سب حضرات سختی سے کاربند رہے، اس کا نتیجہ تھا کہ سیاست کے خارزار میں ان کا دامن کبھی نہیں اُلجھا، اور انقلاباتِ سلطنت کا ان مرکزوں اور ان کی سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ان کا اخلاص، ان کی بے لوثی اور بے غرضی تمام سیاسی اختلافات کے باوجود مُسلّم رہی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سب سے طویل عرصہ تک اس سلسلہ کو اپنا کام جاری رکھنے اور ہندوستان پر اثر انداز ہونے کا موقع ملا اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ اس سلسلہ کو قبول عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔

حضرت شیخ نظام الدینؒ جب سے شیخ کبیر کے پاس سے ہندوستان کی تسخیر روحانی اور تبلیغ و ارشاد پر مامور ہو کر آئے تھے دہلی کے تخت پر یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ بیٹھے اور انھوں نے بڑے جاہ و جلال کیساتھ سلطنت کی، لیکن سوائے ایک موقع کے جبکہ دینی ضرورت درپیش تھی (سماع کی حلت و حرمت کی مجلسِ مناظرہ) وہ کبھی نہ دربار میں گئے اور نہ بادشاہِ وقت کو اپنے یہاں آنے کی اجازت دی۔ غیاث الدین بلبن کے عہدِ سلطنت میں ان کا آفتاب شہرت و قبولیت نصف النہار پر نہیں پہنچا تھا، اس لئے غیاث الدین کو ان کی طرف توجہ نہیں ہوئی، معز الدین کیقباد لہو و لعب اور سیر و شکار میں مشغول رہا۔

جلال الدین خلجی پہلا بادشاہ تھا جو صاحب علم و حلم، جوہر شناس اور ارباب کمال کا قدردان تھا اور حضرت خواجہ کی شہرت بھی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جلال الدین نے کئی بار حاضری کی اجازت چاہی لیکن کبھی منظور نہیں ہوئی۔ آخر سلطان نے امیر خسروؒ کے ساتھ (جو سلطان کے مصحف بردار تھے) یہ منصوبہ بنایا کہ ایک مرتبہ بلا اطلاع حضرت کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ امیر خسروؒ نے مناسب جانا کہ اپنے مرشد کو اس کی اطلاع دے دی جائے، اس لئے کہ اگر میں نے اسکی اطلاع نہ دی تو شاید

میرے حق میں یہ اچھا نہ ہو، اگرچہ بادشاہ نے اس بارے میں امیر خسروؒ کو اپنا رازدار بنایا تھا لیکن اپنے مرشدؒ سے
سے رازداری امیر خسرو کو مناسب نہ معلوم ہوئی۔ امیر نے حضرت خواجہؒ سے جاکر عرض کیا کہ کل بادشاہ آپ کی
خدمت میں حاضر ہوگا۔ حضرت خواجہ نے یہ سنتے ہی اپنے مرشد کی قبر کی زیارت کی نیت سے اجودھن کا رخ فرمالیا
اور روانہ ہوگئے۔ بادشاہ کو جب اسکی اطلاع ملی تو امیر خسروؒ پر ناراض ہوا کہ تم نے میرا راز فاش کردیا اور حضرت
خواجہؒ کی قدمبوسی کی سعادت سے محروم کردیا۔ امیر خسروؒ نے کہا کہ بادشاہ کی بخشش سے جان جانے کا خوف تھا لیکن
مرشدؒ کی بخشش سے سلب ایمان کا خوف تھا۔ بادشاہ حلیم و فرزانہ تھا اس نے اس جواب کو پسند کیا اور خاموش ہوگیا۔

سُلطان علاؤالدّین کا امتحان اور عقیدت

سلطان علاء الدین خلجی جو ہندوستان قدیم کا سب سے باجبروت اور اقبال مند بادشاہ اور سکندر ثانی ہے اپنے
چچا جلال الدّین کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا۔ ابتدا میں اسکو حضرت خواجہ سے نہ کوئی خاص عقیدت تھی
نہ تنفر تھا، بعض لوگوں نے سلطان کو حضرت خواجہ کی طرف سے بدگمان کرنے کی کوشش کی اور ان کی مقبولیت
اور رجوع عام سے سلطنت کیلئے خطرات ثابت کئے، سلطان علاءالدین نے امتحاناً ایک عریضہ آپ کی خدمت
میں اپنے بیٹے اور ولیعہد خضر خاں کے ہاتھ بھیجا جس میں آپ سے انتظام سلطنت کے بارے میں مشورے اور نصائح کی
درخواست کی گئی تھی، جب خضر خاں یہ خط لیکر خواجہ کی خدمت میں آیا آپنے وہ کاغذ ہاتھ میں لے لیا اور اس کا
مضمون بھی نہیں پڑھا۔ حاضرین مجلس سے فرمایا کہ ہم دعا کرتے ہیں، اسکے بعد ارشاد ہوا کہ درویشوں کا بادشاہوں
سے کیا کام، ہمیں ایک فقیر آدمی ہوں، شہر کا ایک گوشہ اختیار کر رکھا ہے، بادشاہ اور مسلمانوں کیلئے دعاگوئی میں
مشغول ہوں، اگر اس وجہ سے بادشاہ کو مجھ سے تعرض کرنا ہے میں یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں، اللہ کی زمین وسیع ہے
سلطان علاءالدین اس جواب سے بہت خوش ہوا، اور کہا کہ میں جانتا تھا کہ حضرت خواجہؒ کو امور سلطنت و سیاست

لہ سیر الاولیاء ص ۱۳۵

کوئی سروکار نہیں، لیکن بدخواہ چاہتے ہیں کہ مجھے مردان خدا سے لڑادیں اور اس طرح ملک تباہ ہوجائے۔[1]

بادشاہ کے آنے سے معذرت

سلطان نے حضرت خواجہؒ سے بڑی معذرت کی اور کہلوایا کہ میں آں مخدوم کا معتقد ہوں، مجھ سے گستاخی ہوئی، معاف کیا جائے اور حاضری کی اجازت دیجائے کہ قدمبوسی کی سعادت حاصل کروں۔" حضرت خواجہؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔" آنے کی حاجت نہیں، میں غائبانہ دعا کرتا ہوں اور غائبانہ دعا بڑی موثر ہوتی ہے۔[2]

گھر کے دو دروازے

سلطان نے اس کے بعد بھی ملاقات کیلئے بڑا اصرار کیا حضرت نے فرمایا کہ اس فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازے سے آئے گا، میں دوسرے دروازے سے باہر چلا جاؤں گا۔[3]

غمِ اسلام

اگرچہ علاء الدین حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا، لیکن اس کو آپ سے برابر عقیدت رہی، اور وہ مہماتِ سلطنت اور فکر و تردد کے موقع پر حضرت خواجہؒ سے رجوع کرتا رہا۔ ایسے موقع پر آپ سے دعا کی درخواست کرتا اور آپ اہتمام کے ساتھ دعا فرماتے۔

قاضی ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ:۔ جب ملک نائب دکا فور ہزار دنگل کے محاصرے میں مشغول تھا، تلنگانہ کا راستہ پُرخطر ہوگیا تھا، راستہ کے تھانے اور چوکیاں بھی اٹھ گئیں تھیں، چالیس روز سے زیادہ ہوگئے تھے کہ لشکر کی سلامتی اور خیریت کی اطلاع سلطان تک نہیں پہنچی تھی، سلطان کو بڑا تردد تھا، اکثر اعیان و امراءِ دربار کا خیال ہونے لگا تھا کہ لشکر کسی حادثہ یا فتنہ کے نذر ہوگیا کہ سلسلۂ رسل و رسائل منقطع ہوگیا ہے۔ اسی فکر و تردد کے ایام میں ایک روز سلطان نے ملک قرا بیگ اور قاضی مغیث الدین بیانوی کو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں بھیجا اور کہلایا کہ لشکرِ اسلام کی خیریت نہ معلوم ہونے سے مجھے سخت تردد ہے

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۳۴ [2] ایضاً ص ۳۵ [3] ایضاً ص ۱۳۵

آپ کو اسلام کا غم اور فکر مجھ سے زیادہ ہی ہے اگر نور باطن سے آپ کو لشکر کا کوئی حال معلوم ہو تو مجھے مطمئن فرمائیں، سلطان نے پیغام لے جانے والوں کو ہدایت کی کہ حضرتؒ کی زبان سے اس موقع پر جو کچھ نکلے اس کو محفوظ رکھیں، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کریں۔ وہ دونوں حضرات شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے سلطان کا پیغام پہنچایا، آپ نے پیغام سننے کے بعد بادشاہ کی فتح و نصرت کا حال بیان کرنا شروع کیا اور فرمایا کہ "یہ فتح کیا ہے ہم اور فتوحات کی بھی امید رکھتے ہیں"۔ یہ سنکر ملک قرا بیگ اور قاضی مغیث الدین شاداں فرحاں واپس آئے اور سلطان کو جواب سنایا، سلطان یہ جواب سنکر بہت خوش ہوا، اس کو یقین ہو گیا کہ ورنگل فتح ہو چکا۔۔۔ اسی روز نماز عصر سے فارغ ہوئے تھے کہ ملک نائب کے قاصد پہنچے اور ورنگل کا فتح نامہ لائے، جمعہ کے دن وہ فتح نامہ منبروں پر سے پڑھکر سنایا گیا، صحن میں خوشی کا نقارہ بجا اور خوشیاں منائی گئیں، سلطان کا اعتقاد اور بڑھ گیا۔[1]

ایک دوسری مرتبہ جب مغل دہلی پر حملہ آور ہوئے، سلطان بنفس نفیس جنگ میں شریک تھا، اس نے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں عرض کرایا کہ یہ بڑا اہم موقع ہے آپ متوجہ رہیں، حضرت خواجہ نے تمام اہل خانقاہ سے ارشاد فرمایا کہ: متوجہ الی اللہ رہیں اور خدا سے مسلمانوں کی فتح کی دعا کریں، چنانچہ سب مشغول رہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں فتح کی خبر آئی، مغلوں نے شکستِ فاش کھائی۔[2]

قاضی ضیاء الدین سلطان علاء الدین کے اہل دربار میں سے تھے، کہتے ہیں کہ: اپنے پورے عہد حکومت میں کبھی سلطان کی زبان سے حضرت خواجہؒ کے بارے میں کوئی خلافِ شان بات نہیں نکلی۔ اگرچہ دشمن اور حاسدین شیخؒ کی شاہانہ داد و دہش، رجوع خلائق اور شاہی لنگر کو سلطان سے رنگ آمیزی اور ایسے طریقے پہ بیان کرتے کہ سلطان بدگمان ہو جائے، لیکن سلطان نے کبھی اس کی طرف التفات نہیں کیا اور خاص طور پر اپنے آخر عہد میں اسکو حضرتؒ سے غایت درجہ کا اخلاص و اعتقاد پیدا ہو گیا تھا، اس سب کے باوجود کبھی ملاقات کی نوبت نہ آئی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صـ۳۳۳ [2] سیر الاولیاء صـ۱۶۰

سُلطان قطب الدّین کی مخالفت اور اُسکا قتل

سلطان علاء الدین کے بعد اس کا دوسرا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ ولی عہدِ سلطنت خضر خاں کو محروم و بکھول کر کے غاصبانہ تخت سلطنت پر بیٹھا۔

"خضر خاں چونکہ حضرت والا کا مرید تھا اور وہی علاء الدین کا ولی عہد تھا جس سے قطب الدین نے حکومت غصب کی تھی، اس لئے قطب الدین حضرتؒ سے بھی ناراض رہتا تھا، اس نے اپنی ایک نئی جامع مسجد "جامع میری" کے نام سے بنوائی تھی اور تمام مشائخ و علما، کو حکم تھا کہ اسی میں آکر نماز جمعہ ادا کریں۔ سلطان المشائخ نے کہلا بھیجا کہ:۔ ما مسجد نزدیک داریم و ایں احق است ہمیں جا خواہیم گزار" (ہمارے قریب ایک مسجد ہے اس کا حق زیادہ ہے، ہم وہیں نماز پڑھیں گے) اور وہ جامع میری نہیں گئے۔ بادشاہ سخت برافروختہ ہوا۔ اسی کے ساتھ ہر نوچندی کو اعیان اور مشاہیر شہر میں دربارِ شاہی میں پیش ہو کر نذر گزارتے تھے، سلطان المشائخ اس تقریب میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے، ادائے رسم کیلئے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیتے تھے اس سے بھی وہ برہم تھا، اس نے اپنے تمام امراء و وزراء کو حکم دیا کہ:۔

"کسے بزیارت شیخ غیاث پور نہ رود"

(کوئی شیخ کی زیارت کے لئے غیاث پور نہ جائے)

امیر خسروؒ نے لکھا ہے کہ:۔ "بارہا می گفت کہ ہر کہ سر شیخ برد ہزار تنکا او را دہم" (جو شیخ کا سر لائے گا اس کو ہزار تنکہ دوں گا) ایک روز شیخ ضیاء الدین رومی کی درگاہ میں سلطان جی اور قطب الدین کا آمنا سامنا بھی ہو گیا، سلطان جی نے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے سلام کیا، قطب الدین نے جواب نہ دیا۔ یوں

مسلسل واقعات قطب الدین کی حکومت کے چار سالہ مدت میں پیش آتے رہے[1]۔
نوچندی کی حاضری پر اصرار کا قصہ سب سے آخر میں پیش آیا۔ قطب الدین نے بھرے
دربار میں اعلان کیا کہ: "اگر در غرۂ ماہ آئندہ نیامد بیاریم چنانکہ دانیم" گویا کہ یہ
اسکی دھمکی تھی کہ بزور حکومت دربار میں گھسیٹوا کر بلواؤں گا۔ شاید قتل ہی کا
ارادہ ہو۔ سلطان جی کو بادشاہ کے اس عزم مصمم کی خبر پہنچی۔ سلطان المشائخ
ہیچ نگفت۔ اب مہینہ ایک ایک دن کر کے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ "ہر چند ماہ نزدیک رسید
التفاتِ مخلصاں را روئے بیشتر می داد" (مہینہ جتنا نزدیک آ رہا تھا اہل تعلق کا فکر و
تردد بڑھتا جا رہا تھا) چاند مغرب کے بعد دیکھا گیا، کل پہلی تاریخ ہے، شہر کے
اعیان و امرا دربار میں جائیں گے، لیکن سلطان المشائخ یہی طے کئے ہوئے ہیں کہ میں
نہیں جاؤں گا۔ قطب الدین یہ فیصلہ کئے ہوئے ہے کہ:۔ اگر نیامد بیاریم چنانکہ
دانیم"۔ "صرف شب درمیان است"۔ دلّی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، دُنیا اور
دین کے دو[2] بادشاہوں کا کل معرکہ ہے۔ رات گذرنے بھی نہ پائی کہ: "ہم دریں
شبِ ماہ بلائے از آسمان بر جان بادشاہ نازل شد" (اسی شبِ ماہ میں بادشاہ
کی جان پر آفتِ آسمانی نازل ہوئی) یعنی "خسرو خاں موئے سر سلطان را گرفت و باہم
در آویختند پہلوئے سلطان را بہ خنجر شگافتہ بر زمین انداخت و سر آں مشوم را از تن
جدا کردہ از بام ہزار ستون بزیر افگند" (طباطبائی) خسرو خاں نے بادشاہ کے
سر کے بال پکڑے، دونوں باہم دست و گریبان ہوئے۔ خسرو خاں نے سلطان
کے پہلو کو خنجر سے چیر کر زمین پر ڈال دیا اور اس شامت زدہ کا سر تن سے جدا

---

[1] نظام تعلیم ص ۲۲

کرکے بامِ ہزار ستون سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔[1]"

غیبی لنگر

اسی زمانہ میں جب سلطان قطب الدین کی طرف سے اس بات کی خاص روک تھام تھی کہ امرادِ دربار اور اعیان سلطنت کی طرف سے حضرت خواجہ کی خدمت میں کوئی نذر پیشکش نہ ہونے پائے، تاکہ دیکھا جائے کہ یہ شاہانہ لنگر خانہ کس طرح چلتا ہے، آپنے خاص طور پر تاکید فرما رکھی تھی کہ اس زمانہ میں کھانا زیادہ پکایا جائے اور دسترخوان وسیع سے وسیع تر کر دیا جائے۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا:۔

"ایک بار سلطان قطب الدین کو کسی بدخواہ نے کہا کہ شیخ ہماری فتوحات قبول نہیں کرتے اور امرا و سرداروں کی لائی ہوئی فتوحات قبول کرتے ہیں، آخر وہ سب بھی تو آپ ہی کے یہاں سے لے جاتے ہیں۔ سلطان قطب الدین نے یہ بات سچ جان کر حکم کیا کہ کوئی امیر یا

---

[1] نظام تعلیم و تربیت ص۳۳ سیر الاولیاء میں یہ واقعہ منقول ہے۔ مگر تاریخ و ماہ و سنہ درج نہیں ص۱۵۰ و ص۱۵۱ تاریخ فرشتہ جلد اول میں ضمن تذکرۂ سلطان قطب الدین، سلطان کے قتل کی تاریخ شب پنجم ربیع الاوّل ۶۲۱ھ مذکور ہے جسکے ساتھ نوچندی کے سلام کی روایت اور چاندرات میں بادشاہ کے قتل کا واقعہ میل نہیں کھاتا (ص۲۲۶)۔ پھر اسی کتاب کی جلد دوم میں جہاں حضرت سلطان المشائخ کا تذکرہ ہے وہاں سلطان کے قتل کی تاریخ ۲۹ شوال لکھی ہے اور سنہ کا تذکرہ نہیں (ص۳۰۰ و ص۳۴۱ جلد ۲) لیکن اس سلسلہ میں سب سے قدیم تر اور قابل اعتماد ماخذ امیر خسروؒ کی مثنوی "تغلق نامہ" ہے، جو سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد کی تصنیف اور امیرؒ کی مستند اور مشہور مثنوی ہے۔ اس میں انھوں نے نہایت صراحت سے لکھا ہے کہ:۔ قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۶۲۰ھ کی عین چاندرات کو واقع ہوا۔ وہ فرماتے ہیں ؎

چوں تاریخ عرب شد ہفتصد و بیست — ثباتِ قطب شد کم جانب زیست
جمادِ دوئیں راشد پدیدار — ہلالِ تیرہ و تاریک دیدار
مہ باریک بُود از حالت تلخ — بناخن کردہ خود را پیش ازاں سلخ
شد آں مہ بر ہمہ گیہاں مُبارک — مگر بر طالعِ سُلطاں مُبارک

(تغلق نامہ ص۱۹ طبع حیدر آباد)

ان اشعار سے تاریخ کا بھی صحیح تعین ہو گیا اور واقعہ کی نوعیت و اہمیت کی بھی تصدیق ہو گئی۔ ۱۲

سردار شیخ کے یہاں نہ جاوے، دیکھو وہ اس قدر دعوت لوگوں کی کہاں سے کرتے ہیں اور جاسوس مقرر کئے کہ دیکھتے رہیں جو امیر وہاں جاوے مجھے آکر اطلاع کریں۔ جناب شیخ نے سنا فرمایا:۔ کھانا آج سے زیادہ پکایا جاوے، ایک مدت بعد سلطان نے لوگوں سے دریافت کیا کہ خانقاہ شیخ کا کیا حال ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ سابق جسقدر پکتا تھا اب اس سے دوگنا پکتا ہے بادشاہ یہ سنکر پشیمان ہوا کہا میں غلطی پر تھا، آپ کا معاملہ عالمِ غیب سے ہے[1]"

غیاث الدین تغلق کا عہد اور سرکاری مجلس مناظرہ

قطب الدین مبارک شاہ کے بعد چند مہینے خسرو خاں نے غاصبانہ سلطنت کی اور شعائر اسلام کو سرنگوں کرکے اسلام کی تذلیل کی۔ ۷۲۱ھ میں غیاث الدین تغلق (ملک غازی) نے خسرو خاں کو قتل کرکے تغلق خاندان کی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ سلطان غیاث الدین اگرچہ صاحب علم نہ تھا لیکن شریعت اور علماء کا احترام کیا کرتا تھا۔ حضرت خواجہ سماع سنتے تھے انکی وجہ سے دہلی میں اس کا عام ذوق اور رواج ہوگیا تھا۔ ایک شخص شیخ زادہ حسام الدین فرجام نامی جو ایک عرصہ تک حضرت خواجہ کے سایۂ عاطفت میں رہا تھا اور باوجود مجاہدوں کے ذوق و شوق اور عشق کی دولت سے فیضیاب نہیں ہو سکا تھا نیز قاضی جلال الدین الولوالجی نائب حاکم مملکت کو بھی اہل درد و محبت سے ایک طرح کی کد تھی۔ قاضی صاحب اور دوسرے علماء نے شیخ زادہ حسام کو آمادہ کیا اور اس نے بادشاہ کو متوجہ کیا کہ خواجہ نظام الدین مقتدائے زمانہ ہیں اور وہ سماع سنتے ہیں جو امام اعظمؒ کے مذہب میں حرام ہے اور ان کی وجہ سے ہزارہا مخلوق اس فعل ممنوع کا ارتکاب کرتی ہے، سلطان اس مسئلہ سے بے خبر تھا، اسکو تعجب ہوا کہ ایسے بزرگ جو مقتدائے عالم ہیں[2]

---

[1] خیر المجالس ماخوذ از ترجمہ صـ۲۰۳ [2] سماع کی حقیقت، اغراض و مقاصد اور اسکے آداب و احکام کی بحث چوتھے باب "اذواق و کیفیات" میں ملاحظہ ہو۔ ۱۲

ایسا نامشروع کام کیسے کرتے ہیں۔ لوگوں نے سماع کی حلت کے فتوے اور کتب شرعیہ کی روایات بادشاہ کے سامنے پیش کیں، بادشاہ نے کہا کہ چونکہ علمائے دین نے سماع کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے اور وہ اسکو منع کرتے ہیں اسلئے حضرت خواجہ اور تمام علماء شہر اور صدور و اکابر کو طلب کیا جائے اور ایک مجلس منعقد کی جائے تاکہ یہ تحقیق ہو جائے کہ حق کیا ہے۔ میر خورد کی زبان سے اسکی تفصیل سنئے:۔

"قصر شاہی میں حضرت خواجہؒ کی طلبی ہوئی۔ حضرت خواجہؒ قاضی محی الدین کاشانی اور مولانا فخر الدین زرادی کی معیت میں کہ دونوں سرآمد علماء اور اساتذۂ وقت تھے محل میں تشریف لے گئے۔ پہلے قاضی جلال الدین نائب حاکم نے حضرت خواجہؒ کو وعظ و نصیحت شروع کی اور نامناسب طریقے پر آپ سے خطاب کیا، یہاں تک کہا کہ اگر اسکے بعد آپ نے سماع کی حلت کا دعویٰ کیا اور سماع سنا تو میں حاکم شرع ہوں، میں آپ کو سزا دوں گا۔ یہ سنکر حضرت خواجہؒ کو جلال آگیا اور فرمایا کہ:۔ حبس منصب کے بھروسہ پر تم یہ بات کہہ رہے ہو اس سے معزول ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ٹھیک بارہ روز بعد قاضی اپنے منصب سے معزول ہو کر دہلی سے روانہ ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ اس مجلس مباحثہ میں تمام علماء و اکابر صدور و امراء اور ارکانِ سلطنت حاضر تھے بادشاہ اور سب حاضرین مجلس کی توجہ حضرت خواجہ کی طرف تھی اور سب آپ کی تعظیم کرتے تھے۔ شیخ زادہ حسام نے کہا کہ آپ کی مجلس میں سماع ہوتا ہے، لوگ رقص کرتے ہیں، آہ و نعرہ لگاتے ہیں، اسی طرح اور بہت سی باتیں کہیں، حضرت خواجہؒ نے شیخ زادہ کی طرف دیکھا اور فرمایا، شور مت کرو، زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں پہلے یہ بتلاؤ سماع کی تعریف کیا ہے؟ شیخ زادہ حسام نے کہا کہ میں نہیں جانتا، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ علماء سماع کو حرام کہتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ: جب

تم کو سماع کے معنی ہی نہیں معلوم تو مجھے تم سے کچھ کہنا نہیں ہے اور نہ کہنا چاہیئے
شیخ زادہ حسام شرمندہ ہوا، بادشاہ پوری توجہ سے آپ کی تقریر سن رہا تھا، جب
کوئی زور سے بات کرتا تو کہتا کہ شور مت کرو، سنو کہ شیخ کیا فرماتے ہیں۔ —
حاضر الوقت علماء میں مولانا حمید الدین اور مولانا شہاب الدین ملتانی خاموش تھے
مولانا حمید الدین نے اتنا فرمایا کہ یہ مدعی حضرت خواجہ کی مجلس کا جو حال بیان
کرتے ہیں یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے اور بہت سے مشائخ اور
درویشوں کو بھی میں نے دیکھا ہے — اسی دوران میں شیخ الاسلام شیخ
بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے نواسے مولانا علم الدین آ گئے۔ بادشاہ نے ان سے کہا
کہ آپ بھی عالم ہیں اور سیاح بھی، اس وقت سماع کی بحث درپیش ہے، میں
آپ سے پوچھتا ہوں کہ سماع سننا حرام ہے یا حلال؟ مولانا علم الدین نے کہا کہ
میں نے اس باب میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے، اس میں اس کی حرمت و حلت
کے دلائل نقل کئے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ جو دل سے سنتے ہیں ان کے لئے حلال ہے
اور جو نفس سے سنتے ہیں ان کے لئے حرام۔ اس کے بعد بادشاہ نے مولانا علم الدین
سے پوچھا کہ آپ بغداد و شام و روم ہر جگہ پھر چکے ہیں، وہاں کے مشائخ سماع سنتے
ہیں یا نہیں، اور وہاں کوئی منع کرتا ہے؟ مولانا علم الدین نے فرمایا کہ:۔ ان سب
شہروں میں بزرگ و مشائخ سماع سنتے ہیں اور بعض دف و شبانہ کے ساتھ بھی،
کوئی مانع نہیں ہوتا اور سماع مشائخ کے درمیان حضرت جنیدؒ و شبلیؒ کے وقت
سے مروّج چلا آ رہا ہے، بادشاہ مولانا علم الدین کی زبان سے یہ سن کر خاموش
ہو گیا اور اس نے کچھ نہیں کہا۔ مولانا جلال الدین نے عرض کیا کہ بادشاہ

سماع کی حرمت کا فرمان صادر کریں اور امام اعظمؒ کے مذہب کی پاسداری فرمائیں۔ اس پر حضرت خواجہؒ نے بادشاہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بارے میں کوئی فرمان جاری نہ کریں، بادشاہ نے آپ کا یہ مشورہ قبول کیا اور اس بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا۔ مولانا فخرالدین (جو مجلس میں حاضر تھے) کا بیان ہے کہ ابتدائے چاشت سے زوال تک یہ بحث جاری رہی، اہلِ مجلس تحریم کی کوئی دلیل نہیں دے سکے اور آخر میں اس پہ بحث آکر ختم ہوگئی کہ اس کا ترک اولیٰ ہے یا اس کا فعل۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ حضرت خواجہؒ سماع سن سکتے ہیں اور کسی کو ان کے منع کرنے کی اجازت نہیں، لیکن یہ روایت مرجوح ہے ــــ انھیں دنوں میں کسی نے حضرت خواجہؒ سے کہا کہ اب تو سماع کے لئے فرمان سلطانی ہوگیا ہے کہ آپ جس وقت چاہیں سماع سنیں وہ حلال ہے۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اگر وہ حرام ہے تو کسی کے کہنے سے حلال نہیں ہوسکتا اور اگر حلال ہے تو کسی کے کہنے سے حرام نہیں ہوسکتا۔ مجلس کے اختتام پر بادشاہ نے خواجہ کو بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ رخصت کیا۔[1]

مجلس مناظرہ کا حال حضرت خواجہ کی زبان سے

قاضی ضیاءالدین برنی اپنی کتاب "حسرت نامہ" میں لکھتے ہیں کہ:۔ جب حضرت خواجہ اس مجلس سے فارغ ہوکر مکان پر تشریف لائے تو آپ نے نماز ظہر کے وقت مولانا محی الدین کاشانی

---

[1] سیر الاولیاء، باختصار ص۵۲۷ تا ص۵۳۲

اور امیر خسرو کو طلب فرمایا، ارشاد ہوا کہ دہلی کے علماء عداوت و حسد سے بھرے ہوئے تھے، انھوں نے وسیع میدان پایا، اور دشمنی کی بہت سی باتیں کیں، عجائب بات یہ دیکھی کہ صحیح احادیث نبویہؐ کا سننا ان کو گوارا نہیں، ان کے جواب میں یہی کہتے تھے کہ ہمارے شہر میں فقہ پر عمل حدیث پر مقدم ہے، یہ باتیں وہی کہہ سکتے ہیں جن کا احادیث نبویہؐ پر اعتقاد نہ ہو، میں جب کوئی حدیث صحیح پڑھتا تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے تھے کہ اس حدیث سے امام شافعی استدلال کرتے ہیں اور وہ ہمارے علماء کے دشمن ہیں، ہم نہیں سنیں گے، معلوم نہیں کہ یہ با اعتقاد ہیں یا نہیں، اولوالامر کے سامنے ایسی زبردستی سے کام لیتے تھے، اور احادیث صحیح کو روکتے تھے، میں نے کوئی عالم ایسا دیکھا نہ سنا کہ اسکے سامنے احادیث صحیحہ پڑھی جائیں اور وہ کہے کہ میں نہیں سنتا، میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا قصہ ہے اور وہ شہر جہاں ایسی جرأت اور زبردستی کی جاتی ہے وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے، تعجب نہیں کہ اگر اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے اس کے بعد بادشاہ اور امراء اور عوام جب قاضی شہر اور علماء شہر سے یہ سنیں گے کہ اس شہر میں حدیث پر عمل نہیں ہوتا تو ان کا حدیث نبویؐ پر اعتقاد کیسے رہیگا۔ مجھے ڈر ہے کہ علماء شہر کی اس بدعقیدگی کی نحوست سے آسمان سے بلا و جلاء و قحط و وَبا نہ برسے[1]

دہلی کی تباہی

اس واقعہ کے ٹھیک چھٹے سال حضرت خواجہ کی وفات کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کے فرزند اور جانشین محمد تغلق نے دلی کو بالکل خالی کر دینے اور دیوگیر (دولت آباد) منتقل ہو جانے کا فرمان جاری کیا اور اس میں ایسی ضد اور عجلت سے کام لیا کہ حقیقتاً شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور دلّی سا گلزار و آباد شہر جس میں پہلے رہنے کو جگہ نہیں ملتی تھی ایسا خالی ہوا کہ سوائے جنگلی جانوروں اور درندوں کے وہاں کسی متنفس کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔

محمد قاسم تاریخ فرشتہ میں لکھتا ہے:۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۲۷، ص ۵۳۲

احدے از مردم دہلی را کہ بآب و ہوائے
آں جا خوگرفتہ بودند، بحال خود
نگذاشتہ طرّاً بدولت آباد فرستاد
دہلی بنوعے ویراں گشت کہ آواز
ہیچ متنفس بجز شغال و روباہ جانوران
صحرائی بگوش نمی رسید[1]

کارپردازان حکومت نے کسی ایک شخص کو
بھی جو دہلی کی آب و ہوا کا خوگر تھا اپنی
جگہ نہیں چھوڑا، سب کو کابتہ دولت آباد
(دیوگیر) بھیج دیا اور دہلی اس طرح ویران
ہوئی کہ کسی ایک جاندار کی آواز بھی سوائے گیدڑ
لومڑی اور جنگلی جانوروں کے کان میں نہیں آتی تھی

وہ تمام علماء جو اس مجلس میں موجود تھے اور دوسرے بھی ان کی بدولت دولت آباد جلاوطن ہوئے، دولت آباد پہنچے تو وہاں سخت قحط اور وبا کا سامنا کرنا پڑا، ہزاروں راستہ میں لقمۂ اجل بن گئے اور ہزاروں وہاں پہنچ کر قحط اور بیماریوں کا شکار ہوئے اور حضرت خواجہؒ کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

نظام الاوقات

امیر خورد نے حضرت خواجہ کا نظام الاوقات اس طرح لکھا ہے:۔
"روزہ افطار کرنے کے بعد (جو اہل جماعت کے ساتھ ہوتا تھا) اپنے بالاخانہ کے قیامگاہ پر تشریف لے جاتے تھے۔ احباب و خدام جو شہر اور اطراف سے آئے ہوتے تھے مغرب و عشاء کے درمیان اوپر ہی بلا لئے جاتے تھے۔ ایک گھڑی وہاں ہم نشینی اور ملاقات کا شرف حاصل ہوتا، ہر قسم کے تر و خشک میوے اور کھانے پینے کی لطیف و لذیذ چیزیں حاضر کی جاتی تھیں حاضرین مجلس تناول کرتے، آپ ہر ایک کی دلداری فرماتے اور خیریت و حالات دریافت فرماتے۔"[2]

امیر خسرو کی خصوصیت

عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے پھر نیچے تشریف لاتے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھکر پھر بالاخانہ پر تشریف لیجاتے، کچھ دیر مشغول

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) صـ۲۴۳ [2] سیر الاولیاء صـ۱۲۵

رہتے پھر آرام کرنے کے لئے چارپائی پر تشریف لیجاتے، اس وقت خدام تسبیح لاکر آپ کے ہاتھ میں دیتے، اس وقت سوائے امیر خسرو کے کسی کو آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی[1]، وہ سامنے بیٹھ کر ہر طرح کے قصے اور باتیں کرتے، آپ پسندیدگی میں سر مبارک کو حرکت دیتے، وقتاً فوقتاً ارشاد ہوتا کہ ترک کیا خبر ہے؟ امیر خسرو اتنی بات سنکر طویل گفتگو کا موقع نکال لیتے، اگر آپ ایک نکتہ پوچھتے تو وہ ساری داستان سناتے[2]، اس موقع پر بعض کم سن اعزہ اور بعض پروردہ جو صاحب خانہ تھے حاضر ہوتے اور قدمبوسی کرتے۔ ؎

نخفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شبہا
کہ دیدہ بر کفِ پایت نہد بخواب شود

شب کی تیاری

جب امیر خسرو اور صاحبزادگان اجازت لیکر رخصت ہوتے تو اقبال خادم آتے اور پانی کے بھرے ہوئے چند آفتابے آپ کے وضو کیلئے رکھ کر باہر چلے جاتے، اس کے بعد حضرت خواجہ خود اٹھتے اور دروازہ کو زنجیر لگاتے، پھر وہاں کی خبر اللہ کے سوا کسی کو نہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ تمام رات کیا راز و نیاز ہوتے اور اپنے مالک سے کیا ذوق و شوق کی

---

[1] امیر خسرو کو حضرت خواجہؒ سے جو والہانہ و عاشقانہ تعلق تھا وہ ان کے سوانح اور دیوان سے معلوم ہوتا ہے، بلبل کو گل سے اور پروانہ کو شمع سے جو تعلق ہوتا ہے، اسی طرح کا تعلق امیر خسرو کو اپنے مرشد سے تھا حضرت خواجہ کو بھی اس عاشق صادق سے ایسا تعلق تھا کہ فرماتے تھے کہ: "من از ہمہ تنگ آیم واز تو تنگ نیایم"، مجھے بعض اوقات ہر ایک سے وحشت ہونے لگتی ہے لیکن اس حالت میں بھی تم سے نہیں ہوتی مزید برآں ایک بار فرمایا: "از ہمہ کس تنگ آیم تا حدے کہ از خود تنگ آیم واز تو تنگ نیایم" بعض اوقات اپنے سے بھی اکتانے لگتا ہوں مگر تم سے نہیں اکتاتا (سیر الاولیاء ص ۳۰۲) ایک بار ارشاد فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ آپ امیر خسرو کو جس نظر سے دیکھتے ہیں ایک بار وہ نظر مجھ پر ڈال دیجئے، میں نے اس کو تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن میرے دل میں آیا کہ اس سے کہوں کہ وہ قابلیت تو لاؤ (ص ۳۰۲) ۱۲

[2] بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را — من از شوق حضوری طول دادم داستانے را

باتیں ہوتیں حضرت خواجہؒ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ دو شعر دیکھے ہیں جو بالکل حسب حال ہیں۔ ؎

تنہا منم و شب و چراغی　　مونس مشدہ تا پگاہ روزم
کاہش ز آہ سرد یکشتم　　گاہ از تف سینہ برفروزم

کبھی کبھی یہ شعر بھی آپ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا ہے اور حکایتِ حال ہے۔ ؎

بارے بہ تماشائے من و شمع بیا
کز من دگے نماند و از وے دودے

سحری سحر کا وقت ہوتا تو خادم آتا اور باہر سے دروازہ پر دستک دیتا، حضرت خواجہ دروازہ کھول دیتے سحری جس میں ہر قسم کی چیزیں ہوتیں سامنے رکھتا، آپ اس میں سے بہت کم تناول فرماتے، باقی کیلئے ارشاد ہوتا کہ بچوں کے لئے حفاظت سے رکھ لو۔ خواجہ عبدالرحیم جن کے ذمہ سحر کا لے جانا تھا بیان کرتے ہیں کہ اکثر ہوتا کہ حضرت خواجہ سحری میں سے کچھ نہ کھاتے، میں عرض کرتا کہ حضرت دالا افطار کے وقت بھی بہت کم کھاتے ہیں اگر سحری بھی کچھ نہ کریں گے تو ضعف بہت بڑھ جائیگا، اس پر گریہ فرماتے اور کہتے کہ کتنے غریب اور بیکس مسجدوں کے کونوں اور چبوتروں پر بھوکے پڑے ہوئے ہیں اور فاقہ سے رات گذار دیتے ہیں، یہ کھانا میرے حلق سے کیسے اتر سکتا ہے چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ سحری میں جیسی لاتا ویسی ہی اٹھا کر لے جاتا۔

صبح کے وقت جب دن ہوتا جس کی جمال مبارک پر نظر پڑتی دیکھتا کہ کھلی ہوئی مستی ہے اور آنکھیں بیداری سے سرخ ہیں، ایسے شدید مجاہدوں سے بھی آپ کے اندر کوئی ضعف نظر نہ آتا اور آپ کی کسی ہیئت میں جو آپ کی معمول تھی تغیر نہ ہوتا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ آپ چار سو یا پانچ سو رکعت نماز پڑھتے ہیں یا اتنی تسبیح کا معمول ہے۔ عمر عزیز ان باطنی مشغولیتوں میں گذرتی جن کا حال اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اور دلجوئی اور قلوب کے تفقد و دریافت میں مشغول رہتے، جس سے افضل کوئی کام نہیں۔ ع

"دل بدست آور کہ حج اکبر است"

دن میں دن میں تمام روز اپنے مشائخ کے سجادہ پر قبلہ رو باطنی طور پر مشغول، مُتَوَجِّهًا اِلَی اللہ تعالیٰ کَاَنَّہٗ یَنْظُرُ اِلَیْہِ (اللہ کی طرف متوجہ ہو کر گویا وہ روبرو ہے) بیٹھ کر گذار دیتے۔ آنے والوں میں مختلف طبقوں کے لوگ ہوتے، علماء و مشائخ، صدور و اکابر، وضیع و شریف ہر ایک کے علم و مرتبہ کے مطابق جس کا جو فن ہوتا اسی میں اس سے گفتگو کرتے اور اس کی دلجوئی فرماتے ظاہری طور پر ان میں مشغول ہوتے اور باطن میں پورے طور پر مشغول بحق ہوتے[1]

دلداری و تربیت نماز ظہر کا وقت ہوتا، نماز ادا کرنے کے بعد جو عزیز قدم بوسی کے لئے آئے ہوئے ہوتے ان کو طلب فرمایا جاتا اور ان سے گفتگو و دلداری میں کچھ وقت گذرتا، عبادات و سلوک و محبت الٰہی کے بارے میں ان کی رہنمائی کی جاتی، اکابر علماء و صلحاء کی (جو اس مجلس میں حاضر ہوتے) ہمت نہ ہوتی کہ سر اٹھا کر چہرۂ مبارک کو دیکھتے، ایسا رعب اور من جانب اللہ عظمت تھی کہ آپ کے چہرے پر نظر کرنا مشکل تھا۔

قربِ سفر عمر مبارک جب اسی ۸۰ سے متجاوز ہوئی تو سفر آخرت کے آثار نمایاں ہوئے ایک روز ارشاد فرمایا کہ:۔ میں نے خواب میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ ارشاد ہوا:۔ نظام ہم کو تمہارا بڑا اشتیاق ہے[2]۔

خلفائے کبار کو اجازت نامے اور ان کی محبت و مواخات بیماری کے دوران میں آپ نے متعدد حضرات کو خلافت عطا فرمائی اور اجازت نامے لکھ کر دیئے۔ مولانا فخر الدین زرادی نے

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۲۵ و ص ۱۲۹ [2] ایضاً ص ۱۴۱

ان کا مضمون مرتب کیا، اور سید حسین کرمانی نے ان کی کتابت کی، آپ نے ان پر اپنے دستخط مبارک ثبت کئے، دستخط کے الفاظ یہ تھے :۔ "من الفقیر محمد بن احمد بن علی البداؤنی البخاری" ان اجازت ناموں پر ۲۰ ذی الحجہ ۷۲۴ھ درج ہے، گویا یہ وفات سے تین مہینے ۲۷ دن پہلے لکھے گئے ہیں[1]۔

جن حضرات کیلئے یہ اجازت نامے تھے ان کو جہاں جہاں وہ تھے پہنچا دیئے گئے، جو حضرات موجود تھے ان کو بلا کر خود عطا کئے گئے۔ پہلے شیخ قطب الدین منور کی طلبی ہوئی، سلطان المشائخ نے خلعت خلافت عطا فرمایا اور وصیت فرمائی، اجازت نامہ ان کو مرحمت ہوا اور ارشاد ہوا کہ جاؤ دوگانہ ادا کرو۔ دوستوں نے مبارکباد دی، اسی دوران میں شیخ نصیر الدین محمود (چراغ دہلی) کو یاد فرمایا گیا، ان کو بھی خرقۂ خلافت اور اجازت نامہ عطا ہوا اور وصیت فرمائی گئی۔ شیخ نصیر الدین محمود ابھی کھڑے ہوئے تھے کہ شیخ قطب الدین منور کی دوبارہ طلبی ہوئی، وہ آئے تو ارشاد ہوا کہ شیخ نصیر الدین محمود کو خلافت کی مبارکباد دو، پھر شیخ نصیر الدین سے ارشاد ہوا کہ شیخ منور کو مبارکباد دو، دونوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی، پھر دونوں کو ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کا حکم ہوا، پھر فرمایا کہ تم دونوں بھائی بھائی ہو، تقدیم و تاخیر کا کچھ خیال نہ کرنا[2]۔

وفات کا حال

وفات سے ۴۰ روز پیشتر استغراق و تحیر کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ امیر خورد نے تفصیل سے وفات کا حال لکھا ہے، ان کا بیان ہے :۔

"جمعہ کا دن تھا، سلطان المشائخ پر ایک کیفیت تھی، نور تجلی سے ان کا باطن منور معلوم ہو رہا تھا، نماز کے اندر بار بار سجدے فرماتے تھے۔ اسی حالت تحیر میں مکان تشریف لائے، گریہ میں ترقی ہو گئی۔

---

[1] حضرت خواجہؒ کی وفات ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو ہوئی

[2] سیر الاولیاء، ص ۲۳۰ و ص ۲۳۱ و ص ۲۳۲ و ص ۲۴۸ و ص ۲۴۹

روزانہ کئی کئی بار غیبوبت و استغراق ہو جاتا تھا، پھر توجہ ہو جاتی تھی، یہی فرماتے تھے کہ آج جمعہ کا دن ہے، دوست کو دوست کا وعدہ یاد آتا ہے اور وہ اس کیفیت میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں دریافت فرماتے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے اور میں نماز پڑھ چکا ہوں؟ اگر جواب دیا جاتا کہ آپ نماز پڑھ چکے ہیں تو فرماتے کہ پھر پڑھ لیں، ہر نماز کو مکرر ادا کرتے جتنے دن اس عالم میں رہے یہ دو باتیں مکرر فرماتے:۔ آج جمعہ کا دن ہے؟ ہم نماز پڑھ چکے ہیں؟ اور کبھی یہ مصرع پڑھتے۔

ع "می رویم و می رویم و می رویم"

اسی دوران میں ایک روز تمام خدام و مریدین کو جو حاضر تھے طلب فرمایا اور ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ:۔ "تم گواہ رہنا کہ اگر اقبال (خادم) نے کوئی چیز بھی گھر میں جنس میں بچالی ہے تو کل روز قیامت اسکو خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔" اقبال (خادم) نے عرض کیا کہ میں نے کچھ نہیں چھوڑا ہے، سب آپ پر صدقہ کر دیا ہے اور واقعی اس جوانمرد نے ایسا ہی کیا تھا، سوائے اس غلّہ کے جو چند دن کے لئے فقرائے خانقاہ کو کفایت کرتا سب کچھ تقسیم کر دیا تھا میرے چچا سید حسین نے اطلاع دی کہ غلّہ کے سوا ہر چیز محتاجوں کو پہنچ گئی سلطان المشائخ اقبال سے ناراض ہوئے انکو طلب کیا اور فرمایا کہ اس مُردار یت کو کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ اقبال نے عرض کیا کہ غلّہ کے سوا جو کچھ موجود تھا سب کچھ تقسیم ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ خلقت کو بلاؤ۔ جب لوگ حاضر ہوئے تو فرمایا کہ غلّہ کے انبار خانے توڑ ڈالو اور تمام غلّہ بے تکلف اٹھا لے جاؤ اور وہاں جھاڑ دے دو۔ ذرا سی دیر میں خلقت جمع ہو گئی اور اسنے غلّہ کو لوٹ لیا۔ اس بیماری میں کچھ احباب اور خدمتگار حاضر ہوئے اور انھوں نے پوچھا کہ:۔ آں مخدوم کے بعد ہم مسکینوں کا کیا حال ہوگا؟ فرمایا کہ: یہاں اتنا ملتا رہے گا جس سے تمہارا گذر ہو جائے۔ میں نے بعض معتبر مشائخ سے سنا ہے کہ لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے درمیان کون نصیب ور ہوگا؟[1] فرمایا: جس کی قسمت یاوری کریگی۔ بعض دوستوں اور خادموں نے میرے نانا شمس الدین وامغانی سے عرض کیا کہ وہ سلطان المشائخ سے پوچھیں کہ ہر شخص نے اپنے

---

[1] غالباً جانشینی و خلافت کے متعلق سوال تھا۔ ۱۲

اعتقاد کے مطابق آپ کے احاطہ میں بلند بلند عمارتیں بنالی ہیں اور سب کی نیت یہ ہے کہ آپ اُس کی عمارت میں آرام فرمائیں، اگر وہ ناگزیر وقت آگیا تو آپ کو کس عمارت میں دفن کریں تاکہ کوئی خود رائی سے کام نہ کرے۔ مولانا شمس الدین نے یہ پیغام پہنچایا تو ارشاد ہوا کہ:۔ میں کسی عمارت کے نیچے دفن ہونا نہیں چاہتا، میں جنگل میں آسودہ خاک ہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ کو باہر میدان میں دفن کیا گیا، بعد میں سلطان محمد تغلق نے اس پر گنبد تعمیر کرایا۔

وفات سے ۴۰ روز پہلے سے غذا بالکل ترک فرمادی تھی، کھانے کی خوشبو بھی گوارا نہ تھی، گریہ اس شدت سے غالب تھا کہ ایک گھڑی کیلئے بھی آنسو نہیں تھمتے تھے۔ ؎

گر نہ بینی گریۂ زارم ندانی فرق کرد
کاب چشم است اینکہ بیشت می رود دریا آب جو

اسی درمیان میں اخی مبارک ایک روز مچھلی کا شوربہ لائے۔ مخلصین نے بڑی کوشش کی کہ آپ تھوڑا سا تناول فرمالیں۔ سلطان المشائخؒ نے پوچھا کہ:۔ یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ:۔ تھوڑا سا مچھلی کا شوربہ ہے۔ فرمایا:۔ بہتے ہوئے پانی میں ڈال دو۔" آپ نے کچھ تناول نہیں فرمایا۔ میرے چچا سید حسین نے عرض کیا کہ کئی دن ہو گئے ہیں کہ آں مخدوم نے کھانا ۔۔۔۔ بالکل چھوڑ دیا ہے اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ فرمایا:۔

سید جو حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا مشتاق ہو اس سے دنیا میں کھانا کیسے کھایا جائے!۔

الغرض، ۴۰ روز کی مدت میں جس طرح کھانا تناول نہیں فرمایا۔ اسی طرح بات بھی بہت کم کی۔ آخر چہار شنبہ کے دن تک جس دن آپ کی وفات ہوئی یہی حال رہا۔

۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو طلوع آفتاب کے بعد زہد و عبادت، حقیقت و معرفت، ارشاد و ہدایت کا یہ آفتاب غروب ہو گیا

لے یعنی مدفون ہوں۔ ۱۲

نماز جنازہ شیخ الاسلام رکن الدین نبیرۂ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی نے پڑھائی نماز کے بعد شیخ الاسلام رکن الدین نے فرمایا کہ:۔

"مجھے اب معلوم ہوا کہ مجھے ۴۰ سال تک دہلی میں اسلئے رکھا گیا کہ مجھے اس نماز جنازہ کی امامت کا شرف حاصل ہو۔"[1]

ساری عمر تجرد میں گذری اسلئے کوئی اولاد نہیں تھی، روحانی سلسلہ سارے ہندوستان میں پھیلا، اور ابھی تک جاری ہے۔

---

[1] سیر الاولیاء (صـ۱۵۲) تا (صـ۱۵۵)

باب سوم

اخلاق وصفات

جامع اوصاف حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے اوصاف وخصوصیات کا خلاصہ اور ان کا صحیح ترین وجامع ترین تعارف ان الفاظ میں ہے جو عطائے خلافت کے وقت ان کے صاحب نظر شیخ ومرشد (شیخ کبیر حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ) کی زبان سے نکلے۔ انھوں نے فرمایا:۔

باری تعالیٰ ترا علم وعقل وعشق دادہ است	اللہ تعالیٰ نے تم کو علم وعقل وعشق کی دولت عطا
وہر کہ بدیں صفت موصوف باشد ازو	کی ہے اور جو ان صفات کا جامع ہو وہ
خلافت مشائخ نیکو آید۔[1]	مشائخ کی خلافت کی ذمہ داریاں خوب ادا کرسکتا ہے

حضرت خواجہؒ کی سیرت اسی جامعیت کا مرقع ہے، یہاں علم وعقل وعشق تینوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ محبت ومعرفت حقیقی اور مشائخ کبار کی تربیت وصحبت جو بہترین اثرات ونتائج پیدا کرتی ہے اور جن کے بہترین مجموعہ کا نام دور آخر میں "تصوف" پڑ گیا ہے، یعنی اخلاص واخلاق اسکی بہترین نمونہ انکی زندگی میں نظر آتی ہے

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۳۴۵)

اخلاص ان کی زندگی کا بہترین جوہر جس نے ان کو اپنے معاصرین ہی میں نہیں بلکہ مشائخ اسلام میں ایک بلند مقام اور اپنے زمانہ ہی میں نہیں بلکہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں قبول عام اور بقائے دوام عطا کیا ہے اور ان کو محبوبیت کے خاص انعام سے نوازا، وہ توحید و اخلاص کی وہ خاص کیفیت اور ذوق ہے جس میں محبت و رضائے الٰہی کے سوا کوئی چیز مطلوب و مقصود نہیں رہی، محبت و یقین کے شعلہ نے ہر طرح کے خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ حُبِّ دنیا، حبِّ جاہ اور اس طرح کی تمام محبتوں اور طلبوں کا استیصالِ کلی ہو چکا تھا ؎

شاد باش اے عشق خود سودائے ما ❊ اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما ❊ اے تو افلاطون و جالینوسِ ما
عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت ❊ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ❊ شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت

امیر حسن علا سجزی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ مسجد میں قیام کرتے ہیں اور وہاں قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل پڑھتے ہیں میں نے عرض کیا کہ اگر اپنے گھر ہی رات کو قیام کریں تو کیسا ہے؟ فرمایا: آدمی اپنے گھر میں ایک پارہ پڑھے وہ مسجد میں ایک قرآن ختم کرنے سے بہتر ہے، اس پر یہ ذکر آ گیا کہ گذشتہ زمانے میں ایک صاحب جامع مسجد دمشق میں رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے، اس لالچ میں کہ اس کی عام شہرت ہو گی اور شیخ الاسلامی کے عہدے پر جو اس زمانہ میں خالی تھا) ان کا تقرر ہو جائے گا، یہ سنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا:۔

بسوز اول شیخ الاسلامی را و پس خانقاہ را ❊ آگ لگاؤ ایسی شیخ الاسلامی کو پھر خانقاہ کو

لہ مولانا رومؒ

ولبعد ازاں خود را[1] ۔ پھر اپنے کو خاک کر کے رکھ دو

حضرت خواجہؒ کی ساری زندگی اسی "دل سوختگی" اور "خود باختگی" کا نمونہ ہے اور اسی چیز نے ان کی صحبت میں کیمیا اور اکسیر کی خاصیت پیدا کر دی تھی۔ انھیں کے سلسلہ کے ایک سوختہ دل شیخ[2] (جو نویں صدی میں نظامی سلسلہ کے مقتدیٰ تھے) یہ دو شعر منقول ہیں جو اس صورتِ حال اور جذبہ کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں

مارا نہ مرید و رُد خواں می باید — نے زاہد نے حافظِ قرآں می باید
صاحب دردے سوختہ جاں می باید — آتش زدہ بہ خانماں می باید

اپنے ہی بارے میں نہیں، اپنے خلفاء اور جانشینوں کے بارے میں بھی (جن سے تہذیب، اخلاق اور تزکیۂ نفس کا کام لینا تھا) اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ وہ اخلاص کے اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ حُبِّ جاہ کا ان کے دل سے خاتمہ ہو چکا ہے۔ مولانا نصیح الدین نے سوال کیا کہ مشائخ کی خلافت کا اہل کون ہوتا ہے؟ فرمایا:۔

"کسے را کہ در خاطر او توقع خلافت نباشد"[3] — وہ شخص جو خلافت کا متوقع اور منتظر بھی نہ ہو۔

صاحب سیر الاولیاء کا بیان ہے، کہ ایک مرتبہ آپ کو اپنے ایک ممتاز خادم کے متعلق جن کو اجازت دی جا چکی تھی معلوم ہوا کہ وہ کئی کمبل تہہ کر کے بچھا کر اس پر مشائخ کی طرح بیٹھتے ہیں اور امراء و عوام و خواص ان کی خدمت میں معتقدانہ حاضر ہوتے ہیں، آپ اس سے اتنے آزردہ ہوئے کہ جب وہ آئے تو آپ نے

---

[1] فوائد الفواد (صـ ۲۴)

[2] حضرت شاہ محمد بینا (محمد بن قطب) لکھنویؒ (م ۸۷۴ھ)

[3] سیر الاولیاء (صـ ۳۴۵)

ان سے منھ پھیر لیا اور ان کو اجانت سے محروم کر دیا، عرصہ تک ان سے ایسی ہی بے رُخی رہی جبتک کہ ان کا عذر ظاہر نہیں ہوا اور انھوں نے معافی نہیں مانگی، ان پر نظرِ عنایت مبذول نہیں ہوئی[1]۔

دشمن نوازی

اخلاص و فنائیت اور بے نفسی کے اس مقام پر پہنچ کر سالک کے دل سے رنج و شکایت انتقام کا جذبہ اور ایذا کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے، وہ نہ صرف آشنا پر درد دوست نواز ہوتا ہے بلکہ دشمن کا احسانمند اور دشمن کے حق میں دعاگو بن جاتا ہے، گویا دشمنی کوئی احسان ہے کوئی نادر تحفہ اور زخم دل کا مرہم ہے جس پر بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے اور منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ امیر علاء سنجری راوی ہیں کہ حضرت نے ایک مرتبہ یہ مصرع پڑھا۔ ع

ہر کہ ما را رنج داده راحتش بسیار باد"

(جو ہم کو رنج دے خدا اس کو بہت راحت پہنچائے)

اسکے بعد یہ شعر ارشاد ہوا ——[2]

ہر کہ او خارے نہد در راہِ ما از دشمنی
ہر گلِ کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

سیر العارفین میں ہے کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی فرماتے تھے کہ حصار اندرپت میں (جو موضع غیاثپور کے قریب ہے) جھجّو نامی ایک شخص تھا جس کو بے وجہ حضرت سے دشمنی تھی، برا بھلا بھی کہتا رہتا تھا اور آپ کو تکلیف و ایذا پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا، اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخؒ نے اسکے جنازے میں شرکت کی، دفن کے بعد اس کی بالیں پر دو رکعت نماز پڑھی اور دعا فرمائی کہ خدایا! اس شخص نے

---

[1] سیر الاولیاء میں اس واقعہ کی تفصیل ہے۔ ۱۲ [2] فوائد الفواد ص۸۶ (ترجمہ) جو ہمارے راستہ میں کانٹے بچھائے اللہ کرے اسکے گلشنِ حیات میں جو پھول کھلے بے خار رہے۔ ۱۲

جو کچھ کہا ہو یا برا سوچا ہو میں نے اس کو بخش دیا تو میری وجہ سے اس کو سزا نہ دینا۔[1]

ایک مرتبہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے ذکر کیا کہ بعض آدمی جناب والا کو منبر پر اور دوسرے موقعوں پر برا بھلا کہتے ہیں ہم سے سنا نہیں جاتا۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ میں نے سب کو معاف کیا تم بھی معاف کرو اور ایسے آدمی سے جھگڑا نہ کرو۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر دو آدمیوں کے درمیان رنجش ہو تو اس رنجش کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باطن کو عداوت سے خالی کرے، دوسرے کی طرف سے بھی آزار کم ہو جائے گا۔ فرمایا کہ: "آخر لوگ برا بھلا کہنے سے کیوں رنجیدہ ہوتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ مال صوفی سبیل است و خون او مباح"۔ (صوفی کا مال وقف ہے اور اس کا خون روا) جب معاملہ یہ ہے تو کسی برا بھلا کہنے والے سے کیوں جھگڑا کیا جائے؟[2]

ایک دن فرمایا کہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ نیکوں کے ساتھ نیکی اور بدوں کے ساتھ بدی کی جائے، لیکن مردانِ خدا کا اصول یہ ہے کہ بدی کا بدلہ بھی نیکی سے دیا جائے۔ فرمایا:۔

یکے خار بہند و تو ہم خار بہ نہ ایں خار خار	اگر کوئی کانٹا رکھے اور تم بھی کانٹا رکھ دو
باشد ..... میانِ مردمان ہمچنین	تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائینگے لوگوں کے
است با نغزاں نغزی و با کوزان کوزی	درمیان عام اصول یہی ہے کہ سیدھوں کے ساتھ
امامیان درویشان ہمچنین است کہ	سیدھا اور ٹیڑھوں کیساتھ ٹیڑھا لیکن
با نغزاں نغزی با کوزاں ہم نغز بی[3]	درویشوں کا اصول یہ ہے کہ سیدھوں کیساتھ
	سیدھا اور ٹیڑھوں کیساتھ بھی سیدھا۔

حضرت خواجہ کا اس بارے میں معیار اتنا بلند تھا کہ برا کہنا تو بڑی چیز ہے وہ برا چاہنے کو بھی روا نہیں رکھتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا:۔

---

[1] سیر العارفین (قلمی) [2] فوائد الفواد ص ۹۵ [3] ایضاً ص ۸۷

بدگفتن اندک است اما بدخواستن — برا کہنا بھی برا ہے لیکن بُرا چاہنا
ازاں بدتر است[1]۔ — اس سے کہیں بُرا ہے۔

جب یہ معاملہ آپ کا سب کے ساتھ تھا تو اپنے شیخ کے عزیزوں اور تعلق والوں کے ساتھ کیوں نہ ہوتا جن کے احسان سے آپ کا رواں رواں تر تھا۔

سیر العارفین میں ہے کہ حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے نواسے خواجہ عطاء اللہ ایک لاابالی و بیباک آدمی تھے۔ ایک دن قلم دوات لیکر آئے اور کہا کہ میرے لئے فلاں سردار کو ایک خط لکھ دیجئے تاکہ مجھے وہ کوئی اچھی رقم دیدے۔ شیخ نے فرمایا کہ: نہ میری اس سردار سے کبھی ملاقات ہوئی ہے نہ وہ کبھی یہاں آیا ہے، جس شخص سے جان پہچان نہ ہو اسکو رقعہ کس طرح لکھا جائے؛ صاحبزادے کو غصہ آگیا اور انھوں نے سخت سست کہنا شروع کیا کہ ہمارے ہی نانا کے مرید ہو اور ہمارے ہی خاندان کا صدقہ پایا ہے، اب ایسے احسان فراموش ہو گئے ہو کہ میرے لئے ایک رقعہ تم سے نہیں لکھا جاتا، یہ تم نے کیا پیری مریدی کا جال بچھایا ہے اور خلق خدا کو دھوکہ دے رہے ہو؛ یہ کہکر دوات زمین پہ پٹک دی اور اٹھکر چلے، حضرتؒ نے دامن پکڑ لیا اور فرمایا کہ ناراض ہو کر کیوں جا رہے ہو، خوش ہو کر جاؤ۔ اسکے بعد ایک رقم سامنے رکھی اور رضامند کر کے رخصت کیا[2]۔

پردہ پوشی و نکتہ نوازی

سیر الاولیاء میں ہے کہ اکثر معمول تھا کہ جو لوگ باہر سے آتے وہ کوئی شیرینی یا تحفہ خرید کر اپنے ساتھ لاتے اور پیش کرتے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ اسی ارادہ سے آرہے تھے، ایک مولوی صاحب بھی ساتھ تھے، انھوں نے سوچا کہ لوگ مختلف تحائف پیش کرینگے اور وہ اکٹھا حضرت کے سامنے رکھیں گے، خادم سب کو اٹھا کر لے جائے گا، کیا پتہ چلے گا کہ کون لایا؟ انھوں نے تھوڑی سی مٹی راستہ سے اٹھا کر کاغذ میں باندھ لی، جب سلطان المشائخؒ کی خدمت

---

[1] سیر الاولیاء صـ۵۴ ۵ [2] سیر العارفین (قلمی)

میں حاضر ہوئے ہر ایک نے اپنی چیز سامنے رکھی، مولوی صاحب نے بھی اپنی پڑیا سامنے رکھدی، خادم وہ سب چیزیں اٹھا کر لے جانے لگا، پڑیا کو بھی اٹھانا چاہا۔ حضرتؒ نے فرمایا "اس کو یہیں چھوڑ دو، یہ میری آنکھ کا سرمہ ہے۔" یہ اخلاق و عالی ظرفی دیکھ کر ان عالم صاحب نے توبہ کی اور مرید ہوئے۔[1]

شفقت و تعلق

اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہؒ کو عام انسانوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں اور اپنے اہل تعلق کے ساتھ ایسی شفقت و محبت عطا فرمائی تھی جس کو اگر ماں کی شفقت سے تشبیہ یا اس پر بھی ترجیح دی جائے تو واقعات کے لحاظ سے اس میں کوئی مبالغہ اور شاعری نہ ہوگی۔ شیوخ کاملین کی یہ شفقت دراصل نبیؐ کی اس شفقت کی وراثت اور نیابت ہے جس کی حقیقت اس آیت میں بیان کی گئی ہے:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	اے لوگو! تمہارے پاس ایسا پیغمبر آیا جو تمہاری
عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ	جنس سے ہے جس کو تمہاری تکلیف و مضرت کی بات
بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝	گراں گذرتی ہے جو تمہاری منفعت کا بڑا خواہشمند ہے،
(التوبہ ع ۱۶)	ایمانداروں کے ساتھ بڑا ہی شفیق و مہربان ہے۔

اور اس حکم کی تعمیل ہے جس کا خطاب رسولؐ سے ہے:۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ	ان لوگوں کے ساتھ فروتنی کے ساتھ پیش آؤ جو
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (شعراء ع ۱۱)	مسلمانوں میں داخل ہو کر تمہاری راہ پر چلیں۔

اس شفقت اور تعلق نے وہ "اتحاد" پیدا کر دیا تھا کہ دوسروں کی جسمانی اذیت سے اپنے کو جسمانی طور پر اذیت اور دوسروں کی قلبی راحت سے اپنے کو قلبی راحت ملتی تھی۔ امیر حسن علاء سنجری راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس ہو رہی تھی، سایہ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے، آپ نے سایہ میں بیٹھنے والوں سے فرمایا:۔

---

[1] سیر الاولیاء، صـ۱۴۲

"بھائی ذرا مل کر بیٹھو تاکہ ان بھائیوں کیلئے بھی جگہ ہو جائے، دھوپ میں یہ بیٹھے ہیں اور میں جلا جا رہا ہوں"۔[1]

ایک مرتبہ آپ نے کسی بزرگ کا مقولہ نقل کیا جو درحقیقت اپنے ہی حال کی ترجمانی تھی کہ "خدا کی مخلوق میرے سامنے کھانا کھاتی ہے اور میں اس کھانے کو اپنے حلق میں پاتا ہوں، جیسے وہ کھانا میں ہی کھا رہا ہوں"۔[2]

امیر حسن علاء سنجری فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ بے وقت حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اس طرف عزیزوں سے ملنے آیا ہوا تھا، حاضری کو جی چاہا۔ بعض دوستوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص کسی اور کام سے آیا ہو اور شروع سے حاضری کی نیت نہ کی ہو تو شیخ کی خدمت میں نہیں حاضر ہونا چاہیئے۔ میں نے دل میں کہا کہ اگرچہ قاعدہ یہی ہے لیکن دل نہیں مانتا کہ یہاں آکر حضرتؒ کی زیارت کے بغیر واپس چلا جاؤں، میں آج قاعدہ کے خلاف ہی کروں گا۔ حضرتؒ نے فرمایا "اچھا کیا"۔ پھر یہ شعر پڑھا۔ ؎

در کوئے خرابات دسرائے او باش

معنے بنود بیا و بنشیں دبہ باش

پھر فرمایا کہ مشائخ کا معمول یہی ہے کہ کوئی انکے پاس اشراق سے پہلے اور عصر کی نماز کے بعد نہیں جاتا، لیکن میرے یہاں یہ قاعدہ نہیں جس وقت جس کا جی چاہے آئے۔[3]

غمخواری عام

یہ اہل قلوب غم دنیا سے فارغ البال لیکن دنیا والوں کے غم اور خلق خدا کی فکروں سے نڈھال اور خستہ حال رہتے ہیں، وہ اپنا غم بھلا دیتے ہیں اور ساری دنیا کا غم اپنا غم بنا لیتے ہیں۔ یہ کہنے کا حق درحقیقت انھیں کو ہے کہ۔ ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے نواسے خواجہ شرف الدین سے کسی مجلس میں کسی صوفی نے کہا کہ خواجہ نظام الدینؒ

---

[1] فوائد الفواد ص۹۱ [2] سیر الاولیاء ص۷۷ [3] فوائد الفواد ج۱ ص۹۸

عجب فارغ البال بزرگ ہیں، مجرد ہیں، اہل وعیال واطفال کا کوئی تردد ان کو نہیں ہے ان کو ایسا فراغِ خاطر حاصل ہے کہ ایک ذرۂ غم بھی ان کو چھو نہیں گیا ہے۔ وہ عزیز اس مجلس سے اٹھے تو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے چاہتے تھے کہ خود اس کا ذکر کریں حضرت خواجہؒ نے خود ہی ارشاد فرمایا:۔

"میاں شرف الدین وہ رنج وغم جو میرے دل کو وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے شاید ہی کسی دوسرے شخص کو اُس سے زیادہ ہوتا ہو، جو شخص میرے پاس آتا ہے اپنا حال مجھ سے بیان کرتا ہے اُس سے دو چند فکر وتردد اور رنج والم مجھے ہوتا ہے، بڑا سنگدل ہے وہ جس پر اپنے دینی بھائی کا غم اثر نہ کرے" اسکے علاوہ یہ جو کہا گیا ہے:۔

"المخلصون علی خطر عظیم" (مخلصین کو بڑا خطرہ درپیش رہتا ہے)

اس سے بھی سمجھ سکتے ہو کہ۔ ع

نزدیکاں را بیش بود حیرانی[1]

حضرت خواجہؒ کے نزدیک مسلمان کا دل خوش کرنا اور اس کی دلجوئی وراحت رسانی افضل ترین عمل اور تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ تھا۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ فرمایا:۔

"مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی اس میں لکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچاؤ کہ مومن کا دل اسرارِ ربوبیت کا مقام ہے"۔ کسی بزرگ نے خوب کہا ہے۔ ؎

می کوش کہ راحت بکسانے برسد یا دست شکستہ بنانے برسد

(کوشش کرو کہ کسی انسانی جان کو تم سے آرام پہنچے، یا جو دست شکستہ ہے اسکو تمہارے ذریعہ روٹی ملے)

---

[1] سیر العارفین (قلمی)

ایک مرتبہ فرمایا، کہ:۔

"قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور چلن نہ ہوگا
جتنا دل کا خیال رکھنے اور دل خوش کرنے کا"[1]

چھوٹوں پر شفقت حضرت خواجہؒ اپنے قیمتی مشاغل اور اعلیٰ کیفیاتِ باطنی کے ساتھ بچّوں اور چھوٹوں پر بڑے شفیق تھے، اور وہ اپنی شدید مصروفیات کے باوجود اُن کی دلجوئی و ملاطفت کے لئے وقت نکال لیتے تھے، ان عظیم ذمہ داریوں اور باطنی مشغولیت کے باوجود ان بچوں کی پوری رعایت فرماتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتے۔

خواجہ رفیع الدین ہارون آپ کے حقیقی بھانجے کے صاحبزادے تھے، اگر کبھی کھانے کے وقت وہ موجود نہ ہوتے، تو اگرچہ بڑے بڑے بزرگ دسترخوان پر بیٹھے ہوتے، لیکن آپ ان صاحبزادے کا انتظار کرتے۔ آپ اپنے بچے کی طرح خلوت و جلوت میں ان کی تربیت و دلداری فرماتے[2]۔

خواجہ رفیع الدین کو تیر و کمان اور پیراکی و کشتی کا بڑا شوق تھا، حضرت سلطان المشائخ بڑی شفقت کے ساتھ ان سے انھیں فنوں کی باتیں کرتے تھے، ان کی ہمت افزائی اور تشویق فرماتے، ان فنوں کی باریکیوں اور نکتوں کی تعلیم دیتے، تاکہ یہ خوش ہوں[3]۔

جو شریف النسب اور ذی استعداد نوجوان اپنے زمانہ کے شوقین لوگوں کے جیسا لباس پہنتا اور ان میں نوجوانی کے تقاضے سے لباس میں تجمل پیدا ہوتا (جس کو بعض سخت گیر ثقاہت و متانت کے خلاف سمجھ کر اعراض کرتے ہیں) حضرت خواجہؒ ان کی بھی دلجوئی فرماتے، اور اس کو جوانی اور زمانہ کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز فرماتے اور اپنے اخلاق و محبت سے ان کی اصلاح و تربیت کی کوشش فرماتے۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۲۸ [2] ایضاً ص ۲۰۳ [3] ایضاً ص ۲۰۳

سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد لکھتے ہیں کہ میرے چچا سید حسین کرمانی کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ وہ اس زمانہ کے شوقین نوجوانوں کے لباس اور وضع میں ایک روز تشریف لائے۔ حضرت خواجہؒ نے ان کو دیکھ کر فرمایا:۔

سید بیا و بنشیں و سعادت ببر[1] | سید آؤ، بیٹھو اور سعادت میں حصہ لو۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس شفقت و ملاطفت اور اس دلجوئی و دلنوازی سے کتنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت ہوئی ہوگی اور کتنے "آہوئے وحشی" اسیر دامِ محبت ہوئے ہوں گے، اور ان کا شمار خدا کے مقبول بندوں اور شیوخ کاملین میں ہوا ہوگا۔

حضرت خواجہؒ کے ان اخلاق و صفات اور صوفیۂ صافیہ کی سیرت کو دیکھ کر امام غزالی کی اس رائے اور شہادت کی تصدیق ہوتی ہے جس کا انھوں نے "تلاش حق" کے طویل سفر اور مختلف گروہوں اور انسانی طبقات کے عمیق مطالعہ کے بعد اظہار کیا ہے:۔

"مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صوفیہ ہی اللہ کے راستہ کے سالک ہیں، انکی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، علماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی اُن کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، انکے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کیجائے۔"[2]

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۰۳ [2] المنقذ من الضلال

باب چہارم

اذواق وکیفیات

محبّت و ذوق حضرت خواجہ کی سیرت اور زندگی کا مرکزی نقطہ جو ان کے تمام اخلاق واحوال واعمال کا محور ہے وہ عشق الٰہی کی نعمت خداداد ہے جو ان میں ابتدائے حال سے نمایاں تھی، محبت کی یہ چنگاری جو ازل سے ان کی فطرت میں ودیعت تھی شیخ کبیر کی صحبت اور طریقۂ چشتیہ کی نسبت سے شعلۂ جاں سوز بن گئی اور اسنے مدت العمر ان کو اور نصف صدی سے زائد دہلی اور اسکے ماحول کو گرم اور منور رکھا اور اس کی وجہ سے صدیوں تک ہندوستان کی فضا عشق الٰہی کی حرارت سے گرم اور گداز رہی ان کے تمام حالات واشغال گفتگو اور مجالس، اشعار اور انکے انتخاب، واقعات اور ان کی تمثیل، غرض ہر چیز سے اسی سوزِ باطن اور اسی حرارتِ عشق کا اظہار ہوتا ہے ؎

شعلہا آخر ز ہر مویم دمید
از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک روز اولیاء اللہ کے دم واپسیں کے واقعات بیان ہو رہے تھے حاضرین میں سے ایک نے ایک بزرگ کی حکایت بیان کی کہ ان کا انتقال ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ اللہ کا نام

ان کی زبان پر جاری تھا، حضرت خواجہؒ آبدیدہ ہو گئے اور یہ رباعی پڑھی۔ ؎

آیم بسر کوئے تو پویاں پویاں　　رخسارہ بآبِ دیدہ شویاں شویاں
بیچارہ زد وصل تو جویاں جویاں　　جاں می دہم و نام تو گویاں گویاں[1]

(ترجمہ) آپ کی گلی میں چلا آ رہا ہوں خراماں خراماں، آنسوؤں سے اپنے رخسار کو دھوتا ہوں، آپکے وصل کا جویا اور طالب بن کر جان دے رہا ہوں، آپکا نام بھی لئے جا رہا ہوں)

اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ دل میں محبوب کے سوا کسی کے خیال کی جگہ نہیں رہی تھی، کسی دوسری طرف توجہ بھی دل پر بار تھی

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

امیر حسن علاء سنجری راوی ہیں کہ ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر کبھی اتفاق سے میں ان کتابوں کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں جو میں نے پڑھی ہیں تو طبیعت میں وحشت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنے دل میں کہتا ہوں کہ کہاں پڑ گیا؛ اس پر حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر کا واقعہ بیان کیا کہ وہ کمال حال پہ پہنچ گئے تو وہ کتابیں جو وہ پڑھ چکے تھے اوران کو کونے میں رکھ دیا تھا۔ ان کو سامنے رکھ کر ایک روز مطالعہ کرنے لگے۔ غیبی آواز آئی اے ابوسعید ہمارا عہد نامہ واپس کر دے کہ اب تو دوسری چیز میں مشغول ہو گیا، خواجہ جب اس مقام پہ پہنچے تو رو پڑے اور یہ شعر پڑھا ؎

تو سایۂ دشمنے کجا در گنجی　　جائے کہ خیال دوست زحمت باشد[2]

(ترجمہ) کسی دشمن کا سایہ بھی کہاں سما سکتا ہے، جہاں دوست کا خیال بھی حجاب بنے)

اسی "سرورِ عشق" کا نتیجہ یہ تھا کہ شب کی خلوت اور رات کے راز و نیاز کے بعد جب دن میں تشریف لاتے تو بقول امیر خورد معلوم ہوتا کہ شراب چھلک رہی ہے، رات کی بیداری سے آنکھیں سُرخ ہوتیں۔ امیر خسرو

---

[1] فوائد الفواد صفحہ ۸۰　　[2] فوائد الفواد صفحہ ۹۰

نے یہی دیکھ کر کہا ہے:۔ ؎

تو شبانہ می نمائی بہ سرے کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد[1]

اور اسی حرارتِ عشق اور سُرور و مستی کا نتیجہ تھا کہ پیرانہ سالی میں برابر روزہ رکھتے، تقلیلِ غذا، طویل شب بیداری اور سخت مجاہدات کے باوجود ضعف و ناطاقتی ظاہر نہ ہوتی تھی، اسّی سال سے عمر متجاوز ہونے کے باوجود چہرے پر وہی سرخی اور نشاط و انبساط کی وہی کیفیت پائی جاتی تھی جو جوانی میں رہی ہوگی بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ تھا[2]

سماع[3] محبت کی یہی حرارت اور تپش تھی جس کی تسکین کا ایک ذریعہ سماع تھا یعنی عشقِ الٰہی کے اشعار اور عارفانہ ابیات کا سننا جس سے قلب کو اپنی آگ نکالنے اور آنسوؤں کے چھینٹوں سے اس کی گرمی کو کم کرنے کا موقع ملے اور اسی کے ساتھ مجاہدات سے تھکا ہوا جسم اور طبیعت اور

---

[1] سیر الاولیا، صفحہ ۱۲۸ [2] سیر الاولیاء

[3] مسئلہ سماع (بلا مزامیر) کی موافقت مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اسمیں نقطۂ اعتدال یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ مطلقاً حرام ہے نہ کوئی عبادت و طاعت و امر مقصود، اعتدال اور خاص شرائط کے ساتھ ایک تدبیر و علاج ہے اور اصحاب ضرورت و اہلیت کے لئے بقدر ضرورت مباح اور بعض اوقات مفید، اس سلسلہ میں مشہور چشتی شیخ قاضی حمید الدین ناگوری کا قول بڑا جامع و معتدل معلوم ہوتا ہے۔ ایک مجلس میں سماع کی حلت و حرمت پر بحث تھی، قاضی صاحب نے فرمایا کہ:۔

"میں ہوں حمید الدین کہ سماع سنتا ہوں اور مباح کہتا ہوں علماء کی روایت کی بنا پر اسلئے کہ درد دل کا مریض ہوں اور سماع اسکی دوا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے شراب سے علاج کرنے کی ایسے وقت میں اجازت دے دی ہے جبکہ ازالہ مرض کے لئے اور کوئی دوا ہی نہ ہو اور حکیموں کا بھی اس پر اتفاق ہو کہ صحت شراب کے بغیر ناممکن ہے۔ اس تقدیر پر میرے مرض کی دوا جو کہ لاعلاج ہے سرود کا سننا ہے، لہٰذا اسکا سننا ہمارے لئے مباح اور تم پر حرام ہے" (سیر الاقطاب قلمی)

نفی کی چوٹ کھایا ہوا دماغ غذا اور تازگی حاصل کر سکے۔ مولانا رومؒ جو ایک بڑے صاحب سماع تھے اسی لئے فرماتے ہیں ؎

پس غذائے عاشقاں آمد سماع — کہ ازو باشد خیالِ اجتماع

قوتے گیرد خیالاتِ ضمیر — بلکہ صورت گردد از بانگ صفیر

آتشِ عشق از نواہا گرد تیز — آں چنانکہ آتش آں جوزریز

خود حضرت خواجہؒ نے اپنی زبان سے سماع کی یہی حکمت بیان کی ہے:۔

سماع حق مریدان و معتقدان و اصحاب ریاضت است، چوں نفس و تن ہلاک شود، او را حق البیت "ان لنفسك علیك حقا" یعنی بدرستی کہ برائے نفس برابر تو حق است چوں نخ بانے از سماع بیاساید باز او را بر کارے بہ برنگذ[1]

سماع مریدین صادقین اور اہل عقیدت اور اصحاب ریاضت کا کام ہے۔ جب طبیعت پوری چوٹ کھا جائے تو ان کا حق ہے (کہ سماع سے قوت و تازگی حاصل کریں) حدیث میں آتا ہے کہ ان لنفسك علیك حقا تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے۔ جب ایک مدت تک نفس سماع کے ذریعہ آرام حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسکو کام میں لگاتے ہیں

ایک بزرگ مولانا کاشانی فرماتے ہیں:۔

اصحاب ریاضت و ارباب مجاہدہ از کثرتِ معاملات گاہ گاہ اتفاق افتد کہ کلالتے و ملالتے در قلوب و نفوس حادث شود و قبض

اصحاب ریاضت و ارباب مجاہدہ کے قلوب و نفوس احوال و کیفیات کے کثرت سے پیش آنے کی وجہ سے کبھی کبھی اکتا جاتے ہیں اور انکو

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۹۸

بسطے کہ موجب فتور اعمال و قصور احوال بود
طاری گردد پس مشائخ متاخر از برائے رفع
ایں عارضہ و دفع ایں حادثہ ترکیبے روحانی
از سماع اصوات طیبہ و الحان متناسبہ و
اشعار و اشعار مہیجہ و مشوقہ بر وجہے کہ مشروع
بودہ نمودہ اند[1]

تکان و ضعف محسوس ہونے لگتا ہے اور
ان پر وہ قبض و بسط جو اعمال و احوال میں سستی
اور کوتاہی کا باعث ہوتا ہے طاری ہو جاتے ہیں
اس بنا پر مشائخ متاخرین نے اچھی آوازوں متناسب
نغموں اور شوق انگیز اشعار کے سننے کو اس
طرح پر کہ حدودِ شرع سے باہر نہ ہوں ایک
علاج روحانی کے طور پر تجویز کیا ہے۔

سماع کی اس حکمت کے علاوہ، اس کی ایک دوسری حکمت ان حضرات کے نزدیک یہ تھی کہ اس سے حضوری کی ایک کیفیت، درد کی لذت اور ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے اور یہ لمحات بقیہ اوقات کو بھی اپنے دامن میں لیکر پاک اور نورانی بنا دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ:-

مردم را ہمہ روز حضور کجا میسر شود اگر در روزے
وقتے خوش دریافت ہمہ اوقات متفرقہ آں
روز در پناہ آں وقت باشد و اگر در جمعے
صاحب نعمتے باشد جملہ اشخاص در پناہ
آں شخص باشند[2]

فرمایا، آدمی کو ہر روز حضوری کہاں میسر
آتی ہے اگر کسی دن کوئی وقت اچھا ہاتھ
آجائے تو اس دن کے تمام متفرق اوقات اس
وقت کی پناہ میں ہوتے ہیں، دیکھو اگر کسی مجمع میں
ایک صاحب ذوق اور صاحب نعمت ہوتا ہے،
تمام حاضرین اس کی پناہ میں ہوتے ہیں۔

پس یہ سماع، حضرت خواجہ اور ان مشائخ کی (جو اسی کیفیت کے حامل اور آتشِ محبت سے

---

[1] مصباح الہدایت ص ۱۸۰ و ص ۱۸۲ [2] سیر الاولیاء ص ۵۲۳

سے جل رہے ہوں) طبعی کیفیت کا نتیجہ، تسکین کا سامان، قوت و غذا اور رقت و حضوری کا ذریعہ تھا جسکو وہ حضرات علاجًا اور ضرورتًا اختیار کرتے تھے اور علاج اور ضرورت کے بقدر ہی اس سے کام لیتے تھے نہ وہ کوئی عبادت، تقرب الی اللہ کا ذریعہ تھا، نہ مستقل سلوک اور شب و روز کا مشغلہ تھا۔

اسی کے ساتھ حضرت خواجہؒ نے سماع کو ان تمام خلافِ شرع منکرات و بدعات اور اسبابِ لہو و لعب سے جو غیر مسلموں کے اثر سے خاص طور پر ہندوستان میں اہل ہوائے یا خام کار صوفیوں نے سماع میں شامل کر لئے تھے خود بھی دور رکھا اور اپنے متبعین کو ان سے اجتناب کی انتہائی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے سماع کے آداب اس طرح بیان فرمائے :۔

آپ نے فرمایا:۔

"سماع کی چار قسمیں ہیں:۔ حلال[۱]، حرام[۲]، مکروہ[۳]، مباح[۴]۔ اگر صاحبِ وجد کا میلان محبوبِ حقیقی کی طرف زیادہ ہو تو سماع مباح ہے، اور اگر محبوب مجازی کی طرف زیادہ ہے، تو مکروہ ہے، اگر محبوب مجازی کی طرف میلانِ کلی ہے تو حرام ہے، اگر محبوبِ حقیقی کی طرف میلانِ کلی ہے تو حلال ہے، پس جس کو سماع کا ذوق ہے، اس کو چاہیئے کہ وہ ان چاروں درجوں کو جانتا ہو۔"

نیز ارشاد فرمایا کہ:۔

"سماع مباح کے لئے چند چیزیں چاہئیں:۔ مُسمِع (سنانیوالا) مستمع (سننے والا) مسموع (جو کچھ پڑھا جا رہا ہے) آلۂ سماع (ذریعہ) مستمع کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ پوری عمر کا آدمی ہو، کم سن نہ ہو، عورت نہ ہو۔ مستمع کیلئے ضروری ہے کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے وہ یادِ حق سے خالی نہ ہو۔ مسموع کے لئے شرط ہے کہ وہ بے حیائی اور ہنسی مذاق کا کلام نہ ہو۔ آلۂ سماع سے مراد مزامیر ہے، جیسے چنگ و رباب کہ یہ درمیان

میں نہ ہو۔"[1]

مزامیر سے نفرت و ممانعت

حضرت خواجہ مزامیر (آلات غنا اور باجے وغیرہ سے) سختی سے منع فرماتے تھے اور جب کبھی اس بارے میں کسی بے احتیاطی کی اطلاع ملتی تو نہایت ناراض ہوتے اور اس بارے میں کسی عذر کو قبول نہ فرماتے سیر الاولیاء میں ہے:-

"مجلس میں ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ ان دنوں بعض حاضر باش درویشوں نے ایک ایسی مجلس میں جس میں چنگ و رباب اور مزامیر تھے شرکت کی اور رقص کیا۔ فرمایا:- اچھا نہیں کیا، جو خلاف شرع ہے وہ ناپسندیدہ ہے۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یہ لوگ جب باہر آئے اور لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا، اس مجلس میں مزامیر تھے، آپ نے سماع کس طرح سنا اور رقص کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم سماع میں ایسے مستغرق تھے کہ ہمیں کچھ پتہ نہ چلا کہ مزامیر ہیں یا نہیں۔ حضرت سلطان المشائخ نے سنکر فرمایا کہ:- یہ جواب بھی کچھ نہیں، یہ بات تو ہر معصیت کے متعلق کہی جا سکتی ہے[2]"

حضرت خواجہؒ مزامیر کی ممانعت میں بڑی شدت اور مبالغہ فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ:-

"جب عورت کو نماز میں امام کی غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے دستک دیتے وقت اس کی ممانعت ہے کہ ہتیلی پر ہتیلی ماری جائے کہ اس سے تالی کی آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ لہو ہے، جب لہو و لعب سے اتنا پرہیز آیا ہے تو سماع میں بطریق اولیٰ مزامیر کی ممانعت ہونی چاہیئے[3]"

---

[1] سیر الاولیاء ص ۴۹۱ و ص ۴۹۲ [2] ایضاً ص ۵۲۰ و ص ۵۲۱ [3] ایضاً ص ۵۲۲

سماع میں آپ کی کیفیت

حضرت خواجہؒ فرماتے تھے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے درد و ذوق عطا فرمایا ہے اس کو بغیر مزامیر کے ایک ہی شعر سنکر رقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جسے عالمِ ذوق کی خبر نہیں، اس کے سامنے پڑھنے والے کتنا ہی پڑھیں اور کیسے ہی مزامیر کیوں نہ ہوں اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اسلئے کہ وہ اہلِ درد میں سے نہیں ہے، اس کام کا تعلق درد سے ہے نہ کہ مزامیر وغیرہ سے[1]

چنانچہ حضرت خواجہؒ کا حال یہ تھا کہ عارفانہ اور عاشقانہ اشعار سنتے ہی آپ پر سخت رقت طاری ہوتی لیکن اس طرح کہ لوگوں کو خبر نہ ہوتی، خدام رومال دیتے جاتے اور وہ آپ کے آنسوؤں سے تر ہوتے جاتے، یہ دیکھ کر لوگ سمجھتے کہ آپ پر گریہ طاری ہے[2]

امیر خورد (جو خود بھی اپنی کمسنی میں ان مجالس سماع میں شریک ہوتے تھے اور زیادہ تر اپنے والد اور چچا سے ان پُرکیف مجلسوں اور ان وجدان انگیز اشعار کا ذکر کرتے ہیں جو وہاں پڑھے گئے) کہتے ہیں کہ بعض مرتبہ بہت سے شعر پڑھے جاتے لیکن کیفیت نہ پیدا ہوتی، یکایک کوئی ہندی کا دوہا یا فارسی کا کوئی شعر پڑھ دیتا اور مجلس مکیف ہو جاتی۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شاہی امیر قیر بک نے ایک مجلس آراستہ کی، مشائخ و صدور شہر کا اجتماع تھا، سماع شروع ہوا، کہنے والے بہت کچھ سناتے رہے کچھ اثر نہیں ہوا، آخر حسن بہدی قوال نے یہ شعر پڑھا ؎

در کلبۂ درویشی در محنت بیخویشی
مگذار مرا با من ہر سوئے مکن افسانہ

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ حضرت سلطان المشائخ پر گریہ اور ایک حالت طاری ہوئی اور اس کیفیت کا تمام حاضرینِ مجلس پر اثر ہوا، اور سب مکیف ہوئے[3]

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۲۳ [2] ایضاً ص ۵۱۴ [3] ایضاً ص ۵۱۴

ایک دوسری مجلس کا ذکر ہے، بالاخانہ پر مجلس ہو رہی تھی، امیر خسرو کھڑے تھے اور سلطان المشائخ ناسازی طبع کی وجہ سے چارپائی پر تشریف رکھتے تھے، حسن بہدی نے سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

سعدی تو کیستی کہ در آئی دریں کمند
چنداں فتادہ اند کہ ماصید لاغریم

حضرت خواجہؒ پر گریہ طاری ہوا اور اس میں ڈوب گئے۔ خواجہ اقبال رومال بڑھاتے جاتے تھے اور آپ آنسو پونچھ کر حسن بہدی کی طرف اُن کو بڑھاتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد سماع ختم ہوا، امیر حاجی فرزند امیر خسرو نے امیر خسرو ہی کی غزل پڑھنی شروع کی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

خسرو تو کیستی کہ در آئی دریں شمار
کیں عشق تیغ بر سر مردانِ دیں زدہ است

حضرت خواجہ پر پھر وہی کیفیت طاری ہوئی اور گریہ کا غلبہ ہوا[1]

ایک مرتبہ امیر خسرو نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

رخ جملہ را نمود، مرا گفت تو مبیں
زیں ذوق مست بیخبرم کیں سخن چہ بود

آپ نے گوشہ چشم سے امیر خسرو کو دیکھا، اور کیفیت طاری ہوئی[2]۔

عام طور پر جس شعر پر حضرت خواجہؒ کو ذوق آتا تھا، دہلی کی مجلسوں اور شہر کی گلیوں میں عرصہ تک اس کا چرچا رہتا تھا اور لوگ اس سے لطف لیتے تھے اور ذوق حاصل کرتے رہتے تھے[3]۔ سلطان علاء الدین نے بھی اہل دربار اور حضرت خواجہؒ کے یہاں آنے جانے والوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ: جس

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۱۵ [2] ایضاً ص ۵۱۶ [3] ایضاً ص ۵۱۰

شعر پر حضرت خواجہ کو ذوق آئے اس کو یاد رکھا جائے اور بادشاہ کو سنایا جائے۔ اکثر جب بادشاہ نے وہ شعر سنا جس پر حضرت خواجہ کو وجد آیا تھا تو بڑی تعریف کی اور دیر تک ذوق لیتا رہا۔

ذوقِ قرآن

قرآن مجید کا ذوق، اسکے حفظ کا اہتمام اور تلاوت کی کثرت مشائخ چشت کا خصوصی ذوق اور ان کی قدیم روایت ہے۔ خواجۂ بزرگ معین الدین چشتیؒ سے لیکر حضرت خواجہ نظام الدینؒ تک سب کے یہاں قرآن مجید کا خصوصی ذوق اور شغف ملتا ہے اور ہر ایک نے اپنے خلفاء خاص اور مریدین باختصاص کو حفظ قرآن اور باشتغال بالقرآن کی تاکید کی ہے[1]۔

خلافت دیتے وقت شیخ کبیر نے حضرت خواجہ کو حفظ قرآن کی وصیت کی تھی حضرت خواجہ نے یہ وصیت پوری کی اور دہلی پہنچتے ہی اس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ حضرت خواجہ اپنے مریدین اور اصحاب خاص کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہتے تھے اور تاکید فرماتے تھے۔ امیر حسن علاء سجزی جب حضرت خواجہ سے متعلق ہوئے تو وہ بوڑھے تھے اور شعر و شاعری زندگی بھر کا مشغلہ تھا۔ حضرت خواجہ نے ان کو ہدایت کی کہ قرآنی ذوق کو شعر و شاعری کے ذوق پر غالب کریں۔ امیر فوائد الفواد میں فرماتے ہیں:۔

بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ ام می فرمایند	بارہا آں مخدوم کی زبان مبارک سے میں نے
کہ قرآن خواندن بر شعر گفتن غالب آید۔[2]	یہ لفظ سنے ہیں کہ چاہیئے کہ قرآن کا پڑھنا شعر کہنے پر غالب آجائے۔

پھر ان کو حفظ قرآن کی ہدایت ہوئی۔ انھوں نے ایک ثلث یاد کر لیا تو ارشاد ہوا۔

دیگر ہا اندک اندک یاد گیر و یاد	تھوڑا تھوڑا یاد کرو اور اگلا یاد کیا ہوا
گرفتہ پیشینہ مکرر می کن[3]	دہراتے رہو۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" از مولانا مناظر احسن گیلانی (جلد دوم)۔ ۱۲

[2] فوائد الفواد ص ۲۴۹ [3] فوائد الفواد ص ۹۳

مولانا بدرالدین اسحٰق کے صاحبزادے خواجہ محمد حضرت خواجہ کی کفالت و پرورش میں تھے ان کو بھی قرآن مجید یاد کرایا۔ خواجہ محمد امام بڑے اچھے حافظ و خوش الحان تھے، ان کو آپ نے نماز کا امام بنایا تھا ان کی قرأت سے آپ بڑے محظوظ ہوتے اور آپ کو ان کی قرات سن کر بڑی رقت اور ذوق آتا[1]۔ ان کے دوسرے بھائی خواجہ موسیٰ بھی حافظ و قاری تھے معمول تھا کہ جب دستر خوان پر بیٹھتے تو پہلے خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ کچھ قرآن شریف پڑھتے، اسکو دعائے مائدہ[2] کہتے تھے۔ اس کے بعد کھانا شروع ہوتا تھا۔ اپنے نواسوں (خواہرزادہ کے صاحبزدگان) خواجہ رفیع الدین وغیرہ کو بھی قرآن حفظ کرایا[3]۔ خود بھی نوافل میں قرآن شریف پڑھتے اور خاص خدام سے دریافت فرماتے کہ ان کا کیا معمول ہے؟

شیخ سے تعلق

یوں تو جو شخص جس سے کوئی نعمت پاتا ہے (اگر اس کی طبیعت میں شرافت اور احسانمندی کا جذبہ ہے) اس کا گرویدہ ہوتا ہے اور اسکو اپنا محسن سمجھتا ہے لیکن حضرت خواجہ کو اپنے محسن سے عاشقانہ اور والہانہ تعلق تھا اور انکے اختصاص امتیاز اور روحانی ترقیات میں اسکو خاص دخل تھا۔ اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کسی محبوب کی تعریف ہوتی تو انکو اپنے شیخ کی یاد تازہ ہو جاتی اور وہ انھیں کو اسکا مصداق سمجھتے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ کی زندگی میں ایک مجلس میں قوال نے یہ شعر پڑھا۔

؎ مخرام بدیں صفت مبادا
کز چشم بدت رسد گزندی

فرماتے ہیں کہ مجھے شیخ کے اخلاق و اوصاف ان کا فضل و کمال اور ان کی لطافت و زیبائی یاد آگئی۔ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ قوال نے چاہا کہ آگے بڑھے، میں نے بار بار وہی شعر پڑھوایا، یہ ذکر

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۰۰

[2] سیر الاولیاء ص ۱۹۹

[3] سیر الاولیاء ص ۲۰۳

کرکے گریہ طاری ہوگیا۔ فرمایا اسکے بعد زیادہ دن نہیں گذرے کہ حضرت نے انتقال کیا[1]۔

جماعت کا اہتمام اور بلند ہمتی

ضعف پیری اور شدید مجاہدات کے باوجود جماعت سے نماز پڑھنے کا بیحد اہتمام تھا۔ صاحب سیر الاولیا لکھتے ہیں:۔

> عمر شریف اسی سے متجاوز ہوگئی۔ جب بھی پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھنے کے لئے بالاخانہ سے (جو بہت بلند تھا) جماعت خانہ میں اترکر ان درویشوں اور ساتھیوں کے ساتھ جو وہاں موجود ہوتے تھے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ اس کبر سنی کے باوجود ہمیشہ روزہ رکھتے، کم افطار کرتے[2]۔"

شریعت کی پابندی اور اتباع سنّت کا اہتمام

حضرت خواجہ خود بھی اتباع سنت کا اہتمام بلیغ رکھتے تھے کہ بقول سعدیؒ

> محال است سعدی کہ راہِ صفا
> تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ

اور اپنے اصحاب و خدام کو بھی بڑی تاکید فرماتے تھے۔ سنن کے علاوہ تاکید تھی کہ مستحبات و آداب تک فوت نہ ہوں۔ سیر الاولیاء میں آپ کا ارشاد منقول ہے:۔

استقامت می باید کہ بر متابعت رسول علیہ السلام والصلوٰۃ باشد و ہیچ مستحبے و آدابے فوت نہ شود[3]۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اتباع پر مضبوطی و ثابت قدمی دکھانی چاہیئے اور کوئی مستحب اور ادب بھی فوت نہ ہونے پائے۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۹۶

[2] سیر الاولیاء، ص ۱۲۵

[3] سیر الاولیاء، ص ۳۱۸

مشائخ کے لئے اور جس کو پیری مریدی کرنا ہو، شریعت کا علم ضروری سمجھتے تھے تاکہ اس سے کوئی عمل خلاف شریعت نہ صادر ہو۔ نہ دوسرے کو کسی خلاف شرع امر کی تلقین کرے۔ فرماتے ہیں:۔

"پیر آں چناں باید کہ در احکام شریعت و	پیر ایسا چاہیئے کہ احکام شریعت و طریقت
طریقت و حقیقت عالم باشد و چوں	و حقیقت کا (ضروری) علم رکھتا ہو اور جب ایسا
ایں چنیں باشد او خود ہیچ نامشروع	ہوگا تو وہ کسی خلاف شرع کام کے لئے
نہ فرماید[1]۔	نہ کہے گا۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۴۷

باب پنجم

افادات و تحقیقات

علمی پایہ

حضرت خواجہؒ باطنی کمالات کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے، اپنے زمانہ کے تمام مروجہ علوم کو بلند ہمتی، محنت اور اہتمام سے پڑھا تھا، ان کے اساتذہ میں اس عہد کے نامور ترین فضلا اور شیوخ ہیں، ادب اور علوم دینیات کی تعلیم انھوں نے مستوفی الممالک شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی سے پائی تھی، حدیث کا درس مولانا کمال الدین زاہد محمد ابن احمد مارکلی سے لیا جو صاحب مشارق الانوار امام حسن ابن محمد الصغانی کے شاگرد اور بیک واسطہ صاحب ہدایہ کے شاگرد تھے۔ کچھ کتابوں کو شیخ کبیر حضرت فرید الدین گنج شکرؒ سے پڑھ کر علم میں مزید جلا حاصل کی۔

علمی و ادبی مناسبت

اگرچہ اپنی مناسبت فطری اور شیخ کی نسبت باطنی کے اثر سے روز بروز الفاظ کے مقابلہ میں معانی اور معانی کے مقابلہ میں حقائق و احوال اور "اسم" سے زیادہ "مسمّٰی" میں مشغولیت بڑھتی گئی، پھر بھی علم و ادب سے مناسبت اور علمی ذوق آخر تک قائم رہا۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ مولانا رکن الدین چغر نے کشاف اور مفصل اور ان کے علاوہ بعض کتابیں حضرت سلطان المشائخ کی خاطر نقل کر کے خدمت میں پہنچائیں۔ یہ دونوں کتابیں مشہور معتزلی فاضل علامہ محمود جار اللہ

---

[1] سیر الاولیاء صفحہ ۳۱۷

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی تصنیف ہیں۔ پہلی کتاب تفسیر میں ہے اور دوسری نحو میں، اس سے بھی آپ کے علمی ذوق اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سیر الاولیاء میں ہے کہ سید خاموش ابن سید محمد کرمانی مجلس خلوت میں "خمسۂ نظامی" حضرت خواجہؒ کی خدمت میں پڑھتے تھے[1]۔ آپ کا ادبی ذوق اتنا بلند اور پاکیزہ تھا کہ امیر خسرو جیسے سرآمد روزگار شاعر (جو اپنے طرز میں بے نظیر اور فارسی کے صف اوّل کے شعراء میں ہیں) کو شاعری میں مشورہ دیا اور رہنمائی فرمائی۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ ابتدا میں امیر خسرو جو غزل کہتے تھے اس کو حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں نظر اصلاح پیش کرتے تھے۔ ایک روز حضرت نے ان سے کہا کہ صفاہانیوں کے طرز میں کہا کرو[2]۔

حدیث و فقہ پر نظر

سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار میں جو مجلس مناظرہ ہوئی تھی اس میں حضرت خواجہؒ نے مسئلہ پر جو تقریر اور اس کی تنقیح فرمائی اس سے بھی حضرت کے علمی مرتبہ اور وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کے عہد سے پہلے کتب صحاح متداول نہیں ہوئی تھیں اور صحیحین تک سے لوگ زیادہ مانوس اور آشنا نہیں تھے۔ حدیث میں مشارق الانوار اور مشکوٰۃ سرمایۂ علمی اور حدیث کا منتہی سمجھی جاتی تھی[3]۔ بکثرت موضوع اور ضعیف احادیث صوفیوں کی زبان پر جاری اور بزرگوں کے ملفوظات مجالس میں بے تکلف منقول ہیں۔ نقد حدیث اور موضوعات کا علم علامہ محمد طاہر پٹنی سے پہلے یہاں نظر نہیں آتا۔ حضرت خواجہؒ کے ملفوظات اور سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسی بہت سی بے اصل روایات سے (جو زبان زد خلائق ہیں) استدلال نہیں فرماتے تھے اور آپ کی اس پر نظر تھی کہ احادیثِ صحیحہ کا سب سے مستند مجموعہ صحیحین ہیں فوائد الفواد میں ہے کہ کسی نے دریافت کیا کہ یہ

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۲۱۹ [2] سیر الاولیاء، ص ۳۰۱

[3] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" کا باب حدیث۔ ۱۲

حدیث کیسی ہے: السخی حبیب اللہ وان کان کافراً" فرمایا: کسی کا مقولہ ہے، ایک شخص نے عرض کیا کہ:۔ یہ اربعین (چہل حدیث) کی حدیث ہے۔ فرمایا:۔ جو کچھ صحیحین میں ہے وہ صحیح ہے۔[۱]

اہمیتِ علم

اپنے مشائخ کرام کی طرح آپ کی نظر میں بھی علم کی بڑی اہمیت اور عظمت تھی اور اسکو سالکین اور ان لوگوں کیلئے جو ارشاد و تربیت کا کام کریں آپ بہت ضروری سمجھتے تھے۔

---

[۱] فوائد الفواد صـ ۱۰۳

اس موقعہ پر اس کا اظہار ضروری ہے کہ باوجود اسکے کہ آپ صحیحین کے مرتبہ سے واقف تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحاح ستہ کے عام طور پر اور صحیحین کے خاص طور پر ہندوستان میں متداول نہ ہونے کی وجہ سے ان علماء و مشائخ کا اشتغال نہیں تھا۔ خود آپ نے بھی (اگر مجلس مناظرہ کی روئداد صحیح ہے) مجلس مناظرہ میں جن حدیثوں کو حلت سماع کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے وہ صحاح کی احادیث نہیں ہیں اور محدثین کے نزدیک ان کا پایہ کچھ بلند نہیں ہے فریق مقابل کے علماء نے بھی جو اکابر علماء اور اعیان قضاۃ میں سے تھے جس طرح گفتگو اور استدلال کیا ہے اس سے علمِ حدیث سے نہ صرف ان کی بے خبری کا ثبوت ملتا ہے بلکہ ایک عالم دین کو اسکے بارے میں جو رویہ اختیار کرنا چاہیئے اس کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کتب صحاح اور نقد حدیث اور جرح و تعدیل کے فن کے شائع نہ ہونے کی وجہ سے خانقاہوں میں بہت سی ایسی رسوم، یہاں تک کہ سجدۂ تعظیمی رائج تھیں اور بہت سے ایسے اوقات و ایام کے فضائل کی روایات مشہور تھیں اور مشائخ کے ملفوظات میں ان کا بڑی آب و تاب سے ذکر آتا ہے۔ جن کا احادیث کے صحیح مجموعوں میں کوئی وجود نہیں اور محدثین ان پر سخت کلام کرتے ہیں اسکو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حضرات محدثین اور ان مخلصین کی کوششوں کی قدر ہوتی ہے جنھوں نے ہندوستان میں فن احادیث کی اشاعت کی اور صحیح و ضعیف احادیث میں امتیاز پیدا کیا۔ شکر اللہ مساعیھم

بنگال کے ایک رئیس عالی استعداد نوجوان جو بعد میں اخی سراج الدین کے نام سے مشہور ہوئے اور جو پنڈوہ کی مشہور عالم چشتی خانقاہ کے بانی اور سرحلقہ ہیں۔ لکھنوتی سے بہ نیت ارادت دہلی آئے، حضرت خواجہؒ کے مرید ہوئے۔ آپ نے مولانا فخرالدین زرادی سے فرمایا کہ: "یہ جوان بڑی قابلیت رکھتا ہے، اگر کچھ علم ظاہر بھی رکھتا ہوتا تو درویشی میں مستحکم ہوتا۔" یہ بات سنکر مولانا فخرالدین نے عرض کیا کہ:۔ اگر اجازت ہو تو میں اس کو کچھ عرصہ اپنی صحبت میں رکھکر ضروری مسائل یاد کرادوں۔ فرمایا کہ: یہ آپ کی صحبت کا بڑا مستحق ہے مولانا فخرالدین ان کو اپنے ساتھ لے گئے اور عرصۂ قلیل میں علم سے مناسبت پیدا کرادی۔ حضرت خواجہؒ کی وفات کے بعد بھی وہ تکمیلِ علم کے لئے کچھ عرصہ دہلی میں ٹھہرے رہے، پھر وطن واپس آگئے اور مشرقی و بنگالہ میں سلسلہ چشتیہ کی اشاعت کا ذریعہ بنے[1]

بلند علوم و مضامین

علم ظاہر و باطن کی اس جامعیت اخلاص اور تفکر و مجاہدات کی بنا پر آپ کو ان بلند اور صحیح علوم اور حقائق و معارف سے حصۂ وافر ملا جو اولیاء کاملین اور کبار مخلصین ہی کو ملا کرتا ہے اور جو صفائے باطن، طہارت اخلاق اور اخلاص کا نتیجہ ہے اور جس کو اہلِ تصوف علومِ لدنیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ صاحبِ سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ کسی علم میں گفتگو ہوتی یا کوئی اشکال پیش آتا، آپ اپنے نورِ باطن سے ان کا جواب شافی عطا فرماتے ؎

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

آپ اس مسئلہ پر ایسی بلیغ تقریر فرماتے کہ تمام حاضرینِ مجلس حیرت میں رہ جاتے اور ایک دوسرے سے کہتے کہ یہ کتابی جوابات نہیں ہیں۔ یہ الہامِ ربانی اور علمِ لدنی کے فیوض ہیں، اسی بنا پر شہر کے چوٹی کے علماء جو تصوف کے منکر اور اہلِ تصوف کے مخالف مشہور تھے حضرت خواجہؒ کے حلقہ بگوش اور اپنے علمی غرور اور زعم پر نادم ہوئے اور آپ کے خدام اور ارادتمندوں میں شامل ہو گئے۔

[1] سیر العارفین وغیرہ ۱۲-۵

علومِ صحیحہ شرعیہ

اس علمی رسوخ، اتباعِ سنّت اور استقامت علی الشریعت نے آپ کے ذہن کو ایسا سلیم اور مستقیم بنا دیا تھا کہ اہلِ تصوّف میں جو باتیں عرصۂ دراز سے ظاہر شریعت کے خلاف چلی آتی تھیں اور بہت جگہ اہلِ تصوّف کا شعار بن گئی تھیں، آپ اپنی سلامتیِ ذہن سے اُن کو قبول نہیں کرتے تھے اور آپ کا ذوق اور تحقیق اُن کے خلاف تھی۔

تصوّف کے حلقوں میں بہت عرصہ سے اس خیال کا اظہار ہو رہا تھا کہ ولایت نبوت سے افضل اور اولیاء کو انبیاء پر فضیلت حاصل ہے اسلئے کہ ولایت عبارت ہے حضرت حق کے ساتھ مشغولیت اور ماسوی اللہ سے انقطاع سے اور نبوت میں (دعوت و تبلیغ کی وجہ سے) مخلوق کے ساتھ مشغولی ہوتی ہے، پھر اس میں کئی مذہب پیدا ہو گئے اور کسی نے یہ تاویل کی کہ انبیاء کی ولایت ان کی نبوت سے افضل ہے، لیکن آپ اسکو تسلیم نہیں کرتے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ:۔ یہ مذہب باطل ہے، اس سبب سے کہ اگرچہ انبیاء مخلوق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں لیکن جس وقت کہ وہ حق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں اس مشغولیت کا قلیل سے قلیل زمانہ بھی اولیاء کے تمام اوقات پر فضیلت رکھتا ہے۔[2]

حلال مانع راہ خدا نہیں

تصوّف کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا اور مشہور کیا گیا ہے کہ تصوّف تعطّل اور بیکاری و بے عملی کا نام ہے اور ہر اشتغال و صول اللہ سے مانع

---

[1] سیر الاولیاء ص۱۲۰

[2] فوائد الفواد ص۱۲۰ امام ربّانی حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ نے اتنا مزید اضافہ کیا کہ انبیاء عین مشغولی بخلق کی حالت میں بھی اولیاء سے (عین اس وقت جب وہ حق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں) زیادہ متوجہ الی اللہ اور مشغول باللہ ہوتے ہیں) ان کی مشغولیت بخلق چونکہ حکم الٰہی سے ہوتی ہے اسلئے وہ عین مشغولیت بحق اور امر الٰہی کا امتثال ہوتا ہے۔ ۱۲

اورراہِ سلوک کا رہزن ہے۔ حضرت خواجہ معرفت و تحقیق کے جس مقام پر فائز تھے اور وسائل و رسوم سے بلند ہو کر مقاصد اور لب لباب پر جس طرح آپ کی نظر تھی اس کا مقتضا یہ تھا کہ آپ اس مقام سے آگے بڑھ چکے تھے اور فعل حلال و مشروع کی نورانیت اور اس کا ذریعۂ قرب ہونا آپ کی نظر میں تھا۔ حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کے ملفوظات "جوامع الکلم" میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین نے فرمایا:۔

ہیچ کسے (چیزے) کہ حلال است مانع	کوئی چیز جو حلال ہے راہ خدا کی مانع
راہ خدائی نیست و قاطع سلوک نیست	اور قاطع سلوک نہیں ورنہ مشروع و
وگرنہ مشروع و حلال نبودی[1]	حلال نہ ہوتی۔

قلب متوجہ الی اللہ کے بعد کوئی چیز مضر نہیں

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ خدا کی طرف متوجہ دل اور پاک نفس چاہیئے اسکے بعد جس کام میں رہنا ہو رہو، تمھیں کوئی نقصان نہ ہوگا۔[2]

ترکِ دُنیا کی حقیقت

ترکِ دنیا اور حقیقی زہد و درویشی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

ترکِ دنیا آں نیست کہ کسے خود را	ترکِ دنیا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی
برہنہ کند مثلاً لنگوتہا بند و بنشیند،	اپنے کو ننگا کر دے مثلاً لنگوٹہ باندھ کر
ترکِ دنیا آں است کہ لباس بپوشد	بیٹھ جائے، صحیح معنی میں ترکِ دنیا یہ
وطعام نخورد و انچہ برسد رد ابدارد	ہے کہ کپڑے پہنے، کھانا کھائے اور
و بجمع او میل نکند و خاطر را متعلق	جو کچھ میسّر آئے اُس کو استعمال کرے،

---

[1] جوامع الکلم ص۱۶۰ [2] یعنی مشروع وجوہ معاشی اور ظاہری مشاغل وغیرہ۔ [3] سیر الاولیاء ص۱۶۰

بہ چیزے ندارد ترک دنیا است[1] لیکن اسکے جمع کرنے کی طرف متوجہ نہو اور
اپنے دل کو کسی چیز میں پھنسائے نہیں یہی ترکِ دنیا ہے

طاعت لازم و متعدی

فرمایا:- طاعت کی دو قسمیں ہیں لازم اور متعدی۔ طاعتِ لازمی اسے کہتے ہیں جس کی منفعت طاعت کرنے والے کو پہنچے، جیسے نماز، روزہ، حج، اوراد و تسبیحات وغیرہ۔ طاعت متعدی وہ ہے جس کی منفعت اور راحت دوسرے کو پہنچے، مثلاً دو مسلمانوں میں اتفاق کرادینا، شفقت، دوسروں کے ساتھ مہربانی وغیرہ اس کو طاعت متعدی کہتے ہیں اور اس کا ثواب بے حد و بے اندازہ ہے۔

طاعتِ لازمی کی قبولیت کے لئے بڑے اخلاص کی ضرورت ہے اور طاعتِ متعدی جس طرح بھی کرے گا ثواب ملے گا۔[2]

کشف و کرامات حجابِ راہ

ارشاد ہوا کہ اولیاء سے جو کچھ اظہار ہوتا ہے وہ ان کی سکر و مستی کا نتیجہ ہے، اسلئے کہ وہ اصحاب سکر ہیں، اسکے برخلاف انبیاء اصحاب صحو ہیں، سالک کیلئے کشف و کرامات حجابِ راہ ہیں، محبت سے استقامت پیدا ہوتی ہے۔[3]

علومِ انبیاء و اولیاء رح

فرمایا کہ:- تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ جس کو طورِ حس کہنا چاہئے، دوسرا طورِ عقل اور تیسرا طورِ قدس۔ طورِ حس میں مطعومات (کھانے پینے کی چیزیں) مشمومات (جن کی خوشبو محسوس ہوتی ہے) وغیرہ محسوسات معلوم ہوتی ہیں، اسکے بعد طورِ عقل ہے اس کا تعلق دو علموں سے ہے، کسبی اور بدیہی، لیکن عالم قدس میں پہنچ کر عقل سے حاصل کئے ہوئے کسبی علوم بھی بدیہی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ بدیہی بھی علمِ قدس نہیں ہے کسبی کا کیا ذکر؟ وہ انبیاء و اولیاء کے علوم ہیں۔ اسکے بعد فرمایا کہ جس پر عالمِ قدس کا دروازہ کھلتا ہے اسکی علامت کیا ہو سکتی ہے؟ جو شخص

---

[1] فوائد الفواد ج ۱ ص ۱۰۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۲۔ [3] فوائد الفواد ج ۱ ص ۳۳

عالمِ عقل میں ہوتا ہے اور وہ کسی مسئلہ کو بدیہی یا کسبی علم سے حل کرتا ہے اور اس سے اس کو ایک فرحت حاصل ہوتی ہے وہ عالمِ قدس میں راہ نہیں پاتا۔ اس درمیان میں کسی بزرگ کا واقعہ بیان کیا کہ وہ فرماتے تھے کہ غیب سے کچھ علوم اور واردات دل پر گذرتے ہیں انشاء اللہ ان کو قلم بند کروں گا، اسکے بعد بہت کچھ لکھا۔ پھر فرمایا کہ بہت کچھ لکھا گیا لیکن جو کچھ مقصود تھا وہ ضبطِ تحریر میں نہیں آسکا۔[1]

دنیا کی محبت اور عداوت

ایک دن اس کا ذکر ہو رہا تھا کہ کسی کو دنیا کی محبت ہوتی ہے اور کسی کو اس سے نفرت۔ فرمایا کہ:۔ تین طرح کے لوگ ہیں جو دنیا کو دوست رکھتے ہیں اور دن رات اس کی یاد اور فکر میں رہتے ہیں ایسے لوگ بہت ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو دنیا سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا حقارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور ہمیشہ اسکی دشمنی میں رہتے ہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کو نہ دنیا سے محبت ہوتی ہے نہ نفرت اور اس کا ذکر محبت یا عداوت کے ساتھ نہیں کرتے، یہ پہلی دونوں قسموں سے بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ نے حکایت سنائی کہ:۔ ایک شخص حضرت رابعہ بصریؒ کے پاس آیا اور دنیا کی سخت مذمت کرنے لگا۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے اس سے کہا کہ:۔ برائے مہربانی آپ اسکے بعد نہ آئیے گا۔ آپ کو دنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ آپ اسکا بہت ذکر کرتے ہیں۔[2]

مراتب تلاوتِ قرآن

ایک مرتبہ آپ نے تلاوت قرآن پاک کے مراتب اس طرح بیان فرمائے کہ: پہلا مرتبہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھے اسکے معانی دل پر گزارے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کا دل حق تعالیٰ کے ساتھ متعلق و مشغول ہو۔

فرماتے کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو کم از کم اس شعور کو ہر شخص میں ہونا چاہیئے کہ میں اس نعمت کے

---

[1] فوائد الفواد ج ۱ ص ۶۹ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۸۹

لائق کہاں تھا اور میرے نصیب ایسے کہاں تھے کہ مجھے یہ دولت ملے، اگر یہ سب حاصل نہ ہو تو پچھتنے پر جس ثواب اور جزا کا وعدہ ہے اسکو ذہن میں تازہ اور مستحضر رکھا جائے[1]۔

اگرچہ حضرت خواجہؒ نے جیساکہ انھوں نے کئی بار ارشاد فرمایا کوئی تصنیف نہیں کی، لیکن آپ کی سب سے بڑی تصنیفات آپ کے تربیت کئے ہوئے اور آپ کی صحبت پائے ہوئے وہ خلفائے کبار اور اصحابِ نامدار ہیں جو عملِ صحیح اور علمِ صحیح کا نمونہ تھے اور جن کے دل کی راستی علم کی گہرائی اور فہم کی پختگی "راسخین فی العلم" کے شایانِ شان تھی۔ امیر حسن علاء سنجری کی فوائد الفواد اور امیر خورد کی سیر الاولیاء میں آپ کے بہت سے اقوال و ملفوظات منقول ہیں جو آپ کی شانِ تحقیق کا مظہر ہیں۔

---

[1] فوائد الفواد ص۱۷

[2] فوائد الفواد ص۴۵ و خیر المجالس ص۳۵

باب ششم

فیوض و برکات

تجدید ایمان و توبۂ عام

قبل اس کے کہ اُن فیوض و برکات کا ذکر کیا جائے جو حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے ساتھ تعلق اور ان کے ہاتھ پر توبہ و بیعت کے ذریعہ لاکھوں مسلمانوں کو پہنچے، اور ایک ایسے زمانہ میں جب مسلمانوں کی حکومت اپنے پورے عروج پر تھی اور غفلت، خدا فراموشی اور نفس پرستی کے اسباب و محرکات پورے شباب پر تھے، ایک ایسی دینی اور روحانی لہر پیدا ہوئی جس کو ہر محسوس کرنے والے نے محسوس کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشائخ طریقت کی بیعت عام اور ارشاد و تلقین توبہ کی حکمت اور ضرورت بیان کر دی جائے، تاکہ معلوم ہو کہ کن حالات و ضروریات کے ماتحت اس طریقے کو اختیار کیا گیا اور اس سے کیا دینی فوائد پہنچے، راقم سطور نے تاریخ دعوت و عزیمت کے حصۂ اول میں حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے تذکرہ کے ضمن میں جو کچھ لکھا تھا پہلے اسی کو کسی قدر اختصار و ترمیم کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:۔

"خیر القرون کے بعد اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور

معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ خصوصی تعلیم و تربیت کے ذرائع سے عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی اور روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں و پابندیوں کو اور شعور و احساس ذمہ داری کیساتھ دوبارہ قبول کرے، اس میں پھر اپنی ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اُسکے افسردہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو، اور اُسکے مضمحل قویٰ میں پھر حرکت و نشاط پیدا ہو، اسکو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین کی صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے۔ ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ اسلامی حکومتیں جن کا یہ اصلی فرض تھا (اسلئے کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر وہ قائم تھیں بقول سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ وہ ہدایت کیلئے مبعوث ہوا تھا۔ "جبایت" "تحصیل وصول" کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھیں بلکہ اپنے سربراہوں اور عمالِ حکومت کے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کیلئے مضر اور اس کے راستہ میں مزاحم تھیں، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھیں کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں قیادت و سیادت کی آمیزش پائیں برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ اسکو وہ فوراً کچل کر رکھ دیتیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کیلئے اسکے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ایمان و عمل اور اتباعِ شریعت کیلئے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں اور پھر وہ نائب پیغمبر اُنکی دینی نگرانی

وتربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت، اپنی استقامت اور اپنے نفسِ گرم سے پھر ایمانی حرارت، گرمیِ محبت، خلوص وللّٰہیت، جذبۂ اتباعِ سنّت اور شوقِ آخرت پیدا کر دے، اُن کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک زندگی سے توبہ کی ہے اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے، اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح وتربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ نے میرے سپرد کی ہے اور اس محبت و اعتقاد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربوں و اجتہاد اور کتاب و سنّت کے اصول و تعلیم کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان احتساب و اخلاص اور ان کے اعمال و عبادات میں ایمانی کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء و تجدید دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا کو حقیقتِ ایمان اور درجۂ احسان تک پہنچا دیا ہے[1]"

بیعت ایک عہد و معاہدہ

یہ بیعت پچھلے گناہوں سے توبہ اور خدا و رسول کے احکام کی تعمیل اور اتباعِ شریعت کا ایک معاہدہ ہوتا تھا، سلطان المشائخ بیعت لیتے وقت بیعت کرنے والے سے کیا الفاظ کہلواتے تھے اور آئندہ کیلئے اس سے کیا عہد لیتے تھے کسی تذکرہ میں اسکے صحیح الفاظ نظر سے نہیں گزرے، لیکن حضرت خواجہ نے خود اپنے شیخ و مرشد شیخ کبیر حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے بیعت لینے کا طریقہ اور ان کی تلقین کا ذکر کیا ہے اور ان کو اپنے شیخ سے جو والہانہ تعلق اور ان کی پیروی کا جو جذبہ تھا، اس سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے

[1] تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ اوّل صـ ۲۰۲

کہ وہ بھی اسی طرح اپنے نئے مریدین کو تلقین فرماتے ہوں گے۔ ارشاد ہے:۔

"جب کوئی شخص شیخ شیوخ العالم فرید الدین والحق کی خدمت میں بہ نیت ارادت آتا فرماتے پہلے ایک بار سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھو، اسکے بعد سورۂ بقر کا آخری رکوع 'امن الرسول سے آخر تک پڑھتے، اسکے بعد شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو ..... ان الدین عند اللہ الاسلام تک پڑھتے، اسکے بعد فرماتے کہ تم نے بیعت کی اس ضعیف کے ہاتھ پر اسکے شیخ اور شیخ کے مشائخ کے ہاتھ پر اور حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دستِ مبارک پر اور حضرت عزت (جل مجدہٗ) سے عہد کیا کہ اپنے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی حفاظت اور شریعت کے راستہ اور طریقے پر قائم رہو گے[1]"

بیعت کی اس تلقین میں اسلام کے بنیادی عقائد آگئے، سمع وطاعت (سننے اور ماننے) کا وعدہ اور ارادہ بھی آگیا، یہ بات بھی آگئی کہ اللہ کے یہاں قابلِ قبول دین صرف دینِ اسلام ہے اس کا احساس بھی بیدار و تازہ کر دیا گیا کہ یہ بیعت در اصل دستِ مبارک نبوی پر ہے اور یہ شیخ کا ہاتھ اس دستِ مبارک کا قائم مقام ہے۔ رب العزت سے اس کا بھی عہد کیا گیا کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی معصیتوں سے حفاظت کی جائے گی اور راہِ شریعت پر قائم رہا جائیگا، تجدید ایمان اور خدا و رسول سے اپنا پرانا عہد استوار کرنے کا اس سے بہتر اور عام فہم طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بیعت کرنے والے سو فی صدی اس عہد پر قائم رہتے تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیعت کرنے والوں میں سے ایک بڑی تعداد اس اقرار اور عہد کی شرم اور لاج رکھتی اور ہزاروں اور لاکھوں بندگانِ خدا کے لئے یہ تجدید ایمان اور انقلابِ حال کا ذریعہ بن جاتی۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۲۳

عمومِ بیعت کی حکمت

بیعت و ارشاد میں ان حضرات نے جو وسعت و اذنِ عام قرار رکھا تھا اور جس طرح بغیر کسی امتحان اور امتیاز کے لوگوں کو اجازت تھی کہ وہ بیعت کریں اور حلقۂ ارادت میں داخل ہو جائیں، خاص طور پر حضرت خواجہ کے یہاں اس باب میں جو وسعت و رعایت تھی، اس پر بعض لوگوں کو یہ کھٹک پیدا ہو سکتی ہے کہ جب بیعت ایک معاہدہ ہے اور اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے تو اس میں اتنی وسعت کیوں روا رکھی گئی ہے؟ حضرت خواجہ نے ایک موقع پر خود ہی اس اشکال کا جواب دیا ہے اور اس عمومیت کی حکمت بیان کی ہے۔

مولانا ضیاء الدین برنی (مصنف تاریخ فیروز شاہی) فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر تھا، اشراق سے چاشت تک آپ کی روح پرور جان نواز باتیں سنتا رہا، اس روز خاص طور پر بہت کثرت سے لوگ بیعت ہوئے، یہ دیکھ کر میرے دل میں آیا کہ مشائخ متقدمین نے مرید کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ سلطان المشائخ نے اپنی فیاضیِ عنایت سے اس کا اذن عام دیدیا ہے اور آپ خاص و عام سب کو مرید کر لیتے ہیں، میں نے چاہا کہ میں اس بارے میں سوال کروں سلطان المشائخ اپنے کشف سے میرے خطرے پر مطلع ہو گئے، فرمایا:۔

"مولانا ضیاء الدین! تم ہر طرح کی باتیں پوچھتے ہو، یہ نہیں پوچھتے کہ میں بغیر تحقیق کے آنے والوں کو کیوں مرید کر لیتا ہوں۔"

یہ سنکر مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا اور میں نے آپ کے قدم لیکر عرض کیا کہ ایک عرصے سے میرے دل میں یہ اشکال تھا آج بھی یہ وسوسہ آیا تھا، اللہ نے آپ کے دل میں یہ بات ڈال دی حضرت نے فرمایا:۔

"حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں اپنی حکمتِ بالغہ سے ایک خاصیت رکھی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر زمانہ کے لوگوں کی راہ و رسم اور عادتیں الگ ہوتی ہیں اور ان کے مزاج و طبیعت پچھلے لوگوں کے اخلاق و طبائع سے میل نہیں کھاتے، تھوڑے لوگ اس سے

مستثنیٰ ہوتے ہیں اور یہ ایک تجربہ کی بات ہے۔ ارادت کی اصل یہ ہے کہ مرید ماسوی اللہ سے منقطع اور مشغول مع اللہ ہو جائے، جیسا کہ کتب تصوف میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ مشائخ متقدمین جب تک طالب میں ارادت میں انقطاع کلی نہ دیکھ لیتے بیعت کا ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے، لیکن سلطان ابوسعید ابوالخیر کے عہد سے لیکر شیخ سیف الدین باخرزی کے زمانے تک اور شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی سے لیکر شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہ العزیز کے وقت تک کہ یہ سب حضرات سرآمد روزگار اور آیۃ من آیات اللہ تھے خلق خدا کا ان کے دروازوں پر ہجوم ہوا اور ہر طبقہ کے لوگوں نے اژدحام کیا، ان بندگانِ خدا نے آخرت کی ذمہ داریوں سے ڈر کر ان عاشقانِ خدا کا دامن تھامنا چاہا اور ان مشائخ کبار نے بھی خاص و عام کو اپنی بیعت میں قبول کیا، اور خرقہ، توبہ و تبرک عطا کیا، ہر شخص ان محبوبانِ خدا کے معاملات پر اپنے کو قیاس نہیں کر سکتا کہ شیخ ابوسعید، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ اسرارہم نے جس طرح لوگوں کو مرید کیا، میں بھی مرید کروں اس لئے کہ اگر خدا کا کوئی محبوب گناہگاروں میں سے ایک عالم کو اپنے دامن عاطفت میں لے لے تو لے سکتا ہے — اب میں تمہارے سوال کا جواب لیتا ہوں کہ میں مرید کرنے میں کیوں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیتا اور اپنا اطمینان نہیں کرتا ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں علی سبیل التواتر سن رہا ہوں کہ بہت سے مرید ہونے والے معصیت سے تائب ہو جاتے ہیں، نماز باجماعت ادا کرنے لگتے ہیں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاتے ہیں، اگر میں بھی شروع ہی سے اس بات کی شرط کروں کہ ان میں ارادت کی حقیقت یعنی انقطاعِ کلی پایا جاتا ہے کہ نہیں، اور ان کو توبہ و تبرک کا خرقہ (جو خرقہ،

ارادت کی جگہ پر ہے) نہ دوں تو وہ خیر کی اس مقدار سے بھی جو ان اللہ کے بندوں سے وجود میں آنی ہی ہے محروم ہو جائیں گے، دوسرا سبب یہ ہے کہ بغیر اسکے کہ میرے دل میں خیال آئے یا میں اسکی درخواست اور التماس کروں یا کوئی وسیلہ اور سفارش اختیار کروں شیخ کامل و مکمل (شیخ کبیر) نے مجھے بیعت لینے کی اجازت دی۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان بڑی عاجزی و درماندگی اور بڑی مسکنت و بیچارگی کے ساتھ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمام گناہوں سے توبہ کی، میں یہ سمجھ کر کہ شاید اسکی بات سچ ہو، اسکو بیعت کر لیتا ہوں، خاص طور پر اسلئے کہ بہت سے معتبر لوگوں سے سنتا ہوں کہ بہت سے بیعت کرنیوالے اس بیعت کی وجہ سے معاصی سے باز آجاتے ہیں[۱]"

عمومی زندگی پر اثر

اس بیعت و تعلق کا جس سے مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگ یکساں مستفیض ہوئے، عام زندگی و معاشرت، لوگوں کے اخلاق و عادات، اشغال و اوقات اور اہلِ حکومت سے لیکر اہلِ حرفہ تک کے حالات پر کیا اثر پڑا، اور دار الحکومت دہلی میں جو شوکت، قوت دولت و ثروت اور عیش و عشرت کا گہوارہ تھا اور مال غنیمت اور سینکڑوں ہزاروں برس کے خزانوں کے زر و جواہر، صناعوں کی مصنوعات اور ملک کے اطراف و جوانب کے تحائف و عجائبات روزانہ سیل رواں کی طرح وہاں امنڈ رہے تھے۔ دینداری، خدا طلبی، عشقِ الٰہی، توبہ و انابت اور رجوع الی اللہ صفائی معاملات، راست گفتاری اور دیانت داری کی کیا کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کی تفصیل اُس عہد کے صاحبِ نظر اور معتبر مؤرخ ضیاء الدین برنی کی زبان سے سُنیئے وہ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۲]:-

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۳۴۶ و ص ۳۴۸ بحوالہ حسرت نامہ مولانا ضیاء الدین برنی [۲] تاریخ فیروز شاہی کے اقتباس کا یہ ترجمہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم، اے (رفیق دار المصنفین) کی کتاب "بزم صوفیہ" سے حذف و اختصار کیساتھ نقل کیا گیا ہے۔ ص ۱۹۹ و ص ۱۰۲

"سلطان علاءالدین کے زمانہ کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوف شیخ الاسلام نظام الدین شیخ الاسلام علاءالدین اور شیخ الاسلام رکن الدین سے آراستہ تھا' ایک دنیا اُن کے انفاسِ متبرکہ سے روشن ہوئی اور ایک عالم نے اُن کی بیعت کا ہاتھ پکڑا اور اُن کی مدد سے گناہگاروں نے توبہ کی اور ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاریوں سے ہاتھ اٹھا لیا' اور ہمیشہ کے لئے پابندِ نماز ہو گئے اور باطنی طور پر دنیی مشغلے کی طرف رغبت ظاہر کی اور توبہ صحیح ہو گئی اور عباداتِ لازمہ اور متعدیہ کا معمول ہو گیا' اور دنیا کی حرص و محبت جو انسانوں کے فوائد اور فرمانبرداری کی بنیاد ہے' ان مشائخ کے اخلاقِ حمیدہ اور ترکِ تجرید کے معاملات کے دیکھنے سے دلوں سے کم ہو گئی اور سالکوں کو نوافل اور وظائف کی کثرت اور اوصافِ عبودیت کی پابندی سے کشف و کرامات کی آرزو دل میں پیدا ہونے لگی' اور ان بزرگوں کی عبادات و معاملات کی برکت سے لوگوں کے دلوں میں سچائی پیدا ہو گئی' اور ان کے مکارمِ اخلاق و مجاہدہ و ریاضت کے دیکھنے سے اللہ والوں کے دلوں میں اخلاق کے بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی اور ان دینی بادشاہوں کی محنت اور اخلاق کے اثر سے خداوند تعالیٰ کے فیض کی بارش دنیا میں ہونے لگی اور آسمانی مصیبتوں کے دروازے بند ہو گئے اور ان کے زمانہ کے لوگ قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا اور گرفتار نہیں ہوئے اور ان کی مخلصانہ اور عاشقانہ عبادت گزاری کی برکت سے مغلوں کا فتنہ جو سب سے بڑا فتنہ تھا ایسا فرو ہوا اور یہ تمام ملاعین اس قدر آوارہ و تباہ ہوئے کہ اس سے زیادہ تباہ نہیں ہو سکتے تھے اور یہ تمام باتیں جو ان تینوں بزرگوں کے وجود سے ان کے معاصرین کو نظر آئیں' وہ شعارِ اسلام کی بلندی کا ذریعہ بن گئیں اور احکام شریعت و طریقت کو جو رونق و رواج حاصل ہوا اس کا کیا کہنا' کتنا عجیب زمانہ وہ تھا' جو سلطان علاءالدین کے آخری دسویں سال میں نظر آیا' ایک

طرف سلطان علاء الدین نے ملک کی بہتری کے لئے تمام نشہ آور ممنوع چیزوں کو اور فسق و فجور کے اسباب کو قہر و غلبہ تعزیر و تشدد اور قید و بند سے روک دیا اور مال جو دینی اور ملکی فساد کا ذریعہ اور ہوا پرستوں کیلئے گناہوں کا آلہ اور حریصوں، بخیلوں اور تاجروں کیلئے سود، ذخیرہ اندوزی کا سامان اور فتنہ پردازوں کے لئے بغاوت کی استعداد اور نیکیوں کے لئے کبر، مفاخرت، غفلت اور کسلمندی پیدا کرنے والا ہے اور عبادت گذاروں کے لئے نسیان و فراموشی کا باعث ہے، سلطان علاء الدین ہر بہانے سے کہ جو اسکو ملتا مالداروں اور حکام سے سختی سے لے لیتا اور بازار والوں کو کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والی اور سب سے زیادہ فریب کرنے والی قوم ہے، سچائی اختیار کرنے، سچائی کے ساتھ مال بیچنے اور سچ کہنے کے لئے خون خرابہ میں رکھتا تھا۔

دوسری طرف اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا، اور گناہگاروں کو خرقہ پہناتے اور ان سے توبہ کراتے تھے اور اپنی مریدی میں قبول کرتے تھے، اور خاص و عام، غریب و دولت مند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل شریف و رذیل، شہری اور دیہاتی، غازی و مجاہد، آزاد و غلام، سب کو طاقیہ، توبہ اور پاکی کی تعلیم دیتے تھے اور یہ تمام لوگ چونکہ اپنے کو شیخ کا مرید سمجھتے تھے، بہت سے گناہوں سے باز آتے تھے، اور اگر شیخ کے کسی مرید سے لغزش ہو جاتی بھی تو پھر از سر نو بیعت کر لیتے، اور توبہ کا خرقہ عطا کرتے تھے اور شیخ کی مریدی کی شرم تمام لوگوں کو بہت سی ظاہری و باطنی برائیوں سے روک دیتی تھی اور عام طور پر لوگ تقلید و اعتقاد کی وجہ سے عبادت کیطرف رغبت کرتے تھے، مرد و عورت بوڑھے، جوان، بازاری، عامی، غلام اور نوکر سب کے سب نماز ادا کرتے تھے،

اور زیادہ تر مرید چاشت و اشراق کے پابند ہو گئے تھے آزاد اور نیک کام کرنیوالوں نے شہر سے غیاث پور تک چند تفریحی مقامات پر چبوترے قائم کر دیئے تھے، چھپر ڈال دیئے تھے، کنویں کھدوا دیئے تھے، پانی سے بھرے ہوئے گھڑے اور مٹی کے لوٹے رکھوا دیئے تھے، چٹائیاں بچھوا دی تھیں، ہر چبوترہ اور ہر چھپر میں ایک چوکیدار اور ایک ملازم مقرر کر دیا تھا، تاکہ مرید اور توبہ کرنے والے نیک لوگوں کو شیخ کے آستانے تک آنے جانے میں نماز ادا کرنے کے وقت وضو کرنے کے لیے کوئی تردد نہ ہو اور چبوترہ اور چھپر میں نفل پڑھنے والے نمازیوں کا ہجوم دیکھا جاتا تھا، ارتکاب گناہ لوگوں کے درمیان کم ہو گیا تھا، اور اکثر آدمیوں کے درمیان چاشت، اشراق، اوابین، تہجد اور زوال کے وقت رکعات نماز کی تحقیقات زیادہ تھی کہ ان نوافل میں ہر وقت کتنی رکعتیں ادا کرتے ہیں اور ہر رکعت میں کلام پاک کی کون سی سورۃ اور کون سی آیت پڑھتے ہیں ..... پنجگانہ نمازوں اور ہر نفل سے فارغ ہونے کے بعد کون کون سی دعائیں آتی ہیں۔ اکثر نئے مرید شیخ کے قدیم مریدوں سے غیاث پور کی آمد و رفت کے وقت پوچھتے تھے کہ شیخ رات کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں اور ہر رکعت میں کیا پڑھتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنی بار درود بھیجتے ہیں، اور شیخ فرید اور شیخ بختیار رات دن میں کتنی بار درود بھیجتے تھے اور کتنی بار سورۃ اخلاص پڑھتے تھے، نئے مرید شیخ کے قدیم مریدوں سے اسی قسم کے سوالات کرتے تھے، روزے، نوافل اور تقلیل طعام کے متعلق پوچھتے تھے، اس نیک زمانہ میں اکثر آدمیوں کو حفظ قرآن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، نئے مرید شیخ کے پرانے مریدوں کی صحبت میں رہتے تھے، پرانے مریدوں کو اطاعت، عبادت،

تزک تعلق، تصوف، کی کتابوں کے پڑھنے، مشائخ کے اوصاف حمیدہ اور ان کے معاملات کے بیان کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا، دنیا اور دنیاداروں کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا تھا، کسی دنیادار کے گھر کی طرف اپنا رخ نہیں کرتے تھے، دنیا اور اہل دنیا کے میل جول کی حکایت نہیں سنتے تھے اور اس کو عیب اور گناہ جانتے تھے ــــ کثرت نوافل اور اسکی پابندی کا معاملہ اس بابرکت زمانہ میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ بادشاہ نے محل میں بہت سے امراء، سلاحدار، لشکری، شاہی نوکر، شیخ کے مرید ہوتے تھے اور چاشت و اشراق کی نمازیں ادا کرتے تھے، ایام بیض اور عشرہ ذی الحجہ کے روزے رکھتے تھے اور کوئی محلہ ایسا نہیں تھا جس میں ایک مہینہ بیس دن کے بعد صلحا کا اجتماع نہیں ہوتا تھا، اور صوفیوں کی محفل سماع نہیں ہوتی تھی اور باہم گریہ وزاری نہیں کرتے تھے۔ شیخ کے چند مرید تراویح کی نمازیں مسجدوں اور گھروں میں ختم قرآن کرتے، وہ لوگ جو مستقیم الحال ہو چکے تھے، رمضان، جمعہ اور تہواروں کی راتوں میں قیام کرتے اور صبح تک بیدار رہتے، پلک کو پلک سے نہیں لگنے دیتے، شیخ کے مریدوں میں سے بڑے درجہ کے مرید تمام سال رات کے ایک یا دو تہائی حصے تہجد کی نماز میں گذارتے، بعض عباد تگذار عشا کی نماز کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے، شیخ کے مریدوں میں سے چند آدمیوں کو میں جانتا ہوں کہ شیخ کے فیض نظر سے صاحب کشف و کرامات ہو گئے تھے، شیخ کے مبارک وجود، ان کے انفاس کی برکت، ان کی مقبول دعاؤں کی وجہ سے اس ملک کے اکثر مسلمان عبادت، تصوف اور زہد کیطرف مائل اور شیخ کی ارادت کی طرف راغب ہو گئے تھے ــ سلطان علاء الدین اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہو گیا تھا، خواص و عوام کے دلوں نے نیکی اختیار کر لی تھی، عہد علائی کے چند آخری سالوں میں شراب، معشوق، فسق و

فجور، جوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پاتا، بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خواری اور زخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہو سکتے تھے، بازار والوں سے جھوٹ بولنے، کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا، اکثر طالبعلموں اور بڑے بڑے لوگوں کی رغبت جو شیخ کی خدمت میں رہتے تھے، تصوف اور احکام طریقت کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف ہو گئی تھی، قوت القلوب، احیاء العلوم ترجمہ احیاء العلوم، عوارف، کشف المحجوب، شرح تعرف، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، لوائح ولوامح قاضی حمید الدین ناگوری، فوائد الفواد، میر حسن سجزی کے بہت سے خریدار پیدا ہو گئے تھے، زیادہ تر لوگ، کتب فروشوں سے سلوک وحقائق کی کتابوں کے بارے میں دریافت کرتے تھے، کوئی پگڑی ایسی نہ تھی جس میں مسواک اور کنگھی لٹکی نظر نہ آتی تھی، صوفیوں کی کثرت خریداری کی وجہ سے لوٹے اور چرمی طشت گراں ہو گئے تھے، حاصل کلام یہ کہ خداوند تعالیٰ نے شیخ نظام الدینؒ کو پچھلی صدی میں شیخ جنیدؒ اور شیخ بایزیدؒ کے مثل پیدا کیا تھا۔"[1]

عشق کا "روز بازار"

توبہ، تجدید ایمان اور اصلاح حال کے اس عام ذوق ورجحان کے علاوہ جس سے دہلی کا کوچہ کوچہ متاثر ہو رہا تھا اور ایوان شاہی اور "بام ہزار ستون" تک اس کی لہریں پہنچی تھیں، ایک نئی تبدیلی یہ تھی کہ دماغی نخوت اور قلبی افسردگی کی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی ص ۴۶ و ص ۳۴۱

اس دنیا میں جہاں نلے ونوش اور "لعیش کوش" کے سوا عرصہ سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی، جذبۂ الٰہی کی ایک ہوا چلنے لگی اور عشق کا سودا عام ہوگیا، ہر جگہ درد و محبت کا تذکرہ، حقیقت و معرفت کی باتیں اور عارفانہ و عاشقانہ اشعار کی گونج تھی۔ امیر خورد مصنف سیر الاولیاء نے خوب لکھا ہے:-

کار محبت و عشق را رونق بازارے	محبت و عشق کے کاروبار کا زمانہ
در جہاں پیدا آمدے ..... و خلق	میں ایک بازار لگ گیا، لوگوں کو
را در آں زماں راحت جز حکایت	سماع کی حکایات، سننے، اخلاص و
سماع و اخلاص و نیازمندی و شفقت	دنیا زمندی، شفقت و نرمی، دلجوئی
و لینت و دل دریافتن و سر در زیر	اور اہل دل کے قدموں پہ سر رکھ دینے
پائے اہل دلان نہادن کارے دیگر	کے علاوہ کسی اور بات سے راحت
نبودے[1]	نہیں حاصل ہوتی تھی۔

خلفاء کی تربیت

اس سلسلۂ ارشاد و تربیت اور طریقۂ عشق و محبت کو ہندوستان میں دور دور تک پھیلانے اور دیر تک قائم رکھنے کے لئے آپ نے اپنے عالی استعداد، سراپا اخلاص خلفاء کا بڑا اہتمام فرمایا، ان میں وہ سب اوصاف و کمالات پیدا کرنے کی کوشش فرمائی جو مشائخ کاملین کے لئے ضروری ہیں، ان سے مجاہدات کرائے، ان کے قلوب کی نگرانی کی، ان میں جو اعلیٰ استعداد رکھتے تھے، لیکن زیور علم سے عاری تھے اُن کی تعلیم و تکمیل کا بندوبست کیا، ان میں سے جن کے دلوں سے ابھی تک بحث و مناظرے کا نشہ نہیں گیا تھا، ان کی اصلاح فرمائی، جو خلق خدا کی رہنمائی اور اجتماعی زندگی کے اہل تھے، لیکن انھیں گوشہ نشینی، عزلت گزینی

---

[1] سیر الاولیاء، صـ۳۰۶

اور انفرادی عبادات و مجاہدات کا ذوق تھا، ان کو اجتماعی زندگی اختیار کرنے اور "خلق خدا کی جفا وقفا" کو برداشت کرنے پر مجبور کیا، اصلاح و تربیت کا جو عالمگیر کام آپ کے پیش نظر تھا اور اپنے خواص اصحاب سے دین کی دعوت کا جو کام لینا تھا اس میں جو چیز حارج اور مزاحم نظر آئی آپ نے اسکو ترک کر دیا۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ ایک من بلند حیثیت کے دوستوں اور خدام نے جن کا وطنی تعلق اودھ سے تھا آپس میں طے کیا کہ سلطان المشائخ سے پڑھنے پڑھانے اور بحث و مذاکرہ کرنے کی اجازت طلب کریں، اگرچہ ان دوستوں میں سے ہر ایک عالم متبحر تھا لیکن سلطان المشائخ کے فیض صحبت سے یاد حق میں مشغول تھا، مگر جس کام میں عمر گذاری تھی اس کا شوق بالآخر اس کا محرک ہوا۔ مولانا جلال الدین کو لوگوں نے آگے کیا اور خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت سلطان المشائخ پر یاد الٰہی کی ایسی کچھ تجلی تھی کہ لوگوں کو بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مولانا جلال الدین کو کچھ جرأت تھی، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر اجازت ہو تو احباب کسی وقت بحث کر لیا کریں؛ سلطان المشائخ سمجھ گئے کہ یہ ان سب علماء کا عندیہ ہے اور مولانا جلال الدین ان کے نمائندہ ہیں۔ فرمایا کہ:۔ میں کیا کروں مجھے تو ان سے تو دوسرا ہی کام لینا مقصود ہے۔[1]

مولانا سید نصیر الدین محمود جو بعد میں حضرت خواجہؒ کے خلیفہ اعظم اور اصل جانشین ہوئے اور چراغ دہلی کے نام سے ان کا نام تمام دنیا میں روشن ہے، اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ وہ کسی جنگل یا پہاڑ پر بیٹھ کر خدا کی یاد کریں۔ انھوں نے ایک دن امیر خسرو کو واسطہ بنایا اور کہلوایا کہ یہ ناچیز اودھ میں رہتا ہے، خلق کے ہجوم سے اپنی مشغولیت میں فرق پڑتا ہے اگر اجازت ہو تو میں کسی صحرا یا پہاڑ پر رہ کر فراغ خاطر کے ساتھ خدا کی عبادت کروں۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۰۶

امیر خسرو نے جب یہ پیغام عرض کیا تو ارشاد ہوا:۔

او را بگو ترا درمیان خلق می باید بود	اُن سے کہہ دو کہ تمکو مخلوق ہی کے درمیان
وجفا و قضائے خلق می باید کشید	رہنا ہوگا، اور مخلوق کی بے مروتی اور
و مکافات آں ببذل و ایثار و عطا	بے رخی کو برداشت کرنا ہوگا! اور اس
می باید کرد[1]	کا بدلہ سخاوت و ایثار سے دینا ہوگا۔

مولانا حسام الدین ملتانی نے خلافت کے بعد عرض کیا کہ:۔ اگر اجازت ہو تو شہر چھوڑ دوں اور کسی چشمہ کے کنارے سکونت اختیار کروں، اس لئے کہ شہر میں کنوؤں کا پانی ملتا ہے اور اس سے وضو کرنے میں دل کو اطمینان نہیں ہوتا[2]؛ ارشاد ہوا کہ نہیں شہر ہی میں رہو اور ایک عام آدمی کی طرح رہو سہو، نفس چاہتا ہے کہ تم کو ایک آرام کی جگہ لیجائے اور ایسی جگہ رکھے کہ تمہیں جمعیت خاطر نصیب نہ ہو، جب تم شہر سے باہر چلے جاؤ گے اور کسی چشمہ کے کنارے سکونت اختیار کروگے تو پردیسی اور شہری تمہارا سراغ لگا کر پہنچیں گے اور مشہور ہوگا کہ فلاں درویش فلاں جگہ مقیم ہے اور پھر تمہارا وقت خراب کرے گا، اس کے علاوہ کنویں کے پانی میں علماء کا اختلاف ہے اور شریعت نے اس میں وسعت دی ہے۔

چشتی خانقاہیں

اللہ تعالےٰ نے حضرت خواجہ کو بڑے جلیل القدر خلفاء عطا فرمائے تھے جن میں سے حسب ذیل خاص طور پر مشہور و ممتاز ہوئے:۔

(۱) مولانا شمس الدین یحییٰ	(۲) شیخ نصیر الدین محمود
(۳) شیخ قطب الدین منور ہانسوی	(۴) شیخ حسام الدین ملتانی
(۵) مولانا فخر الدین زرادی	(۶) مولانا علاء الدین نیلی

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۳۷ [2] پانی بھرنے والوں کی بے احتیاطی کی وجہ سے اور کسی چیز کے گرنے پڑنے کے خیال سے۔

(۷) مولانا برہان الدین غریب؛ (۸) مولانا یوسف چندیری

(۹) مولانا سراج الدین اخی سراج (۱۰) مولانا شہاب الدین

مریدین بااختصاص

(۱) خواجہ ابوبکر (۲) مولانا محی الدین کاشانی

(۳) مولانا وجیہ الدین پاٹلی (۴) مولانا فخر الدین مروزی

(۵) مولانا فصیح الدین (۶) امیر خسرو

(۷) مولانا جلال الدین (۸) خواجہ کریم الدین سمرقندی

(۹) امیر حسن علا سنجری (۱۰) قاضی شرف الدین

(۱۱) مولانا بہار الدین ادہمی (۱۲) شیخ مبارک گوپاموی

(۱۳) خواجہ موید الدین کردی (۱۴) خواجہ تاج الدین داوری

(۱۵) خواجہ ضیاء الدین برنی (۱۶) خواجہ موید الدین انصاری

(۱۷) خواجہ شمس الدین خواہر زادہ (۱۸) مولانا نظام الدین شیرازی

(۱۹) خواجہ سالار (۲۰) مولانا فخر الدین میرٹھی

ان میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو آپ نے خلافت خاص عطا فرمائی اور اپنا جانشین بنایا۔ وہ اپنے شیخ کے قدم بقدم تھے، انھوں نے نہایت نامساعد حالات اور سخت سیاسی طوفانوں میں رشد و ہدایت کا یہ چراغ روشن رکھا۔ بقول شاعر ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن، چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

فیروز تغلق کی تخت نشینی اور اس سے ہندوستان کو جو فیوض و برکات پہنچے اُس میں حضرت سید نصیر الدین ہی کا ہاتھ تھا، پورے تیئیس[۳۲] سال تک انھوں نے سلسلہ چشتیہ کا مرکزی نظام دار الحکومت دہلی میں بیٹھ کر کامیابی کیساتھ چلایا، پھر اس چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوا، جس نے جنوبی ہند ہی نہیں سارے ہندوستان کو عشق و محبت کی حرارت سے گرم اور اس کی خوشبو سے مُعطّر کر دیا، یعنی حضرت سید محمد گیسو دراز[۲] مدفون گلبرگہ (م ۸۲۵ھ) جن کے متعلق کسی صاحب نظر نے کہا ہے ؎

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کے دوسرے خلیفہ علامہ کمال الدین (م ۷۵۶ھ) تھے، جن کی اولاد اور خلفاء نے اس سلسلہ کو اس صدی تک آب و تاب کیساتھ قائم رکھا، اس سلسلہ میں حضرت یحییٰ مدنی، شاہ کلیم اللہ جہان آبادی، مولانا شاہ فخر الدین دہلوی، خواجہ نور محمد مہاروی شاہ نیاز احمد بریلوی اور خواجہ سلیمان تونسوی جیسے اکابر روزگار گذرے، جنھوں نے عشق الٰہی کا بازار گرم رکھا، اور لاکھوں بندگانِ خدا کے دلوں میں محبت الٰہی اور خدا طلبی کی آگ بھڑکا دی[۳]۔

حضرت چراغ دہلی کے خلفاء میں شیخ عبد المقتدر کندی، شیخ احمد تھانیسری اور شیخ جلال الدین حسین بخاری معروف بمخدوم جہانیاں جہاں گشت خاص طور پر قابل ذکر ہیں — ان میں ہر ایک شیخ وقت اور مرجع خلائق تھا۔

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی، از سراج عفیف۔

[۲] حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کے حالات و کمالات کیلئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

[۳] ان بزرگوں کے مفصل حالات کیلئے ملاحظہ ہو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

دہلی کی مرکزی خانقاہ کے بعد جس کے مسند ارشاد پر یکے بعد دیگرے دو شیخ اجل حضرت خواجہ نظام الدینؒ اور حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ متمکن رہے:۔ ہندوستان کے مختلف مقامات پنڈوہ، لکھنوتی، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، زین آباد، مانڈو، احمد آباد، صفی پور، مانک پور، سلون میں چشتی خانقاہیں قائم ہوئیں، جنھوں نے صدیوں تک چراغ سے چراغ روشن رکھا اور عشق و محبت، صدق و اخلاص، علو ہمت و عزیمت، خدمت خلق، ایثار و قربانی، بذل و عطا، فقر و زہد، علم و معرفت کی شمع روشن رکھی، اور ہندوستان کی فضا کو جس پر پے در پے مادیت اور غفلت کے حملے ہوتے رہے اور کسی وقت ایسا محسوس ہوا کہ سارا ملک تنکے کی طرح غفلت و تعیش کے سیلاب میں بہ جائے گا اور متاع درد جس کشتی میں ہے وہ بھی غرق ہو جائے گی، لیکن ان سوختہ سامانوں اور سوختہ دلوں نے اس متاع کی حفاظت کی اور یہ آگ کہیں نہ کہیں سلگتی رہی، ان میں ہر خانقاہ اور اسکے دینی و اصلاحی کارناموں کیلئے ایک مستقل ضخیم کتاب درکار ہے، خاص طور پر بنگال میں شیخ علاء الحق پنڈوی[1]، حضرت نور قطب عالم پنڈوی[2]

---

[1] شیخ علاء الدین علاء الحق پنڈوی کا اصل نام عمری، آپ کے والد اسعد لاہوری بنگال میں منصب وزارت پر فائز تھے۔ شیخ علاء الحق حضرت محبوب الٰہی کے مشہور خلیفہ مولانا سراج الدین عثمانی اودی معروف بہ اخی سراج (۷۵۸ھ) کے خلیفہ اور پنڈوہ کی مشہور عالم چشتی خانقاہ کے بانی ہیں۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی (م ۸۰۸ھ) آپ ہی کے خلیفہ ہیں۔ ۸۰۰ھ میں وفات پائی۔

[2] نور الدین احمد نام، نور الحق اور قطب عالم لقب، اپنے والد شیخ علاء الحق پنڈوی کے خلیفہ و جانشین تھے، اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت و مرجعیت عطا فرمائی، آپ کے زمانہ میں پنڈوہ کی خانقاہ ہندوستان کی سب سے بڑی خانقاہ تھی۔ مجاہدات، خدمت خلق اور بے نفسی و خود شکنی اور علوم و حقائق میں مرتبۂ عالی رکھتے تھے۔ خلفاء میں حضرت شیخ حسام الدین حسام الحق مانکپوری (م ۸۵۳ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کی ذات سے بہار اور اودھ میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی بڑی اشاعت ہوئی۔

۸۱۸ھ میں وفات پائی، تصنیفات میں "مونس الفقراء" "انیس الغرباء" اور مکاتیب کا مجموعہ یادگار ہے۔ ملفوظات و مکتوبات میں غضب کی سادگی اور تاثیر ہے۔ (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۳)

دکن میں شیخ برہان الدین غریب اُن کے خلفاء ہیں شیخ زین الدین، شیخ یعقوب، شیخ کمال الدین ناگوری فتنی، پھر ان کے خلیفہ قطب عالم عبداللہ بن محمود بن الحسین (م ۸۵۷) اور ان کے فرزند و خلیفہ شاہ عالم گجراتی نے بوریائے فقر پر بیٹھ کر اپنے اپنے زمانہ میں بادشاہی کی ہے۔

مالوہ میں شیخ وجیہ الدین یوسف، شیخ کمال الدین، مولانا مغیث الدین وغیرہ اودھ میں حضرت شیخ محمد بینا لکھنوی، شیخ سعد الدین قدوائی خیرآبادی، شیخ عبد الصمد عرف صفی الدین صفی پوری، شیخ حسام الحق مانک پوری، شیخ عبد الکریم مانک پوری اور شاہ پیر محمد سلونی اور شاہ پیر محمد لکھنوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، یہ سب سلسلۂ نظامیہ کے شیوخ کبار ہیں جنھوں نے اپنی اپنی جگہ ارشاد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا۔ ان سے فیض پانے والوں کی تعداد کو خدا کے سوا کوئی شمار نہیں کر سکتا۔

ان خالص چشتی خانقاہوں کے علاوہ ہندوستان میں جابجا ایسی نامور خانقاہیں بھی قائم تھیں جن کے مشائخ کبار اور بانیانِ سلسلہ کو سلسلۂ نظامیہ کے مشائخ چشت سے نسبتِ خاص اور اجازتِ عام حاصل تھی اور وہ چشتی ذوق اور نسبت کے حامل تھے، ان میں سے جونپور کی خانقاہ رشیدی اور پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ خانقاہ رشیدی کے بانی حضرت علامہ محمد رشید جونپوری (م ۱۰۸۳ھ) کو اپنے شیخ طیب بنارسی اور سید احمد الحکیم حسینی مانکپوری سے سلسلۂ حسینیہ نظامیہ میں اجازت حاصل تھی، خانقاہ مجیبی کے بانی تاج العارفین حضرت شاہ محمد مجیب اللہ قادری پھلواروی (م ۱۱۹۱ھ) کو سلسلہ چشتیہ نظامیہ اپنے پیر بیعت حضرت خواجہ عماد الدین قلندر اور حضرت شاہ معین الدین کرجوی کے واسطہ سے پہونچا ہے۔ شاہ معین الدین کرجوی حضرت شیخ پیر محمد سلونی کے خلیفہ تھے۔

آخر میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ذات سلسلہ نظامیہ وصابریہ اور ان کی خصوصیتوں

اور برکتوں کی جامع تھی۔ حضرت حاجی صاحب کو سلسلہ نظامیہ سے نسبت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے طریق سے حاصل تھی، جن کو حضرت درویش بن محمد قاسم اودھی سے سلسلہ نظامیہ میں اجازت تھی۔ حضرت درویش کو تین طریقوں سے سلسلۂ نظامیہ پہونچا تھا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرۃ الرشید" ج ۲ (صفحہ ۱۰۶)

باب ہفتم

حضرت خواجہؒ کی تعلیم و تربیت کے اثرات
آپ کے خلفاء کی دینی و اصلاحی خدمات

حضرت سلطان المشائخ نے اپنے خلفاء اور مریدین کی بڑے اہتمام اور توجہ سے تربیت فرمائی تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی کے امراء دربار اور ارکان سلطنت میں سے ایک بڑے عہدہ دار خواجہ مؤید الدین تھے، ان کو حضرت خواجہؒ سے تعلق پیدا ہوگیا، اور یہ تعلق اتنا بڑھا کہ اُن کی طبیعت "سرکار دربار" سے اُچاٹ ہوگئی اور وہ حضرت خواجہؒ کی خدمت میں رہ پڑے۔ سلطان ان کا بڑا قدردان تھا اور اُن کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ اس نے ایک حاجب کے ذریعہ حضرت خواجہؒ سے شکایت کی اور کہا کہ: حضرت ہر ایک کو اپنا جیسا بنا چاہتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے جواب میں فرمایا کہ بادشاہ اپنے جیسا کیا، اپنے سے بہتر[1]۔

حضرت خواجہؒ کی صحبت و تربیت سے صرف عبادت و ریاضت کا ذوق اور اپنی اصلاح و ترقی ہی کی فکر نہیں پیدا ہوگئی تھی، بلکہ دعوت و تبلیغ کا جذبہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی ہمت اور حوصلہ،

---

[1] سیر الاولیاء (صفحہ ۳۱۱)

سلاطینِ وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت اور بے خوفی و شجاعت بھی پیدا ہوگئی تھی، اور یہ خدا کے نام اور مردانِ خدا کی صحبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس دل میں اللہ کا خوف سما جائے گا اُس دل سے غیر اللہ کا خوف قدرتی طور پر نکل جائیگا اور جو دل طمع دنیا سے آزاد ہوجائے گا اُس پر کسی کا رعب اور اس کو کسی سے ہراس نہیں ہوسکتا، جس پر خالق کی عظمت اور مخلوق کی صحیح حیثیت کا انکشاف ہوگیا، وہ سلاطین عالم کے کروفر، ان کے دربار دل کے تزک و احتشام اور اُن کے غلاموں اور افسروں کی صف بندیوں اور "زنگاہ روبرد" اور "دوربا ش" کو بچوں کے کھیل اور گڑیوں کے گھروندوں سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتا اور جاہ و جلال کی کسی نمائش پر کلمۂ حق کہنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتا، یہی توحید و تجرید کا طبعی نتیجہ، حقیقی تصوف کا خاصہ اور مردانِ خدا اور درویشانِ کامل کا شیوہ ہے ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسد اللّٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت خواجہؒ کے تربیت یافتہ خدام و مریدین نے اس "اسد اللّٰہی" اور اس حق گوئی و بیباکی کے ایسے نمونے پیش کئے جن کی نظیر ملنی آسان نہیں۔

سلاطینِ وقت سے بے رعبی اور حق گوئی کے نمونے

سلطان محمد تغلق کے شوکت و جبروت سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ سلطان کا ایک مرتبہ ہانسی کے پاس سے گزر ہوا، وہاں سے چار کوس کے فاصلہ پر نسبی مقام میں خیمہ شاہی و خرگاہ نصیب ہوا، سلطان نے مخلص الملک نظام الدین مدر باری کو جو اپنے ظلم و قساوت میں اس زمانہ میں مشہور تھا ہانسی کے حصار کے معائنہ کے لئے بھیجا، وہ جب حضرت شیخ قطب الدین منور (برادر اکبر حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی و خلیفہ حضرت سلطان المشائخ) کے مکان کے پاس پہنچا تو دریافت کیا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ لوگوں نے کہا شیخ قطب الدین منور کا جو حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ ہیں

کہا کہ عجیب بات ہے کہ بادشاہ اس جوار میں آئے اور شیخ اُسکے سلام کو حاضر نہ ہوں؛ مخلص الملک نے واپسی پر سب کیفیت عرض کی اور یہ بھی کہا کہ سلطان المشائخ کے ہانسی میں ایک خلیفہ ہیں جو جہاں پناہ کے سلام کیلئے حاضر نہیں ہوئے۔ بادشاہ کو یہ سنکر غصہ آیا، اُسی وقت حسن سربرہنہ کو جو ایک، بڑا مغرور وجاہ پسند شخص تھا شیخ قطب الدین کو لانے کے لئے بھیجا، حسن سربرہنہ جب مکان کے قریب پہنچا تو تنہا پیادہ پا شیخ کی دہلیز میں آکر عاجزانہ طریقے پر بیٹھ گیا۔ شیخ نے بلایا حسن نے جاکر عرض کیا کہ آپ کی بادشاہ کے یہاں طلبی ہے۔ فرمایا کہ اس میں مجھے کچھ اختیار ہے یا نہیں؟ اُس نے کہا مجھے فرمانِ سلطانی ہے کہ میں آپ کو بہرحال لے آؤں۔ شیخ نے فرمایا الحمدللہ کہ میں اپنے اختیار سے نہیں جارہا ہوں۔ پھر گھر والوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا کہ تم کو خدا کے سپرد کیا، یہ کہا اور مصلّی کاندھے پر ڈالا، لاٹھی ہاتھ میں لی اور پیادہ پا روانہ ہوگئے، حسن نے سواری کے لئے عرض کیا: فرمایا: ۔نہیں مجھ میں قوت ہے، میں پیدل چل سکتا ہوں۔ جب بنسی پہنچے تو سلطان کو خبر ہوئی، سلطان نے حکم دیا کہ دہلی چلیں۔ دہلی پہنچ کر دربارِ شاہی میں طلب کیا۔ شیخ نے فیروز شاہ سے جو اُس زمانہ میں نائب باربک تھے کہا کہ ہم فقیر لوگ ہیں بادشاہوں کی مجلس کے آداب سے واقف نہیں، جیسا آپ کا مشورہ ہو ویسا کیا جائے۔ فیروز نے جو فقیر دوست اور صحیح الاعتقاد شخص تھا کہا کہ لوگوں نے آپ کے متعلق بادشاہ کے کان بہت بھرے ہیں، اگر آپ کچھ تعظیم اور تواضع سے کام لیں تو بہتر ہے۔ ایوانِ شاہی کی دہلیز میں قدم رکھا تو امرا و ملوک اور نقیب و چاؤش دو رویہ کھڑے تھے۔ صاحبزادہ نورالدین جو ہانسی سے ہمرکاب آئے تھے، کم عمر تھے اور انھوں نے کبھی بادشاہوں کی بارگاہ نہیں دیکھی تھی، ان پر ایک ہیبت سی طاری ہوئی۔ شیخ قطب الدین منور نے ان سے پکار کر کہا کہ:

"بابا نورالدین! العظمۃ والکبریاء للہ" صاحبزادہ کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی میرے اندر ایک قوت پیدا ہوئی، سارا رعب جاتا رہا اور جو امرا و ملوک وہاں کھڑے تھے وہ مجھے بالکل بکریوں کی طرح معلوم ہونے لگے۔ جب سلطان کو یہ اندازہ ہوا کہ شیخ آرہے ہیں تو وہ کھڑا ہوگیا اور کمان ہاتھ میں لیکر تیر اندازی

میں مشغول ہوگیا۔ شیخ قریب آئے تو اُس نے خلافِ معمول تعظیم کی اور مصافحہ کیا۔ شیخ نے بہت مضبوطی سے بادشاہ کا ہاتھ پکڑا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں آپکے جوار میں پہنچا، آپ نے میری کوئی تربیت نہ فرمائی اور اپنی ملاقات سے عزت نہ بخشی؛ شیخ نے فرمایا کہ یہ درویش اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ بادشاہوں سے ملاقات کرے، ایک کونے میں پڑا ہوا بادشاہ اور اہلِ اسلام کی دعاگوئی میں مصروف ہے۔ اسکو معذور سمجھا جائے۔ بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اپنے بھائی فیروز شاہ سے کہا کہ شیخ کی جیسی مرضی ہو ویسا کرو۔ شیخ منور نے فرمایا کہ مجھ فقیر کا مقصود و مطلوب یہی ہے کہ اپنے دادا اور باپ کے گوشۂ عافیت میں واپس جائے۔ فیروز شاہ نے اس کی تعمیل کی۔ شیخ کی واپسی کے بعد بادشاہ نے ایک امیر سے کہا کہ مجھے جن بزرگوں سے مصافحہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے جس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اُس کے ہاتھ میں کپکپی تھی لیکن شیخ منور نے اتنی مضبوطی سے مصافحہ کیا کہ ان پر ذرا اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔

بادشاہ نے فیروز شاہ اور مولانا ضیاء الدین برنی کو ایک لاکھ تنکے کے ساتھ شیخ منور کی خدمت میں بھیجا شیخ نے فرمایا نعوذ باللہ کہ یہ درویش ایک لاکھ تنکہ قبول کرے۔ انھوں نے واپس آکر سلطان سے عرض کیا۔ سلطان نے کہا کہ اگر ایک لاکھ قبول نہیں کرتے تو پچاس ہزار پیش کرو۔ شیخ نے اسکو بھی قبول نہ کیا۔ سلطان نے فرمایا اگر شیخ یہ بھی قبول نہ کریں گے تو خلقت مجھے کیا کہے گی۔ یہاں تک کہ بات دو ہزار تک پہنچی۔ فیروز شاہ اور مولانا ضیاء الدین نے عرض کیا کہ اس سے کم کا ہم بادشاہ کے سامنے تذکرہ نہیں کر سکتے، شیخ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! درویش کو تو دو سیر چاول دال ایک انگ کا گھی کافی ہے، وہ ان ہزاروں روپیوں کو کیا کرے گا، بڑی کوششوں اور حیلوں سے یہ کہہ کر بادشاہ درپے آزار ہو جائے گا، آپنے دو ہزار تنکے قبول کئے اور وہ بھی اپنے برادران طریقت اور اہلِ حاجت میں تقسیم کر کے ہانسی واپس آگئے[1]۔

جس زمانہ میں سلطان محمد تغلق نے دہلی کی آبادی کو دیوگیر منتقل ہو جانے کا حکم دیا، اس زمانہ میں اس نے عزم کیا کہ ترکستان اور خراسان کو بھی اپنے قبضہ میں لائے اور چنگیز خان کی اولاد کا قلع قمع کرے[2]، اسی زمانہ میں حکم ہوا کہ دہلی اور

---

[1] تنکا یا تنکہ، اس عہد میں ہندوستان کا روپیہ تھا، اس میں ایک تولہ چاندی ہوتی تھی، یہ ترکی زبان کا لفظ ہے اسکے معنی سفید کے ہیں یعنی نقرئی سکہ۔ [2] سیر الاولیاء ص ۲۵۳ تا ص ۲۵۵

اطراف دہلی کے تمام صدور و اکابر حاضر ہوں بڑے بڑے خیمے نصب کریں، ان خیموں میں منبر رکھے جائیں اور ان منبروں پر چڑھ کر حضرات علماء تقریر کریں اور جہاد کی ترغیب دیں۔ اس روز حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے خلفاء خاص مولانا فخرالدین زرّادی، مولانا شمس الدین یحییٰ اور شیخ نصیر الدین محمود کی بھی طلبی ہوئی۔ شیخ قطب الدین دبیر[1] جو حضرت سلطان المشائخؒ کے ایک راسخ الاعتقاد مرید اور مولانا فخرالدین زرّادی کے شاگرد تھے مولانا فخرالدین کو سب سے پہلے بارگاہ سلطانی میں لائے۔ مولانا کو سلطان کی ملاقات سے بہت اجتناب تھا۔ کئی بار فرمایا کہ میں اپنے سر کو اس شخص کے دربار میں کٹا ہوا اور پڑا ہوا دیکھتا ہوں، یعنی میں کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہوں گا اور یہ شخص مجھے معاف نہیں کرے گا۔ جب مولانا سراپردۂ سلطانی میں داخل ہوئے تو شیخ قطب الدین دبیر نے مولانا کی جوتیاں اُٹھالیں اور خدمتگاروں کی طرح بغل میں لیکر کھڑے ہو گئے، سلطان نے ان سے کچھ نہیں کہا اور مولانا فخرالدین سے بات چیت میں مشغول ہو گیا۔ سلطان نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں چنگیز خاں کی اولاد کا قلع قمع کروں، آپ اس کام میں ہمارا ساتھ دیں گے؟ مولانا نے فرمایا انشاء اللہ تعالیٰ۔ سلطان نے کہا کہ یہ شک کا کلمہ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ مستقبل کے متعلق ایسا ہی کہا جاتا ہے، سلطان نے یہ سنکر پیچ و تاب کھایا اور کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجیے؟ مولانا نے فرمایا کہ غصّہ دباؤ۔ سلطان نے کہا کون سا غصّہ۔ مولانا نے فرمایا غضب سبعی (درندوں والا غصّہ)

اس پر سلطان کو ایسا غصّہ آیا کہ چہرہ پر ظاہر ہو گیا مگر کچھ کہا نہیں۔ کہا کہ کھانا لاؤ، خاصہ شاہی لگا، سلطان اور مولانا دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھا رہے تھے، مولانا ایسی ناگواری کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سلطان کے ساتھ ہم پیالہ ہونا پسند نہیں کرتے، سلطان اور زیادہ اظہارِ تعلق کیلئے ہڈی سے گوشت نکال نکال کر مولانا کے سامنے رکھتا تھا، مولانا بڑی ناگواری کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کھاتے تھے پھر دسترخوان بڑھایا گیا، اور سلطان نے مولانا کو رخصت کیا۔ رخصت کے وقت ایک اونی پوشاک اور ایک روپیہ کی تھیلی پیش کی، لیکن اس سے پہلے کہ خلعت اور کیسہ مولاناؒ کے ہاتھ میں آئے شیخ قطب الدین دبیر نے

---

[1] دبیر کا عہدہ سکریٹری کا سمجھنا چاہیئے۔ ۱۲

ہاتھ بڑھا کر اُن کو لے لیا، اُن کے رخصت ہونے کے بعد سلطان نے شیخ قطب الدین دبیر سے کہا کہ اے فریبی آدمی تو نے یہ کیا حرکت کی، پہلے فخرالدین کی جوتیاں اپنے بغل میں لیں، پھر ان کی خلعت اور کمیسہ سنبھال لیا اور اُس کو میری تلوار سے بچا لیا۔ اور بلا اپنے سر لے لی۔ شیخ قطب الدین دبیر نے کہا کہ مولانا فخرالدین میرے استاد اور میرے مرشد کے خلیفہ ہیں، اور میرے لئے مناسب تو یہ تھا کہ میں ان کی جوتیاں تعظیماً سر پر رکھتا، بغل میں لینا تو کوئی بڑی بات نہیں اور یہ خلعت و کمیسہ کیا بڑی چیز ہے؟ سلطان نے کہا کہ ان کفر آمیز عقیدوں کو چھوڑ دو ورنہ میں قتل کر دوں گا۔ اخیر وقت جب مولانا فخرالدین زرّادیؒ کا ذکر سلطان کی مجلس میں آتا تو سلطان ہاتھ مل کر کہتا کہ افسوس فخرالدین میری خون آشام تلوار سے بچ گئے۔[1]

اسلامی سلطنت کی رہنمائی و نگرانی

مشائخ چشت نے اگرچہ سلاطینِ وقت سے بے تعلق اور "سرکار و دربار" سے دُور رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کو اپنے اور اپنے پورے سلسلہ کے لئے دائمی اصول بنا دیا تھا، لیکن وہ سلاطینِ وقت کی رہنمائی و نگرانی سے غافل نہیں تھے اور جب کبھی ان کو صحیح مشورہ یا کسی بہتر انتخاب یا اپنا روحانی اثر استعمال کرنے کا موقع ملتا تو وہ اس زرّیں موقع کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ہندوستان کی مرکزی سلطنت کے متعدد فرمانروا اور صوبوں کی خود مختار سلطنتوں کے متعدد حکمراں ان مشائخ چشت سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے اور اس تعلق سے بہت سے مفاسد کا ازالہ بہت سے منکرات کا سدباب اور بہت سے احکام شریعت اور عدل گستری اور خلق پروری کا رواج ہوا۔

ہندوستان کے سلاطین میں سلطان فیروز تغلق کو اپنی حُسنِ سیرت، نیک نفسی، رعیت پروری، رحم دلی، امن پسندی، رفاہ عامہ، ازالۂ مظالم اور تبلیغِ اسلام کے ذوق، مدارس کے قیام وغیرہ میں جو امتیاز و خصوصیت حاصل تھی اس میں مشکل ہی سے ہندوستان کا کوئی دوسرا فرمانروا اس کا سہیم و شریک ہوگا۔ سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی سے اس بادشاہ کے تعمیری کارناموں اور اسکے زمانہ کی خیر و برکت، امن و امان اور سرسبزی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

[1] سیر الاولیاء، ص ۲۷۱ و ص ۲۷۳

تاریخ فرشتہ کا مصنف، لکھتا ہے:—

او بادشا ہے بود فاضل و عادل و کریم و	وہ ایک فاضل، منصف مزاج، شریف و
حلیم و رعیت و سپاہی از و راضی بودند و	مہربان، رحم دل و بردبار بادشاہ تھا، رعیت
ہیچ کس در عہدِ او یارائے ظلم نہ داشت[1]	اور فوج سب اس سے راضی تھی کسی کو اسکے

عہدِ حکومت میں ظلم کرنے کی مجال نہ تھی۔

مصنف نے اُس کے آئینِ حکومت کی تین بڑی خصوصیتیں لکھی ہیں، اُس نے کسی مسلمان یا ذمی کی سیاست[2] و تعزیر نہیں کی، انعامات، عطیوں اور تالیف قلب کی وجہ سے لوگوں کو سیاست کی ضرورت نہیں رہی۔

۲۔ خراج و محاصل کو رعایا کی استطاعت کے مطابق وصول کیا، اضافہ و توفیر کو جو سلاطینِ ماضی کا دستور تھا، موقوف کیا، رعایا کے بارے میں کسی مفسد کی شکایت کی سماعت نہیں کی، اس کی بدولت ملک آباد اور رعایا مرفہ الحال رہی۔

۳۔ حکومت کے عہدوں اور علاقوں کی صوبہ داری پر دیندار و خدا ترس لوگوں کو مامور کیا، کسی فساد انگیز و بدنفس کو عہدہ نہیں دیا۔ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے اصول کے مطابق حکام و امراء اور کارپردازانِ حکومت نے بھی اسکی پیروی کی[3]۔

لیکن بہت سے لوگوں کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ فیروز شاہ کی تخت نشینی اور اس کے انتخاب میں خواجہ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کا خاص ہاتھ[4] تھا اور اسکی فیروزمندی اور کامیابیوں میں ان کی دعاؤں اور توجہات کا بہت بڑا حصہ تھا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) صـ۲۷۸

[2] تعزیر و تعذیب کے وہ نئے نئے طریقے جو سلاطینِ سابق نے ایجاد کئے تھے۔

[3] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) صـ۲۷۱

[4] تاریخ فرشتہ صـ۲۵۹ (ج ۱)

سراج عفیف لکھتے ہیں :۔

چوں سلطان محمد دنیال طغی در ٹھٹھہ رفت
خدمت شیخ نصیر الدین را برابر خود برد، چوں
سلطان محمد در ٹھٹھہ نقل کرد و سلطان فیروز شاہ
در بادشاہی نشست، خدمت شیخ نصیر الدین
بر سلطان فیروز شاہ پیغام کردہ کہ بایں خلق عدل و
انصاف خواہی کرد یا برائے ایں مشتے مسکینان
والی دیگر از اللہ تبارک و تعالیٰ التماس کردہ
آید، سلطان فیروز جواب فرستاد کہ با بندگانِ
خدائے تعالیٰ حلم و رزم و اتفاق کنم، چوں
خدمت شیخ ایں لفظ شنید، بر سلطان فیروز
جواب فرستاد اگر با خلق ایں چنیں خلق
خواہی کرد، ما ہم برائے تو از اللہ تبارک و تعالیٰ
چہل سال ملک خواستہ ایم، عاقبت ہم چناں
شد، سلطان فیروز تا چہل سال ملک راند۔[1]

جب سلطان محمد تغلق ٹھٹھہ ملک طغی کی بغاوت
فرو کرنے گیا ہوا تھا، حضرت شیخ نصیر الدین کو
اپنے ساتھ لے گیا تھا، سلطان کا جب انتقال
ہوا اور سلطان فیروز شاہ دربار شاہی میں بیٹھا،
حضرت شیخ نصیر الدین نے فیروز شاہ کو پیغام
بھیجا کہ خدا کی اس مخلوق کیساتھ تم عدل و انصاف
کروگے یا میں ان غریبوں کیلئے اللہ سے کوئی
دوسرا حاکم مانگوں۔ سلطان فیروز نے جواب
دیا کہ "بابندگانِ خدائے تعالیٰ حلم و رزم و
اتفاق کنم"، جب حضرت شیخ نے یہ جواب سنا
تو کہلوا بھیجا کہ اگر مخلوق کیساتھ اسی طرح معاملہ
کروگے تو میں نے اللہ تعالیٰ سے تمہارے لئے
چالیس سال مانگ لئے ہیں، اور واقعہ بھی
یہی ہے کہ سلطان فیروز نے چالیس سال حکومت کی

سلطان محمد شاہ بہمنی (۷۵۹، ۷۷۶) کو تمام مشائخ دکن نے بادشاہ تسلیم کرلیا تھا اور اسکے ہاتھ پر حاضرانہ اور غائبانہ بیعت کرلی لیکن حضرت شیخ برہان الدین غریب کے خلیفہ و جانشین حضرت شیخ زین الدین (م ۸۰۱ھ)

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸

نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ بادشاہ شراب نوشی اور منہیاتِ شرعی کا مرتکب ہے اور فرمایا:۔

سزاوارِ پادشاہیِ خلق کسے ہست کو درحفظ	خلقِ خدا پر حکومت کرنے کا اہل وہ شخص
شعارِ ملّت محمدیؐ کو شیدہ سرّاً و علانیۃ	ہے جو شعائرِ اسلام کی حفاظت میں کوشش کرے
پیرامونِ مناہی نہ گردد	اور خلوت و جلوت کسی حالت میں بھی ممنوعاتِ شرعی کے قریب نہ جائے۔

۱۰۶۷ھ میں جب سلطان دولت آباد میں فاتحانہ داخل ہوا تو حضرت شیخ کو پیغام بھیجا کہ یا تو آپ میرے دربار میں حاضر ہوں یا میری خلافت کی تحریر اپنے دستِ خاص کی میرے پاس بھیجیں۔ شیخ نے اسکے جواب میں فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی تقریب سے ایک عالم، ایک سیّد اور ایک ہیجڑا کافروں کے ہاتھ پڑ گئے، انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ تینوں بُت خانہ میں جائیں، جو بت کو سجدہ کرے گا اس کی جان بخشی ہوگی اور جو انکار کرے گا وہ قتل کر دیا جائیگا، پہلے عالم کو لے گئے، انھوں نے قرآن کی رخصت پر عمل کیا[1] اور بت کا سجدہ کر کے اپنی جان بچا لی، سیّد نے عالم کی تقلید کی، جب ہیجڑے کی باری آئی اس نے کہا میری تمام زندگی ناشائستہ کاموں میں گذری، میں نہ عالم ہوں نہ سیّد کہ ان میں سے کسی فضیلت کی پناہ میں ایسا کام کروں، اس نے قتل ہو جانا منظور کر لیا اور بت کا سجدہ نہیں کیا، میرا قصہ بھی اسی ہیجڑے کے قصے سے مشابہت رکھتا ہے، میں تمھارے ہر قسم کے ظلم کو برداشت کروں گا، لیکن نہ دربار میں حاضر ہوں گا اور نہ تمھارے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ بادشاہ کو سخت غصہ آیا اور شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ نے بلا توقف اپنی جائے نماز کاندھے پر ڈالی اور شیخ برہان الدین کے مقبرے میں جا کر ان کی قبر کی پائنتی اپنی لاٹھی گاڑ دی اور جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئے اور کہا کہ اب کوئی مرد ہو تو مجھے اپنی جگہ سے ہلائے۔ بادشاہ نے شیخ کی یہ مضبوطی اور استقامت دیکھی تو پشیمان ہوا اور اپنے ہاتھ سے یہ مصرع کاغذ پر لکھ کر صدرِ شریعت کے ہاتھ بھیجا

---

[1] الا ان تتقوا منھم تقاۃ (سورہ آل عمران، رکوع ۳) مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو۔

ع "من زانِ توام تو زانِ من باش"

شیخ نے فرمایا کہ اگر سلطان محمد شاہ غازی شریعت کے طور و طریق کی حفاظت و ترویج کی کوشش کرے اور ممالکِ محروسہ سے شراب خانے یک قلم اٹھا دے، اپنے باپ کی سنت پر عمل کرے اور لوگوں کے سامنے شراب نہ پیئے اور قضاۃ و علماء و صدور کو حکم دے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں سعیٔ بلیغ سے کام لیں تو فقیر زین الدین سے بڑھ کر بادشاہ کا کوئی دوسرا دوست و خیر خواہ نہ ہوگا۔ نیچے یہ شعر اپنے قلمِ مبارک سے تحریر فرمایا ؎

تا من بزیم بجز نکوئی نہ کنم — جز نیک دلی و نیک خوئی نہ کنم
آنہا کہ بجائے ما بدیہا کردند — تا دست رسد بجز نکوئی نہ کنم

(ترجمہ) جب تک جان میں جان ہے سوائے اچھائی، نیک دلی اور نیک خوئی کے مجھ سے کچھ سرزد نہ ہوگا۔ جن لوگوں نے ہمارے ساتھ برائی کی، جب موقع ملے گا ہم ان کے ساتھ سوائے بھلائی کے کچھ نہ کرینگے)

سلطان محمد شاہ اپنے نام کے ساتھ غازی کا خطاب دیکھ کر بہت خوش ہوا اور فرمان جاری کیا کہ القاب شاہی کیساتھ اس کا بھی اضافہ کیا جائے، قبل اسکے کہ سلطان کی حضرت شیخ سے ملاقات ہو سلطان نے مرہٹ داڑہ کی حکومت مسند عالی خان محمد کے حوالہ کی اور خود بدولت گلبرگہ پہنچا اور شراب کی دکانوں کو اپنی پوری حکومت سے ختم کرکے شریعت کی ترویج و اشاعت میں اپنی کوشش مبذول کی، دکن کے چوروں و فسادیوں کو جو گروہ در گروہ مشہور تھے اور جنھوں نے رہزنی کو اپنا شیوہ بنالیا تھا ختم کرنے کا انتظام کیا، چھ سات مہینے کے اندر اندر ملک ان سے پاک ہوگیا۔ ایک روایت کے مطابق چھ مہینے کی مدت میں چوروں، رہزنوں کے بیس ہزار سر کاٹ کر اطراف و جوانب سے گلبرگہ میں لائے گئے۔ سلطان اس عرصہ میں حضرت شیخ زین الدین سے برابر خط و کتابت کرتا رہا اور اخلاص و عقیدت کی راہ و رسم بڑھاتا رہا۔ شیخ نے بھی اسکی ہمت افزائی، قدردانی اور ہدایات اور مشوروں سے دریغ نہیں کیا۔[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) از صفحہ ۵۶۰ تا صفحہ ۵۶۲، طبع پونا ۱۸۳۲ء) - ۱۲

چشتیوں کی بڑی بڑی خانقاہیں ہندوستان کے جن حصّوں اور صوبوں میں قائم ہوئیں انھوں نے وہاں کی اسلامی حکومتوں اور سلاطینِ وقت کی رہنمائی اور اسلامی حکومت کی حفاظت و تقویت سے غفلت نہیں کی، بنگال کی مشہور عالم خانقاہ جو پنڈوہ میں تھی وہاں کی اسلامی حکومت کے لئے قوت اور پشت پناہی کا ذریعہ تھی، جب وہاں سے اسلامی اقتدار ختم ہونے لگا تو ان درویشوں نے اسکی فکر کی اور اس کو دوبارہ بحال کرنے کی امکانی کوشش کی[1]۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی تاریخ مشائخِ چشت میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت نورؒ قطب عالم شیخ علاء الحق کے فرزند رشید تھے، جس زمانہ میں وہ مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز تھے، بنگال کی سیاست بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی، راجہ کنس (جو بٹھوریہ ضلع راج شاہی کا جاگیردار تھا) بنگال کے تخت پر قابض ہوگیا تھا اور مسلمانوں کی قوت کا خاتمہ کرنے پر تلا ہوا تھا، حضرت نور قطب عالم نے براہِ راست اور سیّد اشرف جہانگیر سمنانی کی وساطت سے سلطان ابراہیم شرقی کو بنگال پر حملہ کرنے کی دعوت دی، سیّد اشرف جہانگیر کے مجموعے میں وہ دلچسپ خطوط خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہیں، جن میں اس سیاسی کشمکش کی تفصیل درج ہے۔ سیّد اشرف جہانگیر نے جو خط حضرت نور قطب عالم کے مکتوب کے جواب میں لکھا وہ بنگال میں صوفیائے کرامؒ کے کارناموں پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔"[2]

ان چند واقعات سے جو تاریخ کے وسیع انبار میں سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر بغیر کسی تاریخی ترتیب کے جمع کر دیئے گئے، اندازہ ہوگا کہ مشائخ چشت کا تصوّف، محض عزلت و خلوت، نفس کشی اور ترکِ دنیا

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ریاض السّلاطین تاریخ بنگالہ تصنیف غلام حسین سلیم صـ۱۱۰ عنوان مسلّط شدن راجہ کانس زمیندار تا صـ۱۱۶ [2] تاریخ مشائخ چشت صـ۲۰۲

اور اقبال کے الفاظ میں "سربزیری اور گوسفندی و بیشی" نہیں تھا، انھوں نے اپنے اپنے دور میں زمانہ کے دھارے کو بدلنے اور حالاتِ زمانہ سے پنجہ آزمائی کی بھی کوشش کی۔ جابر سلاطین کے روبرو کلمۂ حق کہنے، اُن کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرنے اور ان کو صلاح و مشورہ دینے سے بھی پس و پیش نہیں کیا، اور جب کبھی اُن کے اولوالعزم مشائخؒ کو موقع ملا انھوں نے اصلاح و انقلاب کی کوششوں سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اشاعتِ اسلام

سلسلہ چشتیہ کی بنیاد ہندوستان میں پہلے ہی دن سے اشاعت و تبلیغِ اسلام پر پڑی تھی اور اس کے عالی مرتبت بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھ پر اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے کہ تاریخ کے اس اندھیرے میں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کی یہ کثرت بہت کچھ حضرت خواجہؒ کی کوششوں اور روحانیت کی رہینِ منت ہے، ان میں سے ایک بڑی تعداد حضرت خواجہؒ کی روحانی قوت، اشراقی کمال اور عند اللہ مقبولیت کے واقعات سے مسلمان ہوئی، اسوقت تک ہندوستان جوگ و اشراقیت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے بہت سے فقیر و سنیاسی اشراقی اور قلبی قوت میں بڑا کمال رکھتے تھے، ریاضیاتِ شاقہ اور مختلف مشقوں سے انھوں نے کشف و تصرف کی بڑی قوت بڑھا رکھی تھی، اُن میں بہت سے لوگ اس نووارد مسلمان فقیر کے امتحان اور اُسکو زک دینے کے لئے اُس کے پاس آئے، لیکن ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ غریب الوطن درویش اُن سے اپنی قلبی قوت اور اشراقیت میں بڑھا ہوا ہے اور ساحرینِ فرعون کی طرح ان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اُس کے کمالات اور قوتوں کا منبع اور سرچشمہ کچھ اور ہے، اسی کے ساتھ اُن کے اخلاق کی پاکیزگی، صاف ستھری زاہدانہ اور بے طمع زندگی، ایمان و یقین کی قوت، خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی اور بلاتفریق مذہب و ملت انسان سے محبت اور انسانیت کا احترام دیکھ کر مخالفین بھی معتقد اور دشمن بھی دوست ہو گئے۔ تذکرہ و تصوف کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جوگیوں و سنیاسیوں کے ساتھ مقابلہ اور حضرت خواجہؒ کی اشراقی قوت اور کشف و تصرفات کے جو واقعات کثرت کیساتھ نقل کئے گئے ہیں، اگرچہ ان کو تاریخی سند سے اور قدیم تر معاصر مآخذ کے ذریعہ ثابت کرنا مشکل ہے لیکن ہندوستان کے

اُس وقت کے ذوق و رجحان اور اجمیر کی دینی و روحانی مرکزیت کو دیکھتے ہوئے یہ واقعات خلافِ قیاس نہیں، دراصل جس چیز نے حضرت خواجہؒ کا گرویدہ اور اسلام کا حلقہ بگوش بنایا وہ تنہا ان کی قلبی قوت تھی، بلکہ ان کی روحانیت، اخلاص، اخلاق اور اُن کا وہ طرزِ زندگی تھا جس کا ہندوستان کے اہلِ فن اور عوام نے اس سے پہلے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔

خواجہ بزرگؒ کے اہلِ سلسلہ میں سے حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی کوششوں اور توجہات کو اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی مجالس اور خانقاہ میں ہر مذہب و ملت کے آدمی اور ہر طبقہ کے لوگ آتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں:۔

بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین ازہر جنس درویش وغیرآں برسید۔[1]	حضرت خواجہ فریدالدینؒ کی خدمت میں ہر صنف و نوع کے لوگ درویش وغیر درویش پہنچتے تھے۔

حضرت خواجہؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو عالی استعداد قلبی قوت عطا فرمائی تھی اسکے پیشِ نظر بعید نہیں کہ اشاعتِ اسلام میں وہ بھی معین ہوئی ہو اور نومسلموں کی بہت بڑی تعداد ان کی روحانیت اور کشف و کرامات دیکھکر مسلمان ہوئی ہو۔ پنجاب اور پاک پٹن کے اطراف میں بہت سی مسلمان برادریاں اور خاندان اپنے اسلاف کے قبولِ اسلام کو حضرت خواجہؒ کی توجہ اور تبلیغ کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اپنی نسبت اُن کی طرف کرتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں لکھتا ہے:۔

"پنجاب کے مغربی صوبوں کے باشندوں نے خواجہ بہاءالحق ملتانی اور بابا فرید پاک پٹنی کی تعلیم سے اسلام قبول کیا۔ یہ دونوں بزرگ تیرھویں صدی عیسوی کے قریب خاتمہ اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں گذرے ہیں۔ بابا فرید شکر گنج" کا تذکرہ جس مصنف نے

---

[1] فوائدالفواد ص۵

لکھا ہے، اس نے تحریر کیا ہے کہ سولہ قوموں کو انھوں نے تعلیم و تلقین سے مشرف باسلام کیا۔ لیکن افسوس ہے اس مصنف نے ان قوموں کے مسلمان ہونے کا مفصل حال نہیں لکھا[1]

حضرت خواجہ نظام الدینؒ کو اہلِ ہند میں اشاعت اسلام سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ محض تقریر اور کہنے سننے سے کسی شخص کا اپنے قدیم عقیدے سے ہٹنا اور نئے دین کو قبول کر لینا، بالخصوص ہندو قوم کا جو اپنی پختگی، قدامت پرستی اور ذات پات اور چھوت چھات کی پابندی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، محض حسنِ تقریر اور وعظ و نصیحت سے مسلمان کر لینا آسان نہیں، اس کے لئے اُن کے لئے موثر و طویل صحبت کی ضرورت تھی۔

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک غلام جو مسلمان تھا حضرت کی مجلسِ مبارک میں حاضر ہوا اور اپنے ایک ہندو دوست کو اپنے ساتھ لایا اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ حضرت خواجہؒ نے اس غلام سے فرمایا کہ: تمہارا یہ بھائی کچھ اسلام کی طرف بھی میلان رکھتا ہے؟ غلام نے عرض کیا کہ: اس کو حضرت کے قدموں میں اسی لئے لایا ہوں کہ آپ کی نظرِ کیمیا اثر کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے۔ یہ سنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرمایا کہ کسی کے کہنے سننے سے اس قوم کا دل نہیں پھرتا۔ ہاں اگر اسکو کسی نیک بندے کی صحبت میسر آ جائے تو امید ہوتی ہے کہ اس کی صحبت کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے[2]۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پچاس برس کے عرصہ میں جس میں حضرت خواجہ نظام الدینؒ دہلی جیسے مرکزی مقام میں مسندِ ہدایت و ارشاد پر متمکن رہے اور ان کی خانقاہ کا دروازہ ہر انسان کیلئے کھلا رہا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے مختلف ضرورتوں اور تقریبوں سے لاکھوں کی تعداد میں غیر مسلم آتے تھے اور اپنی خوش اعتقادی کی بنا پر حضرت خواجہؒ کی زیارت کو بھی حاضر ہوتے تھے، بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ میوات کا علاقہ جو حضرت خواجہؒ کے مرکز غیاث پور سے جانبِ جنوب متصلاً واقع ہے اور

---

[1] دعوت اسلام، ترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی صفحہ ۲۹۷ [2] فوائد الفواد صفحہ ۱۸۲

جہاں کے رہنے والوں کی رہزنی اور شورہ پشتی کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں شہر پناہ دہلی کے دروازے سرِ شام ہی سے بند ہو جاتے تھے اور جن کی کئی بار غیاث الدین بلبن کو تادیب کرنی پڑی حضرت خواجہؒ کے فیوض و برکات اور اُن کی تعلیم و تربیت سے ضرور مستفید ہوا ہوگا اور عجب نہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں میواتی انھیں کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ہوں۔

چشتی خانقاہوں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بالواسطہ اور بلاواسطہ گرد و پیش کی غیر مسلم آبادیوں کو اپنے اخلاق، روحانیت اور مساوات و اخوت سے جس کی فضا ان خانقاہوں میں قائم تھی ضرور متاثر کیا، اور اُن قوموں کو جو کشف و کرامت اور روحانیت سے خاص طور پر متاثر ہوتی ہیں اسلام میں داخل کرنے کا ذریعہ بنے، پنڈوہ کی چشتی خانقاہ اور احمد آباد اور گلبرگہ کے چشتی مشائخ کے اثر سے غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد کا مسلمان ہونا بالکل قرینِ قیاس ہے، گیارھویں صدی میں سلسلۂ چشتیہ کے مجدد حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کو اشاعتِ اسلام کا بڑا اہتمام تھا، انھوں نے اپنے خلیفہ و جانشین شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں جابجا اس کی تاکید و ہدایت ہے، ان کے مطالعہ سے ان کی اس مسئلہ میں بے چینی اور فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

در آں کوشید کہ صورت اسلام وسیع گردد وذاکرایں کثیر۔[1]

اسکی کوشش کرو کہ اسلام کا دائرہ وسیع اور اسکے حلقہ بگوش کثیر ہوں۔

دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

بہر حال کلمۃ الحق کوشید و از مشرق تا مغرب ہمہ حقیقی برکنید[2]

---

[1] مکتوبات کلیمی، مکتوب نمبر ۶، صفحہ ۶۰ [2] ایضاً نمبر ۸۰ صفحہ ۶۲

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :۔

"شیخ نظام الدین صاحبؒ کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندو گرویدۂ اسلام ہو گئے۔ بعض اپنے رشتہ داروں کے ڈر سے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔"

شاہ کلیم اللہ صاحب ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"و دیگر مرقوم بود بہیہ دیارام و ہندوہائے دیگر بسیار در ربقۂ اسلام آمدہ اند، اما با مردم قبیلہ پوشیدہ می مانند۔"

ساتھ ہی ساتھ اس چیز کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد اپنے مسلمان ہونے کو مخفی رکھے، مبادا بعد موت اُسکے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

"برادرِ من اہتمام نمایند کہ آہستہ آہستہ ایں امر جلیل از بطون بظہور انجامد کہ موت در عقب است، مبادا احکامِ اسلام بعد از رحلت بجا نیارند و مسلمان حقیقت را بسوزانند دیارام اگر خطے می نویسد، خطے نوشتہ خواہد شد۔"[1]

افسوس ہے کہ کسی نے مشائخ ہندوستان اور بالخصوص سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کی تبلیغی کوششوں کی تاریخ و روداد مرتب کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، لیکن تمام مورخین کے نزدیک ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا سب سے بڑا ذریعہ صوفیائے کرام و فقرائے اسلام ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان سلاسلِ تصوف میں سلسلہ چشتیہ اور اُس کے مشائخ کو اولیت اور اہمیت حاصل ہے اور اس کام میں اُن کا حصہ تناسب سے زیادہ ہے۔

خدمت و اشاعتِ علم

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور اُن کے خلفاء اور اہلِ سلسلہ کو علم کی تحصیل و تکمیل کا جتنا اہتمام تھا اُسکا اندازہ حضرت خواجہ فرید الدینؒ

[1] مکتوب ۲۱ ص ۴۱

کے مقولہ اور خود حضرت خواجہ نظام الدین کے شیخ سراج الدین عثمان اودی (اخی سراج) بانیِ خانقاہ پنڈوہ کے ساتھ رویہ سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے انکو اس وقت تک اجازت نہیں دی جب تک کہ انھوں نے علم کی تحصیل و تکمیل نہیں کرلی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ رشد وارشاد اور درس و تدریس اور علم کی اشاعت و ترویج دونوں اس سلسلہ کی تاریخ میں ساتھ ساتھ چلتے رہے اور یہ رفاقت دورِ انحطاط تک قائم رہی حضرت خواجہؒ کے ایک خلیفۂ اجل مولانا شمس الدین یحییٰ تھے جو اس عصر کے بہت سے علماء اور اساتذہ کے استاد تھے۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا مشہور شعر ہے: ؎

سألتُ العلمُ من احیاك حقّا

فقال العلم شمس الدّین یحییٰ

میں نے علم سے پوچھا کہ تمھیں حقیقی حیات کس نے بخشی اُس نے مولانا شمس الدین یحییٰؒ کا نام لیا۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مخصوص ارادت مندوں و مسترشدین میں قاضی عبد المقتدر کندی (م سنہ ۷۹۱ھ) اُن کے شاگرد رشید شیخ احمد تھانیسری (م سنہ ۸۲۰ھ) اور مولانا خواجگی دہلوی (م سنہ ۸۰۹ھ) ہندوستان کے نامور ترین علماء استاد الاساتذہ و مجددینِ علم میں سے ہیں۔ قاضی عبد المقتدر اور مولانا خواجگی کے شاگرد رشیدؒ شیخ شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی (م سنہ ۸۴۹ھ) فخرِ ہندوستان اور نادرۂ روزگار تھے اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین کے نام سے ہندوستان کی علمی تاریخ میں زندۂ جاوید ہیں، اُن کی شرح کافیہ (جو شرح ہندی کے نام سے عرب و عجم میں مشہور ہوئی) کے محشیوں میں علامہ گازرونی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی جیسی بلند شخصیتیں ہیں، یہ وہی ہیں جنکی علالت کے موقع پر سلطان ابراہیم شرقی نے پانی کا پیالہ بھر کر اُن پر سے تصدق کیا اور دعا کی کہ ملک العلماء میری سلطنت کی آبرو ہیں اگر اُن کی موت مقدر ہی ہے تو اُن کے بجائے مجھے قبول کرلیا جائے۔

اسی سلسلہ کے ایک عالم جلیل مولانا جمال الاولیاء شبلی لوردی (م سنہ ۱۰۴۷ھ)

جن کے نامور شاگردوں میں مولانا لطف اللہ کوردی، سید محمد ترمذی کالپوری، شیخ محمد رشید جونپوری اور شیخ لیسین بنارسی جیسے علمار کبار و شیوخ عصر تھے مولانا لطف اللہ کوروی کے شاگرد ہندوستان کے مشہور عالم مولانا احمد امیٹھوی عرف حمید احمد اور قاضی علیم اللہ کچھندی اور مولانا علی اصغر قنوجی تھے جنھوں نے درس و تدریس کا ہنگامہ گرم رکھا، اور بڑے بڑے نامور عالم و مدرس آن کے حلقہ درس سے تیار ہو کر نکلے۔ ٹیلے والی مسجد کا شہرہ آفاق دار العلوم جس کے مسند نشین حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی (م ۱۸۵۵ھ) تھے، اسی سلسلہ سے تعلیمی روحانی نسبت رکھتا تھا خود درس نظامی (جس کی جہانگیری مسلّم ہے) کے بانی ملا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ) اور اُن کے نامور جانشین اور اہل خاندان اس سلسلہ سے نسبتِ روحانی رکھتے تھے، اس کے علاوہ عام طور پر بھی مشائخ چشت کا علمی ادبی ذوق، تبحر اور علمی شغف ایک تاریخی حقیقت ہے، جو حضرت نور قطب عالم، حضرت جہانگیر اشرف سمنانی، حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مکتوبات اور پنڈوہ، گلبرگہ، مانک پور، سلون وغیرہ کی خانقاہوں کی علمی سرگرمیوں اور دلچسپیوں سے عیاں ہے۔

خاتمۂ کلام

قبل اسکے کہ سلسلۂ چشتیہ کی تاریخ کا یہ صفحۂ زرّیں ختم کیا جائے، ایک تلخ حقیقت کی طرح اس کا اظہار ضروری ہے کہ زمانہ کے مرور و انقلاب کے ساتھ، اس سلسلہ اور اسکے بانیانِ کرام اور اسلافِ عظام کی خصوصیتوں میں انحطاط و زوال رونما ہوا، تصوّف و روحانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر سلسلہ کا آغاز جذب قوی سے ہوا، پھر اس نے سلوک اور آخر میں رسوم کی شکل اختیار کر لی، یہاں بھی جس سلسلہ کا آغاز عشق، درد و محبت، زہد و ایثار، فقر و استغنار، ریاضات و مجاہدات اور دعوت و تبلیغ سے ہوا تھا اس میں بتدریج ایسی تبدیلی ہوئی کہ آخر میں اس کے نظام کے تینوں نمایاں عناصر ترکیبی رہ گئے۔

(۱) وحدت الوجود کے عقیدہ میں غلو اس کی اشاعت کا انہماک اور اس کے باریک و دقیق مضامین

(۲) محافلِ سماع کی کثرت، وجد و رقص کا زور۔

(۳) اعراس کا اہتمام اور ان کی رونق و گرم بازاری جو شرعی حدود و قیود سے بے نیاز ہے۔

وہ اعمال و رسوم اور عقائد جن کی اصلاح کیلئے دین خالص کے یہ اولوالعزم داعی ایران و ترکستان کے دور دراز مقامات سے آئے تھے، خانقاہوں کا ایسا دستور العمل بن گئے کہ غیر مسلم آبادی کے لئے یہ ایک معمہ اور سوال بن گیا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں (جن کی اصلاح کے لئے یہ مبلغین اسلام بحر و بر طے کر کے تشریف لائے تھے) عملاً کیا فرق ہے؟ توحید کے لفظ کا استعمال اور دعوتِ توحید وجودی کے معنی میں محدود ہو کر رہ گئی۔ سنت اور اتباعِ شریعت جس پر ان مشائخ نے اتنا زور دیا تھا، اہلِ ظاہر کا شعار اور حقیقت ناشناسوں کی علامت بن کر رہ گیا، شریعت و طریقت دو الگ الگ چیزیں تسلیم کئے گئے جن میں نہ صرف مغائرت تھی بلکہ تضاد، مزامیر و آلاتِ سماع جن کی مشائخِ متقدمین نے اتنی شدت سے ممانعت کی تھی، داخلِ طریق بن گئے، درد و عشق کی جنس جو طریقہ چشتیہ کا سرمایہ تھا اس بازار میں ایسی نایاب ہوئی کہ طالبِ صادق کو حسرت سے کہتے ہوئے سنا گیا کہ۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے

فقر جو اس طریق کا فخر تھا شانِ امیری اور شکوہِ خسروی سے تبدیل ہو گیا۔

اس سے بڑھ کر انقلاب اور تاریخ کا سانحہ یہ ہے کہ بن بندگانِ خدا کا مقصدِ حیات ہی خدا کے سب بندوں کا سر دنیا کے تمام آستانوں ——— سے اٹھا کر خدائے واحد کے آستانہ پر جھکانا اور "ماسوی" میں اٹکے ہوئے اور پھنسے ہوئے دلوں کو نکال کر ایک خدا سے اٹکانا تھا اور جن کی دعوت اور زندگی انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی تصویر اور ان آیات کی تفسیر تھی:۔

ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب — کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تو اس کو

والحکم والنبوۃ ثم یقول	کتاب اور دین کی فہم اور نبوت عطا فرمائے اور پھر
للناس کونوا عبادًا لی	وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا کو
من دون اللہ ولکن کونوا	کی توحید کو چھوڑ کر لیکن وہ یہ کہے گا کہ تم اللہ والے
ربانیین بما کنتم تعلمون	بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب الٰہی اوروں کو بھی
الکتاب وبما کنتم تدرسون	سکھاتے ہو اور بوجہ اسکے کہ خود بھی اسکو پڑھتے ہو
ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکۃ	اور نہ وہ یہ بات بتلاوے گا کہ تم فرشتوں کو اور
والنبیین ارباباً ایأمرکم	نبیوں کو رب قرار دے لو۔ بھلا وہ تم کو کفر کی
بالکفر بعد اذ انتم مسلمون	بات بتلاوے گا بعد اس کے کہ تم
(آل عمران - ع ۸)	مسلمان ہو۔

انقلاب زمانہ سے خود اُن کی ذات مطلوب و مقصود اور خود اُن کا آستانہ مسجود و معبود بن گیا۔

مخدوم الملک

شیخ شرف الدّین یحییٰ منیری

رحمۃ اللہ علیہ

(۶۶۱ھ ——— ۷۸۶ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل[1]

حالاتِ زندگی

ولادت سے بیعت و اجازت تک

خاندان احمد نام، شرف الدین لقب، مخدوم الملک بہاری خطاب، والد کا نام شیخ یحییٰ تھا جو زبیر بن عبدالمطلب کی اولاد میں تھے، اس طرح آپ کا خاندان ہاشمی قریشی ہے۔ آپ کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہ اپنے زمانہ کے بڑے علماء و مشائخ میں سے تھے۔ الخلیل[1] (شام) سے نقل سکونت کرکے بہار کے قصبہ سنبھل[2] میں قیام پذیر ہوئے، بعض مصنفین نے آپ کو شہاب الدین غوری کا ہمعصر بتایا ہے۔

---

[1] اب یہ شہر مملکت ہاشمیہ اُردنیہ کا ایک شہر ہے جو بیت المقدس سے تقریباً ۱۵، ۱۶ میل پر واقع ہے، اس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شرفاء اور صلحاء کی یہ قدیم بستی ہے، اپنی آب و ہوا کی لطافت اور اپنے ساکنین کی نرم خوئی، میزبانی اور حسنِ اخلاق میں مشہور رہا ہے۔

[2] اس وقت عام طور پر قصبہ منیر کے نام سے مشہور ہے، لیکن قدیم مآخذ و روایات سے معلوم ہوتا ہے (بقیہ صفحہ ۸ پر)

مولانا محمد تاج فقیہؒ کی ذات سے منیر اور اُسکے مضافات میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی، کچھ عرصہ آپ نے منیر میں قیام کرکے وطن کو مراجعت فرمائی اور زندگی کا بقیہ حصہ خلیل ہی میں بسر کیا۔ آپ کا خاندان بدستور منیر میں رہا۔

شیخ احمد شرف الدینؒ کے نانا شیخ شہاب الدین جگ جوتؒ سہروردی سلسلہ کے مشائخ میں تھے ۔، آبائی وطن کا شغر تھا، ہندوستان تشریف لائے اور موضع جھلی میں قیام فرمایا جو پٹنہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کے مریدین میں سے تھے۔ زہد و ورع اور استقامت میں پایہ بلند رکھتے تھے، اور اسی وجہ سے جگ جوت (دنیا کی روشنی) کے لقب سے مشہور تھے، ان کی ایک صاحبزادی کے بطن سے شیخ احمد شرف الدینؒ اور دوسری صاحبزادی سے شیخ احمد چرم پوشؒ جیسے نامور مشائخ پیدا ہوئے[1]۔ آپ حسینی سادات میں سے تھے، اس طرح شیخ احمد شرف الدینؒ کا سلسلہ مادری سادات میں ہے۔

دصہ ۱۷ کا بقیہ حاشیہ) اسکا اصلی تلفظ مُنیر تھا فرہنگ ابراہیمی جس کے دوسرے نام شرف نامہ ابراہیمی اور شرف نامہ احمد منیری بھی ہیں اور جو ۸۶۲ھ اور ۸۷۹ھ کے درمیان کی تصنیف ہے، کے مقدمہ میں اُسکے مصنف ابراہیم قوام فاروقی نے اپنے ایک مصرع میں کتاب کا نام اسطرح منظوم کیا ہے۔" ع "شرف نامہ احمد مُنیری" یہ مصرع جب ہی موزوں ہوتا ہے جب مُنیری پڑھا جائے۔ اس کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں اس کو انگریزی میں بھی اسی طرح ضبط کیا گیا ہے یعنی مُنیری (MUNYARI) ۔۱۲

[1] سیرۃ الشرف میں ہے کہ یہ قصبہ ۵۷۶ھ میں مسلمانوں کے ہاتھ فتح ہوا۔ مصنف نے ایک قطعۂ تاریخی نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے: ؎

یافت چوں بر راجۂ منیر ظفر — دادِ امام از دین جہانے راضی ۵۷۶ھ

ہست منقول از بزرگان سلف — سال آں دین محمد شد قوی

(بقیہ ص ۱۷۹ پر)

ولادت شعبان کے آخری جمعہ ۶۶۱ھ میں قصبہ مُنیر میں آپ کی پیدائش ہوئی "شرف آگیں" تاریخ ولادت ہے۔ آپ کے تین بھائی اور تھے: شیخ خلیل الدین، شیخ جلیل الدین اور شیخ حبیب الدین۔

تعلیم جب آپ کی عمر پڑھنے کے قابل ہوئی تو آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ اس زمانہ میں بہت سے ممالک اسلامیہ میں عام طور پر دستور تھا کہ درسی کتابوں کے متون لفظ بلفظ یاد کرائے جاتے تھے اور کچھ لغت کی مختصر کتابیں بھی، تاکہ الفاظ کا ذخیرہ بچپن سے محفوظ ہو جائے۔ شیخ نے اس طرزِ تعلیم پر اپنی بعض بعض تحریروں میں تنقید فرمائی ہے اور قوتِ حافظہ اور وقت کے اس غلط استعمال پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ بجائے قرآن مجید کے ایسی کتابیں رٹائی جاتی ہیں جو دین کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں۔ معدن المعانی کے باب ششم میں فرماتے ہیں:-

در ایام خوردگی چندیں کتابہا مارا یاد گردانیدند چنانکہ مصادر و مفتاح اللغات و جز آں در کتابہا۔ و مفتاح اللغات جزوے بیستے خواہد بود مقدار یک جلد یاد کرانیدند و ہر بار یاد تمام می شنیدند بائیست بجائے آں قرآن یاد می کرانیدند۔[1]	بچپن میں اُستادوں نے بہت سی کتابیں یاد کرائیں، مثلاً مصادر، مفتاح اللغات وغیرہ مفتاح اللغات بیس جزو کی کتاب ہوگی بقدر ایک جلد کے یاد کرائی، ہر مرتبہ زبانی سنتے تھے، اس کے بجائے قرآن مجید یاد کرانا چاہئے تھا۔

افسوس ہے کہ تذکروں میں آپ نے ابتدائی اساتذہ کے نام اور ان کتابوں اور علوم کی تفصیل نہیں ہے

(صفحہ ۱۷۸ کا بقیہ حاشیہ) اس طرح یہ ماننا پڑتا ہے کہ فتح منیر شہاب الدین غوری کی فتح ہندوستان (۵۸۸ھ) سے قبل کا واقعہ ہے، کیا مسلمان غزنویوں کے عہد ہی میں بہار و بنگال کی حدود میں پہنچ گئے تھے، اور انھوں نے جا بجا اسلامی عملداری اور قبضہ کی بنیاد ڈال دی تھی؟ تاریخی حیثیت سے یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ [1] معدن المعانی مطبع شرف الاخبار ص ۴۳

جن کی آپ نے وطن میں رہ کر تحصیل کی۔ اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے غیر میں رہ کر متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور وقت کے بڑے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو گئے۔

مولانا شرف الدین ابوتوامہ سے تلمذ اور سنارگاؤں کا سفر

وطن میں رہ کر علم کی تحصیل کے جو مواقع حاصل تھے، جب آپ نے اُن سے فراغت حاصل کرلی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی علمی تکمیل و ترقی کے لئے ایک دوسرا انتظام فرمایا۔ دہلی کے اساتذہ میں سے مولانا شرف الدین ابوتوامہ جو شمس الدین التمش کے عہدِ دولت ہی سے علم و تدریس کے نظامِ شمسی کے ایک روشن ستارہ تھے۔ غالباً غیاث الدین بلبن کے عہد میں[1] رجوعِ عام اور بعض حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی بناء پر اشارۂ سلطانی سے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور اس وقت ہندوستان کی اسلامی مملکت کے آخری سرحدی شہر سنارگاؤں[2] کا قصد فرمایا۔ راستہ میں بہار سے گذرتے ہوئے آپ نے چند روز منیر میں قیام فرمایا، جو غالباً اس وقت دہلی سے سنارگاؤں جاتے ہوئے ایک کارواں سرائے اور آباد بستی تھی، اہلِ قصبہ

---

[1] اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ مولانا شرف الدین ابوتوامہ کے منیر تشریف آوری کے وقت شیخ شرف الدین احمد کم سے کم ۱۲ سال کے تھے تو یہ ۶۷۳ھ ہوگا، اس طرح یہ زمانہ غیاث الدین بلبن کا ہے جس نے ۶۶۴ھ سے لیکر ۶۸۶ھ تک سلطنت کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوتوامہؒ نے سلطان غیاث الدین بلبن کے اشارہ سے ہجرت اختیار کی تھی۔ ع

"رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند"

[2] سنارگاؤں مسلمانوں کے عہد میں مشرقی بنگال کا دارالحکومت تھا، اب یہ ایک غیر معروف مقام ہے جو کس میرسی میں پڑا ہوا ہے اور پینام (PAINAM) کے نام سے ضلع ڈھاکہ میں شامل ہے، دریا برہم پتر اُس سے دو کوس کے فاصلہ پر بہتا ہے۔ سنارگاؤں کے اطراف میں کثیر تعداد میں ویران مسجدوں کے نشانات پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ ایک بڑا اسلامی شہر تھا، یہ اُس شاہی سڑک کا منتہیٰ تھا جس کو شیر شاہ نے بنایا تھا۔ ۱۲

تاریخ دعوت و عزیمت

(حصّہ چہارم)

اردو ——— لکھنؤ، کراچی

انگریزی ——— لکھنؤ

عربی ——— کویت و بیروت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ
عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ
مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ
بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡكَبِيۡرُ ﴿۳۲﴾

(سورۂ فاطر۔۳۲)

فہرست عناوین

تاریخ دعوت و عزیمت (حصّہ چہارم)

عرض مدّعا ۱۱

باب اوّل

عالم اسلام دسویں صدی میں ۲۳

دسویں صدی ہجری کے تاریخی مطالعہ کی اہمیت ۲۳

سیاسی حالت ۲۴

مذہبی و روحانی حالت ۳۰

علمی حالت ۳۹

ذہنی بے چینی اور اعتقادی انتشار خیال ۴۴

مہدویت ۵۲

بے چینی اور انتشار خیال کے اسباب ۵۷

دسویں صدی کا فتنۂ کبریٰ ۶۱

"الف ثانیؒ" سے ایک نئے نظام عالم کے آغاز کا مغالطہ ۶۱

الف ثانیؒ کا مغالطہ ۶۱

باب دوم

اکبری عہد حکومت اور اس کے دو متضاد دور ۷۰ ۱۲۶

اکبر کی مذہبی اور دیندارانہ زندگی ۷۰

اکبر کے مزاج میں تغیر اور عہد اکبری کا دور ثانی ۷۶

مذاہب کا تقابل و تحقیق اور مجالس مناظرہ اور ان کا اثر ۷۸

اکبر کے تغیر مزاج و انحراف میں علمائے دربار و ارکانِ سلطنت کی ذمہ داری ۸۵

علمائے دربار ۸۷

ارکانِ سلطنت و مشیرانِ دربار ۹۱

ملا مبارک اور ان کے فرزند فیضی و ابوالفضل ۹۲

راجپوت رانیوں کا اثر ۱۰۱

محضر اجتہاد و امامت ۱۰۲

محضر پر ایک نظر ۱۰۳

مخدوم الملک اور صدر الصدور کا زوال ۱۰۴

الف ثانیؒ کی تیاری اور دینِ الٰہی کا اجرا ۱۰۵

اکبر کے دینی و مزاجی انحراف و اختلال کا نقطۂ عروج ۱۰۸

آتش پرستی ۱۰۸

آفتاب پرستی ۱۰۹
گنگا جل ۱۱۰
تصویر کشی ۱۱۱
اوقات عبادت ۱۱۲
سجدۂ تعظیمی ۱۱۲
بیعت وارشاد ۱۱۲
آداب ملاقات ۱۱۳
تاریخ ہجری سے تنفّر ۱۱۳
غیر اسلامی تہوار اور عیدین ۱۱۴
فرمان در منع زکوٰۃ ۱۱۶
ہندو موحّد ہیں ۱۱۹
گوشت خوری ۱۱۹
خنزیر ۱۲۰
شراب نوشی ۱۲۰
رسم ہندوانہ ۱۲۱
سنین الٰہی کا اجرا ۱۲۱
دین اسلامی کی تحقیر ۱۲۲
اسراء ومعراج کا استہزاء ۱۲۳
مقام نبوت کی اہانت ۱۲۳
اسمائے نبوی سے وحشت وگرانی ۱۲۴
نماز کی عدم اجازت ۱۲۴
ارکانِ اسلام کی توہین واستہزاء ۱۲۵
ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا سنگین اور خطرناک موڑ ۱۲۵

باب سوم

حضرت مجدد الف ثانی رح ۱۲۷ / ۱۵۱

حالات زندگی از ولادت تا خلافت

خاندان ۱۲۷
حضرت مخدوم شیخ عبدالاحد ۱۳۳
ولادت وحالات ۱۳۸
ولادت وتعلیم ۱۳۸
سلوک کی تربیت وتکمیل اور حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت واستفادہ ۱۴۱
حضرت شیخ عبدالباقی نقشبندی دہلوی (خواجہ باقی باللہ) ۱۴۳
بیعت وتکمیل ۱۴۸
حضرت مجدد کے علو مرتبہ کی شہادت حضرت خواجہ کی زبان سے ۱۵۰

باب چہارم

اہم واقعات وحالات، ارشاد وتربیت کی سرگرمی، وفات ۱۵۲ / ۱۸۴

سرہند کا قیام ۱۵۲

لاہور کا سفر ۱۵۳

تبلیغ ودعوت اور ارشاد وتربیت کے وسیع انتظامات اور رجوع عام ۱۵۴

سلطانِ وقت جہانگیر کا رویہ ۱۵۶

گوالیار کی اسیری کے اسباب ۱۶۰

قلعہ گوالیار کی نظربندی ۱۶۲

زندان گوالیار میں سنتِ یوسفی ۱۶۳

دوران اسیری کی نعمتیں اور لذتیں ۱۶۵

لشکر شاہی اور بادشاہ کی رفاقت اور اس کے دینی اثرات وبرکات ۱۶۷

جہانگیر پر اثر ۱۶۹

قرب سفر اور اس کے انتظامات ۱۷۰

عادات ومعمولات ۱۷۴

حلیۂ مبارک ۱۸۱

اولاد امجاد ۱۸۲

باب پنجم

حضرت مجدد کے دائرۂ "تجدید" کا مرکزی نقطہ ۱۸۵ / ۲۶۰

نبوت محمدی پر ایمان واعتماد کی تجدید

حضرت مجدد کا اصل تجدیدی کارنامہ کیا تھا؟ ۱۸۵

نبوت محمدی اور اس کی ابدیت وضرورت پر اعتماد کی بحالی ۱۸۹

عقل وکشف کا غیبی اور مابعد الطبیعی حقائق کے ادراک میں عاجز وناکام رہنا ۱۹۲

بنیادی سوالات اور ان کے جواب کی مختلف کوششیں اور ان کا جائزہ ۱۹۴

عقل محض اور کشف خالص کی تنقید کا انقلابی کارنامہ ۱۹۵

عقل کا عجز صانع عالم کے اثبات اور اس کے کمالات کی معرفت میں ۲۰۱

معرفت الٰہی میں عقلائے یونان کی بے عقلیاں ۲۰۲

عقل حقائقِ دینی کے ادراک میں ناکافی ہے ۲۰۸

نبوت کا طور عقل وفکر کے طور سے ماوراء ہے ۲۰۹

عقل کا خالص وبے آمیز ہونا ممکن نہیں اور وہ حقائق الٰہیہ کی دریافت کے لئے (خواہ اس کو اشراق اور صفائی نفس کی مدد حاصل ہو) مفید نہیں ۲۱۰

اہل اشراق وصفائی نفس ۲۱۴

شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی مقتول ۲۱۶

عقل وکشف دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں ۲۱۸

کشف میں آمیزش ۲۱۹

فلاسفہ اور انبیاء کی تعلیم کا تضاد ۲۲۰

بعثت کے بغیر حقیقی تزکیہ ممکن نہیں ۲۲۴

انبیاء کی بعثت کی ضرورت اور عقل کا ناکافی ہونا ۲۲۴

بعثت اللہ کی ذات وصفات واحکام کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے ۲۲۵

اللہ کی معرفت انبیاء ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے ۲۲۶

صحیح ترتیب ۲۲۷

انبیاء کی رسالت کی تصدیق کرنے والا اصحاب استدلال میں سے ہے ۲۲۷

انبیاء کی اطلاعات کو اپنی عقل کا پابند بنانا طریق نبوت کا انکار ہے ۲۲۸

مخالف عقل اور ماوراء عقل میں بڑا فرق ہے ۲۲۹

خدا کی تعظیم کا طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیاء کی اطلاع وتعلیم پر موقوف ہے ۲۲۹

جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے ماوراء ہے ۲۳۰

اسی طرح نبوت کا مرتبہ عقل سے ماوراء ہے ۲۳۰

مقام نبوت ۲۳۰

انبیاء بہترین موجودات ہیں اور بہترین دولت ان کے سپرد کی گئی ہے ۲۳۳

انشراح صدر کی وجہ سے انبیاء کی توجہ خلق توجہ حق سے مانع نہیں ہوتی۔ ۲۳۳

نبی کا باطن حق کے ساتھ ہوتا ہے اور ظاہر خلق کے ساتھ ۲۳۴

"اولیاء کی ابتدا انبیاء کی انتہا ہے" کے مقولہ کی تردید ۲۳۴

انبیاء نے دعوت کو عالم خلق پر منحصر کیا ہے اور صرف قلب سے بحث کی ہے ۲۳۵

نبوت کی پیروی میں قرب بالفرائض حاصل ہوتا ہے ۲۳۵

کمالات ولایت کمالات نبوت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۲۳۶

علماء کے علوم وتحقیقات کی صحت وفوقیت کی وجہ ۲۳۶

انبیاء کی عظمت نبوت کی وجہ سے ہے ۲۳۷

ایمان بالغیب انبیاء ان کے اصحاب اور علماء وعام مومنین کا حصہ ہے ۲۳۸

انبیاء کی بازگشت کامل نہایۃ النہایۃ تک پہونچ جانے کی علامت ہے ۲۳۹

شریعت کی حمایت ونصرت اصلاح عقائد اور ردّ شرک ورسوم جاہلیت ۲۳۹

سنت کی ترویج اور بدعت حسنہ کی تردید ۲۵۳

باب ششم ۲۶۱ / ۲۹۰

وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود؟

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی تفصیل وتدوین ۲۶۱

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور عقیدۂ وحدۃ الوجود کی مخالفت وتنقید ۲۶۵

عقیدۂ وحدۃ الوجود کے غالی مبلغ وداعی اور ان کے اثرات ونتائج ۲۶۷

عقیدۂ وحدۃ الوجود ہندوستان میں ۲۷۰

شیخ علاء الدولہ سمنانی اور وحدۃ الوجود کی مخالفت ۲۷۱

وحدۃ الشہود ۲۷۲

ایک نئی تجدیدی شخصیت کی ضرورت ۲۷۴

مجدد صاحب کا اضافہ اور تجدیدی کارنامہ ۲۷۵

ذاتی تجربہ ومشاہدہ ۲۷۶

توحید شہودی ۲۸۰

شیخ اکبر کے بارے میں منصفانہ ومعتدل مسلک ۲۸۲

توحید وجودی کی مخالفت کی ضرورت ۲۸۳

مجدد صاحب کی انفرادیت وامتیاز ۲۸۷

مجدد صاحب کے بعد توحید وجودی کے بارے میں مشائخ وعلماء کا "مصالحانہ" رویہ ۲۸۸

حضرت سید احمد شہید مجدد صاحب کے نقش قدم پر ۲۸۹

باب ہفتم
اکبر سے جہانگیر تک ۲۹۱

سلطنت کو راہ راست پر لانے کے لئے آپ کی خاموش جدوجہد ۲۹۱ / ۳۵۴

عہد اکبری وجہانگیری کے جرأتمند اور حق گو علماء ومشائخ ۲۹۱

جہانگیر کی تخت نشینی اور مجدد صاحب کے اصلاح حال میں حصہ ۲۹۵

سلطنت کے کام کا آغاز ۲۹۵

صحیح طریقۂ کار ۲۹۷

ہر چہ از دل برخیزد بر دل ریزد ۳۰۲

امراء سلطنت کے نام تحریضی ودعوتی خطوط ۳۰۳

گذشتہ غلطی کا اعادہ نہ کیا جائے ۳۱۳

عقیدتمند ارکان سلطنت اور ان سے خط وکتابت ۳۱۵

اصلاح حال میں حضرت مجددؒ کا ذاتی اثر اور فیض ۳۱۶

جہانگیر کا تأثر ۳۱۷

شاہجہاں کا دور ۳۱۹

شاہزادہ دارا شکوہ ۳۲۲

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر اور اس کی دینی حمیت وحمایت ۳۲۳

حضرت مجددؒ کی مخالفت وتضلیل کی تحریک اور اس کے نمایاں افراد ۳۳۵

باب ہشتم

حضرت مجدد کے دو خلفائے کبار اور ان کے منتسبین کے ذریعہ آپ کے تجدیدی کام کی توسیع و تکمیل ۳۵۵/۳۸۸

مشاہیر خلفاء ۳۵۵

حضرت خواجہ محمد معصوم ۳۵۷

حضرت سید آدم بنوری ۳۵۸

سلسلۂ مجددیہ معصومیہ اور اس کے مشائخ کبار ۳۶۰

حضرت خواجہ سیف الدین سرہندی ۳۶۰

خواجہ محمد زبیر سے مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی تک ۳۶۳

مرزا مظہر جانِ جاناں اور حضرت شاہ غلام علی ۳۶۶

مولانا خالد رومی ۳۶۸

حضرت شاہ احمد سعید اور ان کے خلفاء ۳۷۲

حضرت شاہ عبد الغنی ۳۷۴

سلسلۂ احسنیہ اور اس کے شیوخ کبار ۳۷۷

حضرت سید شاہ علم اللہ اور ان کا خاندان ۳۷۸

شیخ سلطان بلیاوی ۳۸۰

حافظ سید عبد اللہ اکبر آبادی اور سلسلۂ ولی اللّٰہیہ ۳۸۰

حضرت سید احمد شہید اور ان کی جماعت ۳۸۲

حضرت مجدد کی تصنیفات و رسائل ۳۸۵

اشاریہ (انڈکس) ترتیب از محمد غیاث الدین ندوی ۳۸۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مدّعا

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم
النبیین محمد وآلہ وصحبہ أجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم
إلی یوم الدین

غالباً ۳۵-۳۶ء کی بات ہے، میرے مربّی وولی نعمت برادر معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) نے مجھے ہدایت کی کہ میں "مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ" کا مطالعہ کروں، میری عمر اس وقت ۲۲، ۲۳ سال سے زیادہ نہ تھی، اور تازہ تازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات پر مامور ہوا تھا، معرفت وحقیقت کے گہرے مضامین کے مطالعہ سے ناآشنا اور تصوف وسلوک کی اصطلاحات سے یکسر نابلد تھا، ذہن ومذاق پر ادب (بالخصوص ادب عربی) اور تاریخ کی حکمرانی تھی، مصر وبیروت کے اعلیٰ مطابع کی خوبصورت چھپی ہوئی کتابوں کے مطالعہ کی عادت تھی، بھائی صاحب جن کے دامن عاطفت اور آغوش تربیت میں ذہنی وعلمی نشوونما ہوا تھا، اس حقیقت سے خوب واقف تھے، لیکن شاید وہ اقبالؔ کے الفاظ میں کہنا چاہتے تھے کہ ؎

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ

کم سے کم تین سو برس سے ہمارے خاندان کو روحانی وفکری طور پر حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خانوادۂ عالی سے نسبت رہی ہے، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذخیرۂ کتب میں جو گھر میں محفوظ تھا مطبع احمدی دہلی کا چھپا ہوا مکتوبات کا نسخہ تھا، جو تین دفتروں پر مشتمل تھا، بھائی صاحب کے احترام اور تعمیل ارشاد میں اس کا مطالعہ شروع کیا لیکن کئی بار ہمت نے جواب دے دیا، اور کتاب رکھ دی، خاص طور پر وہ مکاتیب جو اپنے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کے نام ہیں، اور جن میں اپنے روحانی تجربات اور واردات بیان کئے گئے ہیں، سب سے زیادہ ہمت شکن ثابت ہوئے لیکن بھائی صاحب کی طرف سے برابر ہدایت رہی کہ میں کسی طرح مکتوبات، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی "ازالۃ الخفاء" حضرت سید احمد شہیدؒ کی "صراط مستقیم" اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "منصب امامت" پڑھ لوں، آخر کمر ہمت باندھ کر اس "ہفت خواں" کو سر کرنے کے لئے تیار ہو گیا، غیرت بھی آئی اور جوش بھی آیا کہ ایک شفیق بھائی کی ہدایت پر عمل نہیں کرتا، اور ایک ایسی متبرک کتاب کے مطالعہ سے محروم ہوں جس کو بڑے بڑے علماء ومشائخ نے حرز جاں بنایا ہے، توفیق الٰہی نے بھی یاوری کی جس قدر آگے بڑھتا گیا دل لگتا گیا، اور بقدر استعداد و توفیق کتاب بھی سمجھ میں آتی گئی، پھر تو کتاب خود دامن گیر ہو گئی، اور اس کے پڑھنے میں ایسی حلاوت ولذت محسوس ہونے لگی جو اچھی اچھی ادبی کتابوں میں محسوس نہیں ہوتی تھی، یہ دور بعض حیثیتوں سے میری زندگی کا نازک ترین دور تھا، بعض شدید آزمائشیں اور شدید قسم کی ذہنی کشمکش درپیش تھی، کتاب نے اس مرحلہ پر ایک کامل مرشد کا کام دیا، صاف محسوس ہوتا تھا کہ قلب سکینت سے معمور بلکہ مخمور ہے، غالباً ایسی سکینت کا احساس اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، یہ سفر جو محض سعادت واطاعت میں شروع کیا گیا تھا، اور جس میں تعمیل ارشاد اور غیرت کا جذبہ کام کر رہا تھا، بڑی فرحت وبشاشت پر ختم ہوا۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد مکتوبات کو دوبارہ اس ارادہ سے پڑھنا شروع کیا کہ اس کے منتشر و مکرر مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت جمع کیا جائے اس کے لئے کتاب کے مضامین کا ایک انڈکس بنانے کے کام کی ابتدا کی، مثلاً توحید خالص اور رد شرک کا مضمون کہاں کہاں آیا ہے، مکتوبات کے نمبروں کے حوالے سے ان کے صفحات ایک جگہ نوٹ کر لئے، رسالت و نبوت پر کس کس جگہ کلام کیا گیا ہے، سنت و بدعت پر کن مکاتیب میں گفتگو ہے، یہ مضمون کتنے مقامات پر ہے کہ بدعت حسنہ [illegible] وجود نہیں، وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود پر کن مکاتیب میں بحث کی گئی ہے، عقل خالص اور کشف خالص پر تحقیقی بحثیں کہاں کہاں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، ہفتوں کی محنت سے یہ پورا انڈکس تیار ہو گیا، اور وہ مکتوبات کے اسی نسخہ میں رکھ دیا گیا کہ پھر اس کی مدد سے مضامین کو علیٰحدہ علیٰحدہ عنوانات کے تحت مرتب کیا جائے گا لیکن شاید وہ نسخہ کسی نے پڑھنے کے لئے لیا اور وہ واپس نہیں آیا، نسخہ کے ضائع ہونے سے (جس کا بدل مل سکتا تھا) زیادہ افسوس اس محنت و عرق ریزی کے ضائع ہونے کا تھا، جو اس انڈکس کی تیاری میں کی گئی تھی "وکان امر اللہ قدرًا مقدورًا"۔

اس کے کئی سال کے بعد غالباً ۴۵-۱۹۴۶ء میں یہ خیال آیا کہ مکتوبات کو مضامین و مطالب کے لحاظ سے مرتب کیا جائے، اور اس کو اس نئی ترتیب و تعارف و تشریح کے ساتھ پیش کیا جائے کہ وہ نئی نسل کے جدید ذہن رکھنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے قابل استفادہ اور شوق انگیز ہو، اور اس سے حضرت مجدد صاحب کے تجدیدی کارنامے اور مجتہدانہ مقام پر بھی روشنی پڑے، چنانچہ اس التزام کے ساتھ یہ کام شروع کیا کہ پہلے ایک تمہیدی مضمون ہو جس میں آنے والے اقتباسات کا مرکزی فکر، ان علوم و تحقیقات کا جوہر و لبّ لباب آجائے جو ایک ہی عنوان کے تحت ہیں، لیکن سارے مکتوبات میں پھیلے ہوئے ہیں، پھر ایک معنوی ترتیب کے ساتھ مکتوبات کے اقتباسات پیش کئے جائیں،

ایک طرف فارسی متن ہو، اور دوسری طرف اس کا اردو ترجمہ، پھر حاشیہ پر حل طلب الفاظ و اصطلاحات کی تشریح اور احادیث کی تخریج ہو، پھر مستند علمائے امت و محققین اسلام کے تائیدی مضامین اور عبارتیں، اس کام کا پیمانہ اتنا وسیع تھا، اور اس میں اتنے پہلوؤں کی رعایت تھی کہ اس کام کا مجھ جیسے کم عمر و نوخیز اور مصروف انسان سے جو تدریس، تصنیف، تبلیغ، تینوں کوچوں میں قدم رکھتا تھا، سرانجام پانا بہت مشکل تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ توحید و رسالت و نبوت کی منزل تک یہ کام پہنچا تھا کہ دوسرے مشاغل نے اس کی مہلت نہ دی، لیکن جتنا کام ہو گیا تھا، وہ بھی بہت بیش قیمت اور مفید تھا، اس مضمون کی چار قسطیں رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے اپنے رسالہ "الفرقان" میں ۱۳۶۶-۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷-۱۹۴۸ء) میں شائع کیں۔

اس سلسلہ کے منقطع ہو جانے کے کئی سال کے بعد جب "تاریخ دعوت و عزیمت" کا سلسلہ شروع ہوا تو بجائے مکتوبات کی نئی ترتیب اور نئی خدمت کے حضرت مجدد کی مستقل سیرت لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا، اور اس کی تیسری جلد جو آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے دو جلیل القدر روحانی پیشوا سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل تھی، مرتب و شائع ہو گئی تو ضروری ہو گیا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سیرت کی طرف توجہ کی جائے اور اس سے کتاب کی چوتھی جلد کو زینت بخشی جائے کہ اس عہد انقلاب اور اس پرفتن دور میں بعض حیثیتوں سے اس کے سامنے آنے کی زیادہ ضرورت ہے، حضرت مجدد کے اس اس طریقۂ کار و حکمت عملی کو واضح و روشن کرنے کی اس زمانہ میں (جس میں آسانی کے ساتھ اور پہلے ہی مرحلہ پر حکومتوں اور طاقتوں کو اپنا مدّ مقابل اور حریف بنا لیا جاتا ہے، اور کام کے راستہ میں بے ضرورت مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر لیا جاتا ہے) جتنی ضرورت

ہے، شاید کسی زمانہ میں نہ تھی، آخر وہ کیا طریقہ تھا کہ ایک فقیر بے نوا نے ایک گوشہ میں بیٹھ کر سلطنت و ملک کا رخ بدل دیا؟ اس حقیقت کی طرف توجہ سب سے پہلے اپنے برادر معظم کی گفتگو اور مجلسوں سے ہوئی پھر مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا وہ فاضلانہ و ولولہ انگیز مضمون پڑھ کر جو انھوں نے "الفرقان" کے مجدد نمبر کے لئے سپرد قلم کیا تھا، اس کا یقین و اذعان پیدا ہوا، خود میں نے اپنے متعدد عربی مضامین اور خطبات[1] میں اس حقیقت کو متعدد بار واضح کیا اور اس حقیقت پر اطمینان و انشراح قلبی برابر بڑھتا ہی جارہا ہے۔

لیکن جب مکمل و مستقل سیرت کا خیال آتا تو دو باتیں اس راہ میں حائل ہو جاتیں، پہلی یہ کہ مجدد صاحب کی کوئی سیرت فلسفۂ وحدۃ الوجود اور نظریۂ وحدۃ الشہود کی تفہیم و تشریح اور ان کے محاکمہ، علمی دلائل اور ناقدانہ بحث و نظر کے ساتھ آخر الذکر کی ترجیح اور اس کے اثبات کے بغیر ممکن نہیں، لیکن جب اس کا خیال آتا تو ہمت ٹوٹ جاتی، اولاً اس لئے کہ اس پر اتنا عظیم کتب خانہ تیار ہو گیا ہے، جس کی تلخیص و انتخاب بھی مشکل ہے، دوسرے ان دقیق فلسفیانہ مباحث، مقدمات اور ان نازک اصطلاحات کے سمجھے اور سمجھائے بغیر اس پر قلم ہی نہیں اٹھایا جا سکتا، پھر آخر میں یہ مسئلہ عملی اور ذوقی ہے، اور ذاتی تجربات و احساسات پر مبنی ہے، اور مصنف اس کوچہ سے یکسر نابلد، کتاب کے پڑھنے والوں کی بڑی تعداد بھی نہ صرف اس سے ناآشنا بلکہ متوحش ہے، اس لئے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس "ہفت خواں" کو کس طرح سر کیا جائے اور اگر کتاب اس مبحث سے (جو بعض حضرات کے نزدیک مجدد صاحب

---

[1] مثلاً راقم سطور کا وہ مضمون جو اس نے جمعیۃ الشبان المسلمین قاہرہ کے ایک استقبالیہ جلسہ میں علماء مصر اور اساتذۂ جامع ازہر کے سامنے پڑھا تھا، اور "الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند وتطوراتھا" کے عنوان سے علیحدہ شائع ہو گیا ہے، یا جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ کی وہ تقریر جو "منھج أفضل فی الاصلاح للدعاۃ والعلماء" کے نام سے شائع ہوئی۔

کی تجدید کا اصل میدان اوران کی تجدیدی عظمت کا راز ہے) خالی ہو تو وہ کس طرح ان کی مکمل سوانح اور تذکرہ کہی جاسکتی ہے؟ دوسرا خیال جو قلم کا عناں گیر اور مصنف کا دامن کش ہوتا تھا، وہ یہ کہ اس موضوع پر اتنا کام ہو چکا ہے، اور اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ مصنف کے لئے ان میں اضافہ کرنا اور نئی تصنیف کا جواز پیدا کرنا مشکل ہے۔

جہاں تک پہلے خیال کا تعلق ہے بڑے غور و فکر کے بعد ذہن نے اس کا حل سوچ لیا، وہ یہ کہ "مالایدرک کلہ لایترک کلہ" کے اصول پر اس مسئلہ کو قارئین کے سامنے شیخ اکبر کے دبستان فکر کے بعض مستند فضلا اور معتبر شارح و ترجمان حضرات کی تشریحات اور خود مکتوبات کی مدد سے اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ ان کو اس نظریہ کا اجمالی طور پر علم و تصور ہو جائے، پھر جن کو شوق و ہمت ہو وہ اصل مآخذ کی طرف رجوع کریں یا اس موضوع کے اختصاصی عالموں اور اس دریا کے شناوروں سے مدد لیں، جو اس مسئلہ پر علمی طور پر حاوی اور عملی طور پر ذوق آشنا ہیں" وقلیل ماھم"۔

جہاں تک دوسری رکاوٹ کا تعلق ہے، اس کے سلسلہ میں علامہ اقبال کے ایک شعر نے رہبری کی اور مصنف کے محدود تصنیفی تجربہ نے بھی اس کی تائید کی اور اس کے لئے شہادتیں مہیا کیں، ترجمان حقیقت نے فرمایا ہے ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مُغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

حضرت مجدد اور ان کے تجدیدی کارنامہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اب بھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، اور بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

پھر زبان و اسلوب، سوالات و حالات، معیار و اقدار، اور طریقۂ تفہیم و تعبیر کی تبدیلی

سے بعض مرتبہ کچھ عرصہ پہلے لکھی ہوئی کتابیں ایسی ہوجاتی ہیں کہ وہ گویا دوسری زبان میں تھیں، اب ان کے ترجمہ کی ضرورت ہے، پھر مقدمات وواقعات سے نتائج نکالنے اور اسباب و نتائج کے درمیان ربط پیدا کرنے اور اپنے زمانہ کے حالات پر منطبق کرنے کا طریقہ بھی ہر مصنف کا جدا ہوتا ہے، مصنف کے دل نے گواہی دی کہ اگر یہ کام خلوص ومحنت سے انجام دیا گیا تو نہ صرف یہ کہ وہ فائدہ سے خالی نہیں ہوگا، بلکہ کیا عجب ہے کہ چودھویں صدی ہجری کے اختتام پر پندرھویں صدی کے لئے (جو اس کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد شروع ہونے والی ہے) وہ ایک قابل قدر تحفہ، ایک حیات آفریں پیغام، اور اللہ کے ایک مخلص ومقبول بندے کے ایک ایسے کام کی روداد بن جائے جو نہایت خاموشی، تواضع اور عجز ومسکنت کے ساتھ انجام دیا گیا، لیکن اس کے اثرات ایک صدی سے متجاوز ہوکر ہزارۂ دوم (الف ثانی) پر محیط ہورہے ہیں، اور ہماری اس صدی کے لئے بھی جس کے زمین وآسمان بظاہر بدل گئے ہیں، اپنے اندر عبرت وموعظت کا وافر سامان رکھتا ہے۔

"ناچیز راقم سطور کا قلم اور قلب دونوں آستان خداوندی پر سربسجود اور ترانۂ حمد وشکر سے رطب اللسان ہیں کہ ۱۸ سال کے طویل وقفہ کے بعد[1] مصنف کو "تاریخ دعوت وعزیمت" کا سلسلہ پھر شروع کرنے اور اس کا چوتھا حصہ لکھنے کی سعادت وتوفیق حاصل ہورہی ہے، یہ وقفہ اتنا طویل ہوا کہ خود مصنف کو اس کا خطرہ لاحق ہوگیا کہ کہیں موت کا پیام آجائے، اور یہ اہم سلسلہ جس کو مصنف کی تصنیفات میں اللہ تعالیٰ نے خاص قبولیت سے نوازا ناتمام نہ رہ جائے، اس چوتھے حصہ کا تعلق چونکہ اس ذات گرامی سے ہے، جس کی تجدید دین نے ایک طرف وہ شہرت وقبولیت حاصل کی جو تاریخ دعوت واصلاح میں کسی داعی ومصلح

---

[1] "تاریخ دعوت وعزیمت" کی تیسری جلد ۱۳۸۳ھ کے اوائل ۱۹۶۲ء کے وسط میں شائع ہوئی۔

کے حصہ میں نہیں آئی، یہاں تک کہ یہ لقب اس کے نام کا قائم مقام ہوگیا، اور بہت سے تعلیم یافتہ اصحاب بھی نام سے زیادہ اس لقب سے واقف ہیں، دوسری طرف اس کی تجدیدی مساعی نے وہ کامیابی حاصل کی اور اس کے ایسے ظاہر و باہر نتائج نکلے جن کی مثال اسلام کی تاریخِ دعوت و عزیمت اور تجدید و احیاء دین میں ملنی مشکل ہے، اس لئے خود طبیعت پر بھی تقاضا تھا، اور "تاریخ دعوت و عزیمت" کا مطالعہ کرنے والوں اور قدر دانوں کا سالہا سال سے اصرار تھا کہ اس حصہ کو جلد سے جلد مرتب ہوجانا چاہیئے، بلکہ بہت سے مخلص صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق احباب اور بزرگوں کا مطالبہ اور حکم تھا کہ میں تمام تصنیفی مشاغل اور دوسرے موضوعات پر اس کام کو ترجیح دوں، اور کچھ دنوں کے لئے اپنے کو اس کے لئے فارغ کرلوں، لیکن یہ کام اتنا آسان نہ تھا، جتنا سمجھا جارہا تھا، عصر حاضر کے تقاضوں، جدید ذہنوں، اور بحث و تحقیق کے جدید معیاروں اور پیمانوں کے مطابق اتنا کافی نہ تھا کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اور قدیم تاریخوں اور تذکروں میں جو مواد موجود ہے، اس کو معمولی انتخاب اور تلخیص کے ساتھ پیش کردیا جائے، مجدد صاحب نے جس عہد اور ماحول میں یہ تجدیدی کام انجام دیا، اس کا علمی اور تاریخی، فکری و سیاسی، اخلاقی و اجتماعی اور اعتقادی و کلامی طریقہ پر مؤرخانہ و ناقدانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اس وقت کیا تحریکیں کام کررہی تھیں، ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ملکوں میں کیا ذہنی و دینی بے چینی پائی جاتی تھی، اسلام اور شریعت اسلامی کے خلاف علمی اور عقلی حلقوں میں کس بغاوت کے آثار تھے، اور کن سازشوں کی تیاریاں ہورہی تھیں، اسلام کی تاریخ میں پہلے ایک ہزار سال کی تکمیل کے قرب نے حوصلہ مندوں اور طالع آزماؤں کے دلوں میں کیسی کیسی امیدوں اور امنگوں کے چراغ روشن کردیئے تھے، اور متشکک اور متردد طبیعتوں میں کیسے کیسے شکوک و شبہات پیدا کردیئے تھے،

ایک طرف فلسفہ اور علوم عقلیہ، دوسری طرف اِشراق و باطنیت نے نبوت و رسالت کی عظمت و مقام کے گھٹانے اور عقل و تفلسف یا ریاضت و مجاہدہ اور نفس کشی کو معرفت الٰہی، اور وصول الی اللہ اور نجات و ترقی درجات کے لئے کافی سمجھنے کا کیسا فتنہ برپا کر دیا تھا، وحدۃ الوجود کے غالی عقیدہ نے کیسی آزادی اور بے قیدی بلکہ الحاد و زندقہ کا دروازہ کھول دیا تھا[1]

سنت و شریعت کی اہمیت علماء راسخین کی ایک قلیل تعداد اور شروح حدیث تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، اور بدعات نے اکثر کھلے طریقہ پر اور بعض مرتبہ "بدعت حسنہ" کے نام اور نقاب سے پورے معاشرہ اور مسلمانوں کی عملی زندگی پر پورا تسلط حاصل کر لیا تھا، اور کوئی اس "بدعت حسنہ" کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عالم اسلام کی دوسری سب سے عظیم سلطنت[2] اور اس میں بسنے والے وسیع مسلم معاشرہ کا رخ چند ذاتی رجحانات شخصی اغراض، خارجی اثرات اور موہوم سیاسی مصالح کی بنا پر دین حجازی سے وابستگی، نبوت محمدی کی پیروی اور اسلامی تہذیب کی نمایندگی سے بدل کر ہندی فلسفہ،

---

[1] واوین کے درمیان کی عبارت سے مصنف نے ۲۴ مارچ ۱۹۷۸ء کو عزیز گرامی مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی تحریک و تحریض سے (جو پیام انسانیت کے اس دورۂ مشرقی پنجاب میں شریک تھے) حضرت مجدد الف ثانی کے مزار سے متصل خانقاہ کی مسجد میں بیٹھ کر اس تصنیف کا آغاز کیا، مصنف بول رہا تھا، اور اس کے رفیق سفر و معاون عزیز مولوی اسحاق جلیس ندوی مرحوم مدیر "تعمیر حیات" لکھ رہے تھے، تبرکاً اس عبارت کو اس مقدمہ میں شامل و تجلیل کر دیا گیا ہے، اصل کتاب کے شروع کرنے میں پھر بھی تقریباً ڈیڑھ سال کا وقفہ ہوا، کتاب ۹ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ (۳۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء) کو عملاً شروع ہوئی دو بیرونی سفروں کی وجہ سے اس میں طویل طویل وقفے آتے رہے، کل مدت تصنیف ۲-۳ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔

[2] سلطنت عثمانیہ کے بعد اپنے رقبہ، فوجی طاقت، وسائل و ذخائر کے لحاظ سے ہندوستان عالم اسلام کے نقشہ پر سب سے بڑی مسلم سلطنت تھی جس کے حدود مشرقی بنگال سے افغانستان کے مغربی حدود تک وسیع تھے۔

ہندی تہذیب اور "وحدت ادیان" کی طرف موڑا جارہا تھا، اور اس کوشش وسازش میں اس عہد کے بعض ذہین ترین اور لائق ترین افراد شامل تھے، اور ببانگ دہل "نیا دور نیا آئین" "نیا ہزارہ نئی امامت" کا نعرہ بلند کیا جارہا تھا۔

اس صورت حال کو کس طرح بدلنے کی کوشش کی گئی، اس کے لئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا گیا، اور اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی، پھر ایک گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر کس طرح "آدم گری" و "مردم سازی" روحانی تزکیہ وتربیت کا وہ کام انجام دیا گیا جس کے نتیجہ میں وہ مردانِ کار تیار ہوئے، جنھوں نے ہندوستان کے مختلف مرکزی مقامات میں بیٹھ کر اور پھر افغانستان و ترکستان اور پھر عراق وشام وترکی وحجاز میں پھیل کر یادِ خدا کی سرگرمی، اعلاء کلمۃ اللہ کی کوشش، مردہ سنتوں کے احیاء، حمایت شریعت واماتتِ بدعت کا عظیم الشان کام انجام دیا، وحدۃ الوجود کے غالی داعیوں اور آزاد مشرب صوفیوں کے اثرات کا ازالہ کیا، اور مختصراً خدا طلبی اور احترام شریعت کا صور پھونک دیا، اور کم سے کم تین صدیوں تک اس کام کو اس قوت وعزیمت اور اس انہماک ومصروفیت کے ساتھ جاری رکھا کہ پورے عالم اسلام میں ہر جگہ وہی نظر آتے ہیں، اور یہ تین صدیاں انھیں کی روحانی وعلمی قیادت کی صدیاں کہلانے کی مستحق ہیں، اور اس عالمگیر اثر کو دیکھ کر ایک حقیقت پسند انسان یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اس سلسلہ میں دو اور پہلو بھی قابل لحاظ تھے، ایک تو یہ کہ حضرت مجدد صاحب کے عہد کی تصویر کشی اور دور اکبری کا نقشہ پیش کرنے کے سلسلہ میں ملا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" اور ان تاریخی مآخذ پر انحصار نہ رکھا جائے جو خاص دینی جذبات یا ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل اور عہد اکبری کی تاریک سے تاریک تر تصویر پیش کرنے کے عادی ہیں، اس سلسلہ میں

ان غیر جانبدار مصنفین یا دربار اکبری کے ان اہلِ قلم کی تحریر و بیانات سے مواد حاصل کیا جائے جو نہ صرف یہ کہ اکبر کے مخالف نہ تھے، بلکہ اس کے وکیل و نقیب اور اس کے خیالات و مقاصد کے ترجمان اور اس کے آئین سلطنت اور اس کے خداداد کمالات کے معترف و معرّف تھے، اسی طرح ان تبدیلیوں کا بھی مؤرخانہ و مبصرانہ جائزہ لیا جائے جو جہانگیر کے دور سے شروع ہو کر عالمگیر کے عہدِ سلطنت پر جا کر مکمل ہوئیں، اور اس سلسلہ میں بھی خاندان مجددیہ کے مصنفین کے بیانات اور خوش اعتقاد مؤرخوں کی شہادتوں کے بجائے غیر جانبدار مؤرخین ہندوستان کی کتابوں سے مواد اخذ کیا جائے اور ان کی روشنی میں اس دعوے کا ثبوت مہیا کیا جائے۔

نیز اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس ربع صدی میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اردو اور انگریزی میں مجدد صاحب اور ان کے دور پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں بہت سے مشہورات و مسلّمات کو چیلنج کیا گیا ہے، نئے سوالات اٹھائے گئے ہیں، اور واقعات و معلومات یا اپنے اخذ کردہ نتائج کی مدد سے بالکل ایک نئی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے (جو اس تابناک اور درخشاں تصویر سے بہت مختلف ہے، جو ابھی تک پیش کی جاتی رہی ہے) ان کو بھی سامنے رکھا جائے، اور خواہ ان کے ایک ایک دعویٰ کا نام لے لے کر تردید نہ کی جائے لیکن مجدد صاحب کی یہ نئی سیرت اور ان کے کارناموں اور ان کے دور کا یہ جائزہ خود بخود ان کتابوں کا جواب اور ان دعوؤں اور اعتراضات کی تردید ہو جائے۔

اپنی شدید مصروفیت، کثیر ملکی و بیرونی اسفار، صحت کی کمزوری اور معاونوں کی کمی[1] کے ساتھ

---

[1] اس موقع پر ناسپاسی ہوگی، اگر رفیق عزیز مولوی شمس تبریز خاں (رفیق "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام") کا شکریہ نہ ادا کیا جائے جنھوں نے فارسی کی بعض قدیم کتابوں سے مواد مہیا کرنے اور لمبی لمبی فارسی عبارتوں کا ترجمہ کرنے میں مصنف کی بیش قیمت مدد کی، نیز عزیزی ناصر الاسلام ندوی بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ کتاب کی تسوید اور مآخذ سے استفادہ میں ان سے عملی مدد ملی۔

کوشش کی گئی ہے کہ "تاریخ دعوت وعزیمت" کا یہ حصہ جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سیرت اور ان کی خدمات وکارناموں پر مشتمل ہے بعض نئے معلومات اور ایسے مواد کے ساتھ جن سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا تھا، اور بعض اہم اور غور طلب نتائج اور دعوت فکر وعمل کے ساتھ جلد منظر عام پر آجائے، شاید ہم اس سے اس زمانہ کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے اور آنے والی پندرہویں صدی کا استقبال کرنے میں (جس کا عالم اسلام کے مختلف حصوں میں استقبال کیا بھی جا چکا ہے) کچھ مدد حاصل کر سکیں" وما توفیقی إلا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب"

آخر میں اس کا اعتراف وشکریہ بھی ضروری ہے کہ مجددی خاندان کی شاخوں اور مجددی سلسلہ کے مشائخ کبار کے سلسلہ میں مخدوم محترم مولانا ابوالحسن زید فاروقی مجددی (فرزند گرامی حضرت شاہ ابوالخیر مجددیؒ) سے وہ بیش قیمت معلومات حاصل ہوئیں جن کا حصول کسی اور ذریعہ سے بظاہر نہایت دشوار تھا، فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی مصنف کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کے ذاتی کتابی ذخیرہ میں بعض ضروری قلمی کتابیں اور مفید مواد حاصل ہوا، اور انھوں نے بڑی فراخدلی سے ان سے استفادہ کی اجازت دی۔ مصنف ڈاکٹر نذیر احمد صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی علمی اعانت کا بھی شکر گزار ہے۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

۲۶ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۰ھ
۱۳ اپریل سنہ ۱۹۸۰ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب اوّل

عالم اسلام دسویں صدی میں

دسویں صدی (ہجری) کے تاریخی مطالعہ کی اہمیت

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ولادت شوال ۹۷۱ھ اور وفات صفر ۱۰۳۴ھ میں ہوئی، اس طرح ان کا عہد دسویں صدی کے آخری انتیس ۲۹ سال، اور گیارہویں صدی کے تقریباً تینتیس ۳۳ سال ہیں، ان کے عہد کے مؤرخ اور ان کی شخصیت کے سوانح نگار کو اصلاً اسی ترسٹھ ۶۳ سال کی مدت سے سروکار ہونا چاہیئے جو ہجری تقویم کی ان دو صدیوں کے آخری اور ابتدائی ثلث سے تعلق رکھتی ہے۔

لیکن حقیقتاً کسی کی ولادت سے خواہ وہ کتنی عظیم شخصیت ہو یکایک کسی ایسے نئے عہد کا آغاز نہیں ہو جاتا جو اچانک کتم عدم سے عالم وجود میں آئے اور اس پر ان واقعات و حوادث، ان تاریخی عوامل، اس سیاسی، اخلاقی، علمی پس منظر، اور ان سلطنتوں اور طاقتوں کا اثر نہ ہو جو اس کی پیدائش سے پہلے سے کارفرما اور ماحول و معاشرہ پر اثر انداز ہو رہی تھیں، اس لئے ہم کو حضرت مجدد کی سیرت و سوانح کی ترتیب اور ان کے اصلاحی و تجدیدی کارنامہ کے تذکرہ، ان کے عہد کا مزاج سمجھنے اور ان کے کام کی دشواریوں اور

آسانیوں کا صحیح اندازہ اور تقابل کرنے کے لئے اس عہد کے عالم اسلام کا سیاسی، دینی، علمی اور اخلاقی حیثیت سے تاریخی جائزہ لینے کی ضرورت ہوگی، جس سے ان کو بدو شعور سے واسطہ پڑا، اور جس میں ان کو اپنا وہ انقلاب انگیز اور عہد آفریں تجدیدی و اصلاحی کارنامہ انجام دینا تھا، جس کی بنا پر وہ بجا طور پر مجدد الف ثانی کہلائے۔

اس جائزہ میں ہم کو اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ایک عہد اور اس عہد کی دنیا اور انسانی معاشرہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے، جس کی ہر موج دوسری موج سے مربوط و متصل ہوتی ہے، اس لئے کوئی ملک خواہ وہ باقی دنیا سے کتنا ہی کٹا ہوا اور الگ تھلگ زندگی گذار رہا ہو، گرد و پیش کی دنیا میں پیش آنے والے اہم واقعات انقلابات، باہم نبرد آزما طاقتوں، اور طاقتور تحریکوں سے یکسر غیر متاثر اور غیر متعلق نہیں رہ سکتا، خاص طور پر جب یہ واقعات و انقلابات اس کے ہم جنس، ہم مسلک اور ہم عقیدہ پڑوسی ممالک میں پیش آرہے ہوں، اس بنا پر اس تاریخی جائزہ میں ہندوستان کے دائرہ کے اندر محدود رہنا درست نہیں ہوگا، ہم کو دسویں صدی ہجری کی پوری دنیائے اسلام، اور خاص طور پر گرد و پیش کے مسلم ممالک پر بھی نظر ڈالنی ہوگی، جن سے اگرچہ ہندوستان کے سیاسی روابط نہ تھے، لیکن دینی، تہذیبی اور علمی روابط تھے، اور وہاں جو سرد و گرم ہوائیں چلتی تھیں، ان کے جھونکے بُعد مسافت کے باوجود ہندوستان تک بھی پہونچ جاتے تھے۔

سیاسی حالت

دسویں صدی کے اوائل میں عرصہ کے بعد (غالباً سلطان صلاح الدین ایوبی

متوفی ۵۸۹ھ کے بعد) عالم اسلام کے مرکزی حصہ (مشرق وسطی) کو سیاسی استحکام حاصل ہوا تھا، اور مغربی ایشیا کے عرب ممالک ایک ایسے جھنڈہ کے نیچے جمع ہوئے تھے، جس کے بلند کرنے والے اپنے کو حامی اسلام، خادم الحرمین الشریفین اور مسلمانوں کا پاسبان کہتے تھے، اور جنھوں نے (خواہ اپنی سیاسی مصلحتوں کی بناپر) خلافت کو بھی زندہ کردیا تھا، جو آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کی تاتاریوں کے ہاتھوں شہادت (۶۵۶ھ) کے بعد سے مصر میں "علیسوی پاپائیت" کی طرح رہ گئی تھی، یاووز سلطان سلیم اول بانی خلافت عثمانیہ (۹۱۸ھ-۹۲۶ھ) نے ۹۲۲ھ میں شام اور ۹۲۳ھ میں مصر فتح کیا، جو ڈھائی سو[۲۵] برس سے سلاطین مملوک کے زیر حکومت چلا آرہا تھا، سلیم کے حملہ کے وقت اس کا حکمراں قانصوہ غوری تھا، اسی ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم نے خلافت اور اس کے بعد حرمین شریفین کی تولیت وخدمت کا اعلان کیا، جزیرۃ العرب پھر رفتہ رفتہ شمالی افریقہ کے مسلم وعرب ممالک (باستثناء مراکش) سلطان سلیم پھر اس کے جانشین سلیمان اعظم قانونی (۹۲۶ھ-۹۷۴ھ) (جس کو مغربی مصنفین "سلیمان ذی شان" کے لقب سے یاد کرتے ہیں) کے زیر حکومت آگئے، سلیمان اعظم کا عہد حکومت (جس کی وفات سے تین سال پہلے حضرت مجدد کی ولادت ہوئی) سلطنت عثمانیہ کے اوج اقبال کا زمانہ ہے، ایک طرف یورپ میں آسٹریا اور ہنگری میں اس کے فتح واقبال کا جھنڈا نصب تھا، دوسری طرف ایران میں اس کی فوجیں فاتحانہ طریقہ پر یلغار کررہی تھیں، مصر وشام کے ساتھ عراق (عرب) بھی اس کی وسیع مملکت میں شامل ہوگیا تھا، اس وقت وہ دنیا کی سب سے بڑی مملکت (ایمپائر) کا فرمانروا تھا، مراد ثالث (۹۸۲ھ-۱۰۰۴ھ) کے زمانہ میں جزیرۂ قبرص، صوبۂ تونس سلطنت ایران کے بعض زرخیز صوبے اور یمن دولت عثمانیہ میں شامل تھے، اسی کے زمانہ میں ۹۸۴ھ میں حرم مکی کی تعمیر کی تکمیل ہوئی، یہ مجدد صاحب کے شعور کا

زمانہ تھا، ان کو ضرور ان اہم واقعات کا علم ہوگا، اس عہد کے مسلمان (خواہ وہ ہندوستان کے باشندے ہوں) عثمانی ترکوں کی (جو متصلب قسم کے سنی حنفی تھے) ان فتوحات و وسعتِ سلطنت سے ضرور مسرور ہوتے ہوں گے۔

اسی صدی کی ابتدا (۹۰۵ھ) میں ایران و خراسان میں صفوی خاندان کا ظہور ہوا اس سلطنت کا بانی شاہ اسماعیل صفوی تھا (۹۰۵ھ - ۹۳۰ھ) اس خاندان نے رفتہ رفتہ اس پورے علاقہ پر اپنا مستحکم اقتدار قائم کر لیا، یہ سلطنت عثمانیہ کے متوازی سلطنت تھی، جس نے سلطنت عثمانیہ کے بالمقابل مذہب اثنا عشری جعفری کو حکومت کا سرکاری مذہب قرار دیا تھا، حکومت کے اقتدار اور وسائل سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے پورے ایران میں اس مذہب کی اشاعت و ترویج کا بیڑہ اٹھایا، اور اس میں اس نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، اس طرح یہ حکومت اپنے حدود پر مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک انسانی دیوار کھڑی کر کے عثمانیوں (جن کے ہم مذہب (سنّی حنفی) قسطنطنیہ سے لے کر لاہور و دہلی تک پھیلے ہوئے تھے) کی وسیع مملکت (ایمپائر) میں تحلیل ہونے سے محفوظ ہو گئی، اس خاندان کی حکومت بغداد سے ہرات تک تھی۔

اس خاندان کا سب سے باعظمت حکمراں شاہ عباس (۹۹۵ھ - ۱۰۳۷ھ - جو تاریخ میں شاہ عباس اعظم کے نام سے ملقب ہے اور جس کو اپنے تعمیری کارناموں کی بنا پر اس خاندان کا شاہجہاں کہا جا سکتا ہے) حضرت مجدد صاحب کا معاصر ہے، صفوی حکومت شاہ عباس اول کے زمانہ میں انتہائی عروج کو پہونچی، اس نے ترکوں سے لڑ کر نجف اور کربلا کو حاصل کر لیا، وہ اکبر اور جہانگیر کا معاصر تھا، شاہ عباس کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہو گیا۔

دنیائے اسلام کا دوسرا اہم مشرقی خطّہ ترکستان تھا، جو صدیوں تک اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم وفنون کا مرکز رہا، اور جس کو قدیم ادبیات میں ماوراء النہر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جس نے فقہ حنفی کی تدوین میں (عراق کے بعد) سب سے بڑا حصہ لیا، اور اس کی متعدد زندہ جاوید کتابیں جو ہندوستان کے نصاب میں ابھی تک داخل ہیں، وہیں تصنیف ہوئیں[1]، نیز سلسلۂ نقشبندیہ (جس سے حضرت مجدد اور ان کے مشائخ کا تعلق ہے) وہیں پیدا ہوا، پھلا پھولا، اور وہیں سے دنیا میں پھیلا، یہ زرخیز و مردم خیز ملک دسویں صدی کی ابتدا (۹۰۵ھ) ہی سے ازبکوں کے شیبانی خاندان کے قبضہ واقتدار میں آگیا، اور ۹۱۶ھ کے ایک مختصر وقفہ کے علاوہ (جس میں بابر نے صفویوں کی مدد سے ماوراء النہر پر حملہ کیا تھا، اور اس وقت کے دارالسلطنت سمرقند پر قابض ہوگیا تھا) اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط (روس کے انقلاب تک) انھیں کے زیر نگیں رہا، دسویں صدی میں شیبانی خاندان کے دو حکمراں عبیداللہ بن محمد (۹۱۸ھ-۹۴۶ھ) اور عبیداللہ بن اسکندر (۹۶۴ھ-۱۰۰۶ھ) کا دارالسلطنت بخارا تھا، ان کی بدولت بخارا دوبارہ فکری وسیاسی زندگی کا مرکز بن گیا۔

ہندوستان کا سب سے قریبی ہمسایہ ملک جو اس کے مغرب میں واقع ہے، افغانستان ہے، یہ ملک دسویں صدی کی ابتدا میں ترکستان کے ازبکوں اور ایران کے صفویوں، اور درمیان درمیان میں مقامی حوصلہ مندوں کی تاخت میں رہا، کابل وقندھار پر کبھی مغل اور کبھی ایرانی قابض ہوجاتے تھے، اور ہرات ایران کے حدود پر ہونے کی وجہ سے اکثر صفوی سلطنت کے زیر اثر رہا، ۹۲۸ھ میں بابر نے قندھار کو فتح کیا، پھر جب اس نے

---

[1] مثلاً، شرح وقایہ، ہدایہ۔

ہندوستان میں تیموری سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اپنا مستقر ہندوستان کو بنایا، جہاں سے وہ کابل، بدخشاں و قندھار تک حکومت کرتا تھا، اس وقت افغانستان، ہندوستان و ایران کی دو بڑی سلطنتوں کے زیر اثر ایک نسبتاً منظم اور پرامن دور میں داخل ہوا، وہ ان دونوں سلطنتوں کے درمیان اس طرح بٹ گیا تھا کہ ہرات و سیستان کے صوبے ایران کے پاس رہے (اگرچہ ان پر وقتاً فوقتاً ازبکوں کے حملے ہوتے رہتے تھے) کابل سلطنت مغلیہ کا جز بنا رہا، اور قندھار پر کبھی مغل کبھی ایرانی قابض ہو جاتے، کوہستان کے شمال میں بابر کے چچازاد بھائی سلیمان مرزا نے (جسے بابر نے بدخشاں کا والی بنایا تھا) ایک نیم آزاد شاہی خاندان کی بنیاد قائم کر لی، ملک کے باقی ماندہ اقطاع شیبانیوں کے زیر نگیں رہے، ۹۶۵ھ میں طہماسپ شاہ ایران نے قندھار پر قبضہ کر لیا، اور ۱۰۰۳ھ تک یہ شہر ایرانیوں کے قبضہ میں رہا، ۱۰۰۳ھ میں شہزادہ مظفر حسین نے اسے اکبر کے حوالہ کیا، اس وقت سے افغانستان کا ملک ہندوستان کی مغل سلطنت کا ایک صوبہ رہا، اور یہ سلسلہ بارہویں صدی کے وسط تک قائم رہا، یہاں تک کہ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ افشار کے ہاتھوں آل بابر کی دو سو چالیس (۲۴۰) سال کی حکومت افغانستان سے اٹھ گئی۔

دسویں صدی شروع ہوئی تو ہندوستان میں لودھی خاندان کی حکومت تھی، جس کا آخری حکمراں ابراہیم لودھی ۹۳۲ھ میں بانی سلطنتِ مغلیہ ظہیر الدین محمد بابر گورگانی (۸۸۸ھ - ۹۳۹ھ) کے ہاتھ سے قتل ہوا، اور سلطنت مغلیہ کی بنیاد پڑی، جو ہندوستان کی مسلم سلطنتوں میں سب سے وسیع مستحکم و منظم اور طویل العمر سلطنت تھی، لودھی خاندان اپنی افغانی نسل و روایات کی بنا پر اسلام کا حلقہ بگوش، مذہب حنفی کا پابند تھا، جو تجدد پسندی اور نامذہبی (سیکولر) سیاست سے ناآشنا تھا، اس خاندان کا سب سے دیندار،

معارف نواز اور علماء کا قدر دان و سرپرست بادشاہ سکندر لودھی (م ۹۲۳ھ) تھا اسی صدی کے پانچ خوش نصیب سال (۹۴۶ھ - ۹۵۲ھ) شیر شاہ سوری کے زیر حکومت گذرے، جس سے زیادہ تنظیم و دستور سازی کی صلاحیت اور رفاہی کاموں کی توفیق رکھنے والا مسلمان بادشاہ اور صاحب علم اور دیندار حکمراں اس سے پہلے کی ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں نہیں گزرا، شیر شاہ کے انتقال کے بعد سے اکبر کی تخت نشینی تک ہندوستان کو سیاسی و انتظامی استحکام، اور حکومت کو استقرار، اور اہل ملک کو فارغ البالی حاصل نہیں ہوئی، شیر شاہ سوری کا جانشین سلیم شاہ اپنے عبقری (GENIUS) باپ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا، بابر کا جانشین نصیر الدین ہمایوں (۹۳۷ھ - ۹۶۳ھ) ہندوستان میں اطمینان کے ساتھ سلطنت نہ کر سکا، اور شیر شاہ کے فاتحانہ حملوں اور بھائیوں کی بے وفائی سے پریشان اور سرگرداں رہا، اور جب تک ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی سے مدد لے کر نہیں آیا، اس کو استقرار نصیب نہیں ہوا، ۹۶۳ھ میں اکبر تخت نشین ہوا، اور پوری نصف صدی تک بڑے کر و فر سے حکومت کی۔

مجدد صاحب کے زمانہ ہی میں جب ان کی عمر ۴۳ سال کی تھی، نور الدین جہانگیر تخت نشین ہوا، اور اسی کے عہد میں مجدد صاحب نے وفات پائی، اس مرکزی سلطنت کے علاوہ جس کا پایہ تخت دہلی تھا، گجرات، بیجاپور، گولکنڈہ، اور احمد نگر میں علاقائی حکومتیں قائم تھیں، جو خود مختار طریقہ پر سلطنت کر رہی تھیں، ان میں سے تین آخر الذکر شیعہ مذہب رکھتی تھیں۔

مذہبی وروحانی حالت

اس وقت پوری دنیائے اسلام کے ذہن پر مذہب کی گرفت مضبوط تھی، عوام عام طور پر (اپنی علمی واخلاقی کمزوریوں کے باوجود) راسخ الاعتقاد مسلمان، دین پسند اور اسلام دوست تھے، ان میں خاص دینی حمیت اور اسلامی جوش پایا جاتا تھا، اگرچہ بہت سی بدعات اور خلاف اسلام افعال کے مرتکب ہوتے رہتے تھے، لیکن عام طور پر کفر والحاد سے بیزار و متنفر تھے۔

ان کے اس عمومی دینی ذوق اور مزاج کی وجہ سے سلاطین اسلام کو بھی (جو بڑی سے بڑی مخالف طاقت کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور جن کی فوجی طاقت نے یورپ کو بھی لرزہ براندام کر رکھا تھا) شعائر اسلام کا احترام، اور دین کی حمایت و نصرت کا اظہار واعلان کرنا پڑتا تھا، اور عوام کے دلوں پر اس وقت تک ان کی عظمت ومحبت کا نقش قائم نہیں ہونے پاتا تھا، جب تک کہ وہ اپنے اس دینی پہلو کو نمایاں نہ کریں، سلطان سلیم اول کی سلطنت میں اس وقت تک استحکام نہیں پیدا ہوا جب تک کہ اس نے خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین الشریفین کا لقب اختیار نہیں کیا، اس نے اپنے دمشق کے قیام کے دوران مقامات مقدسہ سے اپنی نیاز مندی اور عقیدت کا برملا اظہار کیا، ذی الحجہ ۹۲۳ھ میں سلیم نے حاجیوں کا ایک قافلہ دمشق سے روانہ کیا جس کے ساتھ پہلی مرتبہ ترکی سلطان کی طرف سے بطور ہدیہ غلاف کعبہ بھیجا گیا، اس وقت سے ..... سلاطین ترکی خادم الحرمین الشریفین کا خطاب استعمال کرنے لگے، جس کی وجہ سے انھیں اسلامی دنیا میں بڑا وقار حاصل ہوا، سلیمان اعظم کی زندگی میں تواضع اور خاکساری

اور گہرے دینی جذبات کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، اس نے قرآن مجید کے آٹھ نسخے اپنے ہاتھ سے لکھے جو سلیمانیہ میں محفوظ ہیں، وہ اپنے دیوان کی غزلوں اور نظموں سے ایک راسخ الاعتقاد مسلمان ظاہر ہوتا ہے، اس نے مفتی ابوالسعود (م ۹۵۲ھ) (صاحب تفسیر ابوالسعود) کے فتوے کی سند پر کعبۃ اللہ کی از سر نو تعمیر کی، اور مکہ مکرمہ کی پختہ کاریزیں بنوائیں، سلطان مراد نے ۹۸۴ھ میں کعبۃ اللہ کی عمارت کی تکمیل کی، (جس پر وہ اس وقت تک قائم ہے) یہ سب دسویں صدی کے سلاطین آل عثمان کے کارنامے ہیں۔

ایران کی (شیعی) سلطنت میں بھی عوام کا ذہن مذہبی، اور ذوق دینی خوش عقیدگی کا تھا، اور سلاطین صفویہ اس کو غذا پہونچا کر اور مذہب، اور اہل بیت سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کر کے اس سے ملک میں سیاسی استحکام، اور عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کا کام لیتے تھے، ایران کے سب سے عظیم حکمراں شاہ عباس اول نے صرف زیارت کی غرض سے اصفہان سے مشہد تک پیدل آٹھ سو میل کا سفر کیا، اور نجف میں حاضر ہو کر روضۂ مرتضوی پر جھاڑو دی۔

شاہ عباس سے ایرانیوں کی عقیدت غلو اور وہم پرستی کی حد تک پہونچ گئی تھی، اور لوگوں میں عجیب عجیب روایات مشہور تھیں۔

ترکستان و افغانستان کے لوگوں کی راسخ الاعتقادی، دینی صلابت، سنّیت اور مذہب حنفی کی پابندی میں تصلّب ضرب المثل ہے، ان کے حکمراں اور سربراہانِ مملکت، ارکان سلطنت، اور خواص و امراء بھی (اپنی سطح اور معیار زندگی کے مطابق) بہت حد تک ان کے ہم رنگ اور ہم آہنگ تھے۔

ہندوستان میں مسلم سلطنتوں کی بنیاد ترکی و افغانی النسل خاندانوں اور حکمرانوں

کے ہاتھ سے پڑی، اس لئے شروع سے یہاں بھی مذہب کا اثر گہرا لیکن سیدھے سادہ رنگ کا تھا، جو ترکی و افغانی ذہنیت و مذاق کا خاصہ ہے، یہاں شروع سے طریقۂ اہل سنت والجماعۃ، اور مذہب حنفی کی (چند سواحلی مقامات اور جنوبی ہند کے علاقہ مالابار کو مستثنیٰ کرکے) پابندی رہی، اور شروع سے وہی مملکت کا دستور اور عدالتوں کا قانون رہا، یہاں فقہ حنفی کی بعض اہم کتابیں "فتاویٰ تاتارخانی" اور "فتاویٰ قاضی خاں" لکھی گئیں[1]۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں متعدد بادشاہ اپنی حمایتِ سنت و شریعت، کفر و الحاد سے بیزاری، بدعات و منکرات کی مخالفت و ازالہ، اور دینی حمیت میں ممتاز نظر آتے ہیں، آٹھویں صدی میں محمد تغلق، و فیروز تغلق، اور دسویں صدی میں سلطان سکندر لودھی کا نام لینا کافی ہے، "طبقات اکبری"، "تاریخ فرشتہ"، اور "تاریخ داودی" کے مصنفین کے بیان کے مطابق سلطان سکندر کے عہد میں مذہب کی پابندی ایسی پیدا ہوگئی تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کا ایک نیا طریقہ پیدا ہوگیا ہے، وہ اپنے نفس سے نفس اسلام کو زیادہ عزیز رکھتا تھا، ان کے بقول سلطان کو اپنی ابتدائے عمر سے تعصبِ مذہبی دامنگیر تھا، بادشاہ کو تذکرۂ علمی کا شوق تھا، اس کے عہد میں ہندؤں کے فارسی پڑھنے کا آغاز ہوا، کائستوں نے بادشاہ کا مشورہ قبول کیا، سلطان نے سالار مسعود کی چھڑیاں جو سالانہ جاتی تھیں اپنی مملکت میں بالکل موقوف کردیں، مزارات پر زیارت کے لئے عورتوں کے جانے کی سخت ممانعت کردی، بعض مؤرخ لکھتے ہیں، کہ تعزیوں کے نکلنے اور (چیچک کی دیوی) سیتلا کی پوجا کو بھی سختی سے روکا[2]، مشتاقی نے لکھا ہے کہ

---

[1] یہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین سے بہت پہلے کا زمانہ ہے، جس نے عالم اسلام میں شہرت حاصل کی، اور فتاویٰ ہندیہ کے نام سے مصر و شام و عراق میں مشہور ہے۔ [2] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی جلد دوم صـ۳۷۴

"قبور بلامیت رانہر ساختہ" بہت سی جعلی قبریں جو اس زمانہ میں وجود میں آگئی تھیں، وہاں نہریں جاری کرکے ان کا نام و نشان مٹادیا۔[1]

سلطان سلیم شاہ سوری مساجد میں خود نماز پڑھاتا تھا، مسکرات سے سختی سے مجتنب تھا۔

یہ دور تصوف اور سلاسل و طرق صوفیہ کے انتہائی عروج کا تھا، عالم اسلام کا کوئی ملک اور خطہ ایسا نہ تھا، جہاں کوئی سلسلہ پایا نہ جاتا ہو، گھر گھر اس کا چرچا تھا، اس سلسلہ میں ترکستان کے دو مشہور شہر، اور علمی و روحانی مرکز بخارا اور سمرقند، افغانستان میں ہرات اور بدخشاں، مصر میں اسکندریہ اور طنطا، یمن میں تعز اور صنعاء، حضرموت میں تریم، شحر اور سیون علماء اور صوفیاء اور مشائخ کا بڑا مرکز تھے، حضرموت میں باعلوی عیدروس خاندان بڑا مقبول اور صاحبِ کمال خاندان تھا، اسی دور میں ان اطراف میں الشیخ ابوبکر بن عبداللہ بن ابوبکر بہت عالی مرتبہ شیخ اور قطب دوراں سمجھے جاتے تھے، تریم سادات آل باعلوی کا مستقر تھا، اس زمانہ کے مشہور اولیاء میں شیخ سعد بن علی السوینی باذ ج السعید تھے، شیخ محی الدین عبدالقادر عیدروسی (۹۷۸ھ - ۱۰۳۷ھ) نے اپنی مشہور کتاب "النور السافر فی رجال القرن العاشر"[2] کو انھیں کے تذکرہ پر ختم کیا ہے، جو ص ۴۶۶ سے ص ۴۸۰ تک پھیلا ہوا ہے۔

ہندوستان میں دسویں صدی میں اگرچہ سلسلۂ قادریہ اور سلسلۂ چشتیہ کی دونوں شاخیں (نظامیہ اور صابریہ) پھیلی ہوئی تھیں، اور ان میں متعدد باکمال اور صاحبِ حال شخصیتیں پائی جاتی تھیں، لیکن حقیقتاً یہ صدی سلسلۂ عشقیۂ شطاریہ کی صدی ہے، جس نے

---

[1] واقعات مشتاقی [2] یہ کتاب ۱۰۱۲ھ میں احمد آباد میں لکھی گئی۔

(جدید تعبیر کے مطابق) ہندوستان کے صاحب ولایت سلسلۂ چشتیہ سے اس ملک کا روحانی چارج لیا، اور سارے ہندوستان کو تسخیر کر لیا۔[1]

طریقۂ شطّاریہ کے بانی شیخ عبداللہ شطّار خراسانی ہیں، جو غالباً نویں صدی کے اوائل میں ہندوستان تشریف لائے، اور مانڈو میں سکونت اختیار کی، ۸۳۲ھ میں ان کی وفات ہوئی، اور مانڈو میں اندرون قلعہ مدفون ہوئے، وہ امیرانہ ٹھاٹ سے رہتے تھے، صاحبِ جذب قوی تھے، خلق کثیر نے ان سے فائدہ اٹھایا اور تیزی سے ان کا سلسلہ ہندوستان میں پھیل گیا، اس طریقہ کی دو شاخیں ہیں، ایک شاخ کا تعلق شیخ محمد غوث گوالیاری سے ہے، ان کے اور شیخ عبداللہ شطاری کے درمیان تین واسطے ہیں، دوسری شاخ کے بانی شیخ علی بن قوام جونپوری (شیخ علی عاشقاں سرائے میری) ہیں، ان کے اور شیخ عبداللہ شطاری کے درمیان دو واسطے ہیں، اس سلسلہ نے غالباً پہلی مرتبہ جوگ کو تصوف کے ساتھ ملایا، اور ان کے سلوک کے بعض طریقے اور اذکار، اور بعض آسن اور حبس دم کا طریقہ اختیار کیا اور اپنے مریدین کو ان کی تعلیم دی، نیز علم سیمیا کو بھی شامل کیا، ان آسنوں کی تشریح اور اس کے اذکار کی تفصیل "رسالہ شطاریہ" مصنفہ بہاء الدین ابن ابراہیم الانصاری القادری میں موجود ہے،[2] شیخ محمد شطاری کی تصنیف "کلید مخازن" میں مصنف کا ایک مستزاد ہے،

---

[1] اس صدی میں سلسلۂ مداریہ بھی جس کے بانی شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری (م ۸۴۴ھ) تھے، ہندوستان میں پایا جاتا تھا، اس سلسلہ کا مدار وشعار وحدۃ الوجود کے افکار ومضامین کا برملا اظہار واعلان، تجرید ظاہری (اس حد تک کہ محض شرمگاہ کے چھپانے پر اکتفا کیا جائے) اور توکل محض ہے، مرور ایام کے ساتھ اس سلسلہ میں انحطاط اور بے قیدی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ مداری "بازیگر" کا مرادف قرار پایا، دسویں صدی میں یہ سلسلہ خواص کے حلقہ میں اپنی مقبولیت کھو چکا تھا "نزہۃ الخواطر" کے حصۂ چہارم میں (جس میں ہر سلسلہ کے مشائخ کا استیعاب کیا گیا ہے) تلاش سے صرف دو اشخاص ملے جن کو سلسلۂ مداریہ میں بھی بیعت تھی۔

[2] ملاحظہ ہو نسخۂ قلمی موجود کتب خانہ ندوۃ العلماء فن تصوف ۴۸، ص ۴۷-۴۹

جس سے وحدۃ الوجود، بت خانہ و مسجد، اور شیخ و برہمن کی مساوات کا، اور ان سب چیزوں میں خدا کی تجلی، بلکہ ظہور کا صاف صاف اظہار ہوتا ہے کہ یہ سب اسی وحدت کے الوان و مظاہر ہیں، آخر کا شعر ہے ؎

عشقی شد و در مشرب شطّار برآمد ۔ خود غوث جہاں شد[1]

"رسالہ عشقیہ" میں کافری کو "جلال عشق" اور مسلمانی کو "جمالِ عشق" کہا گیا ہے، اور یہ شعر ملتا ہے ؎

کفر و ایمان قرین یک دگر اند
ہر کہ را کفر نیست ایماں نیست[2]

ایک جگہ لکھا ہے :۔

"العلم حجاب اکبر گشت، مراد ازیں علم عبودیت کہ حجاب اکبر است، ایں حجاب اکبر اگر از میان مرتفع شود کفر بہ اسلام و اسلام بہ کفر آمیزد، و عبادت خدائی و بندگی برخیزد"[3]

اس سلسلہ کے سب سے نامور و با اثر شطّاری شیخ محمد غوث گوالیاری تھے، (م ۹۷۰ھ) جن کو رجوع عام اور قبول تام حاصل ہوا، اور جن کی شان و شوکت وزراء و امراء کے درباروں سے چشمک کرتی تھی، ان کی جاگیر کی آمدنی نو[9] لاکھ سکہ نقرئی[4] تھی، ان کے فیل خانہ میں چالیس[40] ہاتھی اور خدم و حشم کا ایک بڑا لشکر تھا، آگرہ کے بازار میں نکلتے تو ٹھٹھ لگ جاتے، ہر ایک کو جھک جھک کر سلام کرتے زین پر سیدھا بیٹھنا مشکل ہو جاتا، ملا عبد القادر بدایونی کے بیان کے مطابق شیخ محمد غوث نے اکبر کو ترکیب سے اپنا مرید بنا لیا تھا، لیکن بادشاہ نے جلد اس حلقۂ ارادت کو اپنی گردن سے دور کر دیا، اس امیرانہ بلکہ شاہانہ شان کے

---

[1] "کلید مخازن" ص ۱۹۶-۱۹۹ [2] "رسالہ عشقیہ" ص ۷۱ [3] ایضاً ص ۷۳ [4] بعض روایات میں ایک کروڑ تک ہے۔

باوجود ملک میں ان کے فقر کی دھوم مچی ہوئی تھی، سلام کرنے کے وقت تا بحدّ رکوع جھک جاتے تھے، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، علماء کو اس پر اعتراض تھا، ان کی تصنیفات میں "جواہر خمسہ" "معراجیہ"[1] "کنز الوحدۃ" اور "بحر الحیاۃ"[2] ہے، ہندوستان پر ان کا بڑا اثر پڑا، اور طریقۂ چشتیہ شطاریہ عام ہوا[3]، مجدد صاحب ان کے انتقال کے ایک سال بعد پیدا ہوئے۔

اس سلسلہ میں شیخ علی بن قوام جونپوری معروف بہ علی عاشقان سرائے میری (م ۹۵۵ھ) شیخ لشکر محمد برہانپوری (م ۹۹۳ھ) شیخ اللہ بخش گڈھ مکتیسری (م ۱۰۰۲ھ) بڑے جلیل القدر مشائخ تھے، جن سے ایک عالم نے رجوع کیا، علی عاشقاں سرائے میری کے متعلق بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے بعد کسی سے ایسی کرامات کا ظہور نہیں ہوا جیسے ان سے[4]، شیخ محمد غوث گوالیاری کے خلف و خلیفہ شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی (م ۱۰۰۵ھ) علامہ وجیہ الدین کے شاگرد تھے، پینتیس[35] سال اکبر آباد میں (جو اکبر کا دار الحکومت تھا) رہے، بڑی مقبولیت حاصل کی، دربار اکبری میں کئی بار طلب کئے گئے، ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے کہ میں نے ان کو سلام مسنون کیا، تو ان کو

---

[1] انھوں نے اپنے لئے معراج کا دعویٰ کیا تھا، جس پر علمائے گجرات میں بڑا ہنگامہ ہوا، لیکن ملک العلماء شیخ وجیہ الدین گجراتی نے (جو اس وقت کے اکثر علماء کے استاد تھے) اس کی علمی توجیہ کی جس سے ہنگامہ فرو ہوا۔

[2] یہ کتاب امرت کنڈ کا ترجمہ ہے، شیخ محمد اکرام اپنی کتاب رود کوثر میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کی تفصیل کو فارسی میں منتقل کیا ہے، اپنی ابتدائی تصنیف "جواہر خمسہ" میں ان کی ایک آدھ جھلک دکھائی، اس سے شطاریہ طریقہ کے اس ارتباط پر روشنی پڑتی ہے، جو اس کو ہندو یوگا سے تھا۔" (ص ۳۴-۳۶)

[3] مشائخ شطاریہ کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۴۔

[4] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "العاشقیہ" تصنیف عارف علی، یا "نزہۃ الخواطر" جلد پنجم۔

گراں گزرا، اور اس میں انھوں نے اپنی توہین محسوس کی، اور اس شعار اسلام اور سنت خیر الانام کی تضحیک کی، بدایونی نے ان کا اچھا نقشہ نہیں کھینچا ہے، اور ان کے استہزاء کے واقعات لکھے ہیں[1]۔

ان حضرات کے علاوہ شاہ عبداللہ سندیلوی (۹۲۴ھ - ۱۰۱۰ھ) اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندی خلیفہ حضرت شیخ لشکر محمد عارف باللہ (جو حضرت مجدد صاحب کے معاصر اور قریب العمر ہیں) نامور مشائخ عشقیہ شطاریہ میں تھے[2]۔

سلسلۂ عشقیہ شطاریہ کے ان نامور مشائخ کے علاوہ ہندوستان میں دوسرے جلیل القدر مشائخ بھی موجود تھے، جن کا دوسرے سلسلوں سے تعلق تھا، ان میں سے ایک شیخ چاؤں لدہ سہنوی[3] (م ۹۹۸ھ) ہیں، وہ "فصوص" اور "نقد النصوص" کا درس دیتے تھے، اکبر ان کا معتقد تھا، ایک دن ان کو صلوٰۃ معکوس پڑھتے دیکھا تو چلا گیا[4]، دوسرے شاہ عبدالرزاق جھنجھانوی (۸۸۶ھ - ۹۴۹ھ) قادری چشتی تھے، وہ صاحب تدریس و تصنیف عالم ہونے کے باوجود اپنے عہد میں وحدۃ الوجود اور شیخ اکبر کے مسلک کے سب سے بڑے علمبردار تھے، ان کے اس موضوع پر کئی رسائل ہیں، شیخ عبدالعزیز شکر بار (۸۵۸ھ - ۹۷۵ھ) بھی وحدۃ الوجود کے قائل اور صاحب حال بزرگ تھے، وہ بھی "فصوص الحکم" اور اس کی شروح کا درس دیتے تھے، یہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اجداد مادری میں بھی ہیں۔

اسی صدی میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) کا آفتابِ ارشاد نصف النہار پر پہونچا، اور ان سے سلسلۂ چشتیہ صابریہ کو نئی تازگی اور طاقت حاصل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "منتخب التواریخ" ملا عبدالقادر، یا "نزہۃ الخواطر" جلد ۵۔ [2] ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵

[3] سُہنہ ضلع گرداسپور (مشرقی پنجاب) میں ایک قصبہ ہے، جہاں کا گرم چشمہ مشہور ہے۔ [4] "نزہۃ الخواطر" جلد ۴۔

ہوئی، وہ وحدۃ الوجود کے اسرار بر ملا زبان سے کہتے اور اس کے داعی تھے، جونپور میں شیخ قطب الدین بینا دل (۷۷۶ھ - ۹۲۵ھ) طریقۂ قلندریہ میں، اور کیتھل (ضلع انبالہ) میں شیخ کمال الدین (م ۹۷۱ھ) سلسلۂ قادریہ کے سرحلقہ اور صدر نشین تھے، جن سے ان دونوں طریقوں نے نئی آب و تاب پائی، شیخ کمال کیتھلی کے متعلق حضرت مجدد صاحب نے اپنے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحد سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ "جب نظر کشفی سے دیکھا جاتا ہے تو اس سلسلۂ عالیہ (قادریہ) میں پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر کے بعد ان سے بلند مرتبہ و باکمال شیخ نظر نہیں آتا"[1] اودھ میں شیخ نظام الدین امیٹھوی معروف بہ بندگی میاں (۹۰۰ھ - ۹۷۹ھ) سلسلۂ چشتیہ کے بڑے شیخ، حامی شریعت، اور متبع سنت بزرگ تھے، "احیاء العلوم" اور "عوارف" و "رسالہ مکیہ" پر ان کا عمل تھا، ایک شخص کے ہاتھ میں "فصوص" دیکھی تو اس کو چھین لیا، اور دوسری کتاب مطالعہ کو دی، ان کے سلسلہ میں اگرچہ سماع عام تھا، لیکن وہ اس سے محترز تھے[2]۔

یہ تھی اس وقت دنیائے اسلام کی مذہبی و روحانی صورت حال، اور یہ تھے ہندوستان کے مختلف المشرب اور متفاوت الدرجات شیوخ طریقہ اور اصحابِ سلسلہ جو دسویں صدی ہجری میں مختلف مقامات پر اپنے روحانی اور تربیتی مرکز قائم کئے ہوئے تھے، اور ہندوستان میں گہرا دینی رجحان رکھنے والے طالب خدا اور محب الفقراء عوام و خواص ان سے کسی نہ کسی درجہ میں وابستہ اور ان کے حلقہ بگوش تھے، اس کو تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا، تاکہ مجدد صاحب کے عہد کی فضا، مذاق، رجحان، اور اس عہد میں دین کے احیاء و تجدید کے کام کے امکانات اور مشکلات دونوں کا اندازہ ہو۔

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۱۰۵ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۴

علمی حالت

دسویں صدی ہجری اگرچہ علمی اختراع وابتکار، مجتہدانہ فکر ونظر، علوم کی تدوینِ جدید، اوران میں وقیع اضافہ کی صدی نہیں تھی، یہ خصوصیات آٹھویں صدی کے وسط تک نمایاں نظر آتی ہیں، جس میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) شیخ الاسلام تقی الدین ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ)، علامہ علاء الدین الباجی (م ۷۱۴ھ) علامہ جمال الدین ابوالحجاج المزّی (م ۷۴۲ھ) اور علامہ شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ) علامہ ابوحیان نحوی (م ۷۴۵ھ) جیسے سرآمد روزگار علماء پیدا ہوئے، جنھوں نے حدیث، اصول وعلم کلام، فن رجال، اور علوم عربیت میں بلند پایہ اور گرانقدر تصنیفات یادگار چھوڑیں، امام فنِ حدیث علامہ ابن حجر العسقلانی صاحبِ "فتح الباری" (م ۸۵۲ھ) کا دور بھی گذر چکا تھا، جن کی بے نظیر شرح بخاری کے متعلق کہا گیا ہے کہ "لا ھجرۃ بعد الفتح"۔

دسویں صدی زیادہ تر جمع وترتیب، اور تسہیل وتلخیص کی صدی تھی، پھر بھی اس کے اوائل میں علامہ شمس الدین سخاوی (م ۹۰۲ھ) اور علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) جیسے علوم دینیہ کے بحرِ زخار، اور اسلام کے مصنفین کبار گزرے ہیں، علامہ سخاوی کے متعلق بعض علماء کا قول ہے کہ امام شمس الدین ذہبی کے بعد علم حدیث، فن رجال اور تاریخ میں ان کے پایہ کا شخص پیدا نہیں ہوا، ان کے بعد فن حدیث کا زوال شروع ہوگیا، اصول و مصطلحات الحدیث میں ان کی کتاب "فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث" اور تذکرہ رجال میں "الضوء اللامع لأھل القرن التاسع" اپنے موضوع پر بے نظیر سمجھی جاتی ہیں، علامہ سیوطی تعریف وتعارف سے مستغنی ہیں کہ ان کا شمار تاریخ اسلام کے عظیم مصنفین میں ہے،

اوران کی بعض کتابیں اپنے موضوع پر دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی حیثیت رکھتی ہیں، اور تفسیر جلالین کے نصف اول نے جو ان کی تصنیف ہے، اور صدیوں سے درس میں داخل چلی آرہی ہے، ان کے نام کو اس وقت تک زندہ اور تابندہ رکھا ہے۔

اس صدی میں مصر و شام و عراق میں فن حدیث و علم رجال، ایران میں علوم حکمیہ، (منطق و فلسفہ) ترکستان و ہندوستان میں علم فقہ (حنفی) کا زور تھا، اور یہی معیار فضیلت، اور درجۂ کمال سمجھے جاتے تھے، مصر میں علامہ احمد بن محمد قسطلانی، صاحب شرح صحیح البخاری (م ۹۲۳ھ) اور شیخ الاسلام زکریا انصاری (م ۹۲۵ھ) ترکی میں علامہ ابوالسعود صاحبِ تفسیر (م ۹۵۲ھ) حجاز میں علامہ ابن حجر ہیتمی صاحب "الصواعق المحرقۃ" وکتب کثیرہ (م ۹۷۴ھ) اور علامہ علی متقی صاحب کنز العمال (م ۹۷۵ھ) رونق افروز تھے، اور ایک عالم کو اپنے درس سے مستفید کر رہے تھے، مشہور محقق و منصف حنفی عالم و مصنف ملا علی قاری اگرچہ ہرات افغانستان میں پیدا ہوئے، لیکن مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر کے ایک عالم کو اپنے علم سے فیضیاب کر رہے تھے، ان کا انتقال اگرچہ گیارہویں صدی کے اوائل (۱۰۱۴ھ) میں ہوا، لیکن ان کی علمی و تصنیفی خدمات کا زمانہ دسویں صدی ہجری ہی ہے، اسی صدی کے آخر میں ادیب و مؤرخ علامہ قطب الدین نہروالی[1] مکی (صاحب "الاعلام فی اخبار بیت اللہ الحرام) نے ۹۹۰ھ میں انتقال کیا، جن کا خمیر ہندوستان کی سرزمین سے اٹھا تھا، اور جن کے کمال کی قدر ترکی و حجاز کے سلاطین و امراء نے کی۔

ایران کی سرزمین علامہ جلال الدین دوانی (م ۹۱۸ھ) ملا عماد بن محمود طارمی (م ۹۴۱ھ) اور علامہ غیاث الدین منصور (م ۹۴۸ھ) کی ذات پر مفتخر و نازاں تھی، جنھوں نے

---

[1] نہروالا انہلواڑہ کی تعریب ہے جو پٹن (گجرات) کا پرانا نام ہے، اور جس کو ۷۱۶ھ میں محمود غزنوی نے فتح کیا۔

علم وحکمت کے دریا بہا دیئے تھے، جن کی موجیں ہندوستان تک پہونچیں، اس عہد کے آخر کے بہت بڑے علماء میں شیخ محمد بن الشیخ ابی الحسن صدیقی شافعی اشعری مصری تھے، جن کو الاستاذ الاعظم، اور قطب العارفین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، مضامین عجیبہ اور نکات غریبہ بیان کرنے میں فرد فرید تھے، اور ربط آیات اور تفسیر وحدیث وفقہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، جامع ازہر میں درس دیتے تھے، شائقین علم پروانوں کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے، اسی کے ساتھ بڑے صاحبِ باطن، شیخ طریقت اور شاعر وادیب تھے[1]، ۹۹۳ھ میں ان کا انتقال ہوا،

اسی طرح مشہور ہندی محدث رحمۃ اللہ بن عبداللہ سندھی حنفی (م ۹۹۴ھ) جنھوں نے حجاز میں بیٹھکر حدیث کی دولت عام کی، اور اپنی مہارت فن اور استادی کا دلوں پر سکہ بٹھا دیا، ملک العلماء علامہ وجیہ الدین ابن نصر اللہ گجراتی جنھوں نے نصف صدی علوم دینیہ وعقلیہ کا درس دیا، اور جن کے تلامذہ نے ایک صدی سے زائد درس وتدریس کا ہنگامہ گرم رکھا، اسی صدی کے نصف آخر کی زینت تھے، اور اسی صدی کی انتہا پر ۹۹۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، اس وقت یمن روایت واسناد حدیث کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا تھا، اور وہاں محدث یمن طاہر بن حسین بن عبدالرحمٰن الاہدل مسند آرائے درس تھے، اور اسی سال ۹۹۸ھ میں انھوں نے وفات پائی[2]۔

اس عہد میں ہندوستان میں فضلائے ایران کی آمد شروع ہوگئی تھی، جو علامہ جلال الدین دوانی، ملا عماد ابن محمود طارمی، اور میر غیاث الدین منصور کے فیض یافتہ تھے، ہمایوں کے زمانہ میں مولانا زین الدین محمود کمان گر بہدائی، تلمیذ مولانا جامی ومولانا عبدالغفور لاری، ہندوستان آئے اور بادشاہ نے ان کی بڑی تعظیم وتکریم کی، اکبر کے زمانہ میں حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمایوں

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "النور السافر" صـ ۴۱۴-۴۳۹ [2] حالات وکمالات کے لئے ملاحظہ ہو علامہ محمد بن علی شوکانی کی کتاب "البدر الطالع"

(حکیم ہمام) اور نورالدین قراری تینوں فاضل بھائی گیلان سے آئے، اور دربار میں رسوخ پیدا کیا، کچھ عرصہ کے بعد ملا محمد یزدی ولایت (ایران) سے آئے، اور امیر فتح اللہ شیرازی بھی بیجاپور ٹھہرتے ہوئے دربار اکبری کی رونق و زینت بنے، وہ میر غیاث الدین منصور کے شاگرد تھے، ۹۹۳ھ میں صدر ہوئے، ہندوستان میں علمائے ایران کی تصنیفات وہی لائے، انھوں نے یہاں کے نصاب اور طریقۂ درس پر ایسا گہرا اثر ڈالا جس نے بالآخر درس نظامی کی ترقی یافتہ شکل اختیار کی، اور جو ہندوستان کے علمی و درسی حلقوں پر ابھی تک غالب اور حاوی ہے[1]۔

اس عہد میں بالخصوص جنوبی ہند میں نیشاپور، استرآباد، جرجان، مازندران، اور گیلان، کے بہت سے فضلاء اور ادباء کے نام ملتے ہیں، جو درباروں میں رسوخ رکھتے تھے[2]۔

افغانستان بھی اپنی سپہ گری اور سیف زنی کے ساتھ علم و درس کی دولت سے محروم نہ تھا، قاضی محمد اسلم ہروی جن کا انتقال ہندوستان میں ۱۰۶۱ھ میں ہوا، ہرات میں پیدا ہوئے، اور افغانستان ہی میں مولانا محمد فاضل بدخشانی سے تحصیل علم کی، مولانا محمد صادق حلوائی بھی اس وقت افغانستان کے بڑے علماء میں تھے، ہرات ایران کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے علوم حکمت کا مرکز تھا، اور اس کے فرزندوں میں قاضی محمد اسلم ہروی اور ان کے نامور و باکمال فرزند مولانا محمد زاہد نے (جو میر زاہد کے نام سے ہندوستان کے مدرسی حلقہ میں معروف و مشہور ہیں) علوم حکمیہ میں بڑا نام پیدا کیا، عرصہ تک مؤخرالذکر کے تین حواشی جو "زواہد ثلاثہ" کے نام سے مشہور ہیں، اساتذہ و علماء کے مرکز توجہ اور معیار فضیلت بنے رہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الثقافة الاسلامية فی الهند" یا اس کا ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" اور مضمون "ہندوستان کا نصاب درس" از مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۴۔

علمائے ہند کے تلمذ و استفادہ کا یہ تعلق صرف ایرانی فضلاء اور ولایت کے اساتذۂ فن ہی سے جاری نہیں تھا، فضلاء و محدثین مصر و حجاز اور یمن سے بھی قائم تھا، شیخ راجح بن داؤد گجراتی (م ۹۰۴ھ) نے علامہ سخاوی سے حدیث میں استفادہ کیا تھا، علامہ سخاوی نے ان کو شیخ العلاء البخاری الحنفی کی ابن عربی کے بارے میں رائے اور مسلک بتایا، تاکہ وہ ہندوستان کے علماء و مشائخ کو اس سے باخبر کریں، اور شیخ اکبر کے بارے میں ان کی جو خوش فہمی ہے، وہ زائل ہو[1]، علامہ سخاوی نے "الضوء اللامع" میں اپنے ان ہندی شاگرد کا تذکرہ لکھا ہے، اور ان کے علمی کمالات کا اعتراف کیا ہے، اپنے زمانہ کے امام فن حدیث شیخ علی بن حسام الدین المتقی صاحب "کنز العمال" جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "سیوطی کا احسان ساری دنیا پر ہے، اور علی متقی کا احسان خود سیوطی پر ہے" علامہ ابوالحسن الشافعی البکری مدرس حرم مکی، اور علامہ شہاب الدین احمد بن حجر مکی مفتی و محدث مکہ کے تلمیذ رشید تھے۔

سطور بالا سے اس کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہندوستان سمندر اور فلک بوس پہاڑوں سے گھرے ہوئے ہونے کے باوجود (جس میں باہر کی دنیا سے رابطہ کا ذریعہ بلوچستان کا درۂ بولان اور شمالی مغربی سرحد کا درۂ خیبر تھا) علمی اور ثقافتی طور پر باہر کی دنیا سے کلی طور پر کٹا ہوا نہیں تھا، اس کے استفادہ و افادہ کا سلسلہ جاری تھا، اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کا استفادہ افادہ سے، اور "درآمد" کا عمل "برآمد" کے عمل سے بڑھا ہوا تھا، اور ایسا ہونا قدرتی امر بھی تھا، کہ ہندوستان میں دین اور علم دونوں ترکستان و ایران کے راستہ ہی سے پہونچے تھے۔

---

[1] "نزہۃ الخواطر" جلد ۴

ذہنی بے چینی اور اعتقادی انتشار خیال

لیکن دسویں صدی کا سیاسی، دینی و علمی جائزہ نامکمل رہے گا، اگر اس ذہنی بے چینی اور اعتقادی انتشار خیال کا ذکر نہ کیا جائے، جو اس دور میں ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں کہیں کہیں پایا جاتا تھا، تاکہ اس صدی کی صحیح صورت حال سامنے آجائے، اور یہ غلط فہمی نہ ہو کہ زندگی کے دریا میں جو ہزاروں میل کی مسافت میں بہہ رہا تھا، کامل سکون تھا، جس میں دین کی تعلیم و اشاعت، اور اخلاق و روحانیت کی تربیت و ترقی کی کشتی پورے اطمینان کے ساتھ چلائی جا سکتی تھی، اور اس کو کسی تلاطم یا بھنور کا کوئی اندیشہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو "احیاء و تجدید دین" کے بجائے اس دور کے لئے "تعلیم و تربیت" اور "نشر و اشاعت" کا عنوان زیادہ موزوں تھا، ہندوستان کے اسلام کے دینی و ثقافتی مرکز (حجاز مقدس اور مصر و شام و عراق) سے دور ہونے، اسلام کے یہاں ترکستان و ایران کا چکر کاٹ کر پہونچنے، عربی زبان کے رائج نہ ہونے، اور خاص طور پر علم حدیث کی (جس سے دین کی صحیح روح، سنت و بدعت کا فرق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی ضرورت کا احساس، اور صحیح دینی احتساب کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے) عدم اشاعت، حج اور طلب علم کے لئے باہر کے ملکوں کے سفر کی دشواریوں، اور اسلام کے حلقہ بگوشوں کا غیر مسلم اکثریت سے گھرے رہنے نے (جو اپنے مذہب میں سخت راسخ الاعتقاد، غیر اسلامی رسم و رواج کی سختی سے پابند اور حد درجہ توہم پرست تھی) ہندوستان کے مسلمانوں کو انتشار پسند دعوتوں، گمراہ کن فرقوں اور طالع آزما مذہبی پیشہ وروں کی آسان چراگاہ بنا دیا تھا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی تشیع کی وہ غالی اور جارحانہ شکل تھی، جو ایرانیوں کے اثر سے

جنوبی ہند کے بعض مقامات اور کشمیر میں پیدا ہوئی، دسویں صدی کے وسط میں احمد نگر کے والئ سلطنت برہان نظام شاہ نے شیخ طاہر بن رضی اسماعیلی قزوینی کے اثر سے (جو ایران سے شاہ اسماعیل صفوی کے خوف سے بھاگ کر احمد نگر آئے تھے) تشیع قبول کیا، اور اس میں بڑا مبالغہ کیا، یہاں تک کہ مساجد، خانقاہوں، بازاروں اور سڑکوں پر خلفاءِ ثلاثہ پر علی الاعلان تبرا کرنے کا حکم دیا، اس خدمت کے انجام دینے والوں کے بڑے بڑے مشاہرے مقرر کئے، اہل سنت میں سے بہت سے رئوں کو قتل اور گرفتار کیا[1]، دوسری طرف میر شمس الدین عراقی کی کوشش سے کشمیر میں تشیع پھیلا، انھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی، کہتے ہیں کہ چونتیس[۳۴] ہزار ہندو شیعہ ہوگئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک جدید مذہب بھی ایجاد کیا جس کا نام نوربخشی تھا، اور فقہ میں ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کے مسائل نہ تو اہلِ سنت کے مسائل سے اتفاق رکھتے ہیں، نہ فرقۂ امامیہ کے مسائل کے مطابق ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد پڑی جس کا اعتقاد تھا کہ سید محمد نوربخش مہدی موعود تھے[2]۔

۹۵۰ھ میں فوجی مدد اور سلطنت ایران کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہمایوں عازم ایران ہوا، اس وقت ایران میں شاہ طہماسپ تخت نشین تھا، شاہ ایران نے ہمایوں سے مذہب تشیع قبول کرنے کی فرمائش کی، ہمایوں نے کہا کہ ایک پرچہ پر تمام معتقدات لکھدیئے جائیں، بادشاہ نے بطریق نقل اس کو پڑھ دیا[3]، بادشاہ کے تبدیلی مذہب کی اگرچہ کوئی مستند شہادت نہیں ہے لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ ایران کے قیام، شہنشاہ ایران کی فیاضانہ میزبانی و مسافر نوازی اور فراخدلانہ فوجی مدد سے ممنونیت و تشکر کے نتیجہ میں اس کے دل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ فرشتہ" از محمد قاسم بیجاپوری (مصنف فرقۂ اثنا عشریہ سے تعلق رکھتا تھا)

[2] ملاحظہ ہو "تاریخ فرشتہ" از محمد قاسم بیجاپوری۔ [3] منتخب التواریخ حصۂ اول ص ۴۴۵

میں مذہب اثنا عشری کے لئے وہ نرم گوشہ ضرور پیدا ہو گیا ہو گا، جو اس کے راسخ الاعتقاد تیموری اسلاف کے دل میں (جو راسخ الاعتقاد سنی حنفی تھے، اور ان میں سے بعض کا بعض مشائخ نقشبندیہ سے ارادت کا تعلق بھی تھا) پایا نہیں جاتا تھا، ہمایوں کی مدد کے لئے ایران سے امرائے قزلباش آئے تھے، ہمایوں خود نیک دل، شائستہ و مہذب انسان تھا، ہر وقت باوضو رہتا تھا، اللہ رسول کا نام بغیر طہارت کے نہیں لیتا تھا، کتب خانہ کے زینے سے جہاں اذان سن کر بیٹھ گیا تھا، پھسل کر گرا، اور ۱۵ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو وفات پائی۔

اس کے امرائے خاص، اور ارکان سلطنت میں بیرم خانخاناں بڑی خوبیوں اور کمالات کا امیر و سردار تھا، رقیق القلب، جمعہ و جماعت کا پابند، علماء و مشائخ کا قدردان تھا، لیکن تفضیلی تھا، اس کا مشہور شعر ہے ؎

شہے کہ بگذرد از نُہ سپہر، افسرِ او
اگر غلامِ علی نیست، خاک بر سرِ او

میر شریف آملی علوم حکمت میں مہارت تامہ رکھتا تھا، وہ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا، اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی، پہلے ۹۹۳ھ میں کابل، پھر ۹۹۹ھ میں بنگالہ کی صدارت کے عہدہ پر سرفراز کیا، اور اس کو اجمیر اور موہان میں جاگیر دی، "مآثر الامراء" کے مصنف خوافی خاں کے بیان کے مطابق وہ ملحدانہ خیالات رکھتا تھا، تصوف کو فلسفہ سے مخلوط کیا اور عینیت کا قائل تھا۔

ہندوستان میں دو تحریکیں سخت انتشار انگیز اور اسلامیت کے لئے خطرناک اور باعث تخریب تھیں، ان میں سے ایک ذکری عقیدہ اور فرقہ تھا، جس کی بنیاد نبوت محمدی کے الفِ اول پر اختتام، اور الف ثانی سے ایک نئی نبوت اور ہدایت کے آغاز پر ہے،

یہ تحریک بلوچستان میں پھلی پھولی، لیکن وہ جس شخص کو پیغمبر مانتی ہے، اس کے بقول اس کا ظہور ۹۷۷ھ میں بمقام اٹک ہوا، اس فرقہ کی کتاب "ذکری کون ہیں؟" کا مصنف بانی فرقۂ ذکریہ ملا محمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"آپ شب دوشنبہ بوقت بام (صبح) قطب شہر سے بطرف زمین بصورت انسانی و لباس فقیری اٹک کے پہاڑی علاقہ میں ایک اونچی پہاڑی پر ۹۷۷ھ میں قدم مبارک رکھ کر آشکار ہوئے"[1]

ذکری ملا محمد موصوف کو خاتم النبیین اور افضل الرسل، اور نور اولین و آخرین مانتے ہیں، موسیٰ نامہ قلمی میں ہے:۔

"حق تعالےٰ گفت اے موسیٰ بعد از مہدی پیغمبر دیگر نیا فریدم از اولین و آخرین ہمیں است کہ پیدا خواہم کرد"[2]

اس فرقہ کی کتابوں "معراج نامہ قلمی" "ثنائے مہدی" (مطبوعہ) "سفر نامہ مہدی" "ذکر الٰہی" وغیرہ میں ایسی صریح عبارتیں آئی ہیں، جن سے ملا محمد موصوف کی تنزیہ و تقدیس اور ان کے بارے میں ایسے مبالغہ آمیز عقائد کا اظہار ہوتا ہے، جن سے ان کی تمام انبیاء پر ترجیح اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فضیلت، اور جرأت افتراء و تخلیق، اور دجل و تلبیس کے عجیب نمونے ظاہر ہوتے ہیں، انھوں نے اپنا ایک مستقل کلمہ بھی وضع کیا تھا، جو "لا الٰہ الا اللہ نور پاک محمد مہدی رسول اللہ" تھا، نماز پڑھنے والوں کی تکفیر و تضحیک کرتے تھے[3] اسی طرح روزہ، حج، اور زکوٰۃ کے وہ منکر ہیں، بجائے حج بیت اللہ کے حج کوہ مراد کو ضروری سمجھتے تھے[4]، تاریخ خوانین بلوچ میں ہے کہ بلوچستان کے کچھ

---

[1] "ذکری کون ہیں؟" ص ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۱۸ [3] اعتقاد نامہ قلمی [4] ملاحظہ ہو ذکری مصنفین کی تصنیفات "ذکر توحید" (مطبوعہ) میں ذکری ہوں" تفسیر ذکر اللہ" (مطبوعہ) اور تصنیفات مذکورۃ الصدر، نیز ملاحظہ ہو بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر جس میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ ان کے اور اہل سنت کے عقائد میں بنیادی اختلاف ہے (ص ۱۱۶ مطبوعہ)

علاقوں میں ذکری جیسا خلاف اسلام مذہب جاری وساری تھا، اور وہ لوگ مسلمانوں کو نمازی کہہ کر قابل گردن زدنی گردانتے تھے، میر نصیر خاں اعظم نے ایک طرف شرع محمدی کا نفاذ اور اجرا فرمایا اور دوسری طرف ذکریوں کی اسلام دشمنی اور شرک پروری کے خلاف خون آشام سلسلۂ جہاد جاری رکھا تا آنکہ بڑے بڑے خون ریز اور فیصلہ کن معرکوں کے بعد اس بدعت کی مکمل طور پر بیخ کنی کی گئی[1] الخ

ہندوستان میں دوسرا مشتبہ فرقہ فرقۂ روشنائیہ تھا، افغانوں کی زوال پذیر طاقت کو سہارا دینے اور مغلوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کے لئے فرقۂ روشنائیہ نے جو اہم کردار ادا کیا[2]، اس نے اس عہد کے مصنفین کے بیانات کو محل غور اور محتاج تحقیق بنا دیا ہے کہ ان میں سیاسی اغراض کہاں تک کارفرما ہیں، اور تاریخی حقیقت کتنی ہے؟ اس فرقہ کے معتقدوں اور حامیوں اور اس کے مخالفین کے بیانات میں اتنا تضاد ہے کہ ایک بانی فرقہ کو "پیر روشن" کے نام سے یاد کرتا ہے، اور دوسرا "پیر تاریک" کہتا ہے، اس فرقہ کے بانی بایزید انصاری تھے، جو پیر روشاں (یا روشن) بھی کہلاتے ہیں، ان کے والد کا نام عبداللہ تھا، جالندھر میں ۹۳۱ھ میں (بابر کی سلطنت سے ایک سال قبل) پیدا ہوئے، ان کا بچپن اور عنفوان شباب خاندانی کشمکش اور بزرگوں کی بے توجہی میں گزرا، اور اس کی وجہ سے تعلیم ادھوری رہ گئی، کسی سفر کے

---

[1] تاریخ بلوچ، اس مضمون میں رسالہ "الحق" (اکوڑہ خٹک) کے ۱۹۷۹ء کے شمارہ کے ایک مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے، جو مولانا عبدالحق صاحب صدر مدرس دارالعلوم تربت بلوچستان کے قلم سے ہے، نیز ملاحظہ ہو ذکری مذہب کا تفصیلی جائزہ "الحق" جنوری ۱۹۸۰ء

[2] اس عہد میں تصوف کا جو اثر اور اس کی غیر معمولی مقبولیت تھی، اس کو دیکھتے ہوئے بعض دور اندیشوں اور حوصلہ مندوں کا یہ خیال مستبعد نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس کو پٹھانوں کی شیرازہ بندی کا ذریعہ بنا کر اور انھیں ایک مذہبی تحریک کے پرچم تلے جمع کر کے مغلیہ حکومت کے خلاف آمادۂ جنگ کیا جا سکتا ہے، اور اس سے افغانوں کے زائل شدہ اقتدار کو واپس لایا جا سکتا ہے۔

دوران (بعض روایات کے مطابق) ان کی ملاقات سلیمان اسماعیلی سے ہوئی، جوگیوں کی صحبت کا حاصل ہونا بھی بیان کیا جاتا ہے، ان کے تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق انھیں خواب نظر آنے لگے اور عالم غیب سے آوازیں سنائی دینے لگیں، وہ ذکر خفی میں منہمک ہوگئے، اور کچھ عرصہ کے بعد اسم اعظم کے ورد میں ان کو استغراق ہوا، جب وہ اکتالیسویں برس کو پہونچے تو انھیں ہاتف نے ندا دی کہ اب انھیں طہارت شرعی کو ترک کر دینا چاہیئے، اور مسلمانوں کی نماز کی جگہ انبیاء کی نماز پڑھنا چاہیئے[1]، اس کے بعد وہ سب کو مشرک و منافق سمجھنے لگے، اور چلہ کشی شروع کر دی، اس کے بعد انھیں علانیہ طور پر تبلیغ کرنے کا حکم ملا، دعوائے مہدویت اور الہام ربانی کا بھی ان پر الزام ہے[2]، ان کے مریدوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہونے لگی، انھوں نے بعض کو اپنا خلیفہ مقرر کیا، تاکہ وہ تبلیغ کے کام کو اور زیادہ وسیع کریں۔

لیکن ان کی تصنیف "صراط التوحید" میں ان کی جو تعلیمات آئی ہیں، وہ تصوف کی مائل بافراط تعلیمات اور غالی خود شناسی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، جو کسی شیخ کامل اور کتاب و سنت کے علم راسخ کے بغیر اکثر بطور خود ریاضت کرنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہے، اور ان کے بعض اصول و عقائد بیان کئے گئے ہیں، وہ غالباً ان کے ضوابط جنگ ہیں، جو اس زمانہ سے متعلق ہیں، جب وہ مغلوں اور اپنے مخالف افغان قبائل سے برسر پیکار تھے۔

انھوں نے پشاور کے علاقہ میں متعدد افغانی قبائل کو اپنا معتقد و مرید بنا لیا، ہندیوں میں اپنا تبلیغی کام شروع کیا، سندھیوں اور بلوچیوں میں بھی ان کا اثر پھیلنا شروع ہوا، پیروں

---

[1] لیکن خود شیخ بایزید نے اپنی کتاب "مقصود المؤمنین" میں لکھا ہے کہ "شریعت درخت کی چھال کی مانند ہے، اور درخت کی بقا چھال کے بغیر ناممکن ہے" ص ۴۴ نسخہ قلمی کتب خانہ جامعہ پنجاب۔ [2] شیخ بایزید نے خود اس بات کی تردید کی ہے کہ وہ مہدی ہیں، جیسا کہ اس مباحثہ کی سرگذشت میں موجود ہے، جو ان کے اور کابل کے قاضی خاں کے درمیان ہوا تھا، نسخہ قلمی جامعہ پنجاب۔

اور علماء کی انتہائی مخالفت کے باوجود ان کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی، شیخ بایزید نے اپنے داعی اور مبلغ ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں، امراء و علماء کے پاس بھیجے، ان میں سے ایک شہنشاہ اکبر کے دربار میں بھی آیا، ان کی زندگی کے آخری ڈھائی سال مغلوں سے جنگ میں گزرے اور ۹۸۰ھ میں کالاپانی کے مقام پر ان کا انتقال ہوگیا، اور ہشت نگر میں دفن ہوئے، ان کی تصنیفات میں سے تین[۳] کتابیں (خیر البیان، مقصود المؤمنین، صراط التوحید) موجود ہیں، جس میں انھوں نے اپنے بنا کردہ فرقہ کے اصول و عقائد کو بیان کیا ہے، ان میں سے "خیر البیان" اور "مقصود المؤمنین" ان کے ماننے والوں کے نزدیک نیم مقدس کتابوں کا حکم رکھتی تھیں، ان کے سب سے بڑے مخالف اخوند درویزہ تھے، جو سید علی ترمذی المعروف بہ پیر بابا (م ۹۹۱ھ) کے مرید تھے، انھوں نے ان کی تردید میں کتاب "مخزن الاسلام" لکھی، "حال نامہ پیر دستگیر" (فارسی) شیخ بایزید کی خود نوشت سوانح حیات ہے، اس کو علی محمد مخلص نے اضافوں کے ساتھ مرتب کیا۔

اندرونی اور بیرونی جنگوں کی وجہ سے خستہ حال ہو کر نیز علماء کی شدید مخالفت کے باعث اور اس لئے بھی کہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں تتر بتر ہو گئے، اس فرقہ کے افراد کم ہوتے ہوتے بالآخر تقریباً ناپید ہو گئے[۱]۔

"داستان ترکتازان ہند" کا مصنف مرزا نصر اللہ خاں فدائی دولت یار جنگ اس فرقہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"روشنائی اس فرقہ کا نام ہے، جس کی بایزید نامی ایک شخص نے جو اہل ہند میں سے تھا بنیاد ڈالی، اس نے افغانوں میں جا کر پیغمبری کا دعویٰ کیا، اور اپنے کو پیغمبر روشنائی کہلایا، اور ان کو اپنا پیرو

---

[۱] مستفاد از مقالہ پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم مشمولہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۴۔

بنایا، انھوں نے آسمانی صحیفوں کو جواب دیا اور خدا کی عبادت ترک کی، اس کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحدۃ الوجود کا قائل تھا[1]، اور اس کا عقیدہ تھا کہ اس واجب الوجود کے سوا کسی کا وجود نہیں، پیغمبر عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کرتا تھا، وہ لوگوں کو بشارت سناتا تھا کہ وہ دن قریب ہے کہ پورا کرۂ ارض ان کے زیر تصرف ہوگا۔

حالنامہ نوشتۂ بایزید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو الہام ہوتا تھا، اور جبریل ان پر نزول کرتے تھے، اللہ نے ان کو نبوت سے سرفراز کیا، وہ خود اپنے کو نبی سمجھتے تھے، نماز پڑھتے تھے، لیکن قبلہ کا تعین ضروری نہیں سمجھتے تھے "فأینما تولوا فثمّ وجہ اللہ" سے استدلال کرتے تھے، پانی سے غسل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے، اپنے مخالفین کا قتل جائز سمجھتے تھے[2]"

مصنف نے اس سلسلہ میں ان کے بعض ایسے اقوال بھی نقل کئے ہیں، جو عارفانہ اور متصوفانہ ہیں، اور جن میں کوئی قدح نہیں کی جاسکتی، لیکن اسی کے ساتھ خلاف اسلام خیالات بھی ہیں:۔

"ان کے یہاں خود شناسی وخدا شناسی سب سے اہم چیز تھی، اگر ہندو کو خود شناس دیکھتے تو مسلمان پر ترجیح دیتے، مسلمانوں سے جزیہ لیتے، خمس بیت المال میں داخل کرتے، اور اہلِ حاجت پر تقسیم کرتے، ان کے سب فرزند فسق وفجور سے مجتنب، اور ظلم وستم سے بہت دور تھے، عربی، فارسی، ہندی، اور پشتو میں ان کی متعدد تصانیف ہیں، ان کی ایک کتاب "خیر البیان" ہے، جو چار[4] زبانوں میں ہے، اور وہ حق تعالیٰ کا براہ راست ان کو خطاب اور ان کے عقیدہ میں آسمانی کتاب ہے[3]"

---

[1] اس عہد میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی، صوفیا ومشائخ کی اکثریت (کم سے کم ہندوستان میں) اس عقیدہ میں غلو رکھتی تھی۔ (مصنف) [2] ص ۳۰۴-۳۰۵ [3] منقول از حالنامہ بایزید در دبستان مذاہب ملا محسن خانی ص ۳۰۶-۳۰۹۔

معاصر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیر بایزید نے افغانوں کی ایک بڑی طاقت مہیا کرلی تھی، اور کوہ سلیمان کو مستقر بنا کر درۂ خیبر پر بھی قبضہ کرلیا تھا، اور پاس پڑوس پر بھی حملہ کرنے لگے تھے، اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے اکبر نے ایک فوج بھیجی لیکن وہ اس کا استیصال نہ کرسکی بایزید کے انتقال کے بعد اس کے فرزند اور جانشین سلطنت مغلیہ کے لئے خطرہ بنے رہے، راجہ مان سنگھ، بیربل اور زین خاں بھی ان کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوئے، اور بیربل تو ایک مقابلہ میں مارا گیا، مان سنگھ ۹۹۵ھ کے حملہ میں بھی روشنائیوں کے مقابلہ میں ناکام رہا، یہ فتنہ شاہجہاں کے عہد ۱۰۵۸ھ میں ختم ہوا[1]۔

مہدویت

اس عہد کی سب سے زلزلہ انگیز تحریک، تحریک مہدویت تھی، جس کے بانی سید محمد (ابن یوسف) جونپوری (ولادت ۸۴۷ھ) کی وفات اگرچہ دسویں صدی کی ابتدا (۹۱۰ھ) میں ہوگئی تھی، لیکن اس کے اثرات دسویں صدی کے اخیر تک باقی رہے، غیر جانب دارانہ تاریخی مطالعہ کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دو تین صدیوں کے اندر کوئی دینی دعوت اور تحریک اس تحتی براعظم (بشمول افغانستان) میں اتنے وسیع پیمانہ، اور اتنے گہرے اور طاقتور طریقہ پر مسلم معاشرہ پر اثر انداز نہیں ہوئی جتنی کہ یہ دعوت و تحریک، موافقت و مخالفت میں معاصر اور بعد کے مؤرخین و مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے مطالعہ سے ہم ان نتائج تک پہونچتے ہیں:-

(۱) سید محمد جونپوری باطنی اور خلقی طور پر ان عالی استعداد اور قوی الباطن لوگوں

---

[1] ملخص از داستان ترکتازان ہند۔

یں تھے، جو زمانۂ دراز کے بعد پیدا ہوتے ہیں، وہ عنفوان شباب ہی میں بڑے جری و شجاع، اپنے ماحول اور دَور کے حالات سے غیر مطمئن، بے محابا امر بالمعروف نہی عن المنکر اور منکرات شرعی پر زجر و توبیخ کرنے والے تھے، اور اسی وجہ سے اسی زمانہ میں ان کو اسد العلماء کا خطاب دیا گیا تھا، سلوک کی تعلیم شیخ دانیال[1] سے حاصل کی، اور شدید ریاضت و مجاہدہ کیا، پہاڑوں اور وادیوں میں عرصہ تک گوشہ نشینی اختیار کی، جس کا اکثر نتیجہ (بالخصوص جب شیخ کامل کی نگرانی اور رہنمائی حاصل نہ ہو) ایسے واردات و اشارات ہوتے ہیں، جن سے لغزش کا اندیشہ، اور بعض اوقات غلط یقین کا حصول ہوتا ہے، اور ایسا شخص جو مقام تحقیق و رسوخ کو نہ پہونچا ہو، الفاظ کو غلط محمل پر حمل، اور اشارات غیبی کو غلط معنی میں سمجھ سکتا ہے، چنانچہ انھوں نے اسی دوران کسی سفر میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، اس کے بعد بھی متعدد بار مختلف مقامات پر اپنے "مہدی موعود" ہونے کا اعلان کیا، اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی۔

(۲) وہ کثرت ریاضت، قوت باطنی اور جذبۂ امر بالمعروف کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے صاحبِ تاثیر تھے، ان کی شخصیت و صحبت، ان کی گفتگو اور بیان سامعین و حاضرین پر جادو کا اثر رکھتا تھا، اور سلاطین و امراء سے لے کر عوام و خواص تک سب پر بے خودی، اور خود فراموشی طاری ہو جاتی تھی، اور ان کے لئے بڑے سے بڑے منصبوں اور جاہ و حشمت کو خیرباد کہہ کے، ترک دنیا اور ترک وطن کر کے ان کے ہمرکاب ہو جانا، اور اپنے کو ان کے حوالہ کر دینا آسان ہو جاتا تھا، دار الحکومت مانڈو میں یہی غیاث الدین شاہ خلجی کے ساتھ پیش آیا، اور یہی جانپانیر گجرات میں محمود شاہ گجراتی پر اثر ہوا، یہی احمد نگر، احمد آباد، بیدر

[1] افسوس ہے کہ کتب تراجم و تذکرہ میں ان کے حالات نہیں ملتے۔

اور گلبرگہ میں دیکھنے میں آیا، ایک خلقت کی خلقت نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، اور ہزاروں آدمی ان کے قافلہ میں شامل ہوگئے، سندھ کے علاقہ میں بھی ایک شہر آشوب کا منظر نظر آیا، اور لوگوں کو تھامنا مشکل ہوگیا، قندھار میں بھی ان کے بیان نے قیامت برپا کردی، اور حاکم قندھار مرزا شاہ بیگ کا ان کی طرف میلان ہوگیا۔

(۳) ان کی زندگی ترک وتجرید، زہد واستغناء، قطع ماسوی اللہ کی زندگی تھی، اور سفر وحضر میں ان کے "دائرہ" میں اسی زہد وایثار، اور ذکر وعبادت کی فضا نظر آتی تھی، کھانا اور ہر چیز برابر برابر کسی کی خصوصیت کا لحاظ کئے بغیر تقسیم ہوتی تھی، اور اس میں خود ان کی اور ان کے گھر کے افراد کی رعایت نہیں ہوتی تھی، اس فضا سے کوئی نووارد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

(۴) اس دعوت نے متعدد ایسے بے لوث، سرفروش وخود فراموش داعی پیدا کردیئے تھے، جنھوں نے "کلمۃ حق عند سلطان جائر" کا فریضہ بڑی شجاعت اور قوت کے ساتھ ادا کیا، امر بالمعروف نہی عن المنکر کے سلسلہ میں سخت اذیتیں برداشت کیں، اور اس راہ میں ہنسی خوشی جان دی، انسان ان کے حالات پڑھ کر متاثر ہوئے اور سید محمد جونپوری کی تربیت اور صحبت کی تاثیر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مثال کے طور پر شیخ علا بن حسن البیانوی (شیخ علائی) (م ۹۵۷ھ) کے حالات ملاحظہ ہوں، جنھوں نے سلطان سلیم شاہ ابن شیر شاہ سوری کے دربار میں دعوت وتذکیر کا فرض انجام دیا، اور آداب شاہی اور کورنش کے بجائے سلام مسنون پر اکتفا کیا، اور دوسری مرتبہ سفر کی خستگی، اور طاعون کی بیماری کی حالت میں کوڑے کھائے، اور اس سے جانبر نہ ہونے پر ان کا جسم ہاتھی کے پاؤں سے باندھ دیا گیا، اور لشکر میں اس کو پھرایا گیا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ترجمہ شیخ علا بن حسن البیانوی "نزہۃ الخواطر" جلد ۴، یا منتخب التواریخ از ملا عبد القادر بدایونی

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

(۵) ان کی دعوت کے پانچ ارکان تھے، (۱) ترکِ دنیا (۲) عزلت عن الخلق (۳) ہجرت عن الوطن (۴) صحبت صدیقین (۵) دوام ذکر (حفظ انفاس کے طریقہ پر) وہ مشاہدہ الٰہی کو (خواہ وہ بچشم سر ہو یا بطریق قلب، بیداری میں ہو یا خواب میں) ضروری اور شرط ایمان قرار دیتے تھے۔

(۶) حالت سُکر میں، یا مفہوم و مراد صحیح طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر ان سے اپنی ذات کے متعلق متعدد بار اور صریح طریقہ پر ایسے اقوال اور دعاوی صادر ہوئے[1]، جن کی تاویل و توجیہ مشکل ہے، اور جنھوں نے ان کے متبعین کو (ابتدا میں ان کی نیت کتنی ہی صحیح اور ان کا جذبۂ دینی کتنا ہی قابل قدر ہو) آسانی کے ساتھ ایک مخالف جمہور، اور مخالف اہل سنت فرقہ کی شکل دے دی، جس نے ان اقوال کا سہارا لیا، اور ان پر اپنے عقیدہ کی بنیاد رکھی، بعد کے آنے والوں اور غالی معتقدین نے (جیسا کہ قاعدہ ہے) ان میں اور اضافہ کیا، اور ان کی تقدیس و تعظیم میں اتنا غلو سے کام لیا کہ ان کو انبیاء کا ہمسر، اور بعض سے افضل و برتر بنا دیا، اور بعض بعض انتہا پسندوں اور غالیوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہمسری و مساوات کے عقیدہ تک پہونچا دیا (اگرچہ سید محمد ان کے نزدیک بھی آپ کے پیرو اور دینِ محمدی کے تابع تھے) اور بعض نے یہاں تک غلو کیا، کہ "اگر کتاب و سنت ان کے کسی قول و فعل کے مخالف ہوں تو کتاب و سنت کا اعتبار نہیں" اسی طرح سے اس بارے میں بھی بہت غلو کیا گیا کہ جو مسلمان انوارِ الٰہی کا مشاہدہ اپنی آنکھ یا دل سے سوتے یا جاگتے

(باقی صـ۵۴ کا) مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مخصوص ادبی انداز میں شیخ علائی کی شہادت کی دل دوز داستان مفصل و موثر طریقہ پر بیان کی ہے (ملاحظہ ہو "تذکرہ" صـ۵۳ تا ۶۱)

[1] اور ایسے اقوال بہت سے غالی صوفیوں، اور شدید ریاضت کرنے والے عابدوں سے منقول ہیں۔

کبھی نہ کرے وہ مومن نہیں ہے، عام مسلمانوں اور اس فرقے کے درمیان یہ خلیج مرور زمانہ سے وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ مہدوی ایک الگ فرقہ بن کر اہل سنت والجماعت سے کٹ گئے، اور وہ مقاصد فوت ہو گئے جن کے لئے یہ تحریک شروع ہوئی تھی، اور جو غالباً اس تحریک کے بانی کے پیش نظر تھے۔

دسویں صدی کے وسط تک اس جماعت کے اثرات ہندوستان اور افغانستان پر قائم رہے، اور دکن میں اس کے پیروؤں کی کئی سلطنتیں قائم ہوئیں، دسویں صدی کے آخر میں مہدویوں کی طاقت اور تعداد میں جو اضافہ ہو چکا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسماعیل نظام شاہ بن برہان نظام شاہ ثانی کے زمانۂ حکومت (۹۹۶-۹۹۸ھ) میں جمال خاں مہدوی نے جو منصب داران صدہ میں سے تھا، احمد نگر میں مہمات شاہی کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اسماعیل نظام شاہ کو بھی (جو خوردسال تھا) اپنے مذہب میں لے آیا، تھوڑے زمانہ میں ہندوستان کے اطراف و جوانب سے طائفہ مہدویہ جمع ہو گیا، جمال خاں کے گرد و پیش دس ہزار کے قریب مہدوی جمع ہو گئے، اور اس نے احمد نگر کی سلطنت پر پورا تسلط حاصل کر لیا، جب برہان نظام شاہ جو باہر چلا گیا تھا، احمد نگر ۹۹۸ھ میں واپس ہوا تو اس نے مذہب مہدویہ کو جس کا رواج ہو گیا تھا، خارج کیا، اور سابق کی طرح مذہب اثنا عشری نے رواج پایا۔[1]

دسویں صدی کے اخیر میں مہدویت کی تحریک میں نمایاں ضعف پیدا ہوا، اس دعوت اور سید محمد جونپوری کے دعاوی اور زیادہ تر ان کے غالی معتقدین کے تشدد سے عقائد میں ایک تزلزل اور مسلم معاشرہ میں ایک انتشار اور اضطراب پیدا ہو رہا تھا، اس سے

---

[1] ملخص از تاریخ ہندوستان جلد چہارم از مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی۔

اس عہد کے علماء راسخین جو کتاب وسنت پر گہری نظر اور علوم دینیہ میں رسوخ تام رکھتے تھے، پریشان اور فکرمند تھے، اور وہ اس کو ایک بڑی ضلالت اور فتنہ کا پیش خیمہ سمجھنے لگے تھے، چنانچہ اس عہد کے سب سے بڑے عالم حدیث وسنت علامہ محمد طاہر پٹنی (سنہ ۹۱۳ھ بسنہ ۹۸۶ھ) مصنف "مجمع بحار الانوار" نے اس کی تردید اور انسداد کا بیڑا اٹھایا، اور یہ عہد کیا کہ جب تک اس بدعت کا (جس کے اثر میں پورا گجرات آگیا تھا) خاتمہ نہیں ہوجائے گا، وہ اس وقت تک پگڑی نہیں باندھیں گے، اکبر نے سنہ ۹۸۰ھ میں جب گجرات فتح کیا، اور علامہ محمد طاہر کی ملاقات ہوئی تو اپنے ہاتھ سے ان کے دستار باندھی، اور کہا کہ "دین کی وہ نصرت وحمایت، اور اس نئے فرقہ کا استئصال (جس کا آپ نے بیڑا اٹھایا تھا) میرے ذمہ ہے" اس نے مرزا عزیز الدین کو (جو اس کا رضاعی بھائی تھا) گجرات کا حاکم مقرر کیا، اور اس نے اس کام میں ان کی مدد کی، اور اس کے زمانہ میں ان کا زور کم ہوگیا لیکن جب مرزا عزیز اپنے اس منصب سے سبکدوش ہوا، اور اس کی جگہ پر عبدالرحیم خانخاناں کو گجرات کی عملداری ملی تو مہدویوں کو پھر طاقت حاصل ہوگئی، اور وہ میدان میں آگئے، پھر علامہ محمد طاہر نے پگڑی اتار دی اور دارالحکومت کا قصد کیا لیکن ان کے پیچھے پیچھے مہدویوں کی ایک جماعت بھی روانہ ہوئی، اور اُجّین پہونچتے پہونچتے ان کو شہید کر دیا۔[1]

بے چینی اور انتشار خیال کے اسباب

تاریخ وفلسفۂ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ ذہنی بے چینی، رد عمل کی جارحانہ تحریکیں، اور انتشار خیال پیدا ہونے کے قوی اسباب ومحرکات عام طور پر حسب ذیل ہوا کرتے ہیں۔

---

[1] "نزہۃ الخواطر" جلد ۴

(۱) معاشرہ کے قول و عمل اور عقیدہ و زندگی میں عدم مطابقت اور تضاد، جو بچپن اور ذکی الحس طبیعتوں میں شدید بے اطمینانی پیدا کرتا ہے، اور وہ ایک خاص مرحلہ پر پہونچ کر باغیانہ دعوتوں اور تحریکوں میں پناہ لیتی ہیں، اور اگر وہ خود کوئی تحریک نہیں پیدا کر سکتی ہیں، تو تشکک و ارتیاب کا شکار ہو جاتی ہیں، عام طور پر یہ تحریکیں بہت جلد غلو اور انتہا پسندی اختیار کر لیتی ہیں، اور خود اس فاسد اور کمزور معاشرہ سے زیادہ دینی حیثیت سے گمراہ، سیاسی حیثیت سے خطرناک، اور معاشرہ کے لئے انتشار انگیز بن جاتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں مال و دولت کی فراوانی، عہدوں اور منصبوں کی طمع اور ان میں مسابقت کے جذبہ نے یہ تضاد پیدا کر دیا تھا، اور دنیا داروں اور دنیا پرستوں کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا، جو دینی اور اخلاقی تعلیمات و اصول کو بالائے طاق رکھ کر حصول جاہ و منصب، یا لذت و تمتّع کے لئے ہر طرح کی بے عنوانی اور بے راہ روی اختیار کرنے لگا تھا، یہ طبقہ عام طور پر ایسے زمانہ میں پیدا ہوتا ہے، جب وسیع اور مستحکم سلطنتیں قائم ہو جاتی ہیں، اور امن و استقرار کا دور آتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوری خاندان کی حکومت کے آخری دور اور مغلیہ سلطنت کے قیام کے بعد ہندوستانی معاشرہ میں یہی کیفیت نمایاں ہو گئی تھی، اور بہت سے خلاف اسلام اور خلاف شریعت اعمال و رسوم اور آئین جاری ہو گئے تھے،[1] سلطنت اموی اور سلطنت عباسی میں بھی یہ طبقہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا تھا، اور اسی کو پہلی صدی ہجری کے آخر کے سب سے بڑے مصلح و داعی حضرت حسن بصری (م سنہ ۱۱۰ھ) "منافقین"

---

[1] تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سلیم شاہ (یا اسلام شاہ) کے زمانۂ حکومت میں ہر ولایت (یا سرکار) کے مستقر پر جمعہ کے دن تمام شاہی عہدیدار امراء جمع ہوتے تھے، اور ایک بلند شامیانہ میں کرسی پر سلطان سلیم شاہ کی جوتی رکھ کر اس کے روبرو سر جھکاتے تھے، اور مجموعۂ قوانین شاہی پڑھا جاتا تھا، (تاریخ ہند سید ہاشمی فرید آبادی جلد سوم صفحہ ۴۰)

کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

(۲) سلاطین وحکام کا استبداد، ان کی مطلق العنانی، جبر وتعدی، احکام شریعت سے چشم پوشی، اور کھلی ہوئی نفس پرستی، جو دینی حوصلہ مندوں کو انقلابی تحریک اور بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے۔

(۳) رسمیت اور ظاہر پرستی جب اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے، معاشرہ اخلاقی و ذہنی انحطاط اور علمی حلقے سخت ترین جمود کا شکار ہو جاتے ہیں[1]، اور نظام تعلیم بے روح، حقیقت پسندی سے دور، اور ذہنی طبیعتوں کو تسکین و تسلی دینے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے، تو لوگ ایسی تحریکوں میں اپنے ذہن کی تسکین کا سامان پاتے ہیں، (جو غلط یا صحیح طریقہ پر) اس محدود دائرہ سے باہر قدم نکالتی ہیں، کتاب وسنت کی تعلیم سے غفلت اور حدیث سے ناواقفیت بھی اس کا ایک اہم سبب اور قوی محرک ہے، جس سے ہر دور میں دین کا صحیح مزاج پیدا ہوتا ہے، اور جس سے اس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ امت کے فہم وعمل میں اصل دین

---

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس عہد کی تصویر کھینچتے ہوئے اور مرض کی صحیح تشخیص کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"مسلمانوں کی عام سماجی اور اخلاقی حالت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی تھی، افسانۂ شاہاں اور تاریخ داؤدی میں جن قصوں کو عجائب روزگار بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ اخلاقی پستی اور اعتقاد کی زبوں حالی کے آئینہ دار ہیں فقیروں کی عیاشانہ زندگی، طالب علموں کی بے راہ روی، تعویذ گنڈوں میں بے جا اعتقاد، جنوں اور دیوؤں کے قصے، چراغ سلیماں کی داستانیں کسی مضبوط معاشرہ یا محکم اخلاقی نظام میں اس طرح عام نہیں ہو سکتی تھیں، حقیقت میں مہدوی تحریک اسی ذہنی انحطاط اور مذہبی جمود کو دور کرانے کی ایک کوشش تھی"۔

("سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" ص ۴۵۱)

اسوۂ رسول اور طریقۂ صحابہ وتابعین سے کتنا بُعد اور انحراف پیدا ہوگیا۔

(۴) کسی ایسی دینی شخصیت کا فقدان جو ذہنی و باطنی دونوں حیثیتوں سے عام سطح سے بلند، طاقتور و دلآویز شخصیت اور مؤثر و طاقتور روحانیت کی مالک ہو، اور جو ذہن کی بے چینی، روح کی بیتابی کو دور، اور معاشرہ کے تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک سکے، اور اسلام کی ابدیت، شریعت محمدی کی صداقت اور کمال و ترقی کے وسیع امکانات پر نیا یقین و اعتماد پیدا کر سکے۔

دسویں صدی کی تاریخ کے مطالعہ سے، (تراجم و تذکرے کی کتابوں، اور حوادث و واقعات کی روئیدادوں کی مدد سے) معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں اس بے چینی اور انتشارِ خیال کے یہ قدرتی اسباب پچھلی صدیوں کے مقابلہ میں بڑھ گئے تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ذہنی بے چینی، اور انتشار انگیز تحریکیں اس صدی میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

دسویں صدی کا فتنۂ کبریٰ

"الف ثانی" سے ایک نئے نظام عالم کے آغاز کا مغالطہ

الف ثانی کا مغالطہ

دسویں صدی ہجری اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے اختتام پر اسلامی تقویم کے ایک ہزار سال کی تکمیل اور دوسرے ہزار سال (الف ثانی) کا آغاز ہوتا ہے، عام حالات میں یہ تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی، دنیا کی طویل عمر اور حیات انسانی کی وسیع تقویم میں جس طرح ہر صدی پر ایک ورق الٹتا ہے، ایک ہزار سال پر بھی گیارہویں صدی کا نیا ورق الٹنے والا تھا، لیکن جب ذہنوں میں شدید قسم کا انتشار، عقائد میں عظیم تزلزل، دین کی صحیح تعلیم اور کتاب و سنت کے علم سے نہ صرف غفلت و جہالت بلکہ وحشت و نفرت ہو، اہلِ یونان کے علوم کو عقل انسانی کی آخری منزل قرار دیا جائے، اور انھیں کا نام "حکمت" "علوم دانشمندی" اور انسانی علوم و کمالات کے وسیع آفاق میں "الافق المبین"[1] قرار دیا جائے، بات کا بتنگڑ بنا لینا، اور رائی کا پربت کھڑا کر لینا، نظام تعلیم، نصابِ درس اور علمی حلقوں کا کمال سمجھا جائے، علوم نبوت، صحف آسمانی، وحی و تنزیل اور نصوص قرآنی کی تضحیک و تحقیر کی جائے، اور ان پر ایمان لانے کو

---

[1] ملا باقر داماد کی کتاب "الافق المبین" کی تلمیح۔

جہل، کورانہ تقلید، اور عقل دشمنی کا مرادف قرار دیا جائے، پھر اس کے ساتھ اس وقت کی حکومتوں اور سیاسی نظاموں سے (جو غلط اور صحیح طریقہ پر مذہب کا سہارا لیتے تھے، اور اس کو اپنے اقتدار کا پشت پناہ سمجھتے تھے) بیزاری بھی بغاوت واشتعال کی حد تک پہونچ گئی ہو، پھر سونے پر سہاگہ جب ایسے حوصلہ منداور طالع آزما افراد پیدا ہوجائیں، جو ذہانت اور اس وقت کے علم وحکمت سے مسلح بھی ہوں، اور وہ نئے دور کا بانی ورہنما، اور احترام واقتدار کا مالک ہونے کے سہانے خواب بھی دیکھنے لگیں، اور ان کے دل ودماغ میں یہ تمنا کروٹیں لینے لگے، کہ ماہ وسال کی گردش سے وہ بھی وہی فائدہ اٹھائیں جو پچھلے پیشوایانِ مذاہب نے (ان کے یقول) اٹھایا، اور ان کی تحریک ودعوت سے قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں ایک نئی تقویم کا آغاز ہوا، جس کی ان کے خیال میں سب سے کامیاب اور مکمل شکل اس عہد کا آغاز تھا، جو بعثت محمدی اور ظہور اسلام سے عرب میں شروع ہوتا ہے اور ساری دنیا کو اپنے سایہ میں لے لیتا ہے، ان کے نزدیک اس دین کی تاریخ اور دنیا کی تقویم میں الف اول کا ختم ہونا اور الف ثانی کا شروع ہونا ایک اہم حادثہ اور ایسا زرّیں موقعہ ہے، جو جلد جلد اور بار بار ہاتھ نہیں آتا، اور اگر اس کو گنوا دیا جائے گا تو پھر ایک ہزار سال کا انتظار کرنا پڑے گا، اس لئے اس موقعہ کو کسی طرح سے جانے نہیں دینا چاہیئے، ورنہ صدیوں کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

دسویں صدی کے نصف آخر میں ہمیں عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں اور خاص طور پر اس کے سب سے بے چین، طباع، اور تخلیقی واختراعی صلاحیت رکھنے والے خطہ ایران میں (جس کو بہت سی مماثلتوں کی بنا پر مشرق کا یونان کہنا صحیح ہوگا) اس خیال کے عکس نظر آتے ہیں، ظہور اسلام کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک ہزار سال پورے ہو رہے تھے، اور دوسرا ہزار شروع ہونے کو جارہا تھا، ہر صدی کے سر پر مجدّد کا ظاہر ہونا، حدیث سے ثابت ہوتا ہے، اور

تاریخ بھی اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے، اس لئے بعض ذہین لوگ دوسرے ہزار سال کے شروع ہونے پر مجدّد سے زیادہ دینِ جدید کے موسّس اور عالم کے نئے دور کے فاتح کے ظہور کے خواب دیکھنے لگے تھے، اور ان میں بہت سے منچلے لوگوں نے اپنا نام اس منصب کے امیدواروں کی فہرست میں لکھانے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی، افسوس ہے کہ اس دور کی کوئی ذہنی و فکری تاریخ مرتب نہیں کی گئی جس میں اس عہد کے قلب و دماغ، جذبات و خیالات، تمناؤں اور آرزوؤں کی پرچھائیاں نظر آئیں، پہلے اور پچھلے دوروں کی طرح سب تاریخیں "سرکار دربار" کے گرد گھومتی ہیں، اور ان میں زیادہ تر انقلابات سلطنت، فتح و ہزیمت، بادشاہوں کی داد و دہش، اہلکاران سلطنت کے عزل و نصب، اور امراء کے عیش و عشرت کی داستانیں، اور رزم و بزم کے افسانے ملتے ہیں، اگر دسویں صدی کے عالم اسلام کی کوئی فکری تاریخ ہوتی تو ہمیں صاف نظر آتا کہ الف ثانی کے قریب کتنے دلوں میں تمنائے خام کے چراغ روشن کر دیئے تھے، اور انھوں نے ایک نئی مسندِ پیشوائی اور ایک نئی سیادت و قیادت کا خیمہ نصب کرنے کے لئے چوب اور طنابیں مہیا کرنی شروع کر دی تھیں۔

صفوی حکومت کے قیام کے بعد جس نے شیعیت کو حکومت کی طاقت اور اقبال سے سارے ایران کا مذہب بنا دیا تھا، اور اگرچہ اس سلطنت کے بانیوں کے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین مسلکاً و ذوقاً صوفی تھے، لیکن شیعیت کو چونکہ تصوف سے بیر ہے، اس کے دور اقتدار میں اس ایران میں جس نے امام غزالی طوسی، شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری، مولانا جلال الدین رومی[1]، اور مولانا عبدالرحمٰن جامی جیسے عارف و محقق پیدا کئے تھے، اور جس سے بغداد و دہلی و اجمیر کو پیران پیر سیدنا عبدالقادر جیلانی، شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی، خواجۂ بزرگ شیخ معین الدین چشتی، اور شہید عشق خواجہ قطب الدین بختیار کعکی اوشی میسر آئے تھے، تصوف کا چراغ بالکل گُل ہو گیا، دوسری طرف کتاب و سنت کا

---

[1] آپ اصلاً بلخ واقع خراسان کے رہنے والے تھے، حال واقع ملک افغانستان۔

وہ علم اور فنِ حدیث جس کا ایران بڑا مرکز رہ چکا تھا، اور جس نے تاریخ اسلام کو مسلم بن الحجاج القشیری نیشاپوری، ابوعیسیٰ ترمذی، ابوداؤد سجستانی، ابن ماجہ قزوینی، اور حافظ ابوعبدالرحمٰن نسائی جیسے امام حدیث اور مصنفین صحاح عطا کئے، وہ اب کتاب و سنت، اور علم حدیث سے بالکل بیگانہ اور تہی دامن تھا، اب اس کے علم کا تمام تر سرمایہ، اور اس کے امتیاز و تفوق کا میدان یونانی علوم و حکمت (فلسفہ و منطق) تھے، اس انقلاب نے جس نے نبی عربیؐ کے صحابۂ کرام، اور ان کی سنت و احادیث سے اس مردم خیز اسلامی ملک کا رشتہ پہلے ہی کاٹ دیا تھا، ملک کے ذہین اور طباع طبقہ کا رابطہ نبوت محمدی، عقیدۂ ختم نبوت، اور دین اسلام کے خلود و بقاء کے عقیدہ سے اگر منقطع نہیں کیا تو کمزور ضرور کر دیا، اور اگر اہلِ بیت کرام سے (شیعیت کی بنیاد پر) عقیدت و نسبت نہ ہوتی تو اس ملک کا مجوسیت، ماقبل اسلام کی تہذیب، اور شاہنامۂ فردوسی کے رستم و اسفندیار کے دور کی طرف واپس چلے جانے کا خطرہ تھا۔

ایسی حالت میں نویں اور دسویں صدی کے ایران میں انتشار انگیز تحریکوں، اور اسلام کے خلاف عقلی و فلسفی سازشوں کا پیدا ہونا خلاف قیاس اور خلاف توقع نہیں، جس کی سب سے ترقی یافتہ مثال نویں صدی کے اخیر اور دسویں صدی کے ابتدا کی نقطوی تحریک ہے، جو ایران کی اس بے چین روح کا بہترین مظہر ہے، جس نے کبھی مزدک کی شکل میں، کبھی مانی کے روپ میں، اور کبھی حسن بن صبّاح کے لباس میں ظہور کیا تھا، اور جو خالص ایک ملحدانہ تحریک ہے، بقول اسکندر منشی کے :-

آنطائفہ بمذہب حکماء عالم را قدیم	یہ فرقہ حکماء کے مذہب کے مطابق
شمردہ اند، و اصلاً اعتقاد بحشرِ اجساد و	عالم کو قدیم مانتا ہے، اجسام انسانی
قیامت ندارند، و مکافات حسن و قبح	کے دوبارہ زندہ ہونے اور حشر و نشر کا

اعمال را در عافیت و مذلت دنیا قرار دادہ، بہشت و دوزخ ہمانرا می شمارند۔[1]

مطلق عقیدہ نہیں رکھتا، اعمال کے حُسن و قُبح کی جزا و سزا کو دنیا کی راحت و ذلت کی شکل میں اسی کو بہشت و دوزخ سمجھتا ہے۔

شاہ نواز خاں ان کے متعلق لکھتا ہے :۔

علم نقطۂ الحاد و زندقہ و اباحت و توسیع مشرب ایشان مثل حکماء بقدم عالم گردند، و انکار حشر و قیامت نمایند، و مکافات حسن و قبح اعمال، و جنت و نار در عافیت و مذلت دنیا قرار دہند۔[2]

علم نقطۂ الحاد و زندقہ اباحت (سب کچھ جائز ہے) اور وسیع المشربی (سب صحیح ہے) کا نام ہے، حکماء قدیم کی طرح وہ قدم عالم کے قائل اور حشر و قیامت کے منکر ہیں، اعمال کے حسن و قبح کا انعام و سزا، اور جنت و دوزخ اسی دنیا کی خوشحالی اور تنگ حالی کو سمجھتے ہیں۔

وہ نظریۂ ارتقاء کے قائل ہیں، اور ان کا عقیدہ ہے کہ جمادات و نباتات ترقی کرتے کرتے انسان کے درجہ تک پہونچ جاتے ہیں[3]، نباتات کے اگنے میں قدرت خداوندی کا کوئی دخل نہیں، وہ محض کواکب و عناصر کی ترکیب کا عمل ہے[4]، قرآن پاک کو نبی کریم کی تصنیف

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی جلد ۲ صـ ۳۲۵ [2] مآثر الامراء جلد ۲ صـ ۶۱۹

[3] دبستان مذاہب صـ ۳۰۰

[4] مبلغ الرجال ورق ۲۷ الف نسخہ قلمی موجود مولانا آزاد کلیکشن مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

سمجھتے ہیں، اور مسائل شریعت کو اہل الرائے کا طبع زاد ، اس فرقہ کے پیرو نماز، حج، اور قربانی کا مذاق اڑاتے ہیں[1]، ماہ رمضان کا نام انھوں نے "ماہ گرسنگی و تشنگی" رکھا ہے، طہارت وغسل کے مسائل کی بھی تضحیک کرتے ہیں[2]، اور محرمات ابدیہ کی حرمت کے بھی قائل نہیں، وہ نقلیات کے منکر اور عقلیات کے داعی ہیں[3]۔

اس فرقہ کا بانی محمود پسیخوانی[4] کو بتایا جاتا ہے، اس فرقہ نے دسویں صدی ہجری میں ہندوستان وایران کے ہزاروں لوگوں کو متأثر کیا، اور ایران میں اس کے پیروؤں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی، نقطویوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اول ظہور سے محمود پسیخوانی تک آٹھ ہزار سال کی مدت ہوتی ہے، یہ دور عربوں کی سیادت کا دور تھا، کیونکہ اس مدت میں پیغمبر صرف عربوں ہی میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔

---

[1] ایضاً [2] ایضاً

[3] ایضاً، اس مضمون میں پروفیسر محمد اسلم کی کتاب "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" نیز ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی کتاب "تاریخی وادبی مطالعے" سے استفادہ کیا گیا ہے، مزید تفصیل اور مستند معلومات کے لئے ملاحظہ ہو "نقطویاں یا پسیخوانیاں" از ڈکٹر صادق کیا، [4] محمود پسیخوانی یا پسیخانی گیلانی نے استرآباد میں ۸۰۰ھ میں اس نئے مذہب کا اعلان کیا، ۸۳۲ھ میں اس کی وفات ہوئی، اس فرقہ کی بنیاد ایران میں نویں صدی ہجری کی بالکل ابتدا میں ہوئی، رفتہ رفتہ اس نے بڑا زور پکڑا، یہاں تک کہ دسویں صدی اور گیارہویں صدی میں ایران اور ہندوستان میں اس فرقہ کے پیروؤں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی تھی، اس فرقہ کو ملاحدہ تناسخیہ اور اہل زندقہ کے نام سے ایرانی مورخین اور مسلمان مصنفین نے یاد کیا ہے، اور چونکہ محمود کے نزدیک ہر چیز کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے، اور وہ خاک کو نقط کہتا ہے، یا اس لئے کہ اس نے مطالب قرآن کو اپنے خیال کو بیان کرنے میں حرفوں اور نقطوں کی تعداد سے مدد لی ہے، اس فرقہ کو نقطوی یا اہل نقط کہتے ہیں،

(ماخوذ باختصار از مضمون "فرقہ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر" مشمولہ "تاریخی وادبی مطالعے" از ڈاکٹر نذیر احمد)۔

محمود پسیخوانی کے ظہور سے عربوں کی سیادت ختم ہوگئی ہے[1]، لہذا آئندہ آٹھ ہزار سال تک پیغمبر عجمیوں ہی میں پیدا ہوا کریں گے[2]۔

نقطویوں کے عقائد کے سلسلہ میں جن کا کسی قدر یہاں بیان ہوا، ان کا یہ نظریہ بنیادی اور انقلابی اہمیت رکھتا ہے (اور ہماری اس بحث اور مجدد صاحب کے تجدیدی کارنامہ کا اس سے خاص تعلق ہے) کہ "مذہب اسلام منسوخ ہو چکا ہے، اس لئے محمود کا لایا ہوا دین قبول کئے بغیر چارہ نہیں" "دین اسلام کی میعاد ختم ہو چکی ہے، اس لئے اب نئے دین کی ضرورت ہے[3]" دسویں صدی میں اس عقیدہ کا ظہور و اعلان صاف اشارہ کرتا ہے کہ وہ اس عقیدہ الفی کے قائل ہیں، اور الف ثانی سے اپنا کام زور شور سے شروع کرنے والے ہیں، شاہ عباس صفوی نے ایران میں نقطوی مذہب کی پیروی کے الزام میں ہزاروں نقطویوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، بادشاہ اس معاملہ میں اپنے پیشروؤں سے زیادہ سخت واقع ہوا تھا، بادشاہ کی نظر میں اس سے زیادہ خطرناک کوئی دوسرا گروہ نہ تھا چنانچہ ۱۰۰۲ھ میں اس نے بڑے وسیع پیمانہ پر ان کا قتل عام کیا، اس قتل و غارتگری کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے نقطوی جان بچا کر ہندوستان بھاگ آئے، اس میں مولانا حیاتی کاشی بھی تھے، جو دو سال تک قید میں رہنے کے بعد شیراز آئے اور ۹۸۶ھ میں وطن میں کچھ دن قیام کر کے بالآخر ہندوستان چلے آئے، ۹۹۳ھ میں وہ احمد نگر میں موجود تھے، شریف آملی جو بڑا باکمال عالم تھا، اس فرقہ کے اکابر سے تعلق رکھتا تھا، وہ اپنے زمانہ کی سخت گیریوں سے تنگ آکر ہندوستان چلا آیا تھا، اکبر بادشاہ اس کے ساتھ

---

[1] محمود یا اس کے کسی پیرو کا شعر ہے ؎

رسید نوبت زندان عاقبت محمود — گذشت آنکہ کہ عرب طعنہ بر عجم میزد

[2] دبستان مذاہب ص ۳۰۱ — [3] ایضاً ص ۳۰۰

پیر جیسا سلوک کرتا تھا، بعض محققین کا خیال ہے کہ میر شریف آملی نے محمود پسیخوانی کی تحریروں سے ثبوت پیش کر کے اکبر کو دین نو کے اختراع کی ترغیب دی، اس نے محمود کی پیشگوئی بیان کی کہ سنہ ۹۹۰ھ میں ایک شخص ظاہر ہوگا جو دین باطل مٹا کر دین حق قائم کرے گا۔

بدایونی اور خواجہ کلاں[1] دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ شریف آملی نے ایران سے بھاگ کر بلخ میں مولانا محمد زاہد نبیرۂ شیخ حسین خوارزمی کی خانقاہ میں پناہ لی، اور صوفیوں کی طرح رہنے لگا، اس کی طبیعت کو چونکہ درویشی سے کوئی مناسبت نہ تھی، اس لئے اس نے ہرزہ سرائی اور شطاحی کو اپنا شعار بنا لیا، جب مولانا محمد زاہد کو اس کے عقائد معلوم ہوئے تو انھوں نے اس کو اپنی خانقاہ سے نکال دیا، اور وہ دکن چلا گیا۔

دکن میں ان دنوں شیعیت کا دور دورہ تھا، اس لئے لوگوں نے شریف آملی کو شیعی عالم سمجھتے ہوئے ہاتھوں ہاتھ لیا، جب لوگوں کو اس کے عقائد معلوم ہوئے تو وہ اس کے درپئے آزار ہوئے، بدایونی کے الفاظ میں :-

حکام دکن می خواستند کہ لوح ہستی	دکن کے حکام اس کا نقش حیات ہی
اورا از نقش حیات پاک سازند،	مٹا دینا چاہتے تھے، لیکن بعد ازاں
عاقبت بر سواری خر قرار یافتہ بر سوائی	انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے گدھے پر
تشہیرش نمودند[2]۔	بٹھا کر اس کی تشہیر کی جائے۔

اکبر نے ہزاری منصب دے کر اسے اپنے مقربین کے زمرہ میں شامل کر لیا[3]، بنگالہ میں اس کو دین الٰہی کا داعی مقرر کیا، اور وہ اکبر کے چار مخلص یاروں میں شامل تھا، دین الٰہی کے

---

[1] خواجہ عبید اللہ فرزند خواجہ باقی باللہ مصنف مبلغ الرجال۔ [2] منتخب التواریخ جلد ۲ صـ ۲۴۶

[3] مبلغ الرجال ورق ۳۲ ب

مریدوں اور معتقدوں کے سامنے اکبر کی وہ نیابت بھی کرتا تھا[1]" "مآثر الامراء" میں ہے "تصوف وحقائق بسیار ورزیدہ والحاد وزندقہ را بداں خلط دادہ، دعوائے "ہمہ اوست" می کرد وہمہ را اللہ می گفت"[2] ابوالفضل علامی کے متعلق بعض معاصر تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ وہ نقطوی تحریک سے متأثر تھا، شاہ عباس صفوی نے نصر آباد کاشان میں ممتاز ترین نقطوی داعی اور ذمہ دار میر سید احمد کاشی کو جب قتل کیا تو اس کے کاغذات کے ذخیرہ میں جن نقطویوں کے خطوط ملے، ان میں ابوالفضل کا بھی ایک خط تھا، معاصر تاریخ نویس اسکندر منشی "تاریخ عالم آرائے عباسی" میں لکھتا ہے :-

"ہندوستان سے آنے جانے والوں سے معلوم ہوا کہ ابوالفضل پسر شیخ مبارک بھی جو ہندوستان کے فضلاء میں ہے اور دربار اکبری میں بہت زیادہ تقرب حاصل کر چکا ہے اسی مذہب کا پیرو ہے اس نے اکبر بادشاہ کو وسیع المشرب بنا کر جادۂ شریعت سے منحرف کر دیا ہے اس کا خط جو میر احمد کاشی کے نام لکھا گیا تھا، اور جو میر مذکور کے کاغذات میں دستیاب ہوا ابوالفضل کے نقطوی ہونے پر دلالت کرتا ہے"[3]

خواجہ کلاں اپنی کتاب "مبلغ الرجال" میں محمود پسیخوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"شیخ ابوالفضل ناگوری بساط آں آئین خسارت قرین را در مملکت ہندوستان گسترد"[4]

ان تاریخی شہادتوں کے بعد اندازہ ہوتا ہے، کہ نقطوی فرقہ یا تحریک کے داعیوں اور علمبرداروں نے ہندوستان آکر الف ثانی کے لئے نئے دور، نئے دین اور نئے آئین کے لئے کس طرح ایک تخت اور مسند تیار کر رکھی تھی، جس پر مسند آرا ہونے کے لئے ایک بااختیار وطاقتور موزوں شخصیت درکار تھی، اور اس کے لئے ان کی نظر میں اکبر سے زیادہ کوئی اہل نہ تھا۔

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۴۵-۲۴۸ [2] مآثر الامراء جلد ۳ ص ۲۸۵ [3] مستفاد از مضمون "فرقہ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر" مندرجہ کتاب "تاریخی وادبی مطالعے" از ڈاکٹر نذیر احمد ص ۲۶۱ [4] مبلغ الرجال ورق ۳۱ نیز ملاحظہ ہو ورق ۳۲-۳۳

باب دوم

اکبری عہد حکومت اور اس کے دو متضاد دور

اکبر کی مذہبی اور دیندارانہ زندگی

عہد اکبری اور ہندوستان کے تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ اکبر کی تخت نشینی اور ابتدائی عہدِ حکومت نہ صرف ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے شروع ہوا، بلکہ خوش عقیدگی اور مذہبی غلو اور تقشُّف کے ساتھ اس کا آغاز ہوا، اس کے ثبوت کے لئے "دربار اکبری" کے مشہور مصنف و عالم اور عہد اکبری کے مورخ ملا عبد القادر بدایونی (م سنہ ۱۰۰۴ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب "منتخب التواریخ" سے منتخب کر کے عہد اکبری کے اس دور کے چند متفرق واقعات اور بادشاہ کے حالات نقل کئے جاتے ہیں، جب وہ اپنے اسلاف کی طرح ایک سیدھا سادہ خوش اعتقاد مسلمان تھا، اور دینی تعلیم بلکہ مطلق تعلیم نہ ہونے، ماحول کے اثر اور اپنے عہد کے رواج کے مطابق (جس میں مشائخ و مزارات کے بارے میں غلو، حد سے بڑھی ہوئی خوش عقیدگی اور بدعات عام تھیں) بزرگوں کے مزارات کے لئے طول طویل سفر (شدّ رحال) کرتا تھا، بدعقیدگی اور خلاف جمہور عقائد کے الزام پر سخت سزا دیتا تھا، اولیاء اللہ کے مزارات پر نذر گزرانتا تھا، خود ذکر میں انہماک کے ساتھ مشغول رہتا، علماء اور صلحاء کی صحبت میں وقت گزارتا،

اور مجلس سماع میں شرکت کرتا تھا۔

اکبر کی دینداری اور مذہبی غلو کی شہادت میں ملا عبدالقادر بدایونی کے بیانات نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے، اور اس سے اکبر کی تعریف نکلتی ہے، اور اس بارہ میں ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ و تصنیف میں کسی مخالفانہ جذبہ کے کام کرنے یا عناد کا کوئی سوال نہیں، البتہ اکبر کی زندگی کے دوسرے دور (دین الٰہی کے نظریہ کی اشاعت وحدت ادیان کے عقیدہ، اسلام سے بُعد و وحشت، مذاہب غیر کے بارہ میں حد سے بڑھی ہوئی رواداری اور اسلام کے بارے میں معاندانہ رویہ) کی شرح و تفصیل میں ہم ملا عبدالقادر کے بیانات نقل کرنے میں (جن کی صحت و استناد، اور ان کی تاریخی غیر جانبداری کے سلسلہ میں ان اخیر برسوں میں بعض حلقوں کی طرف سے بڑا شک و اشتباہ پیدا کر دیا گیا ہے[1]) حق بجانب ہیں۔

---

[1] اکبر کے دور ثانی کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی کے بیانات اور شہادتوں کو ان کے دینی تعصب اور اکبر سے ذاتی عناد و مخالفت پر محمول کرنے اور ان کی کتاب "منتخب التواریخ" کو مجروح و ساقط الاعتبار کرنے کی پچھلے برسوں سے جو مہم شروع ہوئی ہے، اس کی کوئی مثبت علمی بنیاد اور تاریخی ثبوت نہیں، اس الزام کی بنیاد بھی محض جذباتیت اکبر کی عظمت اور اس کو ہر طرح کے الزامات سے بری کرنے کے جذبہ (جو خاص تعلیم و تربیت اور ماحول و زمانہ کا نتیجہ اور ایک مقصد کے ماتحت تاریخ نویسی کا اثر ہے) سوء ظن اور منفی رویہ پر ہے، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر "منتخب التواریخ" کا مطالعہ کرے گا، وہ مصنف کے خلوص و صداقت، دردمندی اور جرأت مندانہ حق گوئی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کتب تاریخ کا وسیع مطالعہ کرنے والے کو تاریخ و افسانہ میں امتیاز کرنے اور مصنف اور اس کی کتاب کے پایہ کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ خود صرّاف کی طرح کھرے کھوٹے کا فرق سمجھنے لگتا ہے۔

الیٹ "منتخب التواریخ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں، جو بدایونی کی طرح

(باقی صـ۷۲ پر)

...احتیاط برتیں گے، اور تنہا ان کے بیانات پر انحصار نہیں کریں گے، بلکہ ان کو اکبر کے مخلص وفادار ارکان سلطنت، مؤرخین دربار اور اس عہد کے غیر جانبدار مؤرخوں کے بیانات اور شہادتوں کی محض تائید میں پیش کریں گے۔

"منتخب التواریخ" کے حسب ذیل بیانات ملاحظہ ہوں :-

"شہزادہ سلیم کی ولادت کے شکرانہ میں بادشاہ نے اجمیر کا پیادہ پا سفر کیا، واپسی میں دہلی میں پڑاؤ ڈالا، اور اولیائے دہلی کے مزارات کی زیارت کی"[1]

"اجودھن جاکر حضرت شیخ المشائخ فریدالدین گنج شکر کی زیارت کی، مرزا مقیم اصفہانی کو میر یعقوب کشمیری کے ساتھ رفض کے الزام میں سزا ملی"[2]

"اوائل شعبان میں بادشاہ نے اجمیر کا سفر کیا سات کوس سے پیادہ پا مزار پر حاضر ہوا، نقارہ نذر گزرانا، اہل اللہ علماء اور صلحاء کے ساتھ صحبت، اور مجلس سماع گرم رہی"[3]

"عبادت خانہ میں "یاہو" اور "یاہادی" کے ذکر میں انہماک رہتا تھا، (۹۸۰ھ میں ... عبادت خانہ کی تین عمارتوں کی تعمیر کا تفصیلی ذکر)[4]

"عبادت خانہ میں ہر شب جمعہ کو سادات و مشائخ، علماء و امراء کی طلبی ہوتی، بادشاہ خود ایک حلقہ میں آتا، اور مسائل کی تحقیق کرتا۔

اسی زمانہ میں قاضی جلال اور دوسرے علماء کو حکم ہوا کہ قرآن مجید کی تفسیر بیان کی جائے"[5]

(باقی صـ۷۱ کا) اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً جو شاہی کانوں کو ناگوار ہوں، یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس صفائی اور بے پروائی کے ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں" (الیٹ جلد ۵ صـ۴۸)

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ صـ۱۲۳ [2] ایضاً صـ۱۲۴ [3] ایضاً صـ۱۸۵ [4] ایضاً صـ۲۰۰-۲۰۱ [5] ایضاً صـ۲۱۱

۹۸۶ھ کے واقعات میں فتح پور سیکری میں عبادت خانہ میں علماء و مشائخ کی صحبت شب جمعہ کی شب بیداری کا ذکر آتا ہے۔

"جب خان زماں نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو اس کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے بادشاہ دہلی کے تمام اولیاء اللہ کے مزارات پر بغرض دعا حاضر ہوا"[1]

ماہم آنکہ کے تعمیر کردہ مدرسہ خیر المنازل کے پاس سے گزرتے ہوئے، فولاد نامی ایک شخص نے (شرف الدین حسین کے ایماء سے) بادشاہ پر ایک تیر چلایا، بادشاہ کو معمولی سا زخم آیا، جو چند روز کی مرہم پٹی سے درست ہو گیا، اس ناگہانی حملہ سے بچ نکلنے کو بقول بدایونی "از تنبیہات غیبی و کرامات پیران حضرت دہلی دانستہ" اولیاء دہلی کی کرامت سمجھا"[2]

"ایک بار اجمیر جاتے ہوئے اس عہد کے مشہور بزرگ شیخ نظام نارنولی (جن کے زہد و اتقا کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی) خدمت میں حاضر ہوا"[3]

"۹۸۰ھ میں اجمیر میں سید حسین خنگ سوار کے مزار پر اور اس کے چند سال بعد ہانسی میں حضرت قطب جمال کے مزار پر بڑی عقیدت و نیاز کے ساتھ حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی"[4]

"شیخ سلیم چشتی کے ساتھ عقیدت خاص تھی، ان کا روضہ بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا، اور اس عقیدت و محبت کی بناء پر ولی عہد سلطنت (جہانگیر) کا جو کہا جاتا ہے کہ ان کی دعا سے پیدا ہوا سلیم نام رکھا، بادشاہ نے سلیم کی ولادت سے قبل رانی جودھا بائی کو شیخ کے گھر بھیج دیا تھا، تاکہ ان کی توجہ اور دعا رانی کے شامل حال رہے"[5]

"اسی طرح شہزادہ مراد کی ولادت بھی شیخ ہی کے گھر میں ہوئی تھی"[6]

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۵۲ [2] ایضاً ص ۲۶۲ [3] ایضاً ص ۲۵۲

[4] ایضاً ص ۲۳۲ [5] ایضاً ص ۱۰۸ [6] ایضاً ص ۱۲۳

"شہزادہ سلیم جب مکتب نشینی کے قابل ہوا تو اس کی رسم تسمیہ خوانی کے لئے اپنے عہد کے مشہور محدث مولانا میر کلاں ہروی کو زحمت دی اور انھوں نے بادشاہ اور عمائدین سلطنت کی موجودگی میں شہزادہ کی بسم اللہ کرائی"[1]

"جب شہزادہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہوگیا تو اسے حکم دیا کہ شیخ عبدالنبی کے گھر جاکر ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کرے، اور اس نے مولانا جامی کی چہل حدیث ان سے پڑھی"[2]، اکبر کو شیخ عبدالنبی (نبیرۂ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی وصدر جہاں عہد اکبری) سے اتنی عقیدت تھی کہ اکثر وہ ان کے گھر جاکر ان کے درس میں شرکت کرتا، ایک دو مرتبہ ان کی جوتیاں بھی سیدھی کیں"[3]

"اکبر نے ان کے لئے کارخانہ شاہی میں خصوصی دوشالہ تیار کروایا، اور ملا عبدالقادر کے ہاتھ ان کی خدمت میں بھیجا، اور کہا کہ یہ آپ ہی کے لئے شاہی کارخانہ میں تیار ہوا ہے"[4]

"اس عہد کے مشہور شطاری شیخ شیخ محمد غوث گوالیاری کے گزارہ کے لئے ایک کروڑ (دام) سالانہ آمدنی کی جاگیر مخصوص کردی، ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند شیخ ضیاء اللہ کے ساتھ بھی نیازمندانہ طریقہ پر پیش آتا"[5]

"بزرگوں سے یہ عقیدت مندی اکبر کو موروثی طریقہ پر ملی تھی، اس کے تیموری آباء واجداد خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرار کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے، بابر کا دادا سلطان ابوسعید پاپیادہ ان کی خدمت میں جایا کرتا تھا، اور ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا، بابر کے والد عمر شیخ مرزا کو بھی خواجہ صاحب سے بڑی عقیدت تھی، خود بابر بھی اپنی تزک میں ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتا ہے، اکبر کے خاندان کی خواتین و بیگمات کے رشتے نقشبندیہ خاندان کے بزرگوں سے ہوئے، حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے اخلاف میں سے ایک بزرگ خواجہ یحییٰ ہندوستان

---

[1] ایضاً ص۱۰۱ [2] ایضاً ص۲۰۴ [3] ایضاً ص۲۰۴ [4] ایضاً ص۲۳۷ [5] ایضاً ص۲۰۲

تشریف لائے تو اکبر نے ان کا بڑا اعزاز کیا، ان کے مصارف کے لئے ایک جاگیر عطا کی، اور انھیں امیر حج بنا کر مکہ مکرمہ روانہ کیا، واپسی پر انھیں مستقل طور پر آگرہ میں ٹھہرالیا[۱]"

"اکبر نے ہفتہ کے سات دنوں کے لئے سات امام مقرر کر رکھے تھے، جو باری باری مقررہ دن میں نماز کی امامت کرتے تھے، بدھ کے روز کی امامت ملا عبدالقادر بدایونی سے متعلق تھی[۲]"

"ہر سال ایک بڑی تعداد کو سرکاری خرچ سے حج کے لئے بھیجتا تھا، امیر حاج کے ہاتھ شریف مکہ کے لئے تحائف اور اہل حرم کے لئے نقد و جنس بھیجتا تھا[۳]" قافلہ کی روانگی کے دن حاجیوں کی طرح احرام باندھ کر سر کے بال تھوڑے سے ترشوا کر تکبیر کہتا ہوا، ننگے سر، برہنہ پا دور تک انھیں رخصت کرنے جاتا، اِس منظر سے ایک شور برپا ہوتا، اور لوگوں پر رقت طاری ہوتی[۴]"

جب ہندوستان میں شاہ ابوتراب حجاز سے قدم رسول لے کر تشریف لائے، اور وہ آگرہ کے قریب پہونچے تو بادشاہ امراء، علماء کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ شہر سے چار کوس باہر نکل کر استقبال کے لئے گیا۔

آخر میں اس کی دینداری کی شہادتوں کو ہم عہد سلطنت مغلیہ کے مشہور مورخ میر عبدالرزاق خافی خاں معروف بہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں (۱۱۱۱ھ - ۱۱۷۱ھ) کی مشہور کتاب "مآثرالامراء" کے اس بیان پر ختم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

اکبر بادشاہ بہ ترغیب شیخ در اجراء احکام	اکبر بادشاہ احکام شرعیہ وامر معروف
شرعی وامر معروف ونہی منکر فراواں	ونہی منکر کے سلسلہ میں بڑی کوشش
جہدی فرمود و خود اذان می گفت	کرتا تھا، خود اذاں کہتا اور امامت
وامامت می کرد حتی بقصد ثواب	کرتا حتی کہ ثواب کی نیت سے مسجد

[۱] ایضاً ج ۳ ص ۱۰۰ [۲] ایضاً ج ۲ ص ۲۲۷ [۳] ایضاً ص ۲۵۱ [۴] ایضاً ص ۲۳۹

بمسجد جاروب می زد۔[1] میں جھاڑو بھی دیتا تھا۔

اکبر کے مزاج میں تغیر اور عہد اکبری کا دور ثانی[2]

اکبر کی دینداری اور مذہبی شغف کی اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں، پڑھنے والے ان سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ ایسی سطحی اور عامیانہ قسم کی مذہبیت تھی، جس کی بنیاد دین کے صحیح فہم، کتاب وسنت سے واقفیت اور براہ راست علم ومطالعہ پر نہیں تھی، اور وہ بجائے علمائے راسخین کی تعلیم اور صحیح دینی صحبت وتربیت کی رہینِ منت ہونے کے محض مذاق زمانہ، مزاج سپاہیانہ اور وسط ایشیاء کے دین سے ناواقف امراء واہل حکومت کی تقلید ونقالی، اور خوش عقیدگی بلکہ ضعیف الاعتقادی پر مبنی تھی، اس دینداری کا رکن اعظم مزارات پر حاضری دینا، کوسوں پیادہ پا چل کر وہاں آنا، وہاں کے سجادہ نشینوں کے ساتھ (جو اکثر بے علم، اسلاف کے کمالات سے عاری اور صحیح روحانیت سے خالی ہوتے تھے) اپنی نیازمندی اور فدویت کا اظہار، خانقاہوں کی جاروب کشی، مجالس ذکر وسماع میں شرکت، اور "درباری سرکاری" علماء ومشائخ کی

---

[1] مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۶۱

[2] بیان کیا جاتا ہے کہ جہانگیر نے چھوٹی توزک میں اکبر کے انتقال کا جو حال لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی غلط روی کا احساس ہوگیا تھا، اور اس نے کلمۂ شہادت پڑھ کر اس حالت میں جان دی کہ سورۂ یٰسین اور دعا پڑھی جارہی تھی، ہم کو اس باب میں اس سے بحث نہیں کہ خدا کا معاملہ اس کے ساتھ کیا رہا، اور وہ دنیا سے کس حال میں رخصت ہوا، ہمیں اس کے ان اقدامات اور کاروائیوں سے بحث ہے جو اس نے نئے دین وآئین کے جاری کرنے میں کیں اور ان اثرات سے جو ان کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں پر مرتب ہوئے۔

توقیر و تعظیم تھی، اکبر کے حالات سے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ وہ ناخواندۂ محض تھا[1]، تیموری خاندان کے مزاجوں میں عام طور پر غلو، انتہا پسندی، اور حد سے بڑھی ہوئی خوش عقیدگی داخل ہے، ہمایوں کے متعلق تاریخ میں آتا ہے کہ وہ محنت کرنے، میدان جنگ کی سختیاں اٹھانے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے پر آتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ گوشت پوست کا نہیں لوہے کا بنا ہوا ہے، اور انسان نہیں، جن ہے، لیکن جب آرام کرنے پر آتا تو سب بھول جاتا، اور معلوم نہیں ہوتا تھا کہ۔۔ یہ میدان جنگ کا ایک جانباز سپاہی ہے، جہانگیر میں بھی یہ تضاد اور بے اعتدالی نظر آئے گی۔

پھر یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جن ناہموار اور غیر معمولی حالات میں اس کا بچپن اور عنفوان شباب گزرا تھا، چچاؤں کی حسن بے مروتی، بے مہری، اور خون کے سفید ہو جانے کا اس نے مشاہدہ کیا تھا، اور جو کڑوے بلکہ زہر آلود گھونٹ اس نے باپ کی شکست اور سفر ایران کے زمانہ میں پئے تھے، پھر بیرم خاں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا' اس سب نے اس کی طبیعت میں انسانی فطرت کی طرف سے بدگمانی، بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے آدمی کے خلوص و وفاداری کے بارہ میں شک اور مزاج میں ایک طرح کا تلوّن پیدا کر دیا تھا۔

---

[1] اکبر جب چار سال چار ماہ چار دن کا ہوا تو رواج زمانہ کے مطابق اس کی مکتب نشینی کی رسم ادا ہوئی اور ملا زادہ عصام الدین ابراہیم اتالیق مقرر ہوئے، لیکن ملا کو اندازہ ہوا کہ اکبر کو تعلیم کی طرف رغبت نہیں، اسے معلم کی ناکامی اور بے توجہی پر محمول کیا گیا، اور ملا زادہ کی جگہ مولانا بایزید کا تقرر ہوا، مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر بادشاہ نے مولانا عبدالقادر بدایونی کو منتخب کیا، مگر بلند اقبال شہزادہ کی طبیعت تعلیم پر مائل نہ ہوئی، سیاسی حالات اور ان کے نتیجہ میں سرگردانی و نقل مکانی نے اس کو اور ہوا دی، اور اکبر تعلیمی لحاظ سے بے سواد اور ناخواندہ رہ گیا۔

(ملخص از تواریخ عہد اکبری)

مذاہب کا تقابل وتحقیق اور مجالس مناظرہ، اور ان کا اثر

اِس صورت حال کی اصلاح، اس کی ان کمزوریوں پر غلبہ حاصل کرنے اور اس کو اسلام سے وابستہ اور دین سے منسلک رکھنے بلکہ بہت سے سلاطین اسلام کی طرح (جن میں سے بعض اس کے خاندان میں بھی پیدا ہوئے) دین کا حامی وناصر بنائے رکھنے کے لئے موزوں صورت یہ ہوسکتی تھی کہ اکبر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ وہ غیر تعلیم یافتہ اور ناخواندہ ہے، (اور یہ ایسی کمزوری تھی، جو بابر سے لے کر سلطنت مغلیہ میں بہادر شاہ تک کسی میں پائی نہیں گئی) مہمات سلطنت اور توسیع مملکت پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا، جس کی اس کے اندر خداداد صلاحیت اور غیر معمولی لیاقت تھی، وہ مذہبی امور میں دخل نہ دیتا، ایک سیدھے سادھے مسلمان اور سپاہی کی طرح مذہبی امور کو علماء اور ذی علم ارکان سلطنت کے حوالہ کرتا، جیسا کہ بابر اور ہمایوں نے (تعلیم یافتہ ہونے اور علمی ادبی ذوق رکھنے کے باوجود) کیا تھا، اور خاص طور پر نازک اعتقادی و کلامی مسائل، مذاہب کے تقابل، اور ماوراء الطبیعاتی (غیبی) حقائق کی تحقیق کے میدان میں قدم نہ رکھتا، جہاں ذرا سی غلطی یا بے احتیاطی سے آدمی کفر والحاد کی سرحد میں داخل ہوجاتا ہے، اور دین وایمان کا سرمایہ کھو بیٹھتا ہے، اور جس کے مبادی ومقدمات سے بھی اکبر ناآشنائے محض تھا، اور جو سیاسی مصالح اور ایسے بادشاہ کے مفاد کے بھی خلاف تھا، جس نے چار سو[۴۰۰] برس کی مسلمان سلطنتوں سے ملک کا چارج لیا تھا، ان نازک اعتقادی اور کلامی مسائل میں دخل دینے اور اس میں سلطنت کے اثر ورسوخ کے استعمال کرنے کی غلطی مامون الرشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) جیسے عالم وذہین خلیفہ کو بھی راس نہ آئی، اور وہ اس سے کوئی مفید نتیجہ حاصل نہ کرسکا۔[۱]

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ اول "فتنۂ خلق قرآن" صـ ۹۴ تا ۱۰۱

لیکن اکبر نے بے چین طبیعت اور متجسّس دماغ پایا تھا، اِدھر اقبال مندی اور مسلسل کامیابیوں اور فتوحات نے اس کو اپنے بارہ میں کسی قدر خوش فہمی اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا، وہ سمجھنے لگا تھا کہ جس طرح وہ سیاسی گتھیوں کو سلجھاتا اور ملکی مسائل کو حل کرتا ہے، اسی طرح وہ مذہب وعقائد کی پُرخار وادیوں میں بھی کامیاب تُرکتازیاں کرسکتا ہے۔

دوسری طرف بعض شاطر ارکانِ دربار نے کچھ تو اپنا ذہنی تفوق ظاہر کرنے کے لئے اور کچھ بادشاہ کی تفریح طبع اور رونق مجلس کے لئے بجائے مرغوں اور بٹیروں کی پالیوں اور سانڈوں اور ہاتھیوں کی لڑائی کے (جو مشرقی سلاطین وامراء کی ندیم تفریح تھی) مختلف مذاہب اور فرقوں کے علماء کے دنگل قائم کئے، اور اس کو تحقیق مذہبی اور علمی مباحثہ کا نام دیا، یہ بالکل بدیہی حقیقت ہے، (اور مذاہب وافکار کی تاریخ میں اس کا سیکڑوں بار تجربہ ہوچکا ہے) کہ اگر ان مناظروں، علماء، اور مذاہب کے وکلاء کی "بیت بازیوں" کا سننے والا گہرا اور وسیع علم اور دقیقہ رس دماغ نہیں رکھتا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ توفیق الٰہی اس کا ساتھ نہیں دیتی، تو اس کا تشکّک وارتیاب، سوفسطائیت اور لاادریت کی وادی میں بھٹکنا یا الحاد وزندقہ کی عمیق خندق میں گرجانا بالکل قدرتی امر ہے۔

جہانگیر جس کی اکبر کے بارہ میں شہادت سے زیادہ کوئی شہادت معتبر نہیں ہوسکتی، تزک میں لکھتا ہے۔

پدرِ من در اکثر اوقات با دانایان ہر	والد ماجد اکثر ہر دین ومذہب کے
دین ومذہب صحبت می داشتند،	دانشوروں سے ملاقات کرتے تھے،
خصوصاً با پنڈتاں ودانایان ہندو	خصوصاً ہندستانی فاضلوں اور
با آنکہ اُمّی بودند از کثرت مجالست	پنڈتوں سے، اور امّی ہونے کے باوجود

با دانایان وارباب فضل در گفتگو ہا چنیں ظاہر می شد کہ ہیچ کسی بے بامی بودن ایشاں نمی برد و بدقائق نظم و نثر چناں می رسیدند کہ ما فوقے بران تصور نہ بود۔[1]

کثرت مجالست کے سبب علماء و فضلا کے ساتھ گفتگو میں کسی کو ان کے امی و ناخواندہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا، نظم و نثر کی باریکیوں کو اس طرح سمجھتے تھے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

اسلام، ہندو مذہب اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب و فرق ہی کے نمائندوں، وکیلوں ہی پر اس بارہ میں اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ نوبت دانایان فرنگ تک پہونچی، خود ابوالفضل لکھتا ہے کہ "دربار کی طرف سے توریت و انجیل و زبور کے ترجمے اور ان کے مطالب کو بادشاہ تک پہونچانے کا اہتمام کیا گیا، اور اس کے لئے ایک درباری فاضل سید مظفر کو متعین کیا گیا، اور بعض عیسائی اہل سلطنت کو لکھا گیا۔

در اوقات طیبہ با دانایان جمیع ادیان صحبت داشتہ از کلمات نفیسہ و مقاصد عالیہ ہر کدام مستفید و مستفیض می شویم چوں تباین السنۃ و تغایر لغات درمیان ست، لائق آں کہ بار سال ایں طور کسی کہ آں مطالب عالیہ باحسن عبارت خاطر نشاں کند مسرور سازند و بسمع ہمایوں رسیدہ کہ کتب سماوی مثل توریت و

ہم فارغ اوقات میں تمام مذاہب کے دانشوروں سے ملتے اور ان کے کلمات پاکیزہ اور بلند خیالات سے مستفید ہوتے ہیں، زبانوں کی اجنبیت حائل ہے، اس لئے کسی ایسے شخص کو بھیج کر مسرور کریں جو ان مطالب عالیہ کو اچھی عبارت کے ذریعہ دلنشیں کرے سمع ہمایوں تک یہ بات

[1] تزک جہانگیری ص ۱۵

انجیل وزبور بزبان عربی و فارسی
درآوردہ اند اگر آں کتب مترجم یا غیر
آں کہ نفع آں عام و فائدہ آں تام
باشد دراں ولایت بودہ باشد
فرستند درینولا بجہت تاکید مراسم
وداد و تشیید مبانیٔ اتحاد سیادت
مآب فضائل اکتساب صادق العقیدہ
والاخلاص سید مظفر را کہ بمزید التفات
عنایت سرفراز و مخصوص بودہ فرستادیم
نسخہ چند بالمشافہ خواہد گفت اعتماد
نمایند و ہموارہ ابواب مکاتبات و
مراسلات را مفتوح دارند۔[1]

پہنچی ہے کہ کتب سماوی، توریت،
انجیل وزبور کے ترجمے عربی فارسی میں
ہوئے ہیں، اگر وہ مترجم کتابیں اس
ملک میں ہوں تو افادۂ عام کے لئے
انھیں بھیج دیں، رسم محبت کی تجدید
اور بنیاد اتحاد کی پختگی کے خیال سے
ہم نے سیادت مآب سید مظفر کو (جو
ہماری عنایات سے سرفراز ہیں) ان
تراجم کے چند نسخوں کے لئے بھیجا ہے،
وہ آپ سے بالمشافہ گفتگو کریں گے،
آپ اُن پر اعتماد کریں اور برابر خط و
کتابت کرتے رہیں۔

ترجمہ کے علاوہ خود عیسائی پادری دربار میں حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنے مذہب کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور عقیدۂ تثلیث اور عیسائیت کو دلائل سے ثابت کیا، ملا صاحب لکھتے ہیں۔

دانایان مرتاض ملک افرنجہ کہ ایشاں
را پادھری، و مجتہد ایشاں را پاپا می
گوئند انجیل آوردو بر ثالث ثلثہ

دربار میں ملک فرنگ کے مرتاض دانشمندوں
کا بھی ایک گروہ تھا، ان لوگوں کو پادری
کہتے ہیں، اور ان کے بڑے مجتہد کا نام

[1] انشائے ابوالفضل ص ۳۹

دلائل گزرانیدہ و حقیقت نصرانیت اثبات کردہ۔[1]

پاپا (پوپ) ہے ان لوگوں نے انجیل پیش کی اور ثالث ثلثہ کے متعلق دلائل پیش کئے اور نصرانیت کو حق ثابت کیا۔

مجالس مناظرہ کا پرانا تجربہ ہے کہ کسی مذہب کی صداقت اور اس کی ترجیح کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیشہ دلائل کی قوت اور علمی ثبوت کافی اور فیصلہ کن نہیں ہوتا، اس کا بہت کچھ دارومدار اس مذہب کے وکیلوں اور نمائندوں کی چرب زبانی اور قوت بیانی پر ہے، بعض مرتبہ ایک کمزور مذہب کے وکیل زیادہ قادر الکلام، خوش بیان، نفسیات انسانی سے واقف اور موقع شناس ہوتے ہیں، وہ سننے والے کو متاثر اور معتقد بنا لیتے ہیں، ایک صحیح مذہب کے ترجمان (کسی وجہ سے) ان خصوصیات سے عاری اور ان کلامی اسلحہ سے خالی ہوتے ہیں، اور وہ اپنے اس نقص کی وجہ سے بازی ہار جاتے ہیں، اس میں بہت شبہ ہے کہ اکبر کے دربار میں اسلام کی نمائندگی اور ترجمانی کرنے والے جو علماء موجود تھے، اور جو ان دانایان فرنگ کے مقابلہ میں کھڑے کئے گئے تھے، ان کا تورات و انجیل اور مذہب عیسوی کا مطالعہ اور اس کی کمزوریوں سے واقفیت اور اسلام کو عقلی و علمی طور پر پیش کرنے کی صلاحیت اس درجہ کی تھی کہ وہ ان کو ان مغربی فضلاء کا مدمقابل بنا سکے اور وہ اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کر سکیں، اس صورت حال سے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ان غیر ملکی عیسائی فضلاء کی علمی و عقلی برتری کا نقش قائم ہو گیا ہو اور علمائے اسلام (جو اس میدان کے مرد نہ تھے) اس کی نظر سے گر گئے ہوں۔

اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا، ملا عبدالقادر لکھتے ہیں :-

اہل بدع و اہوا بمقتضائی آرائی — اہل بدعت اور ہوا پرست اپنی غلط آراء

---

[1] منتخب التواریخ ۲/۲۶۰۔

فاسده وشبهات باطله ازکمیں برآمده
باطل را بصورت حق وخطا را بلباس
صواب جلوه داده، پادشاہی را کہ
جوہری نفیس وطالب حق بود، اما عامی
محض ومتالّف ومستأنس بکفره
وارادل، درشک انداختہ حیرت
برحیرت افزود ومقصود از میاں
رفت، وسد سدید شرع مبین ودین متین
شکست وبعد از پنج شش سال خود
اثری از اسلام نماند وقضیہ منعکس شد۔[1]

اور باطل شبہات کے سبب کمین گاہوں
سے نکل آئے اور باطل کو حق کی صورت
میں اور خطا کو صواب کے لباس میں پیش
کرنے لگے، اور بادشاہ کو جو جوہر ذاتی
رکھتا تھا، اور طالب حق مگر امّی محض
اور کافروں سے مانوس تھا، شک میں
مبتلا کر دیا، اور اس کی حیرت میں اضافہ
کر دیا اور مقصد فوت ہو گیا اور شریعت
کا بندھ ٹوٹ گیا، اور پانچ چھ سال
کے بعد اسلام کا کوئی اثر نہ رہ گیا اور
معاملہ بالکل الٹ گیا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

درہر رکنے از ارکان دین وعقیدہ از
عقیدۂ اسلامیہ چہ در اصول وچہ در
فروع مثل نبوت وکلام ورویت و
تکلیف وتکوین، وحشر ونشر شبہات
گوناگوں بہ تمسخر واستہزاء آوردہ۔[2]

ارکان دین کے ہر رکن اور اسلامی عقائد کے
ہر عقیدہ کے متعلق خواہ ان کا تعلق اصول سے
ہو یا فروع سے مثلاً نبوت ومسئلہ کلام، دیدار الٰہی،
انسان کا مکلف ہونا، عالم کی تکوین حشر ونشر
وغیرہ کے متعلق تمسخر اور ٹھٹھے کے ساتھ
طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کئے جانے لگے۔

---

[1] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۵۵ [2] ایضاً ص ۳۰۷

اس پر طرّہ یہ ہوا کہ تفسیر و تاریخ جیسے نازک مضمون جن میں ناخدا ترس اور غیر راسخ العلم لوگوں کو ذہنی انتشار پیدا کرنے کی بڑی گنجائش ہے، اس امی بادشاہ کے دربار اور ایک غیر سنجیدہ اور بے باک فضا میں پڑھے جانے لگے۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں :-

و دریں ایام قاضی جلال و دیگراں	انہی دنوں میں قاضی جلال اور دوسرے
را از علماء فرمودند تا تفسیر قرآن مجید	علماء کو حکم ہوا کہ تفسیر قرآن بیان کریں
می گفتہ باشد، و درمیان علماء بر سر آں	اور خود علماء کے درمیان اس معاملہ
غوغائی بود۔ دبب چند مسخرہ راجہ	میں بڑی کشمکش تھی، دیپ چند مسخرہ
منجھولہ می گفت کہ اگر گاؤ نزد حق تعالےٰ	راجہ منجھولہ کہتا تھا کہ اگر حق تعالےٰ
معظم نبودی در اول سورہ قرآنی چرا	کے نزدیک گائے محترم نہ ہوتی تو قرآن
مذکور شدی، و چوں تاریخ خواندہ می شد	کی پہلی سورہ میں کیوں مذکور ہوتی، اور
روز بروز اعتقاد از اصحاب فاسد شدن	جب تاریخ پڑھی جانے لگی تو روز بروز صحابہ سے
گرفت و گام فراخ تر نہادند و نماز	لوگوں کا اعتقاد خراب ہونے لگا اور
و روزہ و جمیع نبوات تقلیدیات	سر سے آگے بڑھ کر، نماز روزہ اور تمام نبوی
نام نہادند یعنی غیر معقول و مدار دین	تعلیمات کو تقلیدیات کا نام دینے لگے یعنی
بر عقل گزاشتند نہ نقل، و آمد و رفت	انھیں غیر معقول کہنے لگے اور دین کا
فرنگیاں نیز شد و بعضی اعتقادیات	مدار بجائے نقل کے عقل پر رکھنے لگے،
عقلی ایشاں را فراگرفتند۔[1]	فرنگیوں کی آمد و رفت بھی ہونے لگی،

[1] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۱۲

چنانچہ ان کے بھی بعض اعتقادات
قبول کرلئے۔

اکبر کے تغیرِ مزاج وانحراف میں علمائے دربار وارکان سلطنت کی ذمہ داری

اکبر کو اسلام کی صراط مستقیم پر قائم رکھنے، اور اس کے مزاج کو بے اعتدالی اور انحراف سے بچانے میں علمائے دربار وارکان سلطنت بھی بڑا بنیادی اور مفید کردار ادا کرسکتے تھے، لیکن اس کے لئے ایک طرف ایسے علماء کی ضرورت تھی، جو حکمتِ دین اور "تفقہ" کا جوہر رکھتے ہوں، ان کی نظر جزئیات سے زیادہ کلیات پر ہو، وسائل سے زیادہ مقاصد پر اور "فصل" سے زیادہ "وصل" کی اہمیت وضرورت پر ہو، اخلاق عالیہ سے متصف، بے لوث اور بے غرض، جاہ طلبی اور حبِ دنیا سے امکانی حد تک دور ہوں، اور ان کا کسی درجہ میں "تزکیۂ نفس" ہوچکا ہو، وہ اس عظیم نوخیز اسلامی سلطنت کی اہمیت ونزاکت کو خوب سمجھتے ہوں جو اس غیر مسلم اکثریت سے (جس میں اب بھی اپنے سلطنت واقتدار سے محرومی کا احساس باقی ہے، اور جس کے تعاون کے بغیر کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی) گھری ہوئی ہے، اور یہ کہ ان کو جس تیموری سلطنت کی خدمت ورہنمائی کا زریں اور تاریخی موقع ملا ہے، وہ اِس وقت ترکی کی عثمانی سلطنت کے بعد مملکت کی وسعت، وسائل کی کثرت، انسانی طاقت اور مذہبی جذبہ کی حکمرانی ہر لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی مسلم سلطنت ہے، اس لئے اس کی حفاظت، اس کا اسلام سے رشتہ قائم رکھنے، اس کے سربراہ کو ان نازک حالات میں اس "شیشہ وآہن" اور اس "پنبہ وآتش" کو جمع رکھنے میں مدد دینا وقت کی سب سے بڑی عبادت اور دین وملک کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

دوسری طرف ایسے ارکان سلطنت اور مشیران دربار کا مہیّا ہوجانا ضروری تھا،

جواس دین پر (جس کو بابر نے رانا سانگا (۹۳۳ھ) کے مقابلہ میں میدان جنگ میں منہیات شرعیہ سے توبہ کرکے اور خدا سے بندگی کا عہد استوار کرکے سلطنت کی بنیاد بنا دیا تھا[1]) خود بھی مستحکم عقیدہ رکھتے ہوں، اور بادشاہ کے لئے بھی اسی کو پسند کرتے ہوں، وہ ہر قسم کے ذہنی انتشار سے محفوظ اوران تخریبی اور ملحدانہ تحریکوں سے دور ہوں، جو دسویں صدی میں ایران وہندوستان میں پیدا ہوگئی تھیں، اور جو سلطنت ومعاشرہ کا رابطہ کمزور کرنے والی، اعتقادی واخلاقی انارکی پھیلانے والی تھیں، ان میں سلطنت کے نظم ونسق اور دستور سازی کی صلاحیت کے ساتھ اخلاقی بلندی، دینی استقامت اور مذہبی پابندی بھی پائی جاتی ہو۔

اگر یہ دونوں عنصر اکبر اور اس کی سلطنت کو میسّر آجاتے تو اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ سلطنت مشرق میں حمایت اسلام اور خدمت دین کا وہی کردار ادا کرتی جو مغرب میں آل عثمان کی سلطنت نے ادا کیا بقول اقبالؔ ؎

نہ تھے تُرکان عثمانی سے کم تُرکان تیموری

لیکن یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ اکبر کو (اس کی اقبال مندی اور خوش نصیبی کے ساتھ) ان دونوں جماعتوں میں سے جو عنصر ملا وہ اتنا ہی نہیں کہ وہ اِس معیار پر پورا نہیں اترتا تھا، بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ اس سلسلہ میں خدمت کے بجائے بدخدمتی، اکبر کو دین سے قریب کرنے کے بجائے اس کو دین سے دور، متوحش ومتنفر بنانے، اور ان مخالف اسلام دعوتوں اور تحریکوں سے دور رکھنے یا ان کے استئصال پر آمادہ کرنے کے بجائے اس کو ان دعوتوں اور تحریکوں کا علمبردار بلکہ ان کا رمز ونشان بنانے کی خدمت انجام دینے والے تھے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ۔

علمائے دربار

ہم پہلے عنصر علمائے دربار کو پہلے لیتے ہیں، جن کا اکبر شروع سے غاشیہ بردار رہا تھا، اور جن پر اس نے سب سے زیادہ اعتماد کیا، اور جن کو خود بھی دربار میں سب سے پہلے تقرب حاصل ہوا، اور جو اسلام کے ایک بڑے عالم و مبصر حضرت عبداللہ بن مبارک کی نظر میں تین عناصر فساد میں سے ایک اہم عنصر ہیں ؎

وھل افسد الدین الا الملوک واحبار سوء ورھبانھا

دین کو سلاطین، علمائے سوء اور زاہدان دنیا دار کے سوا کس نے بگاڑا ہے؟

ہم اس موقع پر بھی ملا عبدالقادر بدایونی کی شہادتیں نقل کرتے ہیں، جو خود ارکانِ دربار میں سے تھے، اور ان کے ان بیانات میں بھی جو انھوں نے ایک تاریخی شہادت کے طور پر خود اپنی جماعت اور رفقاء کے متعلق دیئے ہیں، ان کی کوئی ذاتی غرض اور عناد معلوم نہیں ہوتا، علمائے دربار کی تصویر کشی انھوں نے اس طرح کی ہے :-

"عبادت خانہ میں ہر شب جمعہ کو سادات و مشائخ اور علماء و امراء کی طلبی ہوتی، آگے پیچھے بیٹھنے میں مشائخ و علماء سے نفسانیت کا اظہار ہوا، ہر ایک دوسرے سے آگے اور ممتاز جگہ بیٹھنا چاہتا تھا، بادشاہ نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ حکم دیا کہ امراء جانبِ مشرق بیٹھیں، سادات جانب مغرب، علماء جنوب میں، اور مشائخ شمال میں، بادشاہ خود ایک حلقہ میں آتا، اور مسائل کی تحقیق کرتا"[1]

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ایک رات علماء بڑے زور زور سے بولنے اور بحث کرنے لگے،

---

[1] منتخب التواریخ جلد دوم صـ۲۰۲

بادشاہ کو اس سے تنغّص پیدا ہوا، اور اس نے اس کو بے تمیزی اور دنیا داری پر محمول کیا۔[1]

بایک دیگر تیغ زباں کشیدہ در مقام	باہم دگر تیغ زبان کھینچ کر مدّمقابل ہو گئے
تنافی و تقابل بودند، و اختلاف بجائے	اختلاف یہاں تک بڑھ گیا کہ ایک
ایں رسید کہ تکفیر و تضلیلِ ہم دیگری نمودند	دوسرے کی تکفیر و تضلیل پر اتر آئے
رگِ گردن علماء زماں برآمد، آوازہائے	اس وقت کے علماء کی گردنوں کی
بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد، ایں معنی	رگیں پھولی ہوئیں اور آوازیں بہت
برخاطر اشرف گراں آمدہ۔	بلند تھیں، اس بات سے خاطر اشرف
	پر گرانی ہوئی۔

اکبر نے اس پر آزردہ اور مکدّر ہو کر ملا عبد القادر سے کہا کہ جو عالم اس مجلس میں بدتمیزی کا مظاہرہ کرے اسے وہاں سے اٹھا دیا جائے۔

اعلیٰ دینی عہدہ داروں میں ایک اہم رکن ملا عبد اللہ سلطانپوری[2] تھے جن کا عہدہ اور خطاب مخدوم الملک تھا، انھوں نے محض اس لئے کہ حج نہ کرنا پڑے فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دیا تھا، زکوٰۃ کے سلسلہ میں بھی حیلۂ شرعی[3] سے کام لیتے تھے، اور اس کی فرضیت سے بچ جاتے تھے، انھوں نے عہد اکبری اور اپنے عروج کے زمانہ میں اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ سونے سے بھرے ہوئے چند صندوق ان کے آبائی قبرستان سے برآمد ہوئے، جنھیں مُردوں کے

---

[1] ایضاً ص ۲۰۳ [2] یہ سلطان پور مشرقی پنجاب میں جالندھر کے قریب ہے، ان کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵۔

[3] یعنی حولان حول ہونے (ایک سال گزر جانے) سے پہلے وہ رقم جس پر زکوٰۃ فرض ہو رہی تھی، اہلیہ یا کسی دوسرے عزیز کو دے دیتے، وہ لینے کے بعد واپس کر دیتا، اس طرح وہ اس سال زکوٰۃ سے بچ جاتے کہ حولان حول کی شرط ہے آئندہ سال بھی یہی عمل کرتے۔

بہانہ سے انھوں نے دفن کر دیا تھا۔[1]

مخدوم الملک کے بعد دوسرا درجہ صدر الصدور مولانا عبد النبی کا تھا[2]، جو اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے عالم، اور خاص طور پر فن حدیث کے ماہر سمجھے جاتے تھے، لیکن "منتخب التواریخ" کی بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا علمی پایہ کچھ بلند نہ تھا، اور عربی کے بعض الفاظ کی تصحیح و تحقیق بھی پورے طور پر نہ تھی[3]، اکبر نے ان کو صدر الصدور کا عہدہ دیا، اور ان کو ایسا جاہ و جلال اور اختیار و اقتدار حاصل ہوا کہ ان کے سامنے اچھے اچھے ارکان سلطنت کا چراغ نہیں جلتا تھا، بادشاہ نے کئی بار اپنے ہاتھوں سے ان کو جوتے پہنائے، بڑے بڑے علماء شرف باریابی حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں ان کے دروازے پر کھڑے رہتے، سارے ہندوستان کے علماء و مشائخ اور سجادہ نشینوں کو جاگیریں عطا کرنا، معافیاں دینا، اور وظائف جاری کرنا ان کا کام تھا، اور اس میں انھوں نے ایسی دریا دلی سے کام لیا کہ پچھلی سلطنتوں میں بھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

لیکن ملا عبد القادر کے بیان کے مطابق (جو ان کے معاصر دوست اور شریک دربار تھے) معلوم ہوتا ہے کہ وہ علماء کے اعلیٰ اخلاق، اپنے خاندان کی بہترین روایات و خصوصیات بلکہ عام تہذیب اور موقع شناسی سے بھی عاری تھے، ممکن ہے کہ اس اعلیٰ عہدہ نے ان میں یہ تبدیلی

---

[1] ایک روایت ہے کہ ان قبروں سے تین کروڑ روپئے مالیت سونے کی اینٹیں برآمد ہوئیں۔

[2] شیخ عبد النبی شیخ احمد گنگوہی کے صاحبزادہ اور حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے تھے، لیکن علمائے حجاز سے حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ان کو اپنے خاندانی مسلک وحدۃ الوجود اور سماع سے اختلاف ہو گیا تھا، اور ان کے تعلقات اپنے والد سے اچھے نہیں رہے تھے، حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵۔ [3] علمائے حجاز بالخصوص علامہ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی کی جیسے اساتذۂ وقت سے علم حدیث حاصل کرنے، اور صاحبِ تصنیف ہونے کے ساتھ یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ وہ معمولی عربی الفاظ کو غلط (مثلاً حُجر کو جس میں پہلے جیم منقوط ہے، حِجر جس میں پہلے حائے مہملہ ہے) پڑھیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پیدا کردی ہو، ان کا اخلاقی اثر بھی بادشاہ و ارکان دربار پر اچھا نہیں پڑتا تھا، ملا عبدالقادر ان کو اپنے عہدہ ورسوخ کا غلط استعمال کرنے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا الزام دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ "انھوں نے سارے ہندوستان کے مذہبی جاگیرداروں کو دوڑانا شروع کیا، لوگ شیخ کے وکیلوں ان کے فراشوں و دربانوں، سائیسوں، حلال خوروں (مہتروں) تک کو رشوت دینے پر مجبور ہو گئے کہ اس کے بغیر کار برآری نہیں ہوتی تھی"[1]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دینی احتساب کرنے میں وہ حکمت و موقع و محل کی رعایت سے بالکل کام نہیں لیتے تھے، اور بعض اوقات خود بادشاہ اس کی زد میں آجاتا تھا، "آثر الامراء" کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ "اکبر کی ایک سالگرہ کے موقعہ پر امراء، علماء و مشائخ بادشاہ کو مبارکباد دے رہے تھے، بادشاہ کے بدن پر زعفرانی رنگ کا لباس تھا، شیخ نے اِس لباس پر اعتراض کیا، اور دوسرا لباس پہننے کی تاکید کی، لیکن یہ تاکید اس جوش سے کی کہ ان کے عصا کا سرا بادشاہ کے لباس شاہی کو جا لگا، بادشاہ نے اس کو برداشت کر لیا لیکن اس کو پنہ سخت ہتک محسوس ہوئی، اور جب وہ حرم میں گیا تو اپنی والدہ سے شیخ کی شکایت کی، والدہ نے جو ایک بزرگ خاندان کی بیٹی تھیں بادشاہ کو سمجھایا کہ اس وقت اس کا یہ تحمل تاریخ میں اس کے مناقب میں لکھا جائے گا کہ ایک عالم نے جو رعیت میں سے تھا، جہاں پناہ کو عصا مارا اور وہ محض شریعت کے احترام میں خاموش رہا"[2]

اس کے علاوہ مصیبت یہ پیش آئی کہ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی دونوں ایک دوسرے کے حریف و رقیب ہو گئے، مخدوم الملک شیخ عبدالنبی کو الزام دیتے تھے، اور شیخ عبدالنبی مخدوم الملک کی تجہیل و تکفیر کرتے تھے، اور ان کے حامی ایک دوسرے کے صف آرا بن جاتے

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ صـ ۲۰۵ [2] آثر الامراء جلد ۲ صـ ۵۶۱

تھے، مخدوم الملک اور صدر شیخ عبدالنبی کے حالات سے (اگر وہ بالکل اسی طرح ہیں، جو تاریخ میں آئے ہیں) اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات علم و حکمتِ دینی اور تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفس کسی لحاظ سے اس نازک زمانہ (عہد اکبری) اور اس اہم اور پیچیدہ ماحول (دربار اکبری) میں دین کی صحیح نمائندگی اور نیابت رُسُل کے کام کے لئے موزوں نہ تھے، اس کے لئے اگر سلیمان بن عبدالملک خلیفہ اموی کے مشیر و وزیر رجاء بن حیوۃ اور خلیفہ ہارون رشید کے دینی مشیر و قاضی القضاۃ قاضی ابویوسف کے درجہ کا عالم و متقی اور فرزانہ و مدبر نہ ہوتا تو کم سے کم عبدالعزیز آصف خاں اور قاضی شیخ الاسلام[1] جیسے صاحب کمال، عالی دماغ اور زاہد و متقی مشیر سلطنت ہوتے، اکبر کے دربار میں جیسا کہ آگے آئے گا' ایران و ہندوستان کے جو ذہین و متبحر علمائے معقولی اور ادیب جمع ہو گئے تھے، ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ان دونوں سے کہیں بہتر صلاحیتوں، دین و شریعت کے نمائندوں اور سلطنت کے مذہبی محافظوں اور مشیروں کی ضرورت تھی۔

اکبر نے جو (ملا عبدالقادر کے بیان کے مطابق) ان علماء کو جو اس کے عہد کی زینت تھے، غزالی و رازی سے بہتر سمجھتا تھا، جب ان کی یہ سخیف حرکتیں دیکھیں تو علمائے سلف کو بھی انھیں پر قیاس کر کے سرے سے علماء ہی کا منکر ہو گیا۔

ارکان سلطنت و مشیران دربار

ارکان سلطنت کے بارے میں اکبر کی بدقسمتی علمائے دربار سے کم نہ تھی، علم و ثقافت سے سادہ لوح ہونے کی بنا پر اس پر ہر زبان آور ذہین و طبّاع کا جادو چل جاتا تھا، خاص طور پر جب وہ ولایت (ایران) سے آیا ہو جس کو ہندوستان و افغانستان کے رہنے والے یونان کا

---

[1] ان دونوں کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو یادایام (تاریخ گجرات) از مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی مرحوم

درجہ دیتے تھے، اِسی زمانہ میں جب اکبر کے قدم دین کے میدان میں لڑکھڑا رہے تھے، ایران سے تین بھائی حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمایوں (حکیم ہمام) اور نورالدین قراری آئے، اور دربار میں اونچی جگہ پائی، کچھ عرصہ کے بعد ملا یزدی ولایت سے آئے اور صحابۂ کرام کے حق میں بیباکانہ زبانِ طعن کھولی، حکیم ابوالفتح نے قدم آگے بڑھایا اور حقائق دینی (وحی، نبوت، معجزات) وغیرہ کا برملا انکار کیا[1]، اسی عرصہ میں شریف آملی کی ایران سے آمد ہوئی، جو (جیسا کہ اوپر کہا گیا) محمود پسیخوانی کے نقش قدم پر تھا، اور ملحدانہ عقائد رکھتا تھا۔

ان ایرانی فضلاء واہل کمال کے علاوہ اعتقادی تزلزل اور ذہنی انتشار کے اسی دور میں کالپی کا رہنے والا ایک حاضر جواب علم مجلسی میں کمال رکھنے والا اور بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہندو برہم داس نامی دربار میں داخل ہوا اور بہت جلد بادشاہ کے مزاج میں دخیل اور دربار میں کرسی نشیں ہوگیا، اور مصاحب خاص کا اعزاز پاکر راجہ بیربر کے نام سے مشرف و مفتخر ہوا[2]، اس نے ہوا کا رخ دیکھ کر مذہبی معاملات میں اور نازک اسلامی عقائد و مسائل میں بیباکانہ اور استہزائی رویہ اختیار کیا، اور چونکہ یہی "سکۂ رائج الوقت" تھا، اس لئے ہر طرف سے داد پائی، بادشاہ کے مزاج کو دین کے معاملہ میں غیر سنجیدہ بنانے میں اس کو بھی بڑا دخل ہے[3]۔

ملا مبارک اور ان کے فرزند فیضی و ابوالفضل

اس پر طرفہ یہ ہوا کہ دربار میں ملا مبارک ناگوری کی آمد و رفت شروع ہوئی[4]، اور اس کے

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۱۱ [2] راجہ بیربل کے اخلاق و کیریکٹر کا اندازہ کرنے کے لئے ملاحظہ ہو دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص ۳۳۶ تا ۳۸۲ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۱۶۱

[4] ابوالفضل نے اکبر نامہ میں ملا مبارک کے اول مرتبہ دربار میں پہونچنے کو بارہویں سال کے واقعات میں بیان کیا ہے۔

دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کو بادشاہ کے مزاج میں ایسا دخل اور دربار میں ایسا اعزاز حاصل ہوا جو اس سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہوا تھا، ملا مبارک اور ابوالفضل، فیضی تینوں کے حالات کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے عہد کے نہایت ذکی، اعلیٰ علمی استعداد اور تبحر رکھنے والے، علوم عقلیہ وادبیہ پر حاوی، فارسی کے شاعر وانشا پرداز، غرض یہ کہ اس زمانہ کے نظام تعلیم، طرز تدریس وتحقیق اور رائج ومقبول علوم وفنون کے لحاظ سے لائق فاضل و"دانشمند" تھے، اگر اس تبحر وتفنن علمی ذہن کی درّاکی، طبیعت کی موزونیت اور زبان وقلم کی ہم زبانی کے ساتھ، اِن باپ بیٹوں میں دین میں استقامت رسوخ فی الدین، خدا ترسی وآخرت کوشی اور اخلاص وللّٰہیت بھی ہوتا تو وہ اس عہد کی ایسی خدمت انجام دے سکتے تھے، اور اس کو وقت کے فتنوں سے محفوظ رکھ سکتے تھے جس کی نظیر ملنی مشکل ہوتی لیکن ان کے حالات اور خود ابوالفضل وفیضی کے تصنیفات کے مطالعہ سے حسب ذیل حقائق کا علم ہوتا ہے :۔

(۱) ملا مبارک (جو اس مثلّث کا نقطۂ آغاز تھے) کی طبیعت میں بے چینی اور دماغ میں فطرتاً شورش تھی، مذاہب اربعہ اور ان کے اختلافات سے واقف ہونے کے بعد ان کے اندر بجائے جمع وتطبیق اور تاویل وتوجیہ کے سب سے انکار وبیزاری کا رجحان پیدا ہوگیا، اور وہ اس پورے فقہی ذخیرے، اسلاف کی محنت سے بے اعتقاد ہوگئے، اِدھر شیراز کے مشہور فاضل معقولات ابوالفضل گاذرونی کے حلقہ میں شریک ہوکر ان پر تفلسف کا غلبہ ہوا، بجائے مشائخ وائمہ فن سے سلوک وتزکیہ میں کسب فیض کرنے اور مکائد شیطان اور امراض نفس سے واقف ہونے کے تصوف واشراق کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کرکے غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے اور ان سب کوچوں سے گزرنے کے بعد ان کے اندر ایک تلوّن وانتشار پیدا ہوگیا، اور ان میں ہر رنگ میں

رنگ جانے اور ع "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" پر عمل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی، حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادہ خواجۂ کلاں جن کی تربیت شیخ مبارک کی بیٹی کے گھر میں ہوئی تھی[1]، ان کے متعلق لکھتے ہیں:-

در ہر عصر ہم مشرب و مذہب شعار	ہر زمانے کا وہ مروجہ مذہب و مشرب
وقت خود می ساخت کہ ملوک و امرائے عصر	اپنا لیتے تھے جس سے امراء و ملوک
بداں مذہب رغبت داشتند[2]۔	بھی رغبت رکھتے تھے۔

سر ولیزلی ہیگ لکھتا ہے کہ "شیخ مبارک مختلف ادوار میں سنی، شیعہ، صوفی اور مہدوی کے علاوہ خدا جانے کیا کیا رہ چکا تھا"[3]

(۲) طبیعت میں حوصلہ مندی اور جاہ طلبی تھی، اس لئے علم و درس کے محدود دائرہ میں محبوس رہنا ان کی مواج طبیعت کو گوارہ نہ ہوا، ان کو سرکار دربار پر اپنے علم و ذہانت کا سکہ بٹھانے کا شوق ہوا، اور وہ اکبر کے سایہ میں (جو سایۂ ہما کی طرح سمجھا جانے لگا تھا) آ گئے اور خود تو نہیں لیکن اپنے دونوں بیٹوں کو دخیل بنا دیا۔

(۳) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمائے زمانہ (اور خاص طور پر مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی جو دربار پر حاوی تھے) نے ان کو وہ مقام نہیں دیا تھا جس کے وہ اپنی ذہانت اور فضیلت کی بنا پر اہل تھے، اور ان کے بعض عقائد و خیالات اور تلوّن مزاجی کی بنا پر ان کی دینی حلقوں میں مخالفت کی گئی یا ان سے بے اعتنائی برتی گئی، اس کا زخم ان کے دل پر گہرا لگا، مولوی محمد حسین آزاد

---

[1] خواجہ کلاں نے حضرت خواجہ حسام الدین کے گھر میں تربیت پائی تھی، خواجہ حسام الدین کی اہلیہ ملا مبارک کی دوسری بیٹی تھیں (تاریخ ہندوستان جلد ۵ ص ۹۴۷)

[2] مبلغ الرجال ورق ۳۳ الف

[3] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۴ ص ۱۸

کے ادیبانہ الفاظ میں "شیخ مبارک نے ان لوگوں کے تیرِ ستم بھی اتنے کھائے کہ دل چھلنی ہو رہا تھا شیخ (ابوالفضل) اور شیخ کے باپ ملا مبارک نے مخدوم اور صدر وغیرہ کے ہاتھوں برسوں تک زخم کھائے تھے، جو عمروں میں بھرنے والے نہ تھے"[1] دوسری جگہ لکھتے ہیں، "شیخ مبارک پر جو جو مصیبتیں مخدوم کے ہاتھوں گزری تھیں، بیٹوں کو بھولی نہ تھیں، انھوں نے ان کے تدارک کی فکر کر کے اکبر کے کان بھرنے شروع کئے اور اکبر کے خیالات بھی بدلنے لگے"[2] مولوی محمد حسین آزاد، آزاد خیال ہونے کے باوجود بھی لکھتے ہیں کہ "فیضی اور ابوالفضل کا معاملہ ان کے باپ کی طرح گومگو رہا"۔

علماء کی اس مخالفت اور زمانہ کی اِس ناانصافی نے اس پورے گھرانہ کے اندر "احساس کہتری" پیدا کر دیا، جو مختلف شکلوں میں اور اکثر اوقات "احساس برتری" کی شکل میں ظاہر ہوا کرتا ہے، اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کے علم و ذہانت کے سامنے کسی کا چراغ جل نہیں سکتا، اِس کوشش میں اسلام اور پورا دینی نظام زد میں آگیا، یہاں تک کہ جب سب چراغ ان دونوں بھائیوں کے علم و ذہانت کے چراغ کے سامنے گُل یا ماند پڑ چکے تھے، اور اس مملکت میں انھیں کا طوطی بول رہا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی چمن اسلام ان کی آنکھوں کے سامنے جل رہا تھا تو (ملا عبدالقادر کے بیان کے مطابق) ابوالفضل کی زبان پر یہ دو شعر تھے، جو بالکل حسب حال تھے ؎

آتش بدود دست خویش در خرمن خویش — چو خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش — اے وائے من و دست من و دشمن خویش

ملا مبارک کے دو لائق و باکمال فرزند تھے، ابوالفیض فیضی (ولادت ۹۵۴ھ) اور ابوالفضل علامی (ولادت ۹۵۸ھ)۔

---

[1] دربار اکبری ص ۴۹، ۵۰ [2] ایضاً ص ۳۸۹

فیضی علوم ادبیہ میں کمال رکھتا تھا، اور اس کی فارسی شاعری اور اس کے استاد ہونے میں دو رائیں نہیں، مولانا شبلی نے "شعر العجم" میں صحیح لکھا ہے کہ "فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے جن کو اہل زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا خسرو اور فیضی"۔

"فیضی کو خواجہ حسین مروی سے تلمذ تھا، اور اس نے ہر فن میں کمال پیدا کیا، ۱۲ جلوس سنہ ۹۷۴ھ میں وہ دربار میں پہونچا اور شان نوازش سے بہرہ یاب ہوا فیضی کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا لیکن اس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہیں کی، طبیب تھا، مصنف تھا، شاعر تھا، اور انھیں مشغلوں میں بسر کرتا تھا، شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا، چنانچہ ۱۲ جلوس میں شہزادہ دانیال کی تعلیم و تربیت سپرد ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں فیضی نے اس کو ضروری مراتب سکھا دیئے، اِس سن میں اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوی سے مسجد میں جاکر خطبہ پڑھا۔ خطبہ فیضی نے لکھا تھا، اکبر نے شیخ عبد النبی کا زور توڑ کر صدارت کے ٹکڑے کر دیئے تھے، چنانچہ سنہ ۹۹۰ھ میں آگرہ، کالنجر اور کالپی کی صدارت فیضی کو دی گئی، سنہ ۹۹۳ھ میں جب یوسف زئی پٹھانوں پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم میں مامور کیا گیا، سنہ ۹۹۶ھ میں جو اکبر کی تخت نشینی کا ۳۳ واں سال تھا، فیضی کو ملک الشعراء کا خطاب ملا، سنہ ۳۶ جلوس مطابق سنہ ۹۹۹ھ میں فیضی کو خاندیس کی سفارت پر متعین کیا گیا، اور اس نے بڑی کامیابی سے یہ خدمت انجام دی، صفر سنہ ۱۰۰۴ھ ۴۰ جلوس میں انتقال کیا"[1]

ادبی تصنیفات، سنسکرت کے تراجم اور منظومات اور دیوان کے علاوہ اس کی سب سے مشہور تصنیف "سواطع الالہام"[2] ہے، جو قرآن مجید کی غیر منقوط تفسیر ہے، دو سال کی مدت

---

[1] ملخص از شعر العجم حصۂ سوم (ص ۲۸-۷۲) [2] فیضی نے یہ تفسیر جس میں اس کی پابندی کی ہے کہ کوئی نقطہ والا (باقی ص ۹۷ پر)

میں ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی، اکبر نے اس کے صلہ میں فیضی کو دس ہزار روپے دلائے[1] فیضی کو اس تصنیف پر ناز تھا، اور اس سے عربی زبان و لغت پر اس کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، بدایونی اختلاف مذہبی کے باوجود اس کے کمال علمی اور تبحر کی شہادت دیتے ہیں، لکھتے ہیں :-

درفنون جزئیہ از شعر و معمہ و عروض و	فنونِ جزئیہ یعنی شعر و معمہ، عروض و
قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشاء	قافیہ، تاریخ و لغت، طب و انشاء
عدیل در روزگار نداشت۔	میں یکتائے روزگار تھا۔

کتابوں کا نہایت شائق تھا، ایک گراں مایہ کتب خانہ جمع کیا تھا، جس میں ۴ ہزار ۶ کتابیں تھیں، اور اکثر خود مصنف کی یا اس کے زمانہ کی لکھی ہوئی تھیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی اور اس زمانہ کے وہ تمام لوگ جن کے دل میں اسلام کی حمیت تھی،

(باقی صـ۹۶ کا) حرف نہ آنے پائے، اور جس کی اس کے زمانہ اور اس کے زمانہ کے بعد دھوم مچ گئی، اپنی قابلیت کا ثبوت اور اس الزام کی تردید میں لکھی کہ اس کو علوم دینیہ سے اشتغال نہیں ہے، لیکن اِس کام سے اس کی عربی زبان پر قدرت کا کتنا ہی اظہار ہو اس میں کوئی علمی و عملی افادیت نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض خطاط چاول پر قل ہو اللہ لکھ کر اپنی باریک نویسی اور خطاطی کا ہنر ظاہر کرتے تھے، اس تکلف کی وجہ سے تحریر میں نمک اور کلام میں کوئی لطف اور رونق نہیں ہے۔

شائد اس سے زیادہ مفید اور قابل قدر علمی کارنامہ وہ قرار پائے گا جو اسی زمانہ کے ایک شامی عالم محمد بدرالدین معروف بابن الغزی الدمشقی (م ۹۸۴ھ) نے انجام دیا، انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر ایک لاکھ اسی ہزار اشعار میں کی، اس کا ایک منظوم خلاصہ بھی تیار کیا، اور اس کو سلیمان اعظم کی خدمت میں پیش کیا، سلیمان نے علماء کو دکھایا کہ اس میں کوئی چیز جمہور کے عقیدہ کے خلاف یا تحریف کی تو نہیں ہے، علماء نے اس کی تصدیق و تعریف کی سلیمان نے اس پر مصنف کو بڑا انعام دیا، الکواکب السائرہ نجم الدین الغزی نیز البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع للعلامہ محمد بن علی الشوکانی الیمنی صاحب "نیل الاوطار" (م ۱۲۵۰ھ) جزء ثانی ترجمہ محمد بن محمد الغزی صـ۲۵۲)

[1] مآثر الامراء جلد ۲ صـ۵۸۷

اور عہد اکبری کی اس صورت حال سے سخت مغموم و بیزار تھے، اس بات پر متفق ہیں کہ فیضی بھی اپنے والد کی طرح عقائد میں تزلزل اور ذہنی انتشار میں مبتلا تھا، اور اس کو اکبر کو لامذہب و ملحد بنانے میں خاص دخل ہے، مولانا عبدالقادر نے "منتخب التواریخ" میں فیضی کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں سے مبالغہ اور انشاء پردازی کے حصہ کو نکالنے کے بعد بھی اس کی آزاد خیالی میں کوئی شک باقی نہیں رہتا، مولانا شبلی نے "شعر العجم" میں اس کی طرف سے پورا دفاع کیا ہے، پھر بھی لکھتے ہیں کہ "بایں ہمہ وہ فراخ مشرب اور آزاد خیال تھا، اور جانتا تھا کہ متعصب مولویوں نے مذہب کی جو صورت بنا رکھی ہے، وہ اسلام کی اصل تصویر نہیں، شیعہ سنیوں کے جھگڑوں کو وہ اصل مذہب سے غیر متعلق سمجھتا تھا، ان خانہ جنگیوں کی ہنسی اڑاتا تھا" پھر مولانا نے اس کی عرضداشت کے چند اقتباسات پیش کئے ہیں، جن میں تمسخر اور استہزاء کا انداز ہے[1]، مولانا لکھتے ہیں کہ "فیضی اور ابوالفضل نے علمی مجلسیں قائم کرائیں، جن میں درباریوں کو علانیہ نظر آیا کہ ان متعصبوں کے پاس لعن و تکفیر کے سوا کوئی اوزار نہیں"۔

معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کی زندگی ہی میں اس کے ملحدانہ خیالات کی شہرت ہو گئی تھی، لوگوں نے اس کی وفات کی جو تاریخیں نکالی ہیں، اس سے اسی کا اظہار ہوتا ہے، اس کے انتقال کی روایت بھی بڑی عبرت انگیز ہے[2]۔

ابوالفضل بھی اپنی ذہانت، طبّاعی اور تفنن علمی میں نوادر روزگار میں سے تھا، اور جس طرح اس کے بڑے بھائی فیضی کو شاعری میں دستگاہ کامل حاصل تھی، وہ تحریر و انشا پردازی میں ید طولیٰ رکھتا تھا، اکبر نامہ جلد سوم ص۸۳-۸۴ میں وہ لکھتا ہے کہ کمسنی ہی میں اپنی خود بینی اور

---

[1] شعر العجم حصۂ سوم ص۴۹-۵۰ [2] منتخب التواریخ جلد ۲ ص۴۰۶-۴۰۵ فیضی کے مذہب پر تبصرہ مولوی محمد حسین آزاد کے قلم سے دربار اکبری ص۴۷۱ پر ملاحظہ ہو۔

خویشتن آرائی ظاہر بینی اور تقلید کے خلاف اس کو جنون پیدا ہو گیا تھا۔[1]

۹۸۱ھ میں وہ آگرہ میں دربار میں باریاب ہوا، اور اس نے آیۃ الکرسی کی تفسیر بادشاہ کو پیش کی، پھر ۹۸۲ھ میں سورۃ الفتح کی تفسیر کا ہدیہ گزرانا اس وقت اس کا تقرب برابر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وزارت جلیلہ و وکالت مطلقہ کے منصب پر سرفراز ہوا، اس کا سب سے بڑا کارنامہ "آئین اکبری" ہے، "آئین اکبری" کو تیموری دور کے ملکی، حربی، صنعتی، زراعتی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی، خانگی، علمی اور مذہبی حالات و واقعات کا آئینہ سمجھنا چاہئے، اس کی دوسری مایہ ناز تصنیف "اکبر نامہ" ہے،[2] جو ہندوستان کے تیموری سلاطین کے حالات پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ انشائے ابوالفضل کے نام سے اس کے خطوط کا مجموعہ اور دوسری تصنیفات ہیں، ۱۰۱۱ھ میں جہانگیر کے اشارہ سے بیر سنگ دیو نے اس کو قتل کر دیا، اکبر کو اس کا بڑا رنج ہوا اور اس نے آنسو بہائے۔

ڈاکٹر محمد باقر اپنے مضمون "ابوالفضل" مشمولہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لکھتے ہیں:

"ابوالفضل نے اکبر کے مذہبی عقائد میں اچھا خاصا دخل پیدا کیا، چنانچہ جب اکبر نے ۹۸۲ھ ۱۵۷۵ء میں فتح پور سیکری میں مذہبی علماء کے مباحثے سننے کے لئے عبادت خانہ قائم کیا، تو ابوالفضل علماء کے ان باہمی مباحثوں میں شریک ہوتا اور ہمیشہ اکبر کے عقائد کی طرفداری کرتا، یہاں تک کہ اس نے اکبر کو یہ سمجھایا کہ مذہب کے متعلق اس کے نظریات معاصر علماء سے کہیں افضل اور برتر ہیں اور ۹۸۷ھ ۱۵۷۹ء میں دربار شاہی سے ایک محضر جاری کیا، اس کی رو سے مذہبی علماء کے اختلافات

---

[1] بزم تیموریہ ص ۱۶۳ [2] اکبر نامہ کے متعلق مشہور فرانسیسی فاضل کارا ڈی واکس لکھتا ہے کہ "وہ ایک ایسی علمی دستاویز ہے، جس پر مشرقی تمدن کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے، جن انسانوں کی ذہانتوں نے اس ضخیم کتاب کے ذریعہ اپنا تعارف کرایا ہے، وہ حکومت اور انتظام کے فن میں اپنے زمانہ سے بہت آگے معلوم ہوتے ہیں"۔

CARRA DE VAUX ; LES PENSEURS DE L'ISLAM — PARIS 1921

پٹانے کے لئے آخری حکم اکبر کو بنا دیا گیا، عبادت خانہ کے مناظروں کے درمیان ہی میں اکبر کو ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کا شوق چرّایا، اور اس نے ۱۵۸۲ء میں دین الٰہی کی بنیاد رکھی، اسے ابوالفضل نے بھی قبول کیا۔"[1]

"مآثر الامراء" میں ہے کہ جنت مکانی یعنی جہانگیر بادشاہ خود لکھتا ہے کہ "شیخ ابوالفضل نے میرے والد کو یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ جناب ختمی پناہؐ میں بڑی فصاحت تھی، قرآن انھیں کا کلام ہے، اس لئے جب وہ دکن سے آرہا تھا، تو میں نے نرسنگھ دیو سے کہا کہ وہ اس کو قتل کر دے، اس کے بعد میرے والد اس عقیدہ سے باز آگئے۔"[2]

لیکن اس بارہ میں سب سے معتبر شہادت خود ابوالفضل کی ایک عبارت ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے علم و ذہانت سے کام لے کر بادشاہ کی خواہشات کو علمی جامہ پہنانے اور اس کو علمی اسلحہ فراہم کرنے اور اکبر کو فرمانروائے سلطنت کی سطح سے امام زماں اور ہادئ دوراں کے منصب رفیع تک پہونچانے میں جو کردار ادا کیا تھا[3]، اس پر اس کا ضمیر مطمئن نہیں تھا، اور وہ کبھی کبھی اپنی زندگی و بیداری کا ثبوت دیتا تھا، وہ اپنے ایک خط میں جو اُس نے خانخاناں کو لکھا ہے، اپنے بارہ میں لکھتا ہے:۔

وشمہ از آلام و اسقام این قصۂ پرغصہ کہ راقم سطور	اس دردناک کہانی کا ایک معمولی المیہ یہ ہے کہ
درہاویۂ مشاغل لایعنی منہمک شد از عبداللہی	راقم سطور مشاغل لایعنی کے جہنم میں پھنس کر بندۂ خدا

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱ ص ۸۸۹-۸۹۰ [2] ص ۶۱۷، سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ "تزک جہانگیری" کے نولکشور ایڈیشن میں تو جہانگیر کا یہ بیان نہیں ہے، لیکن تزک جہانگیری کے اس انگریزی ترجمہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، جو میجر ڈیوڈ برائس نے کیا تھا ص ۵۳-۵۴ (بزم تیموریہ ص ۱۶۶)

[3] ابوالفضل اپنی تصنیفات میں اکبر کے لئے امام معصوم، خلیفۃ اللہ، واقف اسرار خفی و جلی اور قاسم ارزاق بندگانِ الٰہی کے جیسے مبالغہ آمیز الفاظ بے تکلف استعمال کرتا ہے، اور ان خوارق و کرامات کی نسبت کرتا ہے، جو اس کو مافوق الفطرت انسان ثابت کرتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ مہابھارت فارسی)

بعد الطبعی در آمد، در شرف آں شد کہ عیاذاً باللہ
از عبد اللہی بعبد الدراہمی والدنانیری موصوف گردد،
در قید عبارت در آوردہ ماتم زدگی خود را ظاہر سازد دلذا کہ
از تردد او محاربات ناقصانہ بے تورگانہ کہ در فطرت و طبیعت
دریں سی و چہار سال دنیا خصوصاً دریں دوازدہ
سال کہ در کشمکش ابنائے زمان افتادہ است نہ قدرت
تکلیف و نہ قوت گریز و نہ طاقت پرہیز دارد
بعبارت در آوردہ اعلام آں استظہار الانامی نماید

صبرے نہ کہ از عشق بہ پرہیزم من
دستے نہ کہ با قضا آویزم من

کے مرتبہ سے گر کر بندۂ فطرت ہو گیا اور اس کے
قریب پہونچ گیا کہ خدا کی بندگی کے بجائے
بندۂ درہم و دینار کہا جانے لگے... وہ اس تحریر
میں اپنا یہ غم ظاہر کر رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیا
میں گزرے ہوئے ان تینتالیس[۴۳] برسوں کی احمقانہ
دوڑ دھوپ سے اور خصوصاً اس بارہ سالہ کشمکش سے جو
ابنائے زمانہ کی صحبت میں رہی مجھ میں نہ طاقت صبر ہے
نہ قوت گریز و پرہیز میں اس چیز کو قید تحریر میں لا کر اس کا

بختے نہ کہ با دوست در آمیزم من
پائے نہ کہ از میانہ بگریزم من[۱]

راجپوت رانیوں کا اثر

اکبر کے لئے ایک بڑی آزمائش کی بات اور اسلام سے اس کے مزاج کے منحرف ہونے کا ایک قوی سبب یہ تھا کہ اس نے استحکام سلطنت کے لئے راجپوت راجاؤں کے ساتھ رشتے ناطے کئے اور ان کا اعلیٰ ترین مناصب پر تقرر کیا اور ان کا پورا اعتماد حاصل کرنے اور ان کو شیر و شکر کرنے کے لئے بہت سے ایسے کام کئے جو اس کے پیشرو سلاطین نے ابھی تک نہیں کئے تھے، مثلاً ذبح گاؤ کی ممانعت، آفتاب کے رخ بیٹھ کر جھروکا درشن، ڈاڑھی منڈوانا، بھدرا کروانا، قشقہ لگوانا، ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر تمام ہندوانہ رسموں میں حصہ لینا، اکبر کی ایک بیوی راجہ بہاری مل کی بیٹی اور راجہ بھگوان داس کی بہن تھی، دوسری جودھ بائی جودھ پور کی رانی ... . ان ہندو رانیوں کا اور ان کے واسطہ اور رشتہ سے ان کے بھائیوں اور عزیزوں کا اکبر پر خاصا اثر تھا، اور یہ بالکل قدرتی بات تھی، دین کے ایوان میں سب سے پہلا

[۱] انشائے ابو الفضل دفتر دوم صـ۱۰۲ (لکھنؤ ۱۸۸۳ء)

تزلزل جو واقع ہوا، وہ اسی تعلق کا نتیجہ تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ متھرا کے قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد کی تعمیر کے لئے سامان جمع کیا، لیکن قریب کے ایک برہمن نے راتوں رات وہ سامان اٹھا کر مندر کی تعمیر میں لگا دیا، جب مسلمانوں نے اس سے باز پرس کی تو وہ اسلام اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا، قاضی عبدالرحیم نے شیخ عبدالنبی صدر الصدور کی عدالت میں مرافعہ کیا، شیخ عبدالنبی نے اس کی طلبی کا فرمان جاری کیا، تحقیق سے واقعہ کی تصدیق ہوئی، اور صدر الصدور نے سزائے موت کا حکم جاری کیا، لیکن وہ برہمن، رانی جودھا بائی کا پروہت تھا، رانی اکبر پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ اس برہمن کو سزا سے بچالے، بادشاہ عدالتی کارروائی میں مداخلت، اور صدر الصدور کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، صدر الصدور نے سزا کا نفاذ کیا، لیکن یہ معاملہ بجائے ختم ہونے کے اور بھی نازک صورت اختیار کر گیا، اور بقول بدایونی:۔

"دختران راجہائے عظیم ہند نے بادشاہ کے کان بھرے کہ اس نے ملاؤں کو ایسا سر چڑھا لیا کہ وہ منشاء سلطانی کی بھی پروا نہیں کرتے، دربار میں یہ سوال اٹھا کہ مذہب حنفی میں شاتم رسول کی سزا موت نہیں ہے، اس لئے یہ اقدام اس مذہب کے بھی خلاف ہے، جس کا قانون اس ملک میں چلتا ہے"

محضر اجتہاد و امامت

یہی موقعہ تھا جب ملا مبارک نے بادشاہ کی دستگیری کی اور وہ اہم اور تاریخی محضر تیار کیا، جو اکبر اور اس کی مملکت کے رُخ کے پھیرنے میں سنگ بنیاد ثابت ہوا، اور جو ذہنی و تہذیبی ارتداد کے پورے قصر کا صدر دروازہ کہا جا سکتا ہے[1]، اس محضر میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ:۔

---

[1] اس محضر کا پورا متن منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۷۱-۲۷۲ طبقات اکبری، ص ۳۴۳-۳۴۴ میں ملاحظہ ہو، نزہۃ الخواطر میں اس کا پورا عربی ترجمہ ہے

"خدا کے نزدیک سلطان عادل کا مرتبہ مجتہد کے مرتبہ سے زیادہ ہے، اور حضرت سلطان کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی سب سے زیادہ عدل والے، عقل والے اور علم والے ہیں، اس بنیاد پر ایسے دینی مسائل میں جن میں مجتہدین باہم اختلاف رکھتے ہیں اگر وہ اپنے ذہن ثاقب اور رائے صائب کی روشنی میں بنی آدم کی آسانیوں کے مدنظر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اسی کو معین کر دیں، اور اس کا فیصلہ کریں تو ایسی صورت میں بادشاہ کا یہ فیصلہ قطعی اور اجماعی قرار پائے گا، اور رعایا اور برایا کے لئے اس کی پابندی حتمی و ناگزیر ہوگی"

یہ محضر نامہ رجب ۹۸۷ھ میں تیار کیا گیا اور اس کا مملکت میں نفاذ ہوا، بادشاہ کے ایماء پر تمام علماء نے اس محضر پر دستخط کئے اور اس کی رو سے بادشاہ امام مجتہد واجب الاطاعت اور خلیفۃ اللہ قرار پایا اور یہی اس سفر کا نقطۂ آغاز ہے جو نہ صرف دین اسلام سے انحراف بلکہ اس سے عناد و اختلاف پر جا کر مکمل ہوا۔

محضر پر ایک نظر

سلاطین وقت اور اصحاب اقتدار کی غیر مشروط تائید و حمایت، ان کی لغزشوں اور بے عنوانیوں کی توجیہ و تاویل اور ان کے احکام جائرہ (اور بعض اوقات اسلام کو صریح طور پر نقصان پہونچانے اور اس کو بدنام کرنے والے) غلط اقدامات اور منصوبوں کے لئے علمی دلائل اور فقہی و کلامی سندیں فراہم کرنے کی نظیروں سے مسلم سلطنتوں کی طویل تاریخ خالی نہیں علمائے وقت سے بارہا لغزشیں اور غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، اور انھوں نے (کسی اختیاری مصلحت یا کسی اضطراری ضرورت کی بناء پر) اپنے منصب و مقام کے خلاف کام کیا ہے، لیکن ایسے شاہانِ وقت کی پشت پناہی بلکہ دین و شریعت کے خلاف منصوبہ بندی کے سلسلے میں اس محضر کی

جس کو شیخ مبارک نے اکبر کے لئے تیار کیا تھا، مشکل سے نظیر ملے گی، اس میں ایک ایسے جوان[1] سال بادشاہ کو مجتہد سے اونچا درجہ دیا گیا ہے، اور اس کو مجتہدین کے اختلافی مسائل میں ترجیح اور انتخاب کا حق عطا کیا گیا ہے، اور اس کو اعدل و اعقل و اعلم باللہ مانا گیا ہے جو ناخواندۂ محض ہے، جس کی طبیعت میں پہلے سے بے قیدی اور حد سے بڑھی ہوئی آزادی ہے، جس کا علمائے اسلام اور شارحین دین و شریعت پر سے اعتقاد و اعتماد اٹھ چکا ہے، اور اپنے گھر اور دربار کے ہندوانہ ماحول سے بشدت متأثر اور تیزی کے ساتھ ہندوانہ خیالات و رسوم و عادات کے اختیار کرنے کی طرف مائل ہے، جو مطلق العنان سلطنت اور کامل اختیارات کا مالک ہے، اس کا فائدہ صرف اہل ہوی و ہوس کو یا ان درباری علماء کو پہونچتا تھا، جو بادشاہ کے نام سے اور اس کے احکام و فرامین کے پردہ میں آزادی و بے قیدی کی فضا پیدا کرنا چاہتے تھے، شریعت اسلامی کو بازیچۂ اطفال بنانا چاہتے تھے، یا اپنے پرانے دشمنوں یا حریفوں سے انتقام لینے کا خواب دیکھ رہے تھے، شیخ مبارک جیسے ذہین و فطین انسان سے اس اقدام کے عواقب و نتائج مخفی نہیں رہ سکتے تھے، اس لئے اس کی توجیہ بڑی مشکل ہے کہ اس محضر کے پیچھے کیا منصوبہ کام کر رہا تھا؟ ایک بالغ نظر مؤرخ جس کی اس طرح کے اقدامات کے نتائج و عواقب پر نظر ہے، آج ملا مبارک کی روح کو مخاطب کر کے کہہ سکتا ہے ؎

فان کنتَ لاتدری، فتلک مصیبۃٌ وان کنتَ تدری، فالمصیبۃُ اعظمُ[2]

مخدوم الملک اور صدر الصدور کا زوال

اس محضر کے صدور اور ملا مبارک کی علمی پشت پناہی اور اس کے باکمال فرزندوں فیضی اور

---

[1] اس محضر کے صدور کے وقت اکبر کی عمر ۳۸ سال کی تھی۔ [2] اگر تم کو اس طرز عمل کا قدرتی نتیجہ معلوم نہیں تھا، تو یہ ایک افسوسناک بات ہے، اور اگر معلوم تھا، اور تم نے دانستہ یہ کام کیا تو معاملہ اور زیادہ افسوسناک اور حیرت انگیز ہے۔

ابوالفضل کے دربار میں آنے جانے کے بعد مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری اور صدر الصدور مولانا عبدالنبی گنگوہی کا زوال شروع ہوگیا، مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کو جو دربار کا یہ رنگ دیکھ کر خانہ نشین ہوگئے تھے، ایک دن زبردستی لایا گیا اور جوتوں کی صف میں بٹھایا گیا[1]، مخدوم الملک کو حجاز جانے کا حکم ہوا، ۹۸۷ھ میں وہ حجاز گئے، وہاں کے اکابر علماء نے ان کا بڑا استقبال کیا، اور استاذ العلماء شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی مکی بڑی تعظیم سے پیش آئے، مکہ معظمہ میں تقریباً تین سال قیام کرکے وہ ہندوستان واپس ہوئے، لیکن گجرات پہونچے تھے کہ ان کو زہر دے دیا گیا، اور وہیں ۹۹۰ھ یا ۹۹۱ھ میں انھوں نے انتقال کیا، اس بات کے پورے قرائن موجود ہیں کہ زہر خورانی کا یہ عمل اشارۂ سلطانی سے ہوا، خوافی نے "مآثر الامراء" میں اس کی تصریح کی ہے[2]۔

شیخ عبدالنبی نے بھی حجاز کا قصد کیا، کچھ مدت وہاں قیام بھی کیا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنا جاہ وجلال اور عہد رفتہ کی یاد بھولی نہ تھی، وہ ہندوستان آئے اور بادشاہ سے عفو ودرگزر کی درخواست کی، ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کو حکم دیا کہ ان سے حساب فہمی کرے، راجہ نے ان کو محبوس کرلیا، اور ان سے سخت داروگیر کی، اسی داروگیر میں ان کا انتقال ہوگیا، لیکن "مآثر الامراء" میں ہے کہ بادشاہ نے ان کا معاملہ ابوالفضل کے سپرد کیا، اسی نے ان کو گلا گھونٹ کر مار دیا[3]۔

الف ثانی کی تیاری اور دین الٰہی کا اجراء

بادشاہ کو مجتہد مطلق، اور مطاع برحق بنا دینے کے بعد دوسرا اقدم یہ تھا کہ ظہور اسلام پر ایک ہزار سال گزر رہے ہیں، اور دوسرے ہزار سال کا آغاز ہو رہا ہے، اس نئے ہزار سال سے

---

[1] منتخب التواریخ حصہ ۳ ص ۷۹-۸۳ [2] "نزہۃ الخواطر" جلد ۴ [3] ایضاً

دنیا کی ایک نئی عمر شروع ہوگی، اس کے لئے ایک نیا دین، ایک نیا آئین، اور ایک نیا شارع اور نیا حاکم چاہیئے، اور اس کے لئے اکبر جیسے صاحب تاج ونگیں اور امام عادل اور عاقل سے بڑھ کر کوئی موزوں نہیں، ملا عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

چوں در زعم خویش مقرر ساختند کہ	بادشاہ کے ذہن میں چونکہ یہ بات
ہزار سال از زمانہ بعثت پیغمبر اسلام	راسخ ہوگئی تھی کہ پیغمبر اسلام کی بعثت
علیہ السلام کہ مدت بقاء ایں دین بود	کی مدت کے ہزار سال پورے ہو چکے
تمام شد و ہیچ مانع برائے اظہار دواعی	جو اس دین کی عمر طبعی ہے اور اب کوئی
خفیہ کہ در دل داشتند نماند۔[1]	مانع ان پوشیدہ دلی تقاضوں کے
	اظہار میں نہیں رہا۔

اس فیصلہ کے بعد وہ تمام تبدیلیاں شروع کر دی گئیں جن سے یہ خیال مملکت میں عام اور پختہ ہو جائے، چنانچہ سکہ پر (جو ہر ایک کے ہاتھ میں جاتا ہے اور جس سے بڑھ کر کوئی اشتہار نہیں) الف کی تاریخ ثبت کر دی گئی،[2] تاریخ عالم میں ایک حد فاصل قائم کرنے کے لئے اور اس کو دو دوروں میں تقسیم کرنے کے لئے تاریخ الفی کے نام سے ایک نئی تاریخ کی تدوین کا کام علماء کے ایک بورڈ کے سپرد ہوا، اس میں سنین میں بجائے ہجرت کے رحلت کا ذکر کیا گیا، لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ:۔

"اس صاحب زماں کا وقت آگیا ہے جو ہندو مسلمان کے بہتر فرقوں کے اختلاف کا مٹانے والا ہوگا اور وہ بادشاہ کی ذات قدسی صفات ہے۔"[3]

اسی سے دین الٰہی اکبر شاہی کا آغاز ہوا، جس میں توحید کے بجائے (عبادت آفتاب کی

---

[1] منتخب التواریخ ص ۳۰۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۲۷۹

شکل میں) شرک صریح، کواکب پرستی، ایمان بالبعث کے بجائے عقیدۂ تناسخ تھا، اکبر باقاعدہ بیعت لیتا تھا، اس دین میں داخل ہونے والوں سے جو کلمہ پڑھوایا جاتا تھا، اس میں لاالٰہ الااللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ بھی شامل کیا جاتا تھا، کلمہ کے ساتھ ایک اقرار نامہ بھی ہوتا تھا، جس میں کہا جاتا تھا کہ :۔

"میں اپنی خواہش اور رغبت و دلی شوق کے ساتھ مجازی و تقلیدی دین اسلام سے جو باپ داداؤں سے سنا اور دیکھا تھا علیحدگی اور جدائی اختیار کرتا ہوں، اور اکبر شاہی دین الٰہی میں داخل ہوتا ہوں، اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبوں، یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس و عزت، ترک دین کو قبول کرتا ہوں[1]"

اس دین میں سود، جوئے، اور شراب، اور لحم خنزیر کی حلت تھی، اور ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت قانون نکاح میں ترمیمات کی گئی تھیں، پردہ اور رسم ختنہ کی ممانعت تھی، جسم فروشی کے کاروبار کو منظم کر دیا گیا تھا، اور اس کی جگہ مقرر کر دی گئی تھی، اور اس کے لئے قانون بنا دیا گیا تھا، تدفین کے طریقہ میں بھی ترمیم کر دی گئی تھی، غرض ایک مستقل ہندی اکبری دین کی تدوین ہوئی تھی، جس میں فطرت انسانی کے قانون قدیم کے مطابق اس دین اور طریقۂ زندگی کا پلڑا جھکا ہوا تھا، جس کی طرف طبعی میلان اور تسکین نفس کا سامان تھا، اور خارجی و ملی و سیاسی مصالح اس کی ترجیح کے حق میں تھے[2]۔

---

[1] منتخب التواریخ ص ۲۷۳ [2] اس رواداری اور صلح کل تحریک یا نئے دین و آئین میں اسلام اور ہندو مذہب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ قائم نہیں رہ سکا، قدرتاً اس مذہب اور فرقہ کا پلڑا جھک گیا جس کا دربار میں رسوخ اور طبیعت میں رجحان تھا، مختصر تاریخ ہند کے مصنفین، ڈبلیو، ایچ، مورلینڈ اور اے، سی، چٹرجی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ "اکبر نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے گاؤکشی بھی بند کر دی تھی، اور اس کے اس حکم کی (باقی ص ۱۰۸ پر)

اکبر کے دینی و مزاجی انحراف و اختلال کا نقطۂ عروج

اکبر کا یہ دینی و مزاجی انحراف و اختلال کس نقطہ تک پہونچ گیا تھا، اس کے لئے ہم سب سے پہلے اکبر کے عقل کُل اور نفس ناطقہ ابوالفضل علامی کے اقتباسات پیش کریں گے، یہ اس ہمہ گیر تبدیلی اور انحراف کی متفرق کڑیاں ہیں، جو ابوالفضل کے بیانات میں پائی جاتی ہیں، ان کو جمع کر کے اس زنجیر آتشیں کا کچھ تصور کیا جا سکتا ہے، جو اس وقت اسلام کے گلے میں ڈال دی گئی تھی۔ ع

تو خود حدیث مفصّل بخواں ازیں مجمل

آتش پرستی

کیہان فروز روشن دل، نور دوستی را ایزد پرستی شمارد، و ستائش الٰہی اندیشد، نادان تیرہ خاطر دا و فراموشی و آذر پرستی خیال کند۔[1]

جہاں پناہ اپنی روشن ضمیری سے روشنی کو بیحد عزیز رکھتے ہیں، اور اس کی تعظیم و تکریم کو خدا پرستی اور ستائش الٰہی خیال فرماتے ہیں، نادان کور باطن اس کو خدا فراموشی و آتش پرستی کہتے ہیں۔

(بانی صـ۱۰۷ کا) خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں، اکبری قوانین دین اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے، اس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔

A SHORT HISTORY OF INDIA. کا اردو ترجمہ از مولانا محمد یوسف کوکن صـ۲۵۱

[1] آئین اکبری جلد ۱ صـ۲۸ (طبع لکھنؤ ۱۸۸۲ء)

وچوں روشنی بخش جہاں، نور خویش
برگیرد، خدمت گزاران سعادت
گرا ے در دوازدہ لگن ہائے زریں
وسیمیں کافوری شمعہا افروختہ در پیشگاہ
حضور آورند و یکے از سرایندگان
شیوہ زبان شش ردست، ایزدی سپاس
برگزارد و بگوناگوں نمط سراید و پسیں
دعائے دولت روزافزوں برخواند۔[1]

آفتاب کے غروب ہونے کے بعد خدمت
گزار بارہ کافوری شمعیں روشن کرتے
ہیں، ــــــ اور ہر چراغ چاندی اور
سونے کی لگن میں رکھ کر بادشاہ کے حضور
میں لاتے ہیں اور ان میں سے ایک شیریں
زبان، خوش گلو خادم شمع کو ہاتھ میں لئے
مختلف دلکش سروں میں خدا کی حمد کے
اشعار گاتا ہے اور آخر میں خود جہاں پناہ
کے ازدیاد عمر و دولت کی دعا کرتا ہے۔

آفتاب پرستی

دو آشیانہ منزل، ایزد پرستش دریں
نزہت کدہ شود، دنیالیش خورشید والا
ازیں جالیش آغاز باشد۔[2]
می فرمودند خورشید والا را بہ فرماں روایان
عنایت ست خاص واز یں رو دنیالیشگری
بدو نمایند والٰہی پرستش برشمردند و
کوتاہ بین در بدگمانی در افتند۔

دو آشیانہ منزل نام کی عمارت میں
ایزد پرستی ہوتی تھی اور یہیں سے آفتاب
کی تعظیم کی ابتدا ہوتی تھی۔
فرماتے ہیں کہ آفتاب کی سلاطین کے
حال پر ایک خاص عنایت ہے، اسی
وجہ سے اس کی عبادت خدا کی عبادت
خیال کی جاتی ہے، لیکن کوتاہ بیں شخص

---

[1] ج ۱ ص ۲۹ [2] ج ۱ ص ۳۲

می فرمودند عامہ بخیال نفع چگونہ خواستہ داران (مالداران) سیہ دروں را بزرگ دارند و از نابینائی در احترام ایں چشمۂ نور کوتہی رود و برنیایش گزبان پیغارہ (طعن) برکشایند اگر خرد را آفتے نرسیدہ سورۂ والشمس چرا ازیاد رفت[1]۔

بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عوام کس لئے سیہ دل دولتمندوں کی اپنے نفع کی غرض سے عزت کرتے ہیں اور اپنی نابینائی کی وجہ سے اس چشمۂ نور کے احترام میں کوتاہی کرتے ہیں، اور عبادت گزار پر طعنہ زنی کرتے ہیں، اگر خود ان کی عقل پر آفت نہ آگئی ہے تو سورۂ والشمس کیوں فراموش کر دی گئی ہے۔

گنگا جل

در سفر و حضر آب گنگ برآشامد و چندے از راستان سعادت گرائے برساحل آن باشند باحتیاط برگیرند و کوزہ ہا سرمبہر آید۔

بادشاہ سفر و حضر ہر وقت گنگا کا پانی نوش فرماتے ہیں، معتمد ملازمین کا ایک گروہ دریا کے کنارے مامور ہے جو سرمبہر کوزوں میں پانی بھر کر لاتا ہے۔

در آں ہنگام کہ مرکب اقبال در دار الخلافت آگرہ و فتحپور بود، از قصبۂ سوروں می آوردند امروز کہ عرصۂ پنجاب بقدوم شاہنشاہی آرامگاہ، از ہر دواری آرند

جب جہاں پناہ آگرہ اور فتحپور میں قیام فرماتے ہیں تو قصبہ سوروں سے پانی لایا جاتا تھا، اس زمانہ میں جب کہ شاہی خیمہ لاہور میں نصب ہے ہر دوار

---

[1] ج ۳ ص ۱۸۴

ودرخورش پختن آب جمنا وچناب و آب باراں بخرج رود دولختے ازو (گنگا) نیز برآمیزند۔[1]

کے عمدہ پانی سے آبدارخانہ سیراب ہے باورچی خانہ میں جمنا اور چناب کا پانی یا آب باراں صرف ہوتا ہے لیکن ان میں تھوڑا پانی گنگا کا ملایا جاتا ہے۔

تصویر کشی

برقدسی زبان رفت آنکہ برخے نکوہش ایں پیشہ نمایند دل برنتابد وبخاطر چناں رسد کہ درخداشناسی افزوں تر ازبسیارے بود چہ ہرگاہ جانورنگار دو عضو عضو برکشد واز نیکہ روحانی پیوند نیارد، داد بہ نیرنگئ جاں آفریں گراید وشناسائی اندوزد۔[2]

ایک روز قبلۂ عالم نے خلوت کدے میں جہاں صرف مریدان سعادتمند کا مجمع تھا، فرمایا کہ ایک گروہ فن تصویر کشی کا دشمن ہے، اور اس پیشے کے معائب بیان کرتا ہے، لیکن اس کے اقوال و دلائل کو دل قبول نہیں کرتا، بلکہ قرین قیاس وعقل یہ ہے کہ مصور اکثر طبقات انسانی سے زیادہ خداشناس ہوسکتا ہے، اس لئے کہ یہ شخص جانور کی تصویر اتارنے میں اس کے ہر عضو کی شبیہ کھینچتا ہے، اور تصویر کو تمام کرکے جب دیکھتا ہے کہ باوجود اس ظاہری سحر نگاری کے وہ اس میں

---

[1] آئین اکبری ج ۱ ص ۳۳ [2] ج ۱ ص ۷۸

روح پھونکنے سے عاجز ہے تو اس کو
خالق مطلق کی قدرت کاملہ کا اندازہ
ہوتا ہے، اور صانع باکمال کے آگے
سربسجدہ ہو جاتا ہے۔

اوقات عبادت

سحرگاہ کہ دیباچۂ بہروزی وعنفوان نورپاشی است ونیمۂ روز کہ فروغ آفتاب عالمتاب جہاں را درگیرد وسرمایۂ نشاط گوناگوں فروغ آید وشامگاہ مایہ دہ روشنیہا از چشم خاکیاں پنہاں شود۔[1]

صبح جو مبارک دن کا آغاز اور نورپاشی کی ابتدا ہے، دوپہر جبکہ آفتاب عالمتاب کی روشنی تمام عالم کو محیط ہوتی ہے اور لوگوں میں گوناگوں نشاط پیدا ہو جاتا ہے، اور شام جبکہ سرچشمہ روشنی (آفتاب) لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

سجدۂ تعظیمی

بندگان ارادت گرائے سجود نیایش افزایند وآنرا سجدۂ ایزدی برشمارند۔[2]

بندگان عقیدتمند سجدۂ تعظیمی کرتے اور اسے سجدۂ ایزدی شمار کرتے ہیں۔

بیعت وارشاد

جویائے آگہی دستار برکف سر تقدسی

جویائے آگہی ہاتھ میں دستار لے کر

---

[1] ج ۱ ص ۱۰۵ [2] ج ۱ ص ۱۰۷

پائے برنہد و بزبان حال چناں سراید
کہ بیاوری بخت بیدار و رہنونئ
ستارہ خود آرائی و خویشتن گزینی کہ بنگاہ
گوناگوں گزند بود از سر افگندہ روئے
دل بہ نیایش گرمی آورد م۔ الخ[1]

سر کو پائے اقدس پر رکھتا اور زبانِ حال
سے اس طرح کہتا ہے کہ بخت بیدار
کی یاوری اور ستارۂ خود آرائی و خویشتن
گزینی کی رہنمائی میں (جو گوناگوں
نقصانات کا سبب تھا) میں دل کی
توجہ بادشاہ کی اطاعت کی طرف
مبذول کرتا ہوں۔ الخ

آداب ملاقات

ہنگام دیدار ہم یکے اللہ اکبر آید و
دیگرے جل جلالہ سراید۔[2]

ملاقات کے وقت ایک آدمی اللہ اکبر
کہتا اور دوسرا جل جلالہ کہتا ہے۔

تاریخ ہجری سے تنفر

از دیر باز سر بر آرائے اقبال بران
بود کہ در آباد بوم ہندوستان تازہ سال
و مہ بروئے کار آید و دشواری بآسانی
گراید و نیز از تاریخ ہجری کہ از ناکامی
آگہی بخشد سر گرانی داشتند لیکن

عرصۂ دراز سے قبلۂ عالم کا ارادہ تھا کہ
ملک ہندوستان میں جدید سال و ماہ
جاری فرما کر دقتیں رفع کریں اور سہولتیں
بہم پہونچائیں، جہاں پناہ سنہ ہجری
کو بوجہ اس کے نقائص کے پسند نہیں فرماتے

[1] ج ۱ ص ۱۱۰ [2] ج ۱ ص ۱۱۱

ازانبوہ کوتاہ بینان کارنشناس کہ
روائی تاریخ راناگزیر دیں پندارند،
شاہنشاہ مدارا پژوہ پیوند دلہاگرامی
شمردہ اندیشہ بیروں نمی فرستاد۔[1]

لیکن ناعاقبت اندیش وکم فہم افراد
کی کثرت کی وجہ سے جو تاریخ وسنہ
کے اجراء کو بھی ایک دینی مسئلہ سمجھتے ہیں
حضرت کی خاطر پرور طبیعت نے
گوارہ نہ کیا کہ اس گروہ کی دل شکنی فرمائیں
اور یہی وجہ تھی کہ قبلۂ عالم ابتدا میں اپنے
خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

غیر اسلامی تہوار اور عیدین

ودر لوازم جشن نوروزی وعیدہا اہتمام
نمایند، عید بزرگ نوروز است کہ
ابتدائے آں در وقت تحویل نیز
نور بخش عالم در برج حمل است و
آغاز ماہ فروردین است عید دیگر
نوزدہم ماہ مذکور کہ روز مشرف است،
وعید دیگر سوم ماہ اردی بہشت، و
عید دیگر ششم ماہ خرداد، عید دیگر
سیزدہم ماہ تیر است، عید دیگر ہفتم

پہلا جشن جشن نوروزی کے نام سے
موسوم ہے، جب آفتاب سال کا دورہ
تمام کرکے برج حمل میں داخل ہوتا
ہے، اور اپنی برکات سے اہل عالم کو
مستفید کرتا ہے تو انیس[19] روز کامل
عشرت ونشاط کی ہنگامہ آرائی ہوتی
ہے، اس زمانہ میں دو روز عید کا تہوار
منایا جاتا ہے، اور بے شمار نقد اور
طرح طرح کی اشیاء بطور صدقہ اور

[1] ج ۱ ص ۱۹۳

ماه مرداد ست، عید دیگر چہار دہم
ماہ شہریور ست، عید دیگر شانزدہم
ماہ مہر ست عید دیگر دہم ماہ آبان ست،
عید دیگر نہم ماہ آذر ست، و در دی
ماہ سہ عید ست، ہشتم و پانزدہم و
بست و سوم، عید دیگر دوم ماہ بہمن
ست، عید دیگر پنجم ماہ اسفندار ست،
و عید ہائے متعارف را بدستور میکردہ
باشد، و شب نوروز و شب شرف
بطریق شب برأت چراغاں کند و در
اول شبے کہ صباح آں عید باشد نقارہ
نوازند و روز ہائے عید بر سر ہر شہر
نقارہ نوازند۔[1]

تحفہ اور ہدیہ تقسیم کی جاتی ہیں، یکم فروردین
اور انیسؔ[19] فروردین جو یوم شرف ہیں،
عید کے لئے مخصوص ہیں، پارسیوں کا
دستور ہے کہ ہر ماہ کے اس روز جو ماہ
کا ہمنام ہوتا ہے بیحد مبارک خیال
کرتے ہیں، اور اس روز جشن عشرت
منعقد کر کے بیحد نغمہ نوازی و سامان
ضیافت وغیرہ کرتے ہیں، قبلۂ عالم
نے بھی اس رسم کی تقلید کی اور ہر شمسی
ماہ ایک خاص جشن کے لئے مخصوص
ہو گیا، ان ایام کی فہرست مندرجہ ذیل ہے
انیسؔ[19] فروردین، تیسریؔ[3] اردی بہشت
چھٹیؔ[6] خورداد، تیرہؔ[13] تیر، ساتویںؔ[7] امرداد
چوتھیؔ[4] شہریور، سولہؔ[16] مہر، دسؔ[10] آبان،
نویںؔ[9] آذر، آٹھویں، پندرہؔ[15] ہویں اور
تئیسؔ[23] دے، دوسریؔ[2] بہمن، پانچویںؔ[5]
اسفندار۔

ان ایام میں جشن منعقد ہوتا ہے، اور ہر جشن میں انواع و اقسام کی زیب و زینت و

---

[1] ص ۶۴

آرائش کی جاتی ہے، حاضرین فرط مسرت سے بے اختیار ہو کر نعرہ ہائے نشاط بلند کرتے ہیں۔
ہر پہر کے آغاز پر نقارہ نوازی ہوتی ہے، اور اربابِ نشاط اپنی نغمہ سرائی اور اپنے ساز سے ہنگامۂ عیش برپا کرتے ہیں۔

فرمان در منع زکوٰۃ

متصدیان حال واستقبال، وکارفرمایان کل وجزء ممالک محروسہ بدانند کہ دریں ہنگام سعادت انتظام کہ از ابتدائے جلوس برادرنگ جہاں بانی کہ سنہ سابع ست از قرن ثانی (دی سال سی وہفتم، چہ مراد از قرن درینجا سی سال است) وآغاز ابتسام بہار دولت واقبال وزمان انکشاف صبح جلال وجمال است، فرمان عدالت نشور افاضت بنیان بارقۂ بروں وہ اشعۂ ظہور یافت کہ چوں ناموس اکبر وقانون اعظم سلطنت کہ ابد پیوند الٰہی جل جلال قدرہ بمقتضائے حکمت بالغۂ ازلی کہ

ملازمانِ حال واستقبال اور ممالک محروسہ کے کارپردازوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس دورِ سعادت میں جس کی ابتدا سن جلوس سے ہے، اور جو قرن ثانی کا ساتواں سال ہے (یعنی ۳۷ سنہ کیونکہ قرن سے یہاں تیس ۳۰ سال مراد ہیں) اور جو بہار دولت واقبال اور صبح جلال وجمال کے ظہور کا عہد ہے یہ فرمان صادر ہوا، کہ سلطنت کی حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ حکومت و سیاست جو مقیم ومہاجر اور ملازم و تاجر طبقہ کے مفاد کی حفاظت کا نام ہے، اور جو خراج کا ایک ذریعہ ہے، جس پر نظام عساکر کا مدار ہے،

سلسلہ جنبان دار و گیر عالم ایجاد
و تعبیہ پرواز کن فیکون دائرۂ کون و فساد
ست چناں اقتضا کردہ کہ ریاست
ممالک و سیاست مدن کہ عبارت
ست از ارتباط احوال مقیم و مہاجر
و انتساق مصالح کاسب و تاجر
بدستیاری پادشاہان عادل و دیدبانئ
شہریاران دریادل جلوہ نما و صورت
پذیر باشد و یکے از وجوہ خراج کہ مدار علیہ
نظام عساکر نصرت و جنود اقبال کہ حارسان
اعمار و اموال، و حافظان عقائد و احوال
خلائق اند باج اشیاست کہ در بازار
بیع و شراء و چار سوئے چوں و چرا در آمدہ
کہ اگر سنجیدہ میزان اعتدال ارباب
صیانت و دیانت کہ نقادان نقود و
اجناس کونی الٰہی و مقومان اعراض انفسی
و آفاقی اند گردد، ہر آئینہ جمیع مصالح
بمفاسد انجامد، تمامی محامد بذمائم کشد
للہ الحمد کہ از مبادی احوال نصفت

جو جان و مال اور عقائد کی حفاظت
اور بازاروں کی نگرانی کرتے ہیں،
اگر ان اصحاب امانت و دیانت
کی میزان غلط ہو جائے جو نقد و جنس
کے پرکھنے والے ہیں، تو تمام
مصالح مفاسد سے اور اچھائیاں
برائیوں سے بدل جائیں، الحمد للہ
کہ شروع ہی سے ما بدولت کی
توجہ رفاہِ عام اور رعایا کی پرورش
کی طرف رہی ہے، جو بادشاہ
کی اولاد معنوی اور امانت
خداوندی ہیں، المنۃ للہ کہ
ہندوستان اور دیگر ممالک
محروسہ عدل و خوشحالی کا گہوارہ
اور مسافران عالم کی فرودگاہ
ہیں۔
حال ہی میں مراحم خسروانہ
سے یہ حکم صادر ہوا کہ اصناف
غلہ و نباتات، غذائیں اور

اشتمال ہمگی توجہ خاطر عدالت مناظر و تدبیر
باطن جلادت مواطن مادر رفاہیت عموم
بریت و مراسم تربیت خصوصی رعیت کہ
فی الحقیقت فرزندان معنوی و ودائع
خداوندی اند معروف بودہ المنۃ للہ کہ
باضاءت لوامع عدالت سواد اعظم ہندوستان
ست، و دیگر ممالک محروسہ منہل اصناف
ناز و نعیم و امن مسافران ہفت اقلیم ست،
در نیولا بموجب توسعۂ مراحم ذاتی و تکملۂ
مکارم فکری حکم نافذ و امر جازم شرف
اصدار و عزت ایراد یافت کہ از اصناف
حبوبات و غلات و نباتات از اغذیہ و
ادویہ و روغن و نمک و مشک و اقسام عطریات
کرپاس و پنبہ، و اسباب پشمینہ، و ادوات
چرمینہ و آلات مسیہ و ظروف چوب و ہیمہ
و نے و کاہ و دیگر اشیا و اسباب و امتعہ و
اجناس کہ مدار معاش جمہور انام و ملاک
معشیت خواص و عوام است سوائے
اسپ و فیل و شتر و گوسفند و بز و اسلحہ و

دوائیں، نمک و مشک، اقسام
عطریات، کپڑے اور روئی،
اسباب پشمینہ، چرمی سامان
و تانبہ اور لکڑی کے ظروف،
بانس اور گھانس، اور دیگر اشیاء
و اجناس سے کہ مدار زندگی ہیں،
سوائے ہاتھی، گھوڑے،
اونٹ، بکری، اسلحہ اور ضروری
سامان کے (جو پہلے سے مستثنیٰ
ہیں) تمام ممالک محروسہ میں
زکوٰۃ اور چھوٹے بڑے تمام
ٹیکس معاف کئے جاتے ہیں۔

قماش کہ در تمامی ممالک محروسہ تمغا باج
وزکوٰۃ وصدیک وآنچہ از قلیل وکثیر
می گرفتہ اند معاف ومرفوع القلم
بودہ باشد۔[1]

ہندو موحّد ہیں

روشن شد کہ آنچہ زبان زد روزگار است
کہ ہندو ایزد بے ہمال را انباز گیرد فروغ
راستی ندارد، اگرچہ در برخے مطالب
ولختے دلائل جائے آویزش لیکن خداپرستی
ووحدت گزینیٔ ایں طائفہ دلنشین آمد۔[2]

ہم پر روشن ہوا کہ یہ جو بات زبان زد
عام ہے کہ ہندو خدائے واحد کا شریک
ٹھہراتے ہیں صحیح نہیں، اگرچہ بہت سی
باتیں اور دلیلیں قابل اعتراض ہیں،
لیکن اس قوم کی وحدت گزینی اور
خداپرستی کا یقین ہے۔

گوشت خوری

می فرمودند اگر دشوار زندگی بخاطر
نیامدے مردم را از گوشت خوردن
باز داشتے، وآنکہ خود بیک بارگی نمی
گزاریم ازاں ست کہ بسیارے کام ناکام

فرماتے ہیں کہ اگر دشوار زندگی میرے
ذہن نشین نہ ہو جاتی تو میں انسانوں کے
گوشت خوری سے مانع ہوتا اور میں
اس لحاظ سے اس پر یکبارگی عمل کرنا

---

[1] طبقات اکبری ص ۶۷-۶۸ [2] آئین اکبری ج ۳ ص ۲

خواہد گذاشت و بہ تنگنائے غم کالیوہ (دیوانہ) خواہند شد.....

نہیں چاہتا کہ بہت سے کام ناتمام رہ جائیں گے اور انسان اس سخت غم میں دیوانے ہو جائیں گے۔

می فرمودند قصاب و ماہی گیر و مانند آن جز جان شکاری پیشہ ندارند بنگاہ اینان از دیگر مردم جدا باشد و از آمیزندہ تا واں گیرند۔[1]

فرماتے ہیں کہ قصاب اور ماہی گیر اور مثل ان کے دیگر اشخاص جن کا پیشہ جاں شکنی ہے، ان کی قیام گاہ کو عام آبادی سے علیحدہ کر دیا جائے، اور ان سے ملنے والوں سے تاوان وصول کیا جائے

خنزیر

می فرمودند اگر سرمایۂ حرمت خوک بے غیرتی باشد بایستے شیر و مانند آن حلال بودے۔[2]

فرماتے ہیں کہ اگر سور کی حرمت کا باعث اس کی بے غیرتی ہے تو لازم ہے کہ شیر یا مثل اس کے دوسرے جانور حلال ہوں

شراب نوشی

در جشن ایں ماہ بادۂ ہوش فزا می پیمودند میر صدر جہاں مفتی، میر عدل، میر عبدالحی، نیز ساغرے در کشیدند گیتی خدیورا ایں بیت بر زبان رفتہ ؎

اس ماہ کے جشن میں بادۂ ہوش افزا نوش فرماتے تھے، میر صدر جہاں مفتی، میر عدل اور میر عبدالحی نے بھی بادہ پیمائی کی اور بادشاہ کی زبان پر یہ شعر آیا ؎

---

[1] آئین اکبری ج ۳ ص ۱۸۹ [2] ایضاً ج ۳ ص ۱۸۶

در دور پادشاہ خطا بخش و جرم پوش
قاضی قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش[1]

رسم ہندوانہ

مادر خان اعظم مرزا کو کہ بسخت رنجوری درگذشت و جہاں سالار را غم در گرفت در سوگواری موئے سر و بروت ستردند ہر چند کوشش رفت کہ جز فرزندان آں مہین بانو دیگر نستردند بندگان اخلاص سرشت پیروی کردند۔[2]

والدہ خان اعظم مرزا کو کہ سخت بیماری کے سبب چل بسیں اور جہاں پناہ کو ایسا غم ہوا کہ ماتم میں سر اور مونچھیں منڈوا دیں، ہر چند کوشش ہوئی کہ سوا اس مرحومہ کے بڑے فرزندوں کے کوئی بال نہ منڈائے مگر بندگان مخلص نے بادشاہ کی پیروی کی۔

سنین الٰہی کا اجراء

"سنہ ۹۹۲ھ میں شاہنشاہی تنویر عقل و دانش نے علم و کمال کی وہ نورانی شمع جلائی جس نے اپنی بابرکت روشنی سے تمام عالم کو تاباں و درخشاں کر دیا، خوش نصیب و حق پسند گروہ نے بالیقین ناکامی سے سر اٹھایا، اور بیہودہ گو، سست رائے افراد نے گوشۂ گمنامی میں منہ چھپایا، قبلہ عالم کے نیک ارادہ نے عملی جامہ پہنا اور یادگار حکماء میر فتح اللہ شیرازی نے اس کام کو انجام دینے پر کمر ہمت باندھی، علامہ شیرازی نے جدید زیچ گورگانی کو پیش نظر رکھ کر جہاں پناہ کے سال جلوس

---

[1] آئین اکبری ج ۳ ص ۶۰۶ (اردو) [2] اکبر نامہ ج ۳ ص ۸۳۰

کو سنہ الٰہی کی ابتدا قرار دی[1]۔

ان بنیادی حقائق کے بعد جن سے اکبر کے دینی فکر کا پورا ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے، اب کوئی حرج نہیں کہ ہم ملا عبدالقادر بدایونی کی دی ہوئی بعض تفصیلات و جزئیات سے اس ڈھانچہ کو اور مکمل و مشکل کر دیں، اور دین اسلام سے انحراف نے اسلام اور صاحبِ شریعت اسلامیہ سے جو بُعد و وحشت بلکہ تنفر و عناد پیدا کر دیا تھا، اس کا صحیح نقشہ بھی لوگوں کے سامنے آسکے۔

دین اسلامی کی تحقیر

ملت اسلام ہمہ نامعقول و حادث و واضع آں فقراء عربان بودند کہ جملہ مفسداں و قطاع الطریق، و آں دو بیت شاہنامہ کہ فردوسی طوسی بہ طریق نقل آوردہ متمسک می ساختند۔

ملت اسلامی کا سارا سرمایہ حادث و بدعقلی کا مجموعہ ٹھہرایا گیا اور اس کے بنانے والے (العیاذ باللہ) عرب کے وہ چند مفلس بدو قرار پائے جن میں سب کے سب مفسد اور راہزن تھے، اور شاہنامۂ فردوسی کے دو مشہور شعروں سے سند پکڑی گئی جو اس نے بطور نقل کہے تھے ؎

زشیر شتر خوردن و سو سمار — عرب را بجائے رسید ست کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو — تفو باد بر چرخ گرداں تفو[2]

---

[1] آئین اکبری ج ۱ ص ۵۶۴ (اردو ترجمہ فدا علی طالب حیدر آباد ۱۹۳۸ء)
[2] منتخب التواریخ ص ۳۰۷

اسراء و معراج کا استہزاء

ایں معنی را عقل چہ گونہ قبول کند کہ
شخصے در یک لحظہ با گرانی جسم از خواب
بآسماں رود و نود ہزار سخن گو گوئے
باخدائے تعالےٰ کند و بستر ش ہنوز
گرم باشد، و مردم بآں دعوی بگرایند
ہم چنیں شق و قمر و امثال آں۔

آخر اس بات کو عقل کس طرح مان سکتی
ہے کہ ایک شخص بھاری جسم رکھنے کے
باوجود یکایک نیند سے آسمان پر چلا جاتا
ہے، اور اللہ کے ساتھ طرح طرح کی نوے ہزار باتیں[۹۰]
کرتا ہے، لیکن اس کا بستر اس وقت تک
گرم ہی رہتا ہے اور لوگ اس دعویٰ
کو مان لیتے ہیں، اور اسی طرح شق القمر
وغیرہ جیسی باتوں کو بھی مان لیتے ہیں۔

پھر اپنی اٹھی ہوئی ٹانگ کی طرف حاضرین کو مخاطب کر کے سوال کرتا ہے۔

ممکن نیست کہ تا پائے دیگر بر جا ماند
استادہ تواں بیم ایں چہ حکایتہاست؟[۱]

ناممکن ہے کہ جب تک دوسرا پاؤں
زمین سے ٹکا نہ ہو میں کھڑا نہیں ہو سکتا
آخر یہ ہیں کیا قصے؟

مقام نبوت کی اہانت

زدن قافلہ قریش در اوائل ہجرت
وچہاردہ زن خواستن و تحریم شہد کردن

یعنی اوائل ہجرت میں قریش کے قافلہ
کا لوٹنا چودہ[۱۴] عورتوں سے نکاح کرنا

---

[۱] منتخب التواریخ ص ۳۱۷ جلد سوم

برائے خوشنودی زناں[1]۔

اور بیویوں کی رضامندی کے لئے شہد کو حرام کرنا (ان سے نبوت پر اعتراض کرنا تھا)

اسمائے نبوی سے وحشت و گرانی

نام احمد و محمد و مصطفٰے و امثال آں بہ جہت کافران بیرونی و زنان اندرونی گراں می آمد تا بہ مرور ایام اسامی چند را از مقرباں کہ بایں نام مسمّٰی بودند تغیر دادہ مثلاً یار محمد، محمد خاں را رحمت می خواندند و می نوشتند[2]۔

احمد و محمد و مصطفٰے وغیرہا بیرونی کافروں کی خاطر سے اور اندرونی عورتوں کی وجہ سے بادشاہ پر گراں گزرنے لگے آخر کچھ دن کے بعد اپنے خاص لوگوں کے نام ـــــ بدل بھی ڈالے مثلاً یار محمد اور محمد خاں کو وہ رحمت ہی کے نام سے پکارتا بھی تھا، اور لکھنے کے وقت بھی ان کو اسی نام سے موسوم کرتا تھا۔

نماز کی عدم اجازت

در دیوان خانہ ہیچ کسے یارائے آں نداشت کہ علانیہ ادائے صلاۃ کند[3]۔

دیوان خانہ میں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز ادا کر سکے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

نماز و روزہ و حج پیش ازاں ساقط

نماز و روزہ اور حج تو اس سے پہلے

---

[1] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۰۸ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۱۴ [3] ایضاً ص ۳۱۵ ج ۲

شدہ بود[1]۔

ارکان اسلام کی توہین واستہزاء

پسر ملا مبارک شاگرد ابوالفضل رسائل در باب قدح وتمسخر ایں عبادات بہ دلائل [illegible] ومقبول افتادہ باعث تربیت گشت[2]۔

ہی ساقط ہو چکے تھے۔

ملا مبارک کے ایک بیٹے نے جو ابوالفضل کا شاگرد تھا، اسلامی عبادات کے متعلق اعتراض اور تمسخر کے پیرایہ میں چند رسالے تصنیف کئے (شاہی جناب) میں اس کے ان رسالوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس کی سرپرستی کا ذریعہ یہی رسالے بن گئے۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا سنگین اور خطرناک موڑ

غرض یہ کہ اس وقت ہندوستان جس میں دین فطرت کے شجرۂ طیبہ کے نصب اور بارآور کرنے کے لئے چار سو[400] برس تک مسلسل بہترین انسانی توانائیاں، دماغی صلاحیتیں اور اہل قلوب اور اصحاب صفا کی روحانیتیں صرف ہوئی تھیں، ایک ہمہ جہتی، دینی، ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے راستہ پر پڑ رہا تھا، جس کی پشت پر اس عہد کی ایک عظیم ترین سلطنت اور فوجی طاقت تھی، جس کو اپنے زمانہ کے متعدد ذہین وفاضل انسانوں کی علمی وذہنی کمک بھی حاصل تھی، اس وقت اگر حالات کی رفتار یہی رہتی اور اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جانے والی

---

[1] ایضاً ص ۲۵۱ [2] ایضاً

کوئی طاقتور شخصیت یا کوئی انقلاب انگیز واقعہ پیش نہ آتا تو اس ملک کا انجام گیارہویں صدی ہجری میں بظاہر وہی ہوتا جو نویں صدی ہجری میں اسلامی اندلس کا (جس کو دنیا اب صرف اسپین کے نام سے جانتی ہے) یا چودھویں صدی ہجری میں (انقلاب روس کے بعد) ترکستان کا ہوا لیکن۔ ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

ہم اس باب کو سیرت نگار نبوی اور مؤرخ اسلام مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اس بلیغ عبارت پر ختم کرتے ہیں، جو انھوں نے "ہندوستان کے غربت کدہ میں مسافر اسلام" کی داستانِ سفر سناتے ہوئے لکھی ہے:۔

"اس غفلت کی نیند پر چار سو برس گزر گئے، اور مسافر کے آغاز سفر پر ہزار واں برس گزر رہا تھا، یہ اکبر کا دور تھا جب عجم کے ایک جادوگر نے آکر بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہوگئی، اب وقت ہے کہ ایک شاہنشاہ امی کے ذریعہ نبی امی علیہ الصلاۃ والسلام کا دین منسوخ ہو کر دین الٰہی کا ظہور ہو، مجوسیوں نے آتش کدے گرمائے، عیسائیوں نے ناقوس بجائے برہمنوں نے بت آراستہ کئے، اور جوگ اور تصوف نے مل کر کعبہ اور بت خانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا، اس پنج میل تحریک کا جو اثر ہوا اس کی تصویر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو "دبستان مذاہب" کا مطالعہ کرے، کتنے زناروں کے ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خوانوں کے گلوں میں زنار نظر آئیں گے! بادشاہی آستانہ پر کتنے امیروں کے سر سجدہ میں پڑے اور شہنشاہ کے دربار میں کتنے دستار بند کھڑے دکھائی دیں گے، اور مسجدوں کے منبر سے یہ صدا سنائی دے گی:۔

تعالیٰ شانہٗ ۔ اللہ اکبر!

یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کی سمت سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی: "راستہ صاف کرو کہ راستہ کا چلنے والا آتا ہے" ایک فاروقی مجدد، فاروقی شان سے ظاہر ہوا، یہ احمد سرہندی تھے"[1]

---

[1] مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۳۰-۳۱

باب سوم

حضرت مجدد الف ثانیؒ

حالات زندگی، از ولادت تا خلافت

خاندان

حضرت مجدد صاحب نسبًا فاروقی ہیں[1]، آپ کا سلسلۂ نسب[2] ۳۱ واسطوں سے

---

[1] حضرت مجدد کو حضرت فاروق اعظم سے اس نسبت پر فخر تھا، اور وہ دینی حمیت کو اس کا تقاضا اور قدرتی نتیجہ سمجھتے تھے، جمہور اہل سنت اور عقائد اسلامیہ کے خلاف ایک عارف شیخ عبد الکبیر یمنی کی ایک تحقیق کو سُن کر ان کے قلم سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے ہیں، "مخدوما! ایں فقیر را تاب استماع امثال ایں سخنان نیست، بے اختیار رگ فاروقیم در حرکت می آید" مکتوب ۱۰۱ (دفتر اول بنام ملا حسن کشمیری) ایک دوسرے مکتوب میں یہ سن کر کہ قصبہ سامانہ میں خطیب نے خطبۂ جمعہ میں خلفائے راشدین کا ذکر عمدًا ترک کر دیا تحریر فرمایا "چوں استماع ایں خبر وحشت انگیز در شورش آورد رگ فاروقیم را حرکت داد، بچند کلمات اقدام نمود" (مکتوب نمبر ۱۵ حصۂ ششم دفتر دوم)

[2] سلسلۂ نسب کے بارے میں ہم نے اسی خاندان والا شان کے ذی علم و صاحب تحقیق فرزند مولانا شاہ ابو الحسن زید فاروقی کی اس محققانہ بحث پر اعتماد کیا ہے، جو انھوں نے مجدد صاحب کے سلسلۂ نسب کے بارے میں اپنی تصنیف "مقامات خیر" میں "حضرات آباء و اجداد کرام" کے عنوان سے (ص ۲۶-۳۳ میں) کی ہے، ان کی تحقیق یہ ہے کہ اٹھائیسویں (باقی ص ۱۲۸ پر)

امیر المؤمنین فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

حضرت شیخ احمد (مجدد الف ثانی) بن مخدوم عبد الاحد بن زین العابدین بن عبد الحی بن محمد بن حبیب اللہ بن امام رفیع الدین بن نصیر الدین بن سلیمان بن یوسف بن اسحاق بن عبد اللہ بن شعیب بن احمد بن یوسف بن شہاب الدین علی فرخ شاہ بن نور الدین بن نصیر الدین بن محمود بن سلیمان بن مسعود بن عبد اللہ الواعظ الاصغر بن عبد اللہ الواعظ الاکبر بن ابو الفتح بن اسحاق بن ابراہیم بن ناصر بن عبد اللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن حضرت عبد اللہ بن حضرت عمر الفاروق رضؓ۔

آپ کے پندرہویں جد شہاب الدین علی فرخ شاہ کابلی، اس سلسلہ کے نامور جد امجد اور مورث اعلیٰ ہیں، ہندوستان کے اکثر باکمال اور شہرۂ آفاق فاروقی النسب فضلاء اور مصلحین مشائخ واصحاب سلسلہ مثلاً حضرت بابا فرید الدین گنج شکر وغیرہ آپ ہی کے سلسلۂ نسب میں ہیں، افسوس ہے کہ افغانستان کے علماء ومشائخ کے حالات میں کسی مبسوط تذکرہ اور کتب طبقات کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے، ان کے جو کچھ حالات ملتے ہیں، ان کا ماخذ وہی کتابیں ہیں جو مجدد صاحب اور ان کے خاندان کے حالات میں لکھی گئی ہیں[1]، موصوف

(باقی ص۱۲۷ کا) واسطہ عمر کے بعد جس کو امیر المؤمنین عمر بن الخطاب سمجھا گیا ہے، چار واسطے عام طور سے کتب انساب میں ساقط ہو گئے، اور وہ حفص، عاصم حضرت عبد اللہ اور حضرت عمر الفاروق ہیں، غالباً ستائیسویں واسطہ عبد اللہ کے بعد عمر کا نام دیکھ کر مصنفین کو مغالطہ ہوا کہ یہی مشہور عبد اللہ بن عمر صحابی بن صحابی ہیں، لیکن چونکہ ان عبد اللہ بن عمر کے کسی فرزند کا نام ناصر نہ تھا، اس لئے یہ اشکال پیدا ہوا، اور تحقیق کی ضرورت سمجھی گئی، اس خاندان کے ایک بڑے باخبر ومحقق بزرگ شاہ محمد حسن مجددی (سائیں دادنہ) اور محمود احمد صاحب عباسی کی بھی یہی تحقیق ہے، اور احمد حسین خاں نے "جواہر معصومی" میں بھی یہی لکھا ہے۔

[1] مثلاً زبدۃ المقامات، حضرات القدس وغیرہ۔

شیخ نورالدین کے صاحبزادہ اور شیخ نصیرالدین کے پوتے تھے، اسی لئے ان کے خاندان کو بھی کابل کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے، وہ اوصاف محمودہ سے متصف تھے، اسلام کی اشاعت و ترویج اور شعائر کفر و شرک کی اہانت و تذلیل میں خاص امتیاز اور خصوصی ذوق رکھتے تھے۔[1]

والد ماجد کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوئے اور افغانوں اور مغلوں کے تنازعات ختم کرنے میں انھوں نے سعی محمود فرمائی، دنیاوی وجاہت و سیادت کے ساتھ دولت باطنی سے بھی حصۂ وافر رکھتے تھے، ایک کثیر تعداد نے آپ سے اکتساب فیض کیا، وفات سے پیشتر زمام حکومت صاحبزادۂ والاقدر شیخ یوسف کے حوالہ کر کے ایک درہ میں جو آپ کی نسبت سے درۂ فرخ شاہ کہلاتا ہے، اور کابل سے ساٹھ میل مسافت پر جانب شمال واقع ہے، عزلت و انزوا کی زندگی اختیار کی، اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

شیخ یوسف نے تحصیل علوم ظاہری کے بعد اپنے والد بزرگوار سلطان فرخ شاہ سے تربیت باطنی حاصل کی، اور ان کے ترک سلطنت کے بعد ان کی جانشینی کی، عدل و صلاح اور دینداری میں نیک نام اور مقبول خاص و عام تھے، آپ کے ضمیر میں بھی عشق الٰہی کی وہی چنگاری تھی، جو آپ کے آباء کرام کو دقتاً فوقتاً مولانا روم کے اس شعر پر کاربند ہونے پر آمادہ کرتی رہی تھی ؎

ملکِ دنیا تن پرستاں را حلال
ما غلامِ ملکِ عشق لا یزال

آپ نے بھی آخری عمر میں سلطنت و اقتدار سے دست کش ہو کر خلوت گاہ حق کو اختیار کیا، اور ان کے صاحبزادہ شیخ احمد نے سلطنت کا کاروبار سنبھالا، وہ بھی اپنے

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۸۸، ۸۹

والد ماجد کی طرح صاحب علم و تقویٰ اور لباس شاہی میں درویش صفت بزرگ تھے، آپ پر جذب الٰہی نے ایسا غلبہ کیا کہ سلطنت کو بالکل ہی خیر باد کہا اور اولاد کو بھی اس سے دور رہنے کی وصیت کی، تھوڑا سا اثاثہ اہل و عیال کے لئے رکھ کر باقی تمام مال فقراء میں تقسیم کر دیا، آپ نے اپنے والد بزرگوار کے علاوہ شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ سے بھی باطنی استفادہ کیا تھا، اور خلافت سے سرفراز ہوئے تھے۔

ان کے بعد خاندان کے اکابر بھی صاحب فقر و ارشاد تھے، اور اپنے اپنے زمانہ کے مقبول و عالی مرتبہ مشائخ سے تربیت سلوک اور فیض باطنی حاصل کرتے رہے، خواہ وہ کسی سلسلۂ عالیہ سے تعلق رکھتے ہوں۔

امام رفیع الدین جو مجدد صاحب کے جد سادس اور شیخ شہاب الدین علی فرخ شاہ کی نویں پشت میں ہیں، صاحب "زبدۃ المقامات" کے بیان کے مطابق علوم ظاہری و باطنی دونوں کے جامع تھے، تربیت باطنی اور تعلیم سلوک حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت سید جلال الدین بخاری (م ۷۸۵ھ) سے حاصل کی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آٹھویں صدی کے آخر یا نویں صدی کی ابتدا کے بزرگ تھے، اس خاندان کے یہ پہلے بزرگ ہیں، جو کابل سے ہندوستان تشریف لائے، اور سرہند کی اقامت اختیار کی جس کا قدیم نام سہرند تھا، یہ جگہ غیر آباد اور جنگلی جانوروں کا مسکن تھی، اور اس کے اور سامانہ کے درمیان جہاں شاہی خزانہ جایا کرتا تھا، کوئی اور بستی نہ تھی، اس بنا پر اس کے نواح و اطراف کے رہنے والے باشندوں خصوصاً قریۂ سرالیس کے ساکنوں نے جو وہاں سے ۶، ۷ کوس پر واقع ہے، حضرت مخدوم جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہو کر (جن سے سلطان فیروز شاہ ارادت و عقیدت رکھتا تھا) التماس کیا کہ دار الحکومت تشریف لے جا کر وہاں شہر آباد کرنے کی تحریک فرمائیں، سلطان نے آپ کی اس خواہش و فرمائش

کی تعمیل کی، اور خواجہ فتح اللہ کو جو امام رفیع الدین کے بڑے بھائی اور مقربان سلطانی میں تھے، اس پر تعینات فرمایا، اور خواجہ صاحب دو ہزار (۲۰۰۰) سواروں کے ساتھ تشریف لائے، اور قلعہ کی تعمیر فرمائی، حضرت مخدوم جہانیان نے امام رفیع الدین کو جو آپ کے خلیفہ اور امام نماز تھے، اور قصبۂ سُنام میں مقیم تھے، ارشاد فرمایا کہ وہ اس قلعہ کا سنگ بنیاد رکھیں اور اس شہر میں سکونت اختیار کریں کہ وہ وہاں کے صاحب ولایت ہیں، اس وقت سے آپ کا خاندان وہاں سکونت پذیر ہے[1]، قلعہ کی بنیاد اور سرہند کی آبادی کا آغاز ۷۶۰ھ بتایا جاتا ہے[2]۔

اس طرح حضرت مجدد کی ولادت سے دو سو (۲۰۰) برس پہلے سے سرہند آباد چلا آرہا تھا[3]،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "زبدۃ المقامات" ص ۸۹-۹۰

[2] جہاں تک قدیم تاریخ کا تعلق ہے یہ شہر کبھی ضلع ستلج کا صدر مقام تھا، مشہور چینی سیاح ہیون سانگ (HIUN SONG) نے بھی (جس نے ساتویں صدی مسیحی میں ہندوستان کا سفر کیا تھا) اس کا ذکر کیا ہے، اور اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ اس کے اردگرد سونا دستیاب ہوتا ہے، ہندی میں "سہ" شیر کو کہتے ہیں، اور "اند" کے معنی ہیں جنگل، ایک زمانہ میں ہندؤں اور غزنویوں کے لئے یہ سرحد کا کام دیتا تھا، اور اس سے آگے ہند شروع ہوتا تھا، غالباً اس لئے اس کا نام "سرہند" مشہور ہوگیا، جو سہرند کا قریب المخرج ہے ۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) میں سلطان محمد غوری نے سرہند فتح کیا، فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی تک سلاطین دہلی نے سرہند کو چنداں اہمیت نہیں دی، اس کے بجائے سامانہ زیادہ مورد توجہ رہا، فیروز شاہ تغلق کے زمانہ سے سرہند کی طرف از سر نو توجہ شروع ہوئی اس کے بعد سے اہم امرائے سلطنت سرہند و فیروز پور کے ناظم بنتے رہے، فوجی نقطۂ نگاہ سے بھی اس کی اہمیت میں معتدبہ اضافہ ہوا، بابر کئی بار سرہند آیا گیا، ہمایوں بھی سرہند آیا اور یہیں سے وہ دہلی آکر دوبارہ تخت و تاج کا مالک بنا، عہد مغلیہ میں شہر کی خوشحالی اور رونق کا یہ عالم تھا کہ یہاں ۳۶۰ مساجد، سرائے، کنویں اور مقبرے پائے جاتے تھے۔ (ملخص از دائرۃ معارف اسلامیہ مضمون سرہند شریف)

[3] حضرت مجدد نے اپنے وطن سرہند کے متعلق مکتوبات میں بڑے بلند کلمات فرمائے ہیں، اور اس میں خاص نورانیت و سکینت کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو مکتوب ۲۲ مکتوبات دفتر دوم

تذکرہ وتراجم کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں شرفاء وعلماء کے خاندان آباد ہوگئے تھے، اور اس خاک سے کئی باکمال پیدا ہوئے[۱]، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عروج اور اسلامی علوم وفنون سے رشتہ دسویں صدی ہجری کے ابتدا میں قائم ہوا، آٹھویں اور نویں صدی میں حضرت مجدد کے خاندان کے چند برگزیدہ افراد کے علاوہ کسی بڑے سرہندی عالم کا نام کتب تذکرہ وتراجم میں نہیں آتا، لیکن دسویں صدی کے شروع ہونے کے بعد سرہند میں علمی ودینی بیداری اور درس وتدریس کی گرم بازاری نظر آتی ہے، اور متعدد اہلِ کمال اور سربرآوردہ علماء کے نام نظر آتے ہیں، جو مسند درس وارشاد پر متمکن اور مصروف افادہ وافاضہ تھے، ان میں سب سے پہلے مشہور صاحبِ درس وافادہ مولانا الہ داد بن صالح سرہندی (م ۹۲۷ھ) کا نام ملتا ہے، ان کے بعد مولانا شیر علی قادری (م ۹۸۵ھ) اور مولانا علی شیر (م ۹۸۵ھ)[۲] مفتی احمد سرہندی، (م ۹۸۶ھ) الحاج ابراہیم سرہندی تلمیذ علامہ شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی (م ۹۹۴ھ) مولانا عبداللہ نیازی مہدوی[۳] (م ۱۰۰۰ھ) اور چند ان فضلاء کے نام نظر آتے ہیں، جن کا سن وفات معلوم نہیں، مثلاً مشہور استاذ زمانہ مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری کے استاد مولانا عبدالقادر مولانا عبدالصمد حسینی مرید شیخ علی عاشقاں جونپوری، مولانا امان اللہ، مولانا قطب الدین اور مولانا مجدالدین، آخر الذکر کے متعلق مولانا یعقوب کشمیری استاد حضرت مجدد کی شہادت ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے متبحر عالم تھے، بابر سے سرہند میں ان کی ملاقات ہوئی اور بابر نے ان کا بڑا اعزاز کیا مولانا میر علی اور مولانا بدرالدین سرہندی بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں[۴]۔

---

[۱] تاریخ وتراجم کی کتابوں میں صرف تاریخ مبارک شاہی کے مصنف یحییٰ بن احمد کا نام ملتا ہے، جو نویں صدی کے مصنفین میں ہیں، انھوں نے "تاریخ مبارک شاہی" ۸۳۸ھ کے حدود میں لکھی، وہ اپنے آپ کو اسیہرندی لکھا کرتے تھے، (اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

[۲] ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی شخصیت ہوں، "گلزار ابرار" و "نزہۃ الخواطر" میں دونوں کا نام معکوس ترتیب سے آیا ہے۔

[۳] کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آخر عمر میں مہدوی عقیدہ سے رجوع کر لیا تھا۔

[۴] یہ سب نام "نزہۃ الخواطر" جلد چہارم سے التقاط کئے گئے ہیں، کتاب میں ان کے حالات دیکھے جا سکتے ہیں۔

حضرت مخدوم شیخ عبدالاحد

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے "زبدۃ المقامات" میں حضرت مخدوم شیخ عبدالاحد کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، چونکہ حضرت خواجہ حضرت مجدد کی خدمت میں مسلسل تین۳ سال حاضر رہے، اور ان کی معلومات کا زیادہ تر ماخذ وہ اقوال اور ارشادات ہیں، جو انھوں نے حضرت مجدد کی زبان سے وقتاً فوقتاً سنے، ان میں اگر کوئی اضافہ ہے، تو صاحبزادگان والاشان سے حاصل کئے ہوئے معلومات کا ہے، اس لئے ان کے بیان کو ہر طرح مستند اور بالواسطہ حضرت مجدد کے ارشادات کا مجموعہ سمجھنا چاہئے، یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالاحد پر عنفوان شباب اور اثنائے تحصیل علم میں طلب موئے اور حصول علم الیقین کا ایسا غلبہ ہوا کہ تکمیل علوم کا انتظار کئے بغیر اس عہد کے شہرۂ آفاق چشتی (صابری) شیخ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو گئے، اور ان سے ذکر واذکار کی تلقین اور سلوک کی تعلیم حاصل کی، جب حضرت شیخ..... کے آستانہ پر پڑ رہنے۔ ع

یا جاں رسد بجاناں، یا جاں زتن برآید

کے شوق وعزم کا اظہار کیا، تو پیر روشن ضمیر نے اس کو منظور نہ فرمایا اور علوم دین وشریعت کی تحصیل وتکمیل کی تاکید کی، اور فرمایا کہ "علم کے بغیر جو درویشی ہوتی ہے، اس میں کچھ آب ونمک نہیں ہوتا"، مخدوم نے حضرت شیخ کی کبرسنی کا لحاظ کرتے ہوئے عرض کیا کہ مجھے شبہ ہے کہ علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد جب اس آستانہ پر حاضر ہوں گا تو یہ دولت جاوید پاؤں گا یا نہ پاؤں گا؟[1] شیخ نے فرمایا کہ اگر مجھے نہ پاؤ تو میرے فرزند رکن الدین سے وہ دولت حاصل کر لینا، مخدوم نے

---

[1] اشارہ تھا، حضرت شیخ کے دنیا سے رحلت فرما جانے کی طرف۔

تعمیل ارشاد کی اور تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔

تقدیری بات کہ آپ کو جس کا اندیشہ تھا وہی ہوا، اور فراغت سے پہلے شیخ نے رخت سفر باندھ لیا، مخدوم نے علوم مروجہ کی تکمیل کرنے کے بعد کچھ دن مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی اور وہاں کے بزرگوں سے استفادہ کیا، پھر حضرت شیخ رکن الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے، منازل سلوک طے کئے اور چشتی و قادری سلسلہ میں خرقۂ خلافت اور تلقین و تربیت کی اجازت سے سرفراز ہوئے[1]۔

ان دو بزرگوں شیخ عبدالقدوس اور شیخ رکن الدین پر وحدۃ الوجود، غلبت و بیخودی، سکر و شورش اور استغراق کا غلبہ تھا، اور وہ صاحب وجد و سماع تھے، خاص طور پر شیخ عبدالقدوسؒ وحدۃ الوجود کے اظہار و اعلان پر اپنے کو مامور سمجھتے تھے، اور اس کے پرجوش داعی و مبلغ تھے، بایں ہمہ اتباع سنت اور عمل بالعزیمت میں قدم راسخ رکھتے تھے، نیستی و بے نفسی کا غلبہ تھا، نہایت رقیق القلب کثیر العبادت بزرگ تھے، موت کو ہمیشہ یاد کرتے تھے، اور خاتمہ کی فکر غالب رہتی تھی[2]۔

اپنے پیر بیعت شیخ عبدالقدوس اور شیخ رکن الدین کے علاوہ مخدوم شیخ عبدالاحد کا قادری سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ کمال کیتھلی سے بھی ربط خاص تھا، حضرت شاہ کمال اپنے زمانہ کے بڑے باکمال اور صاحب حال بزرگ تھے[3]۔

شیخ عبدالاحد کا یہ قول گزر چکا ہے کہ "نظر کشفی سے کام لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] شیخ رکن الدین نے آپ کو جو خلافت نامہ دیا وہ "زبدۃ المقامات" میں من وعن درج ہے صـ۹۲-۹۶ اس کا بڑا حصہ عربی میں ہے۔ [2] کمالات اور اذواق و مواجید کے لئے ملاحظہ ہو، لطائف قدوسی تالیف شیخ رکن الدین فرزند حضرت شیخ و "زبدۃ المقامات" از خواجہ محمد ہاشم کشمی، صـ۹۷-۱۰۱ و نزہۃ الخواطر ج ۴۔

[3] ان کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۴۔

سلسلہ علیہ قادریہ میں بانی سلسلہ پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے بعد اس مرتبہ کا آدمی کم تر نظر آتا ہے" ان کے پوتے شاہ سکندر بھی بڑے عالی مرتبت شیخ تھے، اور حضرت مخدوم نے ان سے بھی استفادہ کیا۔

حضرت مخدوم جب اکتساب علوم سے فارغ ہوئے تو مردانِ خدا کی تلاش میں مختلف شہروں کا سفر کیا، سفر کرتے وقت عزم کیا کہ جہاں بدعت کے آثار نظر آئیں گے، وہاں ارادت تو درکنار صحبت سے بھی پرہیز کریں گے، اس سفر میں شیخ الٰہ داد کی صحبت سے بھی مستفید ہوئے، رہتاس میں شیخ الہ داد اور مولانا محمد بن فخر صاحبِ "توضیح الحواشی" سے بھی ملاقات کی اور ان کے درس میں شریک ہوئے، بنگالہ بھی تشریف لے گئے، اور جونپور بھی چند دن حضرت سید علی قوام (علی عاشقاں) کی خدمت میں رہے، اس سفر سے واپس سرہند تشریف لائے، پھر سفر آخرت تک یہیں مقیم رہے، اور کہیں کا سفر نہیں کیا، معقولات اور منقولات کی کتب متداولہ بڑی پابندی سے اور بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ پڑھاتے تھے، حضرت مجدد صاحب فرماتے تھے کہ تمام علوم میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، لیکن فقہ و اصول فقہ میں ان کی نظیر نہیں تھی، جب "اصول بزدوی" کا درس دیتے تھے، تو امام ابو حنیفہؒ کی فقہ میں علو شان اور ان کی جلالت و امامت عیاں و نمایاں ہو جاتی تھی، کتب تصوف کا بھی درس دیتے تھے، خاص طور پر "تعرف" "عوارف المعارف" اور "فصوص الحکم" کے مطالب اور دقیق مضامین کو حل کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، تحقیقاً و ذوقاً بھی شیخ اکبر کے مشرب پر تھے، لیکن خداداد عالی ظرفی اور ضبط و احترامِ شریعت کی وجہ سے کبھی زبان سے سکر و شطحیات کی کوئی بات نہ نکلتی، بے نفسی اور تفرید کا بڑا غلبہ تھا، تلامذہ کی کثرت کے باوجود کبھی کسی سے خدمت نہ لیتے گھر کی ضرورت کی چیزیں خود بازار سے لاتے، اتباع سنت کا بڑا اہتمام تھا، حتی الامکان کوئی سنت فروگذاشت نہ ہوتی، امور عادیہ،

لباس و پوشاک میں بھی اتباع سنت کا اہتمام کرتے، عزیمت پر عمل کرتے، اور رخصت سے اجتناب، اگرچہ بیعت و خلافت سلسلۂ چشتیہ اور قادریہ میں تھی، اور ان طرق میں نسبت عالی رکھتے تھے، لیکن آپ کے اخلاص اور عالی ہمتی کی دلیل یہ ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا بڑا اشتیاق ظاہر کرتے تھے، اور اس کے متعلق بڑے بلند کلمات فرماتے تھے مثلاً "اس کی دعا کرتا ہوں کہ یہ سلسلۂ عالیہ ہمارے ملک میں پہونچے، یا خدا ہمیں اس کے مرکز میں پہونچائے کہ اس سے استفادہ کیا جاسکے"، صاحب تصنیف بھی تھے، "کنوز الحقائق" اور "اسرار التشہد" آپ کی تصنیفات میں سے ہیں[1]۔

حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ میں نے بارہا والد ماجد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اہل بیت کرام کی محبت کو ایمان کی حفاظت اور حسن خاتمہ میں بڑا دخل ہے، جب والد صاحب کو سکرات شروع ہوئے تو میں نے آپ کو یاد دلایا، فرمایا الحمد للہ والمنۃ کہ میں اس محبت میں سرشار اور اس دریائے احسان میں غرق ہوں ؎

الٰہی بحق بنی فاطمہ
کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ[2]

اثنائے سفر میں جب سکندرہ[3] کے مقام پر پہونچے اور وہاں کچھ دن قیام کیا تو وہاں آپ کی شرافت و نجابت اور صلاح و تقویٰ اور علم و عمل کی جامعیت دیکھ کر ایک شریف خاندان نے

---

[1] خواجہ محمد ہاشم کشمی نے "زبدۃ المقامات" میں "اسرار التشہد" کے کچھ مضامین نقل کئے ہیں، ص ۱۱۸-۱۲۰ حضرت مجدد کی زبانی حضرت مخدوم کے بعض فوائد اور تحقیقات بھی نقل کئے ہیں ص ۱۲۰-۱۲۲

[2] زبدۃ المقامات ص ۱۲۳ [3] صاحب زبدۃ المقامات نے اس کو اٹاوہ کے قریب بتایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ صوبہ اتر پردیش میں واقع تھا۔

خود رشتہ کی پیش کش کی اور اس خاندان کی ایک نیک سیرت صالحہ خاتون سے آپ کا عقد کر دیا، حضرت مخدوم کی سب اولاد انہی سے ہوئی۔

حضرت مخدوم کو اللہ تعالیٰ نے ان کے مرشد ہی کی طرح سات فرزند عطا فرمائے تھے، جن کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں، شاہ محمد، شیخ محمد مسعود، شیخ غلام محمد، شیخ مودود[1] دو بھائیوں کے نام اور کچھ تفصیل معلوم نہ ہو سکی، ان میں واسطۃ العقد، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ تھے، بقیہ فرزند بھی صاحبِ علم اور صاحب استعداد تھے، اور انھوں نے بھی علوم رسمیہ اور سلوک کی تعلیم اپنے والد یا مشائخ عصر سے حاصل کی تھی۔

حضرت مخدوم نے اسّی سال کی عمر میں ۱۷ رجب ۱۰۰۷ھ کو اس دار فانی سے رحلت فرمائی،[2] قبر مبارک شہر سرہند سے مغربی جانب تقریباً ایک میل پر واقع ہے۔[3]

حضرت مخدوم کی سیرت کا جوہر خاص حق پسندی، انصاف، شریعت و سنت کی تعظیم و احترام اور ان پر عمل کرنے کی کوشش و اہتمام، حمیّت دینی اور ترقیاتِ باطنی میں عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کہا جا سکتا ہے، اور یہی جوہر ان کے لخت جگر کے ضمیر میں (جس کے لئے دین کی تجدید اور ہندوستان میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کی سعادت مقدر ہو چکی تھی) ودیعت ہوا تھا، جس کو فضل ربانی نے چمکا کر اور دوسرے وہی کمالات عطا فرما کر آفتابِ عالمتاب بنا دیا۔

---

[1] شیخ غلام محمد اور شیخ مودود کے نام حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات ہیں۔ (ملاحظہ ہو جلد اول)

[2] زبدۃ المقامات ص۱۲۲ بعض حضرات نے تاریخ وفات ۱۷ رجب اور بعض نے ۲۷ جمادی الآخرہ لکھی ہے ۱۰۰۷ھ پر سب کا اتفاق ہے۔ [3] زبدۃ المقامات ص۱۲۲

ولادت وحالات

ولادت وتعلیم

شبِ جمعہ ۱۴ رشوال ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء کو شہر سرہند میں آپ کی ولادت ہوئی، شیخ احمد نام رکھا گیا، لفظ "خاشع" سے سن ولادت نکلتا ہے، صغر سنی ہی سے آپ میں رشد وسعادت کے آثار نمایاں تھے ؎

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

صلحائے وقت بالخصوص حضرت شاہ کمال کیتھلی کی (جن سے والد بزرگوار کو نسبت باطنی تھی) آپ کی طرف خاص توجہ اور شفقت تھی، اور وہ آپ کے ساتھ خصوصی معاملہ فرماتے تھے[1]، آپ کی عمر سات سال کی تھی کہ شیخ کمال نے رحلت کی آپ کو ان کا حلیۂ مبارک یاد تھا، اور جس گھر میں والد صاحب کے ساتھ جاکر زیارت کی تھی، اس کا نقشہ بھی ذہن میں موجود تھا۔

تعلیم کی ابتدا حفظ قرآن سے ہوئی، اور تھوڑی ہی مدت میں آپ نے اس کی تکمیل کرلی، پھر والد ماجد کی خدمت میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں آپ کے ذہن خداداد کے جوہر کھلنے لگے، دقیق مضامین کے جلد اخذ کرلینے اور ان کو اپنے الفاظ میں سلجھے طریقہ پر پیش کرنے میں آپ کا امتیاز ظاہر ہوا، بیشتر علوم کی والد بزرگوار سے اور چند کی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، زبدۃ المقامات ص ۱۲۷-۱۲۸

اپنے عہد کے بعض علمائے کبار سے تحصیل کی، کچھ عرصہ کے بعد سیالکوٹ جو اس زمانہ کا بڑا علمی و تعلیمی مرکز تھا تشریف لے گئے اور مولانا کمال کشمیری سے جن کو منطق و فلسفہ، علم کلام و اصول فقہ میں کمال حاصل تھا، اور جن کی ذکاوت و حافظہ، کثرت مطالعہ اور قوت تدریس کا شہرہ تھا[1]، اور جن کے شاگردوں میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی جیسے سرآمد روزگار علماء اور مدرسین پیدا ہوئے اس وقت کے نصاب تعلیم کی بعض انتہائی اور اعلیٰ کتابیں (مثلاً عضدی) پڑھیں، حدیث کی بعض کتابیں شیخ یعقوب صرفی کشمیری سے پڑھیں، جو حدیث میں مسند وقت شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی مکی کے شاگرد تھے، اور جن کی تصنیفات میں صحیح بخاری کی بھی ایک شرح ہے[2]۔

شیخ یعقوب کو بڑے بڑے محدثین اور مصنفین سے کتب حدیث و تفسیر اور ان کی تالیفات کی اجازت حاصل تھی، آپ نے اپنے زمانہ کے مشہور عالم ربانی قاضی بہلول بدخشانی سے جو علم حدیث و تفسیر میں پایہ بلند رکھتے تھے، اور حدیث میں شیخ وقت عبدالرحمٰن بن فہد کے تلمیذ رشید تھے، صحیح بخاری، مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی اور دوسری کتب حدیث ثلاثیات بخاری اور حدیث مسلسل کی سند حاصل کی، نیز متقدمین کے دستور کے مطابق کتب تفسیر وغیرہ

---

[1] مولانا کمال الدین بن موسیٰ ۹۷۱ھ میں کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہوئے، اور تقریباً نصف صدی درس و تدریس میں مصروف رہ کر ۱۰۱۷ھ میں لاہور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۱۶)

[2] مولانا یعقوب بن الحسن الصرفی کشمیری کی ۹۰۸ھ میں کشمیر میں ولادت ہوئی، تحصیل علم اور حصول طریقہ کے لئے سمرقند کا سفر کیا، جہاں شیخ حسین خوارزمی سے طریقہ کبرویہ حاصل کیا، اور ایک عرصہ تک ان کی صحبت میں رہے، حجاز جاکر علم حدیث حاصل کیا اور وہاں سے فقہ، حدیث و تفسیر کی نفیس کتابیں اپنے ساتھ لائے، ۱۲ ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ میں ان کی وفات ہوئی (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۳۹) اس طرح اپنے استاذ مولانا یعقوب کے ذریعہ حضرت مجدد کو صحاح کے مطالعہ اور امہات کتب حدیث سے متعارف ہونے کا موقع ملا ہوگا۔

کی سند بھی ان کے مصنفین تک پہونچائی[1]، سترہ سال کی عمر میں آپ فارغ التحصیل ہوگئے۔

آپ جب علوم عقلیہ ونقلیہ اور اصول وفروع سے فارغ ہوئے تو درس وتدریس کے کام کا آغاز کیا، اور عربی وفارسی میں کچھ رسائل بھی لکھے جن میں "رسالہ تہلیلیہ" "رسالہ رد مذہب شیعہ" شامل ہے، آپ دارالحکومت اکبرآباد (آگرہ) بھی گئے، وہاں ابوالفضل وفیضی سے صحبتیں رہیں، لیکن اختلاف ذوق ومسلک کی وجہ سے ان سے مناسبت نہ ہوئی بعض مرتبہ کچھ ردّوکد کی بھی نوبت آئی اور ابوالفضل کے بعض بے باکانہ الفاظ پر ناگواری کا اظہار فرمایا، اور آمدورفت موقوف کردی ابوالفضل نے آدمی بھیج کر بلوایا اور معذرت کی، ایک مرتبہ فیضی کو جو اُس زمانہ میں تفسیر غیر منقوط (سواطع الالہام) لکھنے میں مصروف تھے، ایک جگہ مناسب (غیر منقوط) لفظ ملنے میں اور مطلب کے ادا کرنے میں دقت پیش آئی اور قلم رک گیا، حضرت مجدد سے انھوں نے تذکرہ کیا آپ نے مشکل کشائی فرمائی اور فیضی کو آپ کے طبع رسا اور وفورِ علم کا اعتراف کرنا پڑا۔

آگرہ میں آپ کا قیام کچھ طویل ہوگیا، والد ماجد کو شوق ملاقات ہوا، باوجود کبرسنی اور بُعد مسافت کے آگرہ تشریف لے گئے، حضرت مجدد نے والد ماجد کے ساتھ وطن مراجعت فرمائی، دہلی وسرہند کے درمیان جب شہر تھانیسر سے گزر ہوا تو شیخ سلطان جو وہاں کے رؤسا وعمائد اور اسی کے ساتھ علماء وفضلائے وقت میں تھے، اور ان کو تقرب سلطانی بھی حاصل تھا، اور اس وقت علاقۂ تھانیسر کے حاکم تھے، اعزاز واکرام کے ساتھ پیش آئے، اور اپنے یہاں مہمان رکھا اور ایک اشارۂ غیبی کی بنا پر اور حضرت مجدد کے اخلاق وخصوصیات کو دیکھ کر ان سے نسبت مصاہرت قائم کرنے کی خواہش کی، والد صاحب نے اس رشتہ کو منظور فرمایا اور وہیں عقد مسنون انجام پایا، اور آپ بہو کو رخصت کرکے سرہند تشریف لائے۔

---

[1] حدیث مسلسل اور دوسری اسانید "زبدۃ المقامات" میں موجود ہیں۔

سلوک کی تربیت و تکمیل اور حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت و استفادہ

اس موقع پر تصوف و سلوک کی ضرورت اور اس کے شرعی و علمی ثبوت پر خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں کہ "تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ کے (جس کا یہ چوتھا حصہ ہے) قارئین کو اس کی پہلی جلد کے مطالعہ ہی سے جس میں حضرت خواجہ حسن بصری، سیدنا عبدالقادر جیلانی، اور مولانا جلال الدین رومی کے تذکرے موجود ہیں، اور تیسری جلد تو سراسر ہندوستان کے مشائخ کبار ہی کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اس مضمون سے واسطہ پڑ چکا ہے، اگر اس سلسلہ میں مزید تشفی اور اطمینان کی ضرورت ہو تو مصنف کی کتاب "تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک؟" کا مطالعہ کیا جائے۔

یہاں صرف اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس ماحول اور عہد میں حضرت مجدد کو اپنا نازک و دشوار تجدیدی اور اصلاحی کارنامہ انجام دینا تھا، اس میں تصوف، اسلامی معاشرہ اور ماحول میں اس طرح گھُل مل گیا تھا کہ وہ اس کا مزاج و مذاق بن گیا تھا، خواص تو خواص عوام بھی کسی عالم، معلّم یا مصلح کے اُس وقت تک قائل، اس کے عقیدت کیش اور اس کے خطاب و تفہیم سے منتفع نہیں ہوتے تھے، جب تک کہ وہ تصوف و سلوک کے کوچہ سے آشنا اور کسی مقبول و مستند سلسلہ سے وابستہ اور مشائخ کا صحبت یافتہ نہ ہو، یوں بھی کسی نہ کسی درجہ میں تزکیۂ نفس، اخلاص و یقین اور درد و سوز کے بغیر (جو عموماً کثرتِ ذکر و صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا) محض وفورِ علم اور زورِ تقریر سے کوئی حقیقی انقلاب برپا نہیں ہوتا، غرض یہ کہ اس عہد و ماحول میں تصوف و سلوک اور قوت روحانی اور نورِ باطنی کے بغیر اصلاح و انقلاب کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہتھیاروں اور سپہ گری کے مشق و تربیت کے بغیر کوئی شخص میدانِ جنگ میں اتر آئے، اور کسی تربیت یافتہ اور مسلح فوج کا مقابلہ کرے، یا کوئی ایسا شخص جو قوتِ گویائی

سے فطرتاً محروم ہو، تعلیم و تفہیم کا کام انجام دینا چاہیے، یہ عین حکمت و تدبیر الٰہی کا تقاضا تھا کہ اس میدان اصلاح و انقلاب میں اترنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ احمد السرہندی کو تصوف و سلوک کا نہ صرف رمز آشنا اور محرم راز بنایا بلکہ اہل کمال و تکمیل کی صحبت و تربیت سے پھر موہبت ربانی اور اجتباءے خاص سے ان کو اس میں درجۂ امامت و اجتہاد تک پہونچایا تاکہ وہ اس کار عظیم کو پوری تیاری اور پورے اعتماد کے ساتھ انجام دیں اور اس کا اثر دنیا کے دور دراز گوشوں اور بعد کی صدیوں تک قائم رہے، "ذلك تقدير العزيز العليم"

سرہند پہونچ کر آپ والد ماجد کی حیات تک اُنہی کی خدمت میں رہے، ان سے بیش بہا فوائد باطنی حاصل کئے اور سلسلۂ چشتیہ و قادریہ کا سلوک طے کیا، اسی کے ساتھ علوم ظاہری کی تعلیم کا مشغلہ بھی جاری تھا۔

اس زمانہ میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کے شوق نے غلبہ کیا اور وہاں کی کشش نے مضطرب و بے آرام بنا دیا، لیکن چونکہ والد ماجد کبیر السن تھے، اور بظاہر ان کی رحلت کا زمانہ قریب تھا، اس لئے ایسی حالت میں ان کو چھوڑ کر جانا مناسب نہ معلوم ہوا جب ۱۰۰۷ھ میں ان کا واقعۂ ارتحال پیش آگیا تو اب آپ کو کوئی مانع نہ رہا اور ۱۰۰۸ھ میں آپ نے حرمین شریفین کی حاضری اور ادائے حج بیت اللہ کے لئے رخت سفر باندھ لیا، اور سرہند سے کوچ کر کے دہلی پہونچ گئے، وہاں کے علماء و فضلاء جن کے کانوں تک آپ کا آوازۂ فضل و کمال پہونچ چکا تھا، ملاقات کے لئے آئے، ان میں مولانا حسن کشمیری بھی تھے، جن سے حضرت کا پرانا تعارف تھا، انھوں نے دوران گفتگو حضرت خواجہ باقی اللہ کے علو مرتبہ، اور قوتِ باطنی کا تذکرہ کیا جن کا کچھ ہی عرصہ پہلے دہلی میں ورود ہوا تھا، حضرت مجدد اپنے والد ماجد سے سلسلۂ نقشبندیہ کا ذکر اور اس کا اشتیاق سن چکے تھے، اس لئے آپ کو بھی ملاقات کا شوق ہوا، اور اس کو حرمین شریفین کی

حاضری کی تیاری اور اس کی ایک سوغات سمجھ کر حاضری کا قصد فرمالیا، اور مولانا حسن کشمیری[1] کی معیت میں وہاں حاضر ہو گئے، اس وقت ہاتف غیب نے صدا دی ہوگی۔ ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم!

قبل اس کے کہ اس "قِران السعدین" کا حال بیان کیا جائے اور اس کے بعد کے واقعات لکھے جائیں، حضرت خواجہ کا تعارف کرا دینا ضروری ہے[2]، اس سلسلۂ میں ہم وہ مضمون نقل کرتے ہیں جو مصنفِ "نزہۃ الخواطر" نے (جلد پنجم) حضرت خواجہ قدس سرہٗ کے تذکرہ میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ "ما قل ودل" کا مصداق ہے، اور اس میں مستند کتابوں اور تذکروں کا لُبّ لباب آگیا ہے۔

حضرت شیخ عبدالباقی نقشبندی دہلوی (خواجہ باقی باللہ)

شیخ اجل، قطب الاقطاب، امام الأئمہ رضی الدین ابوالمؤید عبدالباقی بن عبدالسلام بدخشی مشہور بہ باقی باللہ کابلی ثم دہلوی، آپ کا وجود دنیا کے لئے باعث برکت و زینت، آپ کی حیات طیبہ مقصدِ آفرینش و غایت خلق کا مظہر[3]، آپ کی زبان حقیقت ترجمان، اور آپ کی ذات خلاصۂ عرفان تھی، علم و معرفت میں اللہ کی کھلی نشانی، اور ولایت و روحانیت کے منارۂ نورانی،

---

[1] حضرت مجدد مدۃ العمر ان کے احسان مند اور شکر گزار رہے کہ ان کے ذریعہ آپ کو یہ دولتِ جاوید حاصل ہوئی ملاحظہ ہو مکتوب ۲۷۹ دفتر اول۔ [2] سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کبار بالخصوص بانی سلسلہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کے حالات اور سلسلہ کی خصوصیات اور نسبت خاصہ کی اجمالی واقفیت کے لئے اسی سلسلہ کے گُلِ سرسبد حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیفات بالخصوص "الإنتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" اور "ہمعات" کا مطالعہ کیا جائے۔

[3] یعنی آیت "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" (میں نے جن و انس کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں) کی عملی تفسیر اور روشن تصویر۔

۷۲-۹۷۱ھ کے حدود میں کابل میں پیدا ہوئے اور مولانا محمد صادق حلوائی سے تلمذ اختیار کیا اور ان کے ساتھ ماوراء النہر کا سفر کیا اور ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے، پھر ان کے دل میں طریقۂ صوفیہ میں داخل ہونے کا داعیہ پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں آپ نے رسمی علوم کی تحصیل چھوڑ دی اور بلاد ماوراء النہر کے بہت سے مشائخ کبار کی مجلسوں میں حاضر ہوتے رہے، آپ نے سب سے پہلے شیخ خواجہ عبید خلیفہ مولانا لطف اللہ خلیفۂ مخدوم اعظم دہبیدی کے دست حق پرست پر توبہ کی، مگر جب آثار استقامت ظاہر نہ ہوئے تو شیخ افتخار کی سمرقند آمد کے موقع پر ان کے ہاتھ پر دوبارہ توبہ کی جو شیخ احمد لیسوی کے سلسلہ کے بزرگ تھے، جب دوبارہ اپنی عزیمت واستقامت میں کمی محسوس کی تو اضطراری حالت میں امیر عبداللہ بلخی کے ہاتھ پر تیسری بار توبہ کی، اور کچھ عرصہ حفظِ حدود کے پابند رہے، مگر آخری بار یہ توبہ بھی ٹوٹ گئی، اِسی عرصہ میں ان کو خواب میں حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کی زیارت ہوئی اور اہل اللہ کے طریقہ کی طرف رجحان پیدا ہوا، جہاں آپ کے لئے ممکن ہوتا وہاں جاتے رہتے تھے، یہاں تک کہ کشمیر میں شیخ بابا کبروی کی خدمت میں پہونچے اور ان سے مستفید ہوئے، ان کی صحبت میں ان ربانی فیوض کی بارش ہوئی اور اس سلسلہ کی معروف غیبت وفنائیت کے آثار ظاہر ہوئے، شیخ مذکور کی وفات کے بعد آپ شہروں میں پھرتے رہے، اور سیاحت واستفادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ کی روح نے ظاہر ہوکر آپ کو نقشبندی طریقہ کی تعلیم دی اور آپ کی تکمیل ہوگئی، اس کے بعد ماوراء النہر گئے، جہاں شیخ محمد امکنکی سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے تین دن کے بعد اجازت وخصوصت عطا کی، جس کے بعد آپ ہندوستان واپس ہوئے، اور لاہور میں ایک سال ٹھہرے جہاں بہت سے علماء نے آپ سے استفادہ کیا، پھر وہاں سے ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی تشریف لائے اور قلعۂ فیروزی میں قیام فرمایا، جس میں ایک بڑی نہر اور ایک بڑی مسجد تھی، آپ وہاں اپنی وفات

تک مقیم رہے۔

آپ اعلیٰ درجہ کے صاحبِ وجد وذوق، نہایت متواضع ومنکسر مزاج تھے، اغیار اور نامحرموں سے اپنے احوال رفیعہ کو چھپانے کی کوشش کرتے اور اپنے کو مقام ارشاد کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، اور اگر کوئی آپ کے پاس باطنی استفادہ کے لئے حاضر ہوتا تو آپ اس سے فرماتے کہ میرے پاس تو کچھ نہیں اس لئے آپ کسی اور بزرگ سے رجوع کریں اور اگر آپ کو کوئی شخصیت مل جائے تو مجھے بھی خبر کردیں، غرض آپ ادّعا سے دور رہ کر آنے والوں کی خدمت وتالیفِ قلب میں مشغول رہتے تھے، اور کسی ضرورت یا دقیق مسئلہ کی وضاحت ہی کے لئے لب کشائی کرتے اور مخاطب کی رہنمائی کے لئے مسئلہ کی پوری وضاحت فرماتے تھے، اپنے احباب کو قیام تعظیمی سے منع فرماتے اور اپنے کو انھیں جیسا سمجھتے تھے، اور تمام حالات میں ان سے مساوات کا معاملہ فرماتے تھے، تواضع ومسکنت کے خیال سے ننگی زمین پر بھی بیٹھ جاتے تھے۔

آپ کو عجیب وغریب کیفیت روحانی اور قوت تاثیر حاصل تھی جس پر آپ کی نظر پڑجاتی اس کے حالات بدل جاتے اور پہلی ہی صحبت میں اُسے ذوق وشوق اور اہل معرفت کی روحانی کیفیات حاصل ہوجاتیں اور پہلی ہی توجہ وتلقین میں طالبین کا قلب جاری ہوجاتا تھا، آپ کا فیض اور مخلوق پر شفقت سب کے لئے اس قدر عام تھی کہ سخت جاڑے کی ایک رات میں آپ کسی کام سے بستر سے اٹھ کر گئے اور جب واپس ہوئے تو اپنے لحاف میں ایک بلّی کو سوتا دیکھ کر اسے جگانے اور ہٹانے کے بجائے صبح تک بیٹھے رہے، اِسی طرح آپ کے قیام لاہور کے زمانہ میں قحط پڑا تو اس عرصہ میں آپ نے کچھ نہیں کھایا، آپ کے پاس جو کھانا آتا اسے محتاجوں میں تقسیم کردیتے تھے، لاہور سے دہلی جاتے ہوئے راستہ میں ایک معذور شخص کو دیکھ کر سواری سے اتر پڑے اور اُسے سوار کرکے اور پہچاننے والوں سے بچنے کے لئے

چہرہ چھپائے ہوئے اس کی منزل مقصود تک پیدل گئے اور پھر سوار ہوئے، غلطی کے اعتراف اور اپنے کو خطا کار سمجھنے میں کوئی تأمّل نہ کرتے تھے، اور اپنے اصحاب ہی سے نہیں بلکہ عوام سے بھی اپنے کو ممتاز نہیں سمجھتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے پڑوس میں رہنے والا ایک نوجوان ہر قسم کی برائیوں کا ارتکاب کرتا تھا، مگر باخبر ہونے کے باوجود آپ اسے برداشت کرتے رہے، کسی موقع پر ان کے مرید خواجہ حسام الدین دہلوی نے حکام سے اس کی شکایت کی اور انھوں نے اسے پکڑ کر بند کر دیا، جب شیخ کو معلوم ہوا تو وہ اپنے ان مرید پر ناراض ہوئے، اور ان سے باز پرس کی، انھوں نے عرض کیا "حضرت وہ بڑا ہی فاسق ہے" اس پر آپ نے ایک آہ سرد بھری اور فرمایا کہ جی ہاں! آپ لوگ اہل صلاح و تقویٰ تھے، اس لئے آپ نے اس کا فسق و فجور محسوس کر لیا، مگر ہم تو اپنے کو اس سے بہتر نہیں سمجھتے، اس لئے اپنی ذات کو چھوڑ کر حکام تک اس کی شکایت نہیں لے گئے، پھر آپ کی کوشش سے حکام نے اسے رہا کیا، اور وہ تائب ہو کر اہلِ صلاح میں سے ہو گیا۔

جب آپ کے کسی مرید سے کوئی غلطی ہوتی تو اس کے بارے میں فرماتے کہ یہ میری ہی غلطی تھی، جو بالواسطہ اس سے ظاہر ہوئی، عبادات و معاملات میں احتیاطی پہلو اختیار کرتے اس لئے ابتدا میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں اور قوی دلیلیں ہیں۔

یہ چند چیزیں ان کے فضائل و کمالات کا صرف ایک معمولی حصہ اور ان کے بحر شمائل کا صرف ایک قطرہ ہیں، اسی وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ قلیل مدت میں کتنے انسانوں کو آپ سے فیض باطنی پہونچا، جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اس سلسلۂ مبارکہ کو آپ ہی کے ذریعہ

فروغ حاصل ہوا، جسے آپ سے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔[1]

شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری کہتے ہیں کہ آپ وعظ وارشاد میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے کیونکہ کل تین۳ چار۴ سال کی مدت میں اپنے افادات کے ذریعہ دنیا میں روشنی پھیلا دی، اس کی تفصیل ملا ہاشم کشمی کی "زبدۃ المقامات" میں ہے، آپ نے کل چالیس۴۰ سال کی عمر پائی اور ہندوستان آنے کے بعد کل چار۴ سال حیات رہے، اور اس تھوڑی مدت میں آپ کے اصحاب ورفقاء کمالات کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ گئے یہاں تک کہ انھوں نے گذشتہ سلسلوں کے آثار محو کر دیئے، اور طریقۂ نقشبندیہ تمام سلسلوں پر غالب آگیا۔

محمد بن فضل اللہ محبّی نے "خلاصۃ الاثر" میں لکھا ہے کہ "حضرت شیخ اللہ کی ایک نشانی و روشنی اور سرِّ الٰہی اور علم ظاہر و باطن اور تصرفات کے حامل تھے، خاموش طبع، متواضع اور ایسے خوش اخلاق تھے کہ لوگوں میں اپنے کو ذرا بھی ممتاز نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ اپنے احباب کو بھی قیام تعظیمی سے روکتے اور معمولی سلوک کی تلقین کرتے تھے۔"

محبّی کا کہنا ہے کہ آپ سے بڑے تصرفات ظاہر ہوئے، جس پر آپ کی نظر پڑ جاتی یا داخل سلسلہ ہوتا تو اس پر محویت و فنائیت کا غلبہ ہو جاتا، اگرچہ اسے اس راہ سے پہلے کوئی مناسبت نہ ہوتی، لوگ آپ کے دروازہ پر مدہوشوں کی طرح پڑے رہتے، بعض لوگوں

---

[1] سلسلہ نقشبندیہ ہندوستان دو طریق سے پہونچا، ایک امیر ابو العلاء اکبر آبادی کے ذریعہ جن کو اپنے چچا عبد اللہ احراری سے طریقۂ نقشبندیہ میں اجازت وخلافت تھی، اس طریق میں چشتیت و نقشبندیت باہم مخلوط ہیں، کالپی، مارہرہ، داناپور وغیرہ کا ابو العلائی سلسلہ انہی سے چلتا ہے، دوسرا طریق حضرت خواجہ باقی باللہ کا ہے، اصلاً اس سلسلہ کی ہندوستان میں اشاعت حضرت خواجہ کی آمد اور حضرت مجدد کے اس سلسلہ میں داخل ہونے سے ہوئی، پھر وہ سارے عالم میں پھیل گیا۔

("الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" تالیف مولانا سید عبد الحیؒ "مصنف" نزہۃ الخواطر")۔

پر پہلے ہی وہلہ میں عالم ملکوت منکشف ہوجاتا جو غیبی کشش کا نتیجہ تھا۔

آپ کے مریدوں میں طریقۂ مجددیہ کے امام و بانی حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شیخ تاج الدین بن سلطان عثمانی سنبھلی، شیخ حسام الدین بن شیخ نظام الدین بدخشی، شیخ الہ داد دہلوی جیسے جلیل القدر مشائخ اور مرجع خلائق بزرگ تھے۔

آپ کی تصنیفات میں نادر رسالے، قیمتی مکاتیب اور پاکیزہ اشعار ہیں، جن میں کتاب "سلسلۃ الأحرار" ہے، جس میں آپ نے فارسی میں اپنی عرفانی رباعیات کی شرح کی ہے۔

چہار شنبہ ۱۴ جمادی الآخرۃ ۱۰۱۴ھ کو دہلی میں چالیس سال چار ماہ کی عمر میں انتقال فرمایا، آپ کی قبر مغربی دہلی میں قدم رسولؐ کے قریب ہے، اور زیارت گاہ خلائق ہے۔

بیعت و تکمیل

حضرت مجدّد حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ گویا آپ کے انتظار ہی میں بیٹھے تھے، بڑی شفقت و مہربانی کے ساتھ پذیرائی فرمائی، حضرت خواجہ کی طبیعت بڑی غیور اور دیر آشنا واقع ہوئی تھی، کسی کو خود اپنی طرف متوجہ نہیں فرماتے تھے، لیکن یہاں طالب خود مطلوب تھا، اور خدا کو حضرت خواجہ کے ذریعہ حضرت مجدّد کی روحانی تکمیل کرکے اور اُس نسبت خاص کو عطا کرکے جس کا طریقۂ نقشبندیہ اس عہد میں حامل تھا، اور جس کی سلوک باطنی کی دنیا اور ہندوستان کے اِس روحانی ماحول میں ضرورت تھی، ایک نئی نوعیت و طرز سے دین کی تجدید کا کام لینا، طریقت کو شریعت کے تابع بنانا، منازل سلوک کو طے کرانا اور وسائل سے مقاصد تک پہونچانا مقصود تھا، حضرت خواجہ نے خلاف معمول فرمایا کہ "آپ چند روز ہمارے مہمان رہیں، ایک ماہ ایک ہفتہ ہی سہی"۔

حضرت خواجہ نے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا تو استخارہ کیا تھا، استخارہ کے بعد معلوم ہوا کہ ایک خوبصورت طوطی جو بہت میٹھی باتیں کرتا ہے، ان کے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا، وہ اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالتے ہیں، اور وہ اپنے منقار سے ان کے منہ میں شکر دے رہا ہے، حضرت خواجہ نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ امکنکی سے یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ "طوطی ہندوستان کا جانور ہے، ہندوستان میں تمہاری تربیت سے کوئی ایسا شخص تیار ہوگا، جس سے ایک عالم منور ہو جائے گا، اور تم کو بھی اس سے حصہ ملے گا"[1]

حضرت مجدد کے لئے اس ارشاد کے بعد انکار و معذرت کی کیا گنجائش تھی کہ ان کے اندر خود خضر طریق اور چشمۂ حیواں کی طلب موجود تھی، آپ نے یہ دعوت قبول فرمالی اور رفتہ رفتہ یہ قیام ایک ماہ دو ہفتہ کو منجر ہوا، اس صحبت میں طریقۂ نقشبندیہ کے اکتساب و تحصیل کا ایسا جذبہ طاری ہوا کہ بیعت کی درخواست کی، حضرت خواجہ نے بلا تامل قبول فرمالیا اور خلوت میں لے جاکر ذکر قلبی کی تلقین کی، اور آپ کی توجہ سے اسی وقت ذکر قلبی جاری ہوگیا اور ایسی حلاوت و لذت محسوس ہوئی جو یوماً فیوماً بلکہ آناً فاناً ترقی کرتی رہی، حضرت خواجہ نے ان حالات اور برق رفتار ترقی کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہی وہ طوطی خوشنوا ہے، جو خواب میں دکھایا گیا تھا، اور اسی کی خوش نوائی و خوش ادائی سے ہندوستان کے چمن بلکہ چمن اسلام میں نئی بہار آئے گی ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اس دو ڈھائی مہینہ میں حضرت مجدد کو جو باطنی کیفیات و ترقیات حاصل ہوئیں اور جو مراحل سلوک طے ہوئے ان کا بیان کرنا اور الفاظ کے ذریعہ ان کا سمجھنا یا سمجھانا ممکن نہیں[2] ؎

---

[1] زبدۃ المقامات ص۱۴۰-۱۴۱، حضرات القدس ص۲۶-۲۷ [2] اگر کسی کو اس کے دیکھنے کا شوق ہو تو وہ مکتوب ۲۹۶ دفتر اول حصہ چہارم بنام حضرت خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبد اللہ فرزندان حضرت خواجہ باقی باللہ، نیز مکتوب ۲۹۰ دفتر اول حصہ پنجم بنام مولانا محمد ہاشم کشمی کا مطالعہ کرے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

حضرت مجدد اس کے بعد سرہند تشریف لے گئے، اس پہلی مرتبہ ہی حضرت خواجہ نے خوشخبری سنائی کہ تم کو نسبت نقشبندیہ کامل طور پر حاصل ہوگئی اور یوماً فیوماً ترقی ہونے کی امید ہے، دوسری مرتبہ جب دہلی حاضری ہوئی تو خلعت خلافت عطا فرمایا اور طالبانِ خدا کو تعلیم طریقت اور ارشاد و ہدایت کی اجازت دی، اور اپنے مخصوص ترین اصحاب کو تعلیمِ طریقت کے لئے آپ کے سپرد کیا۔

حضرت مجدد اس کے بعد تیسری اور آخری مرتبہ حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت خواجہ نے بہت دور باہر نکل کر استقبال کیا اور بڑی بشارتیں دیں، اپنے حلقۂ توجہ میں آپ کو سرِ حلقہ بنایا اور مریدوں سے فرمایا کہ ان کی موجودگی میں کوئی شخص میری طرف متوجہ نہ ہوا کرے، رخصت کرتے وقت فرمایا کہ "اب ضعف بہت معلوم ہوتا ہے، امید حیات بہت کم ہے، اور اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت خواجہ عبیداللہ اور حضرت خواجہ عبداللہ کو جو اس وقت شیر خوار تھے، اپنے سامنے آپ سے توجہ دلائی اور فرمایا کہ ان کی ماؤں کو بھی غائبانہ توجہ دیجئے، چنانچہ آپ نے توجہ دی اور توجہ کا اثر بھی اسی وقت ظاہر ہوا[1]۔

حضرت مجدد کے علو مرتبہ کی شہادت حضرت خواجہ کی زبان سے

حضرت خواجہ نے اپنے ایک مخلص کو اس تعلق کے بعد ایک خط میں تحریر فرمایا کہ "شیخ احمد نے جو سرہند کے باشندہ کثیر العلم قوی العمل بزرگ ہیں، فقیر کے ساتھ چند دن نشست و برخاست

[1] زبدۃ المقامات ص۱۵۵

کی فقیر کے مشاہدہ میں ان کے عجیب کمالات واوصاف آئے، امید ہے کہ وہ ایک ایسا چراغ بنیں گے جس سے ایک عالم روشن ہوجائے گا، ان کے احوال کاملہ پر میرا یقین استوار ہے۔"

خود حضرت مجدد کو پہلی ہی توجہ وتلقین سے یقین ہوگیا کہ وہ اس راہ کے مدارج عالیہ تک پہونچیں گے، اسی کے ساتھ دید قصور اور اپنی نفی بھی دل میں راسخ تھی، اسی کے ساتھ یہ شعر بھی وردِ زبان تھا ؎

ازیں نورے کہ از تو بر دلم تافت
یقین دانم کہ آخر خواہمت یافت[1]

حضرت مجدد ان ترقیات باطنی اور فضائل علمی وعملی کے ساتھ اپنے شیخ ومرشد کا نہایت درجہ ادب کرتے تھے، کسی وقت اگر شیخ نے ان کو طلب فرمایا تو چہرہ کا رنگ متغیر ہوجاتا اور جسم پر لرزہ طاری ہوجاتا[2]، ادھر شیخ کا معاملہ ان کے ساتھ یہ ہوگیا جو کم تر کسی شیخ کا اپنے مسترشد کے ساتھ ہوا ہوگا، ایک مرتبہ فرمایا کہ "شیخ احمد آفتاب است کہ مثل ما ہزاراں سیارگان در ضمن ایشاں گم اند"[3] (شیخ احمد وہ آفتاب ہیں، جن کی روشنی میں ہم جیسے ہزاروں ستارے گم ہیں۔)

---

[1] زبدۃ المقامات ص۱۴۵ [2] ایضاً ص۱۴۹ [3] ایضاً ص۳۳

باب چہارم

اہم واقعات وحالات، ارشاد وتربیت کی سرگرمی، وفات

سرہند کا قیام

اس اکتساب فیض اور تکمیل کے بعد حضرت مجدد نے سرہند میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی، ایک عرصہ تک آپ طالبین کی تربیت سے احتراز فرماتے رہے، اور آپ کو اپنی ذات میں کمی کا بہ شدت احساس ہوتا رہا، ترقیات باطنی تیزی کے ساتھ ہو رہی تھیں، اور طبیعت عروج کی طرف مائل تھی، ایسی صورت میں طالبین کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ مشکل تھی جس کے لئے نزول شرط ہے، جو ابھی تک نہیں ہوا تھا، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ (اس حالت میں) "اپنے نقص کا علم روشن ہو گیا جو طالب میرے پاس جمع تھے، سب کو جمع کر کے اپنا نقص ان سے بیان کیا اور سب کو رخصت کر دیا، لیکن طالب اس بات کو کسر نفسی سمجھتے ہوئے اپنے عقیدے سے نہ پھرے کچھ مدت کے بعد حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل احوال منتظرہ عطا فرما دیئے"[1]

آخر وہ وقت آگیا کہ آپ کا فیض عام ہو، اور طالبین کی تکمیل اور ارشاد کا کام

---

[1] مکتوبات، مکتوب نمبر ۲۹ دفتر اول۔

شروع ہو، مجدد صاحب اپنے احوال مسترشدین اور برادران طریقت کی ترقیات باطنی کی تفصیل شیخ کو لکھتے رہے، ایسی بشارتیں منامات اور کیفیات بھی ظاہر ہوئیں جن سے آپ کو یقین ہوگیا کہ اللہ تعالےٰ کو آپ سے کوئی بڑا کام لینا ہے، اور آپ سے دین کی کوئی عظیم الشان خدمت وجود میں آئے گی،[1] تیسری حاضری کے بعد حضرت خواجہ کی صحبت میسر نہ ہوسکی۔

لاہور کا سفر

حضرت مجدد نے کچھ عرصہ سرہند مقیم رہ کر شیخ کے اشارہ وارشاد پر لاہور کا سفر اختیار فرمایا، لاہور اس وقت دہلی کے بعد ہندوستان کا دوسرا علمی و دینی مرکز تھا، اور وہاں بکثرت علماء و مشائخ تھے، ان میں سے ایک جم غفیر نے آپ کی آمد کی خبر سن کر آپ کا پرجوش استقبال کیا اور بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آئے،[2] مولانا طاہر لاہوری (جو بعد میں حضرت مجدد کے اجلّۂ خلفاء میں ہوئے) مولانا حاجی محمدؒ، مولانا جمال الدین تلوی آپ کے حلقۂ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے، ذکر و مراقبہ کا حلقہ قائم ہوتا اور مجالس صحبت گرم رہتیں۔[3]

حضرت مجدد ابھی لاہور ہی میں مقیم تھے کہ حضرت خواجہ کی رحلت کی اطلاع ملی، حضرت پر بڑا اثر ہوا، ایک اضطرابی و اضطراری حالت میں دہلی کی طرف عنان سفر موڑ دی، راستہ میں سرہند پڑتا تھا لیکن گھر نہ گئے پہلے اپنے شیخ و مرشد کے مزار پر حاضر ہوئے، مرشد زادوں اور برادران طریقت سے تعزیت کی اور ان کی خواہش پر ان کی تسکین خاطر کے لئے چند روز دہلی میں قیام

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ۴۲ دفتر دوم [2] زبدۃ المقامات ص ۱۵۷

[3] زبدۃ المقامات ص ۱۵۸، روضۃ القیومیہ میں ہے کہ اس سفر میں خانِ خاناں اور مرتضےٰ خاں (سید فرید) بھی حلقۂ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے ص ۱۱۷

فرمایا، اور تربیت وارشاد کی محفل جو حضرت خواجہ کے ارتحال سے سونی ہوگئی تھی، دوبارہ آباد اور مغموم ومجروح دل شگفتہ اور تازہ ہوگئے۔[1]

کچھ روز قیام فرما کر آپ سرہند تشریف لے آئے، اس کے بعد صرف ایک مرتبہ دہلی اور دو تین مرتبہ آگرہ جانے کا اتفاق ہوا، آخر عمر میں تین سال تک شاہی لشکر کے ہمراہ (جس کا ذکر آگے آئے گا) بعض شہروں اور مقامات سے آپ کا گذرنا ہوا، تو وہاں کے اہل طلب اور اہل شوق آپ کی صحبت سے مستفید ہوئے۔[2]

تبلیغ ودعوت اور ارشاد وتربیت کے وسیع انتظامات اور رجوع عام

۱۰۲۶ھ میں آپ نے اپنے بہت سے خلفاء تبلیغ وہدایت کے لئے مختلف مقامات پر بھیجے، ان میں سے ستر مولانا محمد قاسم کی قیادت میں ترکستان کی طرف روانہ کئے گئے، چالیس حضرات مولانا فرخ حسین کی امارت میں عرب، یمن، شام اور روم کی طرف بھیجے گئے، دس ذمہ دار اور تربیت یافتہ حضرات مولانا محمد صادق کابلی کے ماتحت کاشغر کی طرف اور تیس خلفاء مولانا شیخ احمد برکی کی سرداری میں توران، بدخشاں، اور خراسان گئے، اور ان حضرات کو اپنے اپنے مقامات میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی، اور بندگان خدا نے ان سے فائدہ اٹھایا۔[3]

بہت سے نامی گرامی علماء ومشائخ جو اپنے اپنے مقامات پر بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، سفر کی دشوار گزار منزلیں طے کر کے سرہند حاضر ہوئے، اور بیعت واستفادہ سے مشرف ہوئے، ان میں شاہ بدخشاں کے معتمد علیہ شیخ طاہر بدخشی، طالقان کے

---

[1] زبدۃ المقامات ص۱۵۸ [2] ایضاً ص۱۵۹ [3] روضۃ القیومیۃ ص۱۶۶-۱۶۷

جیّد عالم شیخ عبدالحق شادمانی، مولانا صالح کولابی، شیخ احمد برسی، مولانا یار محمد، اور مولانا یوسف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آپ نے ان میں سے اکثر حضرات کو خلافت واجازت عطا فرما کر دعوت وارشاد کے لئے اپنے اپنے مقامات کو واپس کیا[1]۔

ہندوستان میں بھی آپ نے جا بجا اپنے خلفاء کو دعوت وارشاد پر مامور فرمایا، خواجہ میر محمد نعمان کو خلافت عطا فرما کر دکن بھیجا، ان کی خانقاہ میں کئی کئی سو سوار اور بے شمار پیادہ ذکر ومراقبہ کے لئے حاضر ہوتے تھے، شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو خلافت عطا فرما کر پہلے سہارنپور پھر شاہی لشکر گاہ (معسکر) آگرہ میں متعین کیا، ان کو وہاں قبول عام حاصل ہوا، بہت سے ارکان سلطنت ان کے حلقہ بگوش ہوئے، لشکر کے ہزارہا آدمی مرید ہوئے، ہر روز اس قدر ہجوم ہوتا کہ بڑے بڑے امراء کو مشکل سے شیخ کی زیارت کی نوبت آتی، میر محمد نعمان کشمی کو جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلفاء میں تھے، تجدید بیعت واجازت نامہ مرحمت فرما کر برہان پور روانہ فرمایا اور آپ وہاں مرجع طالبین بن گئے، اور لوگوں کی بڑی اصلاح ہوئی، شیخ طاہر لاہوری کو شہر لاہور کے (جو ہندوستان کا دوسرا علمی وسیاسی مرکز تھا) طالبان معرفت کی رہنمائی کے لئے روانہ فرمایا، اور ان سے اس دیار میں بڑا فیض پہونچا، شیخ نور محمد پٹنی کو اجازت مرحمت فرما کر شہر پٹنہ روانہ فرمایا اور ان سے ان دیار میں ارشاد و ہدایت اور افادۂ علوم دینیہ کا سلسلہ جاری ہوا، شیخ حمید بنگالی کو منازل سلوک طے کرا کے اور تعلیم وطریقت کی اجازت دے کر بنگالہ روانہ کیا، شیخ طاہر بدخشی کو تکمیل حال کے بعد تعلیم وطریقت کی اجازت دے کر جونپور روانہ کیا، مولانا احمد برکی تعلیم وتربیت میں مجاز ہونے کے بعد برک

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو روضۃ القیومیۃ ص ۱۲۸، ۱۲۹ "حضرات القدس" میں بھی خلفاء کے ضمن میں متفرق طور پر ان کے مختلف مقامات کی طرف روانہ کرنے اور ارشاد وتربیت پر مامور کرنے کا ذکر آیا ہے۔ ملاحظہ ہو حضرات القدس ص ۲۹۹ تا ۳۶۸

پہونچ کر ارشاد و تربیت میں مشغول ہو گئے، اور اپنے مریدوں کے احوال بذریعۂ مکاتیب حضرت کی خدمت میں لکھتے رہے، شیخ عبدالحی حصار شادماں (علاقہ اصفہان) کے باشندہ تھے، مکتوبات کا دفتر ثانی آپ ہی کا ترتیب دیا ہوا ہے، حضرت نے آپ کو تعلیم و طریقت کی اجازت دے کر شہر پٹنہ روانہ فرمایا، شیخ عبدالحی شہر کے درمیان تشنگان طریقت کی پیاس بجھاتے تھے، اور شیخ نور محمد دریائے گنگا کے کنارے ارشاد و تربیت کا چشمہ جاری کئے ہوئے تھے، شیخ حسن برکی بھی اپنے وطن میں اشاعت طریق و سنت پر مامور تھے، سید محب اللہ مانکپوری کو خلافت عطا کر کے مانکپور روانہ کیا، پھر حضرت کی اجازت سے وہ الہ آباد منتقل ہو گئے، شیخ کریم الدین بابا حسن ابدالی توجہات خصوصی سے سرفراز ہو کر وطن واپس ہو گئے، ۱۰۲۷ھ[1] کمل نہیں ہوا تھا کہ حضرت مجدد کی جلالت شان اور قوت ارشاد و حسن تربیت کا آوازہ بیرون ہند تک پہونچ چکا تھا، لوگ جوق در جوق زیارت و استفادہ کے لئے آنے لگے، ماوراء النہر، بدخشاں، کابل اور بعض دوسرے عجمی ممالک کے بہت سے شہروں میں آپ کے خلفاء موجود تھے، اور عرب ممالک تک بھی آپ کی شہرت پہونچ گئی تھی، ہندوستان میں تو مشکل سے کوئی شہر ہوگا جہاں آپ کے نائبین اور دعوت الی اللہ دینے والے موجود نہ ہوں۔

سلطانِ وقت جہانگیر کا رویہ

۱۰۱۴ھ میں جلال الدین اکبر بادشاہ کا انتقال ہوا، اور نورالدین جہانگیر تخت سلطنت پر بیٹھا، اکبر کے دور میں اسلام اور مسلمانوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ ہوا، اور اس عظیم ملک میں (جس کو مسلمان فاتحین کے خون، مصلحین اور خادمین اسلام کے پسینہ، اور اہل باطن و

---

[1] حضرات القدس الحضرۃ الثانیۃ عشرۃ فی بیان احوال خلفائہ، و دیگر کتب۔

اہلِ قلوب کے اشک سحرگاہی سے سیراب و بارآور کیا گیا تھا) اسلام کی بیخ کنی کا کام جس قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا تھا، وہ آپ کے دردمند دل اور غیور اسلامی طبیعت کو مضطرب کرنے کے لئے کافی تھا، لیکن کچھ تو اپنی تکمیل حال اور باطنی تیاریوں میں مشغولیت کی بنا پر اور کچھ اس لئے کہ وہ فتنہ اپنے شباب پر تھا، اور ابھی وہ سِرا ہاتھ میں نہیں آیا تھا، جس کے ذریعہ آپ سلطنت اور اس کے رجحان اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس کی سیاست پر اثر انداز ہو سکیں، آپ نے اپنا تجدیدی و اصلاحی کام پوری قوت کے ساتھ شروع نہیں فرمایا، اور اگر فرمایا تو تاریخوں میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ نے خانِ خاناں سید صدر جہاں اور مرتضیٰ خاں وغیرہ کے ذریعہ بادشاہ کو نصیحت آمیز پیغامات بھیجے ان حضرات کو بادشاہ کا تقرب و اعتماد حاصل تھا، اور حضرت مجدد کی عظمت و عقیدت بھی ان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

جہانگیر کو نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی عناد نہ تھا، بلکہ ایک طرح کی سلامت روی اور حسن اعتقاد تھا، اور اس کو کسی نئے دین و آئین کے جاری کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس کا عمل اپنے جدامجد کی اس ہدایت پر تھا کہ ؎

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

آپ نے بادشاہ کی اس سادہ طبیعت سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان سے ان اثرات کو ختم کرنے کا ارادہ کیا جو سابقہ سلطنت میں پیدا ہوئے تھے، اور جس کی تفصیل آئندہ ایک مستقل باب میں آئے گی۔

لیکن قبل اس کے کہ آپ یہ انقلاب انگیز کام شروع کریں، گوالیار کی اسیری کا واقعہ پیش آ گیا جو کئی حیثیتوں سے حضرت مجدد کی حیات اور اس عہد کی اصلاحی و تجدیدی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے،

بعض سیر و سوانح کی عام کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ جہانگیر کے سامنے مکتوبات کے وہ نازک مضامین پیش کئے گئے، جن کا سمجھنا تصوف کی اصطلاحات و دقائق اور لکھنے والے کے غرض و منشاء کے سمجھنے پر موقوف ہے، اور جو درحقیقت وہ عبوری مکشوفات و محسوسات تھے، جو سالک کو اپنے سیر و سلوک میں عارضی طور پر پیش آتے ہیں، اور جن کی اپنے شیخ و مربی کو اطلاع دینی ضروری ہے۔[1]

جہانگیر کے لئے ان مضامین میں جو اس کے فہم سے بالاتر تھے، اور جن میں ایک سادہ لوح سنّی العقیدہ مسلمان کے لئے جو کشف، واقعہ اور عبور و استقرار کے فرق کو نہیں جانتا، وحشت و تشویش کے پورے اسباب موجود تھے، اس نے ان میں بڑے حیرت و استعجاب کا اظہار کیا، اور ان کو جمہور مسلمین و اہل سنت کے مسلمہ عقائد کے خلاف سمجھا اور ادعاء و خود پرستی پر محمول کیا، اپنی توزک میں اس نے جہاں واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس میں اس کی حیرت و استعجاب صاف جھلکتا ہے، مجدد صاحب کا ذکر اس نے بہت نامناسب انداز اور کسی قدر تحقیر آمیز طریقہ پر کیا ہے،[2]

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۱۱ دفتر اول بنام حضرت مرشد خواجہ باقی باللہ۔

[2] "جہانگیر کے علاوہ جو اس کوچہ سے نابلد تھا بعض اچھے راسخ العلم حضرات کو بھی ان مضامین کو پڑھ کر بڑا اشکال پیش آیا، ان میں اس عہد کے نامور عالم ناشر علم حدیث اور جامع شریعت و طریقت حضرت شیخ عبدالحق بخاری دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، عرصہ تک ان کو اس بارہ میں بڑا تردد رہا، اور ان کی اور حضرت مجدد کی مراسلت بھی ہوئی، آخر میں ان کو اس بارے میں اطمینان و شرح صدر ہو گیا جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں فرمایا، ان کے صاحبزادے شیخ نورالحق کی روایت ہے کہ "یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچی ہے کہ ایک شخص حسن خاں نامی پٹھان جو حضرت شیخ (مجدد) کے مریدوں میں تھا کسی بات پر آزردہ اور ناراض ہو کر چلا گیا اور شیخ کے مکتوبات میں جن کا ایک قلمی مجموعہ اس کے پاس تھا تحریف و اضافہ کر کے مسخ شدہ حالت میں جا بجا پھیلا دیا" (مناقب العارفین از شاہ فتح محمد فتحپوری چشتی ص ۱۲۶)

غلط فہمی اور اس ہنگامہ کی بنیاد یہ تحریف شدہ مکاتیب بھی ہو سکتے ہیں۔ [2] ملاحظہ ہو توزک جہانگیری ص ۲۷۲-۲۷۳ وقائع سنہ جلوس ۱۴ سنہ ۱۰۲۸ھ

اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجدد صاحب کے مرتبہ و مقام سے بالکل بے خبر ہے، اور وہ ایک تورانی مغل امیر کے قلم سے جو مسلمانوں کے عام عقائد کے سوا کچھ نہیں جانتا، اور اپنے کو ان کا حامی و محافظ سمجھتا ہے، بے تکلف اظہار خیال کر رہا ہے۔

شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو لشکر شاہی میں جو قبولیت حاصل ہوئی تھی، اور اعیان سلطنت کی ان کے یہاں بکثرت آمد و رفت شروع ہو گئی تھی، اس کو بھی لوگوں نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا، اور اس سے خطرہ ظاہر کیا، یہ بھی کہا گیا کہ حضرت مجدد شیخ کے ذریعہ فوج سے ساز باز کر رہے ہیں، اور بغاوت کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں شیخ بدیع الدین سے اپنے جوش عقیدت میں بھی بعض بے احتیاطیاں ہوئیں، اور انھوں نے اپنے بعض وقائع و کشوف "کلموا الناس علی قدر عقولھم" کی نصیحت پر عمل نہ کرتے ہوئے ایسے بیان کئے جو خواص کا لعوام اور عوام کالانعام کے فہم و ادراک سے بالاتر اور محل قیل و قال تھے[1]، اس کا اثر حضرت مجدد تک بھی پہونچا، جہانگیر اس کوچہ سے بالکل ناآشنا تھا، اور دربار میں اس کے کان بھرنے والے بھی موجود تھے، اور چونکہ مجدد صاحب تشیّع کے ان اعتقادی اور عملی اثرات کا مقابلہ کرتے تھے، جو ایرانی عنصر کے ہندوستان میں آنے اور دربار پر حاوی ہو جانے کے بعد سے مسلم معاشرہ پر چھائے چلے جا رہے تھے، اور عقائد اہل سنت کی صاف صاف تبلیغ فرماتے تھے، اس سے اگر دربار کے بارسوخ ایرانی عنصر نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا ہو تو تعجب نہیں مسئلہ کو سیاسی رنگ دینے کے بعد اس کی اہمیت اور بڑھ گئی، اور جہانگیر نے اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت مجدد کا آفتاب ارشاد نصف النہار پر تھا، اور آپ کی سرگرمی و مصروفیت اور اسی کے ساتھ شہرت و مقبولیت نقطۂ عروج پر، شاید اس میں بھی

[1] زبدۃ المقامات ص ۳۴۸

حکمت الٰہی تھی کہ اس عظمت و عروج کے عین شباب کے زمانہ میں آپ کو اس ابتلاء و امتحان میں ڈال کر وہ مقامات عبدیت طے کرائے جائیں، اور روحانی ترقی کے اس مقام پر پہونچایا جائے جو عادۃً اس مجاہدہ و امتحان کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

گوالیار کی اسیری کے اسباب

تاریخ و سوانح کی عام کتابوں میں اسیری اور قلعۂ گوالیار میں نظر بند کئے جانے کا سبب اسی خاص مکتوب کے (جو حضرت نے اپنے شیخ و مرشد کو لکھا تھا) وہ نازک مضامین، مکاشفات اور سیر و سلوک کے سلسلہ کی ان دقیق باتوں ہی کو ٹھہرایا گیا ہے جن سے کہ آپ کا بہت سے اکابر امت سے عالی مقام ہونا ثابت ہوتا ہے۔

لیکن راقم سطور کو اس میں بہت شبہ ہے کہ حضرت مجدد کو یہ ابتلاء محض اس غلط فہمی میں پیش آیا، اور اس کا سبب جہانگیر کی دینی حمیت اور جمہور اہل سنت کے عقائد و مسلمات کی حمایت تھی، یا یہ محض علمائے دربار یا اس عہد کے قابل احترام علماء و مشائخ کے اصرار و تقاضہ سے کیا گیا، جہانگیر کسی زمانہ میں بھی اس دینی مزاج کا آدمی نہیں تھا، اور اس کی دینی حس کبھی اتنی تیز اور نازک نہیں تھی کہ وہ ایک ایسے مسئلہ میں جو اس کے فہم سے بالاتر تھا، اور جس کا امور سلطنت اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، ایک ایسی بلند پایہ دینی شخصیت کے خلاف اتنا بڑا اقدام کرے جو ہزاروں آدمیوں کی محبت و عقیدت کا مرکز تھی۔

اس سے پہلے اس کے والد اور دادا کے زمانہ میں شیخ محمد غوث گوالیاری معراج کا دعویٰ کر چکے تھے، اور اس کی وجہ سے علماء کے حلقہ میں شورش و بےچینی تھی[1]، اور ان پر فتوے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر محمد مسعود صاحب کی کتاب "شاہ محمد غوث گوالیری" مطبوعہ کراچی

لگائے جارہے تھے، لیکن نہ ہمایوں نے ان کے خلاف کوئی کارروائی کی اور نہ اکبر نے، خود جہانگیر کے زمانہ میں بہت سے مشائخ وحدۃ الوجود کے آخری حدود "عینیت" اور "مساوات" تک پہونچ گئے تھے، اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے، اسی کے زمانہ میں شیخ محب اللہ الہ آبادی[1] نے عربی میں کتاب "التسویۃ" لکھی اور فارسی میں اس کی شرح کی، لیکن جہانگیر نے ان تحقیقات وغریب اقوال کا کوئی نوٹس نہیں لیا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ متنازعہ فیہ مکتوب[11] (جس کو اس پورے قصہ کی بنیاد بنایا گیا ہے) حضرت خواجہ کے نام ۱۰۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے، اور گرفتاری سولہ[16] سال بعد ۱۰۲۸ھ میں عمل میں آئی۔

راقم سطور کے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت مجدد کے ارکان سلطنت اور امرائے دربار سے خصوصی تعلقات ہوگئے تھے، اور ان کو حضرت سے گہری عقیدت تھی، جو ایک ایسے ذکی الحس حکمراں کے لئے جو اپنے والد کے خلاف علم بغاوت بلند کرچکا تھا، اور بیٹوں سے زور آزمائی کرکے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، وسوسہ اندازی کے لئے کافی تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ جہانگیر کو ان موثر اور ولولہ انگیز خطوط کا بھی علم ہوگیا ہو، جو حضرت مجدد نے ان ارکانِ سلطنت کو اصلاح حال اور حکومت کو اسلام کی حمایت اور دین کی حمیت کے سلسلہ میں تحریر فرمائے تھے۔

ان امرائے دربار اور ارکین سلطنت میں خان اعظم مرزا عزیز الدین، خان جہاں خاں لودھی، خان خاناں مرزا عبدالرحیم، مرزا داراب، قلیج خاں وغیرہ تھے۔[52]

مغل سلاطین مشائخ سے عوام کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت، رجوع عام اور ان کے گرد لوگوں کے پروانہ وار جمع ہوجانے سے ہمیشہ خائف رہے،... مجدد صاحب کے خلیفہ کبیر حضرت سید آدم بنوری کے ساتھ یہی پیش آیا، وہ جب ۱۰۵۲ھ میں لاہور تشریف لے گئے تو ان کی

---

[1] متوفی ۱۰۵۸ھ [52] اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جہانگیر تزک میں خود لکھتا ہے کہ شیخ کے خلفاء ہر دیار اور ہر قریہ میں متعین ہیں (ص ۲۷۲) نیز یہ کہ اس گرفتاری کی مصلحت یہ ہے کہ "شورش عوام نیز فرو شود" (ص ۲۷۳)

ہمرکابی میں دس ہزار سادات ومشائخ اور مختلف طبقوں کے عقیدت مند تھے، اس وقت شاہجہاں لاہور ہی میں تھا، اس کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اور اس نے ایسے اسباب پیدا کئے کہ آپ نے ہندوستان کو خیرباد کہا اور حرمین شریفین کی طرف ہجرت کی، غالباً یہی وجہ تھی کہ جہانگیر نے گوالیار کی نظربندی ختم کرنے کے بعد ایک طویل عرصہ تک حضرت کو اپنے لشکر میں سفروحضر میں ساتھ رکھا تاکہ وہ امراء وارکان سلطنت کے تعلقات کی نوعیت کا مطالعہ کرسکے، اور اس کا اطمینان کرلے کہ آپ سے سلطنت واقتدار کے لئے کوئی خطرہ نہیں، اور نہ آپ سے کوئی مخالف عنصر یا حوصلہ مند یا طالع آزما فائدہ اٹھاسکے گا، اس کو جب حضرت کے طرز عمل سے اس کا اطمینان ہوگیا، اور اس نے آپ کے اخلاص، للّٰہیت، بے لوثی، اور بے غرضی اور علو مقام کا مشاہدہ کیا، اور اس کو بچشم خود دیکھ لیا کہ آپ دنیا کی شوکت وحشمت کو خس وخاشاک کے برابر نہیں سمجھتے، تو اس نے آپ کو سرہند میں آزادانہ طریقہ پر قیام کی اجازت دی۔

قلعۂ گوالیار کی نظربندی

بہرحال جہانگیر نے حضرت مجدد کو اپنے مستقر پر طلب کیا اور حاکم سرہند کو تاکید کی کہ جس طرح ہوسکے آپ کو وہاں بھجوادے، آپ حاضر الوقت پانچ مریدوں کو ہمراہ لے کر روانہ ہوگئے، بادشاہ نے جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو امراء کو آپ کے استقبال کے لئے بھیجا، اپنے محل کے قریب خیمہ نصب کرایا، اور ملاقات کے لئے آپ کو دربار میں طلب کیا، آپ دربار میں تشریف لے گئے تو آداب شاہی جو خلاف شرع تھے، آپ نے ادا نہ کئے، ایک ناخدا ترس درباری نے بادشاہ کو متوجہ کیا اور کہا کہ جہاں پناہ شیخ نے آداب سلطنت کی کوئی رعایت نہیں کی، بادشاہ نے وجہ دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ میں نے آج تک خدا اور

رسول کے بتائے ہوئے آداب واحکام کی پابندی کی ہے، اس کے علاوہ مجھے کوئی آداب نہیں آتے، بادشاہ نے ناراض ہوکر کہا مجھے سجدہ کرو[1]، آپ نے فرمایا میں نے سوائے خدا کے نہ کسی کو سجدہ کیا اور نہ کروں گا، بادشاہ اس پر ناراض ہوا اور گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کرنے کا حکم دے دیا[2]۔

اس واقعہ سے پہلے شاہ جہاں نے (جس کو حضرت سے عقیدت وخلوص تھا) علامہ افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو کتب فقہ اور اس پیغام کے ساتھ حضرت مجدد کے پاس بھیجا تھا کہ سجدۂ تحیہ سلاطین کے لئے آیا ہے، اگر آپ سجدہ کرلیں تو میں اس بات کا ضامن وذمہ دار ہوں کہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہونچے گا، آپ نے فرمایا کہ یہ محض رخصت ہے، عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے[3]۔

گرفتاری کا یہ افسوسناک واقعہ ربیع الثانی ۱۰۲۸ھ کی کسی تاریخ کو پیش آیا، اس لئے کہ جہانگیر نے اسی مہینہ کے واقعات میں اس کا ذکر کیا ہے، قید کرنے کے بعد آپ کی حویلی، سرائے، کنواں، باغ اور کتابیں ضبط کرلی گئیں، اور متعلقین کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کردیا گیا[4]۔

زندان گوالیار میں سنت یوسفی

گوالیار کی یہ نظر بندی اللہ تعالیٰ کی بہت سی حکمتوں اور دینی مصالح پر مبنی تھی، اور ترقیات باطنی وازدیاد مقبولیت ومحبوبیت کا موجب، یہاں اس یوسف زندانی نے یوسف کنعانی کی طرح اپنے رفقاء زنداں میں تبلیغ وارشاد کا کام پوری سرگرمی سے

---

[1] یہ درباری سجدہ اکبر کے زمانہ سے رائج تھا، اور شاہی آداب میں شامل تھا، اورنگ زیب نے اس کو ختم کیا۔

[2] حضرات القدس ص۱۱۷ [3] ایضاً ص۱۱۶ [4] توزک جہانگیری ص۲۷۲-۲۷۳ ومکتوب ۲ دفتر سوم۔

شروع کر دیا، اور پسِ زندان "یَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَیْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" کی آواز اس بلند آہنگی سے بلند کی کہ قلعہ کے در و دیوار گونج اٹھے، اور ان کی آواز باہر بھی سنی گئی، کہا جاتا ہے کہ کئی ہزار غیر مسلم قیدی آپ کی دعوت تبلیغ اور صحبت و تربیت کے فیض سے مشرف بہ اسلام ہوئے، اور سیکڑوں قیدی ارادت و صحبت سے سرفراز ہو کر درجات عالیہ تک پہونچے، ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں ہے:۔

"شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۸ء) کے عہد میں ایک سنی عالم شیخ احمد مجدد نامی تھے، جو شیعی عقائد کی تردید میں خاص طور پر مشہور تھے، شیعوں کو اس وقت دربار میں رسوخ حاصل تھا، ان لوگوں نے کسی بہانہ سے انھیں قید کرا دیا، دو برس وہ قید میں رہے، اور اس مدت میں انھوں نے اپنے رفقائے زنداں میں سے سیکڑوں بت پرستوں کو حلقہ بگوش بنا لیا"

(صـ۴۱۲ طبع ثالث)

اس طرح انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (ENCYCLOPEDIA OF RELIGION - AND ETHICS) (مذہب و اخلاقیات کا دائرۃ المعارف) میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں ہے:۔

"ہندوستان میں سترہویں صدی میں ایک عالم جن کا نام شیخ احمد مجدد تھا، جو ناحق قید کر دیئے گئے تھے، ان کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے قید خانہ کے ساتھیوں میں سے کئی سو بت پرستوں کو مسلمان بنا لیا[1]"

ج ۸ صـ۷۴۸

---

[1] ماخوذ از مضمون "حضرت مجدد الف ثانی یورپ کی نظر میں" بقلم مولانا عبد الماجد دریابادی "الفرقان" مجدد نمبر ۱۳۵۷ھ۔

دوران اسیری کی نعمتیں اور لذتیں

زندان گوالیار کے اس چند روزہ مہمانی سے حضرت مجدد پر انعامات الٰہیہ کی جو بارش ہوئی اور آپ کو جو باطنی ترقیات، حقیقی شکستگی اور وارستگی کی لذت اور خلوت میں جلوت کی جو نعمت حاصل ہوئی، اس کا حضرت نے اپنے خاص خدام کے نام خطوط میں تحدیث بالنعمت کے طور پر بڑے مزے لے لے کر ذکر کیا ہے، میر محمد نعمان کے نام ایک طویل مکتوب میں جو قلعۂ گوالیار سے بھیجا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں :۔

"اگر محض فضل خداوندی سے فیوض و واردات الٰہی کا تسلسل اور اس کے غیر متناہی انعامات وعطیات کا پے در پے ظہور اس محنت کدہ میں مجھ جیسے شکستہ پر کے شامل حال نہ ہوتا تو قریب تھا کہ معاملہ پاس و ناامیدی کی حد کو پہونچ جاتا، اور رشتۂ امید شکستہ ہو جاتا، حمد ہے اس خداوند کی جس نے مجھ کو عین بلا میں عافیت عطا فرمائی، اور ظلم و جفا میں عزت بخشی، مشقت و تکلیف میں مجھ پر احسان کیا، اور راحت و مصیبت میں شکر کی توفیق دی، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرنے والوں اور اولیائے کرام کے نقش قدم پر چلنے والوں اور علماء و صلحاء سے محبت رکھنے والوں میں داخل فرمایا، اس سبحانہ و تعالےٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں انبیاء کرام پر اولاً اور ان کے متبعین پر ثانیاً"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے حکم سلطانی سے محبوس ہونے کی شہرت جب عام ہوئی تو اس پر طرح طرح کے تبصرے شروع ہوئے، لوگوں نے اس پر حاشیے چڑھائے، اور

---

[1] مکتوب ۵۰ دفتر سوم حصہ ہشتم، اردو ترجمہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کے مضمون "امام ربانی" سے ماخوذ ہے۔

قیاس آرائیاں کیں، خدام ومحبین کو اس سے قدرتاً اذیت پہونچی، اس تنقید وملامت خلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک دوسرے مخلص شیخ بدیع الدین کو اسی قید خانہ سے لکھتے ہیں:۔

"جب یہ فقیر اس قلعہ میں پہونچا تو اوائل حال ہی میں محسوس ہوتا تھا کہ ملامتِ خلق کے انوار شہروں اور دیہاتوں سے نورانی بادلوں کی طرح پے در پے پہونچ رہے ہیں، اور میرے معاملہ کو پستی سے بلندی کی طرف لئے جارہے ہیں، برسوں تربیت جمال سے میری منزلیں طے کرائی گئیں، اب تربیت جلال سے قطع مسافت کرائی جارہی ہے، لہذا آپ مقام صبر بلکہ مقام رضا میں رہیں، اور جمال وجلال کو مساوی جانیں[1]"

حضرت صاحبزادگان والاشان کو بھی قید خانہ سے صبر وتسکین اور شکر ورضا کی ہدایت فرماتے رہے، اور توجہ الی اللہ، دعا ومناجات اور ذکر وتلاوت اور ماسوا اللہ کی نفی اور اپنی تعلیم وتکمیل میں مشغول رہنے کی تاکید فرماتے رہے[2]۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کے اس حبس بے جا کا اثر ہندوستان کے صحیح الاعتقاد امراء اور ارکین سلطنت پر برا پڑا، بعض جگہ شورش اور انتشار کے آثار بھی ظاہر ہوئے[3]، عبدالرحیم خانِ خاناں، خان اعظم، سید صدر جہاں، خان جہاں لودھی وغیرہ بھی جہانگیر کے اس اقدام سے آزردہ تھے، اس شورش وانتشار کی معاصر تاریخ سے زیادہ شہادتیں نہیں ملتیں، اور وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا حضرت مجدد کی

---

[1] مکتوب نمبر ۶ دفتر سوم حصہ ہشتم [2] مکتوب نمبر ۲ دفتر سوم حصہ ہشتم بنام حضرت خواجہ محمد سعید وخواجہ محمد معصوم۔

[3] اس سلسلہ میں مہابت خاں کی بغاوت کا بھی حوالہ دیا گیا ہے لیکن یاد رہے کہ مہابت خاں کی بغاوت کا واقعہ ۱۰۳۵ھ کا ہے، جب کہ حضرت مجدد کی رہائی کو ۴-۵ برس ہوچکے تھے، اور آپ اس دار فانی سے رحلت فرماچکے تھے۔

اسیری سے کتنا تعلق تھا:۔

بہرحال بادشاہ کو (کسی وجہ سے بھی[1]) اپنے اس اقدام سے ندامت ہوئی یا اس نے اتنی مدت کی اسیری کو کافی سمجھا اور آپ کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کرکے تشریف لانے کی دعوت دی حضرت مجدد کامل ایک سال قلعۂ گوالیار میں رہے، اس طرح آپ کی رہائی جمادی الآخرہ ۱۰۲۹ھ (مئی ۱۶۲۰ء) میں ہوئی ہوگی۔

لشکرِ شاہی اور بادشاہ کی رفاقت اور اس کے دینی اثرات و برکات

حضرت مجدد بڑی عزت و احترام کے ساتھ قلعہ سے باہر تشریف لائے، تین یوم سرہند قیام فرماکر معسکرِ شاہی آگرہ میں تشریف لے گئے، ولی عہد شہزادہ خرم اور وزیر اعظم نے آپ کا استقبال کیا، مگر بادشاہ نے حکم دیا کہ چند روز آپ ہمارے لشکر میں رہیں، آپ نے منظور فرمایا، اس رفاقت سے بادشاہ اور اہل لشکر کو بہت نفع پہونچا، جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ میں نے خلعت اور ہزار روپیہ خرچ عنایت کیا، اور جانے اور ساتھ رہنے کا اختیار دیا، انھوں نے ہمرکابی کو ترجیح دی۔

حضرت مجدد نے لشکر کی اس رفاقت اور اس کے فوائد و برکات کے متعلق صاحبزادوں کو لکھا ہے کہ لشکر میں اس طرح بے اختیار و بے رغبت رہنا بہت ہی غنیمت جانتا ہوں، اور اس عرصہ کی ایک ساعت کو دوسری جگہوں کی بہت سی ساعتوں سے بہتر تصور کرتا ہوں[2]۔

---

[1] کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کو خواب میں زیارت نبویؐ ہوئی اور اُس نے دیکھا کہ سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم بطور تأسف اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے فرما رہے ہیں کہ "جہانگیر تو نے کتنے بڑے شخص کو قید کر دیا"۔

[2] مکتوب ۴۳ دفتر سوم۔

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"الحمد للہ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اس طرف کے احوال واوضاع حمد کے لائق ہیں، عجیب وغریب صحبتیں گزر رہی ہیں، اور اللہ تعالےٰ کی عنایت سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ کی ان گفتگوؤں میں سرمو سستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی۔

اللہ تعالےٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں بیان ہوتی ہیں، جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر چاہیئے"[1]

ایک شاہی مجلس کے بارے میں جو اسی زمانہ میں پیش آئی تھی، ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"فرزندان گرامی کا صحیفۂ شریفہ پہونچا، اللہ تعالےٰ کی حمد ہے کہ صحبت وعافیت سے ہے، ایک تازہ معاملہ جو آج ظاہر ہوا ہے لکھتا ہوں، اچھی طرح سماعت کریں، آج شنبہ کی رات کو بادشاہی مجلس میں گیا تھا، ایک پہر رات گزرے وہاں سے واپس آیا، اور تین سی پارہ قرآن مجید حافظ سے سنا، دو پہر سے زیادہ رات گزر چکی تھی کہ نیند میسر ہوئی"[2]

ایک دوسرے مکتوب میں جو خواجہ حسام الدین کو لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں :-

"برخورداران ورفقاء میں سے جو بھی ساتھ ہے، ان سب کو وابستگی حاصل ہے، اور ان کے احوال میں ترقی ہے، ان کے واسطے یہ چھاؤنی گویا کہ خانقاہ بن گئی ہے"[3]

لشکر شاہی کے ساتھ لاہور پہونچے، وہاں سے سرہند کوچ ہوا، سرہند میں حضرت نے بادشاہ کی ضیافت فرمائی، حضرت کی خواہش سرہند رہ جانے کی تھی لیکن بادشاہ نے

---

[1] مکتوب نمبر ۱۰۶ دفتر سوم [2] مکتوب نمبر ۵۸ دفتر سوم، عبارتوں کے تراجم "حضرت مجدد الف ثانیؒ" تالیف مولانا سید زوار حسین سے ماخوذ ہیں۔ [3] مکتوب نمبر ۷۲ دفتر سوم۔

آپ کی جدائی گوارانہ کی وہاں سے دہلی روانگی ہوئی، دہلی سے بنارس، پھر اجمیر قیام رہا۔

جہانگیر پر اثر

بعض کتابوں میں جو زمانۂ حال میں حضرت مجدد کی سوانح حیات میں لکھی گئی ہیں، جہانگیر کی حضرت کے ساتھ گہری عقیدت اور باقاعدہ بیعت وارادت کو دکھایا گیا ہے لیکن اس کا کوئی مستند تاریخی ثبوت نہیں ملتا، توزک میں جہانگیر نے کئی مقامات پر جس انداز میں حضرت کا ذکر کیا ہے، اس سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی، وہ نشۂ سلطانی میں کتنا ہی مست ہو اور اس کا انداز تحریر کیسا ہی شاہانہ ہو وہ اپنے شیخ کا اس انداز میں ذکر نہیں کرسکتا، پروفیسر فرمان نے اپنی کتاب (ص ۳۵، ۳۶) میں بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جہانگیر کی ارادت ثابت نہیں، اور اس میں کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا، دوسرے قدیم سوانح نگاروں نے نہ جہانگیر کی بیعت کا ذکر کیا ہے، نہ شاہ جہاں کی، البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہانگیر نے اس رفاقت سے فائدہ اٹھایا، اس کے اندر نئے دینی رجحان پیدا ہونے، منہدم مساجد کی دوبارہ تعمیر، اور مفتوحہ علاقوں میں دینی مدارس کے قیام سے دلچسپی میں اس کو بہت دخل تھا، ۱۰۳۱ھ میں قلعہ کانگڑہ کی فتح کے موقعہ پر اس نے جس طرح اپنی اسلامیت کا اظہار کیا، اور وہاں شعائر اسلام کا اجراء کرایا[1]، اس سے بھی اس تبدیلی اور دینی ترقی کا پتہ چلتا ہے، جس کو مجدد صاحب کی شرف ہمرکابی کا فیض کہا جاسکتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو توزک جہانگیری ص ۳۴۰ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو باب ہفتم

قُربِ سفر اور اس کے انتظامات

خواجہ محمد کشمی لکھتے ہیں کہ ۱۰۳۲ھ تھا، اور آپ اجمیر میں تشریف رکھتے تھے، آپ نے فرمایا کہ سفر آخرت کے دن قریب ہیں، مخدوم زادگان کو جو اس وقت سرہند میں تھے، ایک خط میں تحریر فرمایا کہ "ایام انقراضِ عمر نزدیک و فرزندان دور" (زندگی کے اختتام کے دن قریب ہیں اور فرزند دور) صاحبزادگان اس خط کو پاتے ہی اجمیر حاضر ہوئے ایک دن خلوت میں دونوں فرزندوں (خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم) سے فرمایا کہ "مجھے اب اس دنیا سے کسی طرح کی دلچسپی اور اس کی طرف التفات نہیں، اب اس عالم کا خیال غالب ہے، اور سفر کے دن قریب معلوم ہوتے ہیں"[1]

حضرت مجدد کا قیام لشکر سے واپسی پر سرہند میں دس ماہ ۸ یا ۹ دن رہا[2]، جب اجمیر سے سرہند معاودت فرمائی تو وہاں پہونچ کر تمام تعلقات سے انقطاع فرمالیا اور خلوت اختیار کرلی، سوائے مخدوم زادوں اور دو تین مخصوص خادموں[3] کے کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی، سوائے نماز پنجگانہ اور جمعہ کے باہر تشریف نہیں لاتے تھے، سارا وقت ذکر و استغفار اور ظاہری و باطنی مشغولی میں گزرتا جو "وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" (اور سب سے منقطع ہو کر

---

[1] زبدۃ المقامات ص۲۸۲ [2] "حضرت مجدد اور ان کے ناقدین" ص۱۶۴-۱۶۵

[3] انہی خوش نصیبوں میں خواجہ محمد ہاشم کشمی بھی تھے لیکن وہ وفات سے سات ماہ پہلے رجب ۱۰۳۳ھ میں اپنے اہل و عیال کو دکن سے لانے کے لئے (جہاں اس زمانہ میں بدامنی و انتشار تھا) چلے گئے، اس عرصہ میں شیخ بدرالدین سرہندی حاضر خدمت رہے، اور زندگی کے آخری ایام کے حالات "زبدۃ المقامات" میں انہی کے حوالہ سے نقل کئے گئے ہیں، اس میں صاحبزادگان الاشان کی دی ہوئی معلومات بھی ہیں۔

اسی کے ہو رہو) کی تفسیر تھی۔

وسط ذی الحجہ سے ضیق النفس کے عارضہ میں شدت ہوئی، گریہ کا غلبہ ہوتا، اور جب ضعف کی شدت ہوتی تو "اللھم الرفیق الأعلیٰ" زبان پر جاری ہوتا، اسی عرصہ میں چند دن صحت کے ساتھ گزرے، اور مغموم و مجروح دلوں کو کچھ تسکین ہوئی، اسی حالت میں فرماتے تھے کہ "ضعف کی شدت میں وہ حلاوت و لذت محسوس ہوتی تھی جس کا اس چند روزہ صحت میں پتہ نہیں"، اس حالت میں بکثرت صدقہ اور خیرات فرمائی، ۱۲ محرم کو فرمایا کہ "مجھے بتایا گیا ہے کہ پینتالیس ۴۵ دن کے اندر تمہیں اس عالم سے دوسرے عالم کا سفر کرایا جائے گا، اور مجھے قبر کی جگہ بھی دکھائی گئی ہے" ایک دن صاحبزادگان نے دیکھا کہ آپ پر گریہ غالب ہے، انھوں نے سبب دریافت کیا، فرمایا کہ شوق وصال! صاحبزادوں نے کہا کہ ہمارے حق میں اس قدر (خلاف معمول) بے مہری و بے التفاتی کیوں ہے؟ فرمایا کہ "اللہ کی ذات تم سے زیادہ محبوب ہے"۔

۲۲ صفر کو خدام و اعزہ سے فرمایا کہ آج چالیس ۴۰ دن پورے ہو گئے، دیکھا چاہئے کہ اس سات، آٹھ دن میں کیا پیش آتا ہے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عنایات بے غایات اور انعامات بے حساب کا تذکرہ فرماتے رہے، ۲۳ صفر کو اپنی تمام پوشاکیں اور کپڑے خدام کو تقسیم کر دیئے، جسم مبارک پر چونکہ کوئی روئی دار کپڑا نہ تھا، ٹھنڈی ہوا کا اثر ہوا، اور دوبارہ بخار ہو گیا[1]، اور جیسا کہ حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کا مزاج مبارک بیماری سے قلیل افاقے کے بعد دوبارہ ناساز ہوا، یہ سنت بھی ادا ہوئی۔

اس ضعف کی حالت میں علوم عالیہ کا افاضہ شدت کے ساتھ تھا، صاحبزادہ عالی قدر

---

[1] مہینہ غالباً نومبر کا تھا، اس لئے کہ انتقال دسمبر کے مہینہ میں ہوا ہے، اس علاقہ میں یہ مہینہ سردی کا ہے۔

خواجہ محمد سعید نے عرض کیا کہ حضرت کا ضعف اس گفتگو کا متحمل نہیں، ان حقائق و معارف کے بیان کو کسی اور وقت کے لئے ملتوی رکھیں! فرمایا کہ فرزند عزیز! اب وقت و فرصت کس کو ہے کہ دوسرے وقت پر ان مضامین کو اٹھا رکھا جائے؟ غلبۂ ضعف کے ان دنوں میں بھی نماز بغیر جماعت کے ادا نہیں فرمائی، صرف زندگی کے آخری چار[۴] پانچ[۵] دنوں میں لوگوں کے کہنے سننے سے تنہا پڑھی، ادعیہ اور اد ماثورہ اور ذکر و مراقبہ میں کوئی فتور واقع نہیں ہوا، شریعت و طریقت کے آداب و احکام میں سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، ایک رات ثلث اخیر میں اٹھ کر وضو فرمایا، تہجد کھڑے ہو کر پڑھی، فرمایا کہ یہ ہماری آخری تہجد کی نماز ہے، اور یہی ہوا کہ اس کے بعد تہجد کی نوبت نہیں آئی۔

وصال سے کچھ پیشتر غَیبت اور استغراق کا غلبہ ہوا، مخدوم زادوں نے عرض کیا کہ یہ استغراق و غیبت آپ کو ضعف کی وجہ سے ہے یا استغراق کی وجہ سے؟ فرمایا استغراق کی وجہ سے، بعض معاملات و حقائق درپیش ہیں، اس حالتِ ضعف و شدت و علالت میں سنت کی پابندی، بدعت سے اجتناب اور دوام ذکر و مراقبہ کی وصیت فرماتے تھے، ارشاد فرماتے تھے کہ سنت کو دانتوں سے پکڑنا چاہئے، فرمایا کہ صاحبِ شریعت علیہ الصلاۃ والسلام نے "الدین النصیحۃ" کے مطابق امت کی خیر خواہی اور نیک صلاح کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، دین کی معتبر کتابوں سے متابعت کامل کا راستہ حاصل کرنا اور اس پر کاربند ہونا چاہئے، فرمایا کہ میری تجہیز و تکفین میں سنت پر پورا عمل کیا جائے کوئی سنت ترک نہ کی جائے، اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ چونکہ میری رحلت تمہاری رحلت سے پہلے ہوتی معلوم ہوتی ہے، اس لئے میرے کفن کا سامان اپنے مہر سے کرنا، یہ بھی فرمایا کہ میری قبر کسی گمنام جگہ پر بنائی جائے، مخدوم زادوں نے عرض کیا کہ پہلے تو حضرت کی

وصیت تھی کہ ہمارے برادر اکبر خواجہ محمد صادق[1] جہاں دفن ہیں وہیں دفن کیا جائے، اب حضرت یوں فرماتے ہیں، فرمایا کہ ہاں، اس وقت مجھ پر یہی شوق غالب ہے، جب آپ نے دیکھا کہ صاحبزادے یہ سن کر خاموش ہو گئے اور ان کو اس میں تردد ہے تو فرمایا، اگر ایسا نہ کر سکو تو بیرون شہر والد بزرگوار کے پاس یا باغ میں کہیں دفن کر دینا، میری قبر کو خام رکھنا، تاکہ تھوڑے دنوں میں اس کا نشان باقی نہ رہے، اس پر بھی جب دیکھا کہ صاحبزادے سوچ میں پڑ گئے تو مسکرا کر فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے . . ہاں مناسب سمجھو سپرد خاک کر دینا۔

سہ شنبہ کی شب اور ۲۷ صفر کی تاریخ تھی جس کے اگلے روز سفر آخرت تھا، ان خدّام سے جنھوں نے راتوں کو جاگ کر خدمت اور تیمارداری کی تھی، فرمایا کہ تم نے بڑی محنت کی بس اس رات کی محنت اور رہ گئی ہے، پھر فرصت! آخر شب میں فرمایا "اصبح لیلا" (رات کسی طرح صبح کر) دن ہوا تو چاشت کے وقت پیشاب کے لئے طشت منگوایا جس میں ریت نہیں تھی، چھینٹیں آنے کے خیال سے اس کو واپس کر دیا، کسی نے کہا کہ حکیم کو قارورہ دکھانا چاہیئے، فرمایا میں وضو شکست نہیں کرتا، مجھے بستر پر لٹا دو، آپ کو گویا اس کا انکشاف ہو گیا کہ اب کچھ ہی دیر کے بعد اس عالم سے کوچ ہے، وضو کی فرصت نہ ہوگی، جب بستر پر لٹا دیا گیا تو طریقۂ مسنون کے مطابق دائیں رخسارے کے نیچے دایاں ہاتھ رکھ کر ذکر میں مشغول ہو گئے، مخدوم زادوں نے سانس کی تیزی دیکھ کر عرض کیا کہ مزاج مبارک کیسا ہے؟ فرمایا کہ ہم اچھے ہیں! فرمایا کہ میں نے جو دو رکعت نماز پڑھی ہے کافی ہے، اس کے بعد سوائے اسم ذات کے ذکر کے کوئی بات نہیں فرمائی، ایک لمحہ کے بعد جان جاناں کو سپرد کر دی، یہ واقعہ روز سہ شنبہ چاشت کے وقت ۲۸ ماہِ صفر ۱۰۳۴ھ[2] کا ہے۔

---

[1] حضرت مجدد کے فرزند اکبر جن کا انتقال ۹ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ میں ہوا۔

[2] مطابق ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء (حضرت مجدد اور ان کے ناقدین)۔

صفر کا وہ مہینہ ۲۹ ر کا تھا، اگلے دن ربیع الاول کا مہینہ شروع ہو رہا تھا کہ روح نے قفص عنصری سے اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کی "یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً" اس وقت عمر مبارک ترسٹھ ۶۳ سال تھی[1]۔

جب غسل کے لئے لایا گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ آپ نماز کے طریقہ پر ہاتھ باندھے ہوئے بائیں ہاتھ کی کلائی پر داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور چھنگلیا سے حلقہ کئے ہوئے ہیں، مخدوم زادوں نے انتقال کے بعد ہاتھ پھیلا دیئے، لیکن غسل کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ آپ کے دونوں دست مبارک پہلی ہیئت کے مطابق حالت نماز کی طرح بندھ گئے اور یہ حالت آخر تک قائم رہی، دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ تبسم فرما رہے ہیں گویا ؎

ہم چناں زی کہ وقت رفتن تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں

ہاتھوں کو کتنا ہی الگ کیا جاتا وہ نماز کی کیفیت میں ایک دوسرے پر خود بخود آجاتے، تجہیز و تکفین کا سامان سب سنت کے مطابق کیا گیا، فرزند کلاں خواجہ محمد سعید نے نماز جنازہ کی امامت کی اور جسد مبارک کو آخری آرامگاہ میں پہونچا دیا گیا[2]۔

عادات و معمولات

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے جو حضرت مجدد کی خدمت میں ان کی آخری حیات میں تین سال سفر و حضر میں ساتھ رہے ہیں، حضرت کے عادات و معمولات کو تفصیل سے قلمبند کیا ہے[3]،

---

[1] مولانا زید ابوالحسن صاحب کی تحقیق ہے کہ عمر شریف قمری حساب سے باسٹھ ۶۲ سال چار ۴ ماہ چودہ ۱۴ دن اور شمسی حساب سے ساٹھ ۶۰ سال چھ ۶ ماہ پانچ دن کی ہوئی (حضرت مجدد اور ان کے ناقدین) ص ۲۲ [2] ملخصاً از زبدۃ المقامات ص ۲۵۶، ۳۰۰ [3] ملاحظہ ہو زبدۃ المقامات ص ۱۹۲-۲۱۵

یہاں اس کا خلاصہ لکھا جاتا ہے، قدرے اضافہ مولانا بدرالدین سرہندی کی کتاب "حضرات القدس" سے کیا گیا ہے[1]۔

"حضرت کو بارہا یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہمارا عمل اور کوشش بھی کیا چیز ہے جو کچھ ہے، وہ سب فضل خداوندی ہے، لیکن اگر اس کا کوئی ذریعہ کہا جاسکتا ہے تو وہ سید الاولین والآخرین صلے اللہ علیہ وسلم کی متابعت ہے، جس پر مدار کار سمجھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی عطا فرمایا ہے، اسی پیروی اور اتباع کی راہ سے عطا فرمایا ہے، جزئیاً وکلیاً، اور جو کچھ نصیب نہیں ہوا، وہ محض اس وجہ سے کہ بحکم بشریت اتباع کامل میں نقص وفتور ہونے کی وجہ سے، ایک روز فرمایا کہ ایک دن سہواً جائے ضرور میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے رکھ دیا، اس دن بہت سے احوال سے محرومی رہی، ایک مرتبہ صالح ختلانی سے فرمایا کہ ہماری تھیلی سے تھوڑی سی لونگیں لے آؤ! وہ گئے اور چھ لونگیں لے آئے، آپ نے دیکھ کر ناگواری سے فرمایا کہ ہمارے صوفی کو ابھی تک یہ خبر نہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ وتر ویحب الوتر" رعایت وتر مستحب ہے، مستحب کو لوگوں نے کیا سمجھا ہے، اگر دنیا وآخرت کو کسی ایسے نیک عمل کے بدلے میں دے دیا جائے جو اللہ کو پسند ہے تو اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں، ایک خادم کہتے ہیں کہ میں نے شیخ محمد بن فضل اللہ قدس سرہ سے پوچھا کہ آپ نے سرہند میں کیا دیکھا، کچھ ہمیں بھی سنائیے، انھوں نے کہا کہ مجھ بے بصیرت کو کیا نظر آسکتا ہے، لیکن میں نے اتنا دیکھا کہ سنت کے آداب اور اس کی باریک باتوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی فروگذاشت نہیں فرماتے، کسی اور سے اتنا اہتمام نہایت مشکل ہے۔

---

[1] "حضرات القدس" کی عبارت واوین "" کے درمیان کردی گئی ہے، اور اس کے صفحات کا حوالہ دے دیا گیا ہے، اس کے علاوہ جو کچھ مضمون ہے وہ زبدۃ المقامات سے ماخوذ ہے۔

ایک دوسرے حاضر باش نے کہا کہ ان حضرات کے احوال باطنی ہمارے ادراک سے بالاتر ہیں، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ حضرت کے حالات دیکھ کر اولیائے متقدمین کے حالات پر (جو کتابوں میں لکھے گئے ہیں) یقین آگیا، اور معلوم ہوا کہ ان میں مبالغہ نہیں تھا، بلکہ احساس ہوا کہ لکھنے والوں نے کم لکھا ہے، سارا دن اسی مشغولی میں گزرتا، ایک خادم خاص نے (جس سے وضو جانماز اور عبادات کے سلسلہ کی خدمات متعلق تھیں) کہا کہ صرف قیلولہ کے وقت اور رات کے ثلث دوم میں مجھے کچھ فرصت ملتی ہے، اپنے خدام و رفقاء کو بھی بکثرت دوام ذکر حضور اور مراقبہ کی تاکید فرماتے رہتے تھے، اور ارشاد ہوتا تھا کہ یہ دنیا دار العمل ہے، اور مزرعۂ آخرت حضور باطن کو آداب و اعمال ظاہری کے ساتھ جمع رکھنا چاہئے، حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے (باوجود محبوبیت اور علو مرتبہ کے) پائے مبارک کثرت عبادت سے متورم ہو جاتے تھے۔

اگرچہ حضرت کو مسائل فقہیہ کا استحضار تھا، اور اصول فقہ میں ملکۂ تامہ رکھتے تھے، لیکن بربنائے احتیاط مسائل میں معتبر کتابوں کی طرف رجوع فرماتے، اور سفر و حضر میں ان کو ساتھ رکھتے، عمل مُفتیٰ بہ قول اور فقہائے کبار کے ترجیح دیئے ہوئے مسئلہ پر ہوتا، اکثر خود امامت فرماتے، اور اس کی حکمت ایک مرتبہ ارشاد فرمائی کہ "حضرات شافعیہؒ و مالکیہؒ کے یہاں قرأت فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، اس لئے وہ امام کے پیچھے بھی فاتحہ پڑھتے ہیں، اور بہت سی احادیث صریحہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں، لیکن ہمارے امام ابو حنیفہؒ کے یہاں مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں، اور جمہور فقہائے حنفیہؒ کا بھی یہی مذہب ہے، چونکہ میں مذاہب کے جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اس لئے اس کی آسان صورت یہی معلوم ہوئی کہ خود امامت کروں[1]"۔

---

[1] خواجہ محمد ہاشم کشمی نے اسی فصل میں دوسری جگہ لکھا ہے "و فاتحہ خلف الامام ہمی خواند ندو آں را مستحسن ہمی شمردند" ص ۲۰۹۔

گرمی ہو یا سردی ہو حضرت کا سفر و حضر میں معمول یہ تھا کہ اکثر رات کو نصف اخیر میں اور کبھی ثلث اخیر میں بستر سے اٹھ جاتے اس وقت کے لئے احادیث میں جو دعائیں آئی ہیں، وہ پڑھتے، وضو بڑے اہتمام و احتیاط (اسباغ وضو) کے ساتھ فرماتے کہ پانی اعضاء کو پورے طور پر پہونچ جائے، دوسرے کو اس کی اجازت نہ دیتے کہ وہ پانی ڈالے، وضو کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ ہوتا، البتہ پائے مبارک دھوتے وقت اس کو شمال یا جنوب کی طرف موڑ لیتے، مسواک کی بڑی پابندی فرماتے، اور جو دعائیں حدیث میں آئی ہیں، وہ پڑھتے، پھر بڑے حضور و جمعیت اور طول قرأت کے ساتھ نوافل پڑھتے، نوافل سے فارغ ہونے کے بعد خشوع و استغراق کے ساتھ مراقبہ میں مشغول ہو جاتے، فجر سے کچھ پہلے سنت کے مطابق جھپکی لے لیتے اور صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے اٹھ جاتے، تازہ وضو فرماتے، فجر کی سنت دولت خانہ ہی پر ادا فرماتے "سنت و فرض کے درمیان سرّی طریقہ پر" سبحان اللہ وبحمدہٖ۔ سبحان اللہ العظیم" پڑھتے رہتے، فجر کی نماز آخر غلس (اندھیرے) اور اول اسفار (روشنی) میں ادا کرتے، تاکہ غلس و اسفار کے بارے میں دونوں مذہبوں پر عمل ہو جائے، خود امامت کرتے اور نماز فجر میں طوال مفصل[1] (جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے) پڑھتے تھے۔[2] فجر کی نماز کے بعد سے اشراق کے وقت تک حلقہ فرماتے، پھر طویل نماز اشراق پڑھ کر اور تسبیحات و ادعیۂ ماثورہ سے فارغ ہو کر دولت خانہ میں تشریف لاتے، اور اہل خانہ و متعلقین کی خیر خبر لیتے، اور جو امور روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے متعلق ہدایات دیتے، پھر خلوت میں تشریف لے جاتے، اور پوری توجہ کے ساتھ تلاوت قرآن میں مشغول ہو جاتے، تلاوت کے بعد طالبین کو طلب فرما کر ان کے حالات کی تحقیق و ہدایات فرماتے، اسی وقت اخصّ اصحاب کو بلا کر مضامین و علوم خاصہ سے

---

[1] سورۂ حجرات سے سورۃ البروج تک کی سورتیں طوال مفصل کہلاتی ہیں [2] حضرات القدس ص ۸۲

ان کو مستفید فرماتے اوران کو توجہ دیتے، اور وہ اپنے حالات وکیفیات سے مطلع کرتے، اور آپ ان کو علو ہمت، اتباع سنت، اور دوام ذکر حضور اور اخفائے حال کی تاکید فرماتے، کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ساری کائنات اس کے مقابلے میں وہ حیثیت بھی نہیں رکھتی جو ایک قطرہ کی دریائے محیط کے سامنے ہے، خدام وحاضرین کو کتب فقہ کے مطالعہ کی تاکید اور علماء سے احکام شریعت کی تحقیق کی ترغیب فرماتے۔

فرماتے تھے کہ کشف میں ایسا نظر آتا ہے کہ سارا عالم بدعات کے گرداب ظلمانی میں ڈوب گیا ہے، اور اس میں سنت کا نور کرمک شب تاب (جگنو) کی طرح چمک رہا ہے، غیبت اور مسلمانوں کی عیب چینی سے سخت احتراز تھا، خدام بھی آپ کے احترام وہیبت سے آپ کے سامنے کسی کی غیبت نہیں کرسکتے تھے، اپنے حالات وکیفیات کا بے انتہا اخفاء فرماتے تھے، میں نے دو۲ سال کی مدت میں صرف تین۳ چار۴ بار ایسا دیکھا کہ اشک کے چند قطرے چہرۂ مبارک پر ٹپک پڑے، ایسے تین چار بار مضامین عالیہ بیان کرتے وقت رخسار مبارک اور آنکھوں میں سرخی دیکھی۔

"ضحوۂ کبریٰ"[1] اور نماز چاشت کے بعد حرم سرا تشریف لے جاتے اور گھر والوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، صاحبزادوں یا اہل تعلق میں سے اگر کوئی چیز تیار کرتا تو پیش کرتا فرزندوں اور خدام میں سے اگر کوئی اس وقت موجود نہ ہوتا تو اس کا حصہ الگ رکھوا دیتے" کھانے میں اکثر کھلانے میں مشغولی رہتی اور زیادہ وقت دوسروں کی خبر گیری اور خاطر میں گزرتا بعض اوقات برائے نام تناول فرماتے، معلوم ہوتا تھا جیسے کھانے کی احتیاج نہیں، محض سنت کی پیروی

---

[1] ضحوۂ کبریٰ صبح صادق اور غروب آفتاب کے ٹھیک بیچ کا وقت (انتصاف النہار الشرعی وھو الضحوۃ الکبریٰ) شامی ج ۱ ص ۲۴۸

مقصود ہے[1]" آخری زندگی میں جب گوشہ نشینی اختیار کی اور روزہ رکھتے تو کھانا بھی خلوت خانہ میں تناول فرماتے، کھانے کے بعد فاتحہ پڑھنے کا (جیسا کہ عام طور پر رواج ہے) معمول نہیں تھا، اس لئے کہ صحیح احادیث میں نہیں آیا ہے" فرائض کے بعد بھی فاتحہ پڑھنے کا جیسا کہ بعض مشائخ کے یہاں دستور ہے معمول نہیں تھا"

دوپہر کا کھانا تناول کرنے کے بعد سنت کے مطابق قیلولہ فرماتے، موذن ظہر کے اول وقت اذان دیتا، آپ وضو کر کے سنت زوال پڑھتے، ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر کسی حافظ سے ایک پارہ یا کم و بیش سنتے، اور اگر درس ہوتا تو درس دیتے، نماز عصر بھی مثلین ہو جانے کے بعد اول وقت میں ادا فرماتے، عصر کے بعد غروب تک اصحاب و خدام کے ساتھ سکوت و مراقبہ میں مشغول اور خدام کی باطنی کیفیات کی طرف متوجہ رہتے، نماز مغرب کی سنت کے بعد اوابین ادا کرتے، کبھی چار رکعت کبھی چھ رکعت، نماز عشاء شفق ابیض کے زوال کے بعد فوراً پڑھ لیتے، وتر کی دعائے قنوت میں احناف و شوافع کی دعائے قنوت کو جمع کر کے پڑھ لیتے، نماز وتر کے بعد کبھی دو رکعت بیٹھ کر کبھی کھڑے ہو کر ادا فرماتے، آخر زمانہ میں شاذ و نادر یہ دو رکعتیں پڑھیں، وتر کے بعد دو سجدے جو متعارف ہیں نہیں فرماتے تھے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے، نماز عشاء اور وتر کے بعد جلد آرام فرمانے کے لئے لیٹ جاتے اور ادعیۂ ماثورہ پڑھنے میں مشغول ہو جاتے، درود کثرت سے پڑھتے، خاص طور پر شب جمعہ اور روز جمعہ، شب دوشنبہ اور روز دوشنبہ، تلاوت کے وقت چہرۂ مبارک اور پڑھنے کے انداز سے سامعین کو ایسا محسوس ہوتا کہ اسرار قرآنی و برکات آیات کا فیضان ہو رہا ہے، نماز اور بیرون نماز میں خوف کی آیات پڑھتے، یا جن آیات میں تعجب و استفہام آیا ہے،

---

[1] حضرات القدس ص۸۷

اس کا انداز و لہجہ پیدا ہو جاتا، نماز میں تمام سنن و مندوبات اور آداب کی رعایت فرماتے، تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد کا بھی اہتمام کرتے، تراویح کے علاوہ کوئی نفل نماز جماعت سے ادا نہ کرتے، لوگوں کو شب عاشورا یا شب قدر میں جماعت کے ساتھ نوافل ادا کرنے سے منع فرماتے۔

مریضوں کی عیادت کے لئے جاتے، اور اس موقع پر جو دعائیں آئی ہیں وہ پڑھتے، زیارت قبور کے لئے بھی تشریف لے جاتے، بعض اعلیٰ دینی کتابوں (مثلاً تفسیر بیضاوی، صحیح بخاری مشکوٰۃ المصابیح، فقہ، واصول وکلام میں ہدایہ، بزدوی، مواقف، اور تصوف میں عوارف العوارف کا درس دیتے، لیکن اس میں بحث ومباحثہ اور قیل وقال نہ ہوتا، اخیر عمر میں درس سے اشتغال کم رہ گیا تھا، طلباء کو تحصیل علوم دینی کی تاکید فرماتے، اور تحصیل علم کو سلوک و طریقہ پر مقدم رکھتے، کثرت سے حمد و استغفار کرتے، اور تھوڑی سی نعمت پر بہت زیادہ شکر ادا کرتے۔

رمضان کا بڑا اہتمام فرماتے، تین سے کم ختم قرآن نہ کرتے، خود حافظ قرآن تھے، اس لئے غیر رمضان میں بھی زبانی تلاوت فرماتے، اور مختلف حلقوں میں بھی سنتے رہتے[1]" افطار میں جیسا کہ احادیث میں آیا ہے تعجیل اور سحور میں تاخیر سے کام لیتے اور اس کا اہتمام فرماتے"[2]

"ادائے زکوٰۃ میں طریقہ یہ تھا کہ جب کہیں سے کوئی ہدیہ یا نذر آتی تو حولان حول یا سال گزرنے کا انتظار نہ کرتے، ان فتوحات کے وقت فوراً حساب کر کے زکوٰۃ ادا کر دیتے، اور ان میں اہل اصلاح، بیوگان اور اہل قرابت کو ترجیح دیتے، حج کا کئی بار عزم مصمم فرمایا، لیکن نوبت نہ آئی ہمیشہ اس شوق میں رہے، اور اسی شوق میں اس دنیا سے سفر کیا۔

اخلاق و تواضع، اور خلق اللہ پر شفقت، رضا و تسلیم کی خو انتہا درجہ پر پہونچی ہوئی تھی،

---

[1] زبدۃ المقامات ملخصاً از ص ۱۹۲-۲۱۵ [2] حضرات القدس ص ۹۱

آپ کے اعزہ اور اہل تعلق کو ظالم حاکموں سے بڑی ایذاء پہونچی لیکن تسلیم و رضا سے کام لیا، اور کبھی اس کی شکایت زبان پر نہیں آئی، اگر کوئی آپ سے ملاقات کے لئے آتا تو تعظیماً کھڑے ہو جاتے، اور صدر مجلس میں اس کو جگہ دیتے، اور اسی کے ذوق و مناسبت کی باتیں کرتے غیر مسلموں کی تعظیم خواہ وہ حاکم ہوں اور جاہ و اقتدار رکھتے ہوں نہیں کرتے تھے، سلام میں ہمیشہ سبقت فرماتے تھے، یاد نہیں آتا کہ کسی نے سلام میں آپ سے سبقت کی ہو، اہل حقوق کی حد درجہ رعایت فرماتے۔ کسی کے انتقال کی خبر آتی تو متاثر ہوتے اور کلمۂ ترجیع (انا للہ وانا الیہ راجعون) پڑھتے، اور نماز جنازہ میں شرکت کرتے، اور دعا و ایصال ثواب فرماتے"[1]

"آپ کا لباس ایک کرتہ جس کے دونوں کاندھوں پر چاک ہوتا تھا، اس کے اوپر ایک عبا، لیکن گرمیوں میں اکثر کرتہ ہوتا، دستار سر پر لپیٹ لیتے، جیسا کہ سنت ہے، اور شملہ دونوں کاندھوں کے درمیان پیٹھ پر پڑا ہوتا (سوائے استنجا اور قضائے حاجت کے وقت) پائجامہ ٹخنوں سے اوپر ہوتا، جمعہ اور عیدین میں لباس فاخرہ پہنتے تھے، جب نیا جوڑا زیب تن کرتے تو پہلا کسی خادم یا عزیز یا مہمان کو دے دیتے، آپ کی خدمت میں پچاس ۵۰ ساٹھ ۶۰ بلکہ سو ۱۰۰ آدمیوں کے قریب ہمیشہ علماء، عارفین، مشائخ، حفاظ و شرفاء و سادات میں سے رہتے تھے، اور سب کو آپ ہی کے مطبخ سے کھانا پہونچتا تھا"[2]

حلیۂ مبارک

شیخ بدرالدین سرہندی نے جو حضرت کے خلفاء میں ہیں اور سترہ ۱۷ سال آپ کی صحبت میں رہے "حضرات القدس" میں آپ کا حلیہ اس طرح لکھا ہے :-

---

[1] حضرات القدس از شیخ بدرالدین سرہندی مطبوعہ محکمۂ اوقاف پنجاب ۱۹۷۱ء ص ۹۱-۹۲ [2] ایضاً ص ۹۲

"حضرت کا رنگ گندم گوں مائل بہ بیاض تھا، پیشانی اور رخسار پر ایسا نور معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں، کشادہ ابرو تھے، ابرو کمان کی طرح جھکی ہوئی، دراز، سیاہ اور باریک، آنکھیں فراخ اور کشادہ جن میں سیاہی کی جگہ بہت سیاہی اور سفیدی کی جگہ بہت سفیدی، بینی مبارک بہت باریک، لب سرخ نازک، دہانہ نہ دراز نہ کوتاہ، دانت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، اور لعل بدخشاں کی طرح چمکتے ہوئے، ڈاڑھی گھنی، باوقار، دراز و مربع تھی، رخساروں پر ریش مبارک کے بال حد سے بڑھے ہوئے نہیں، میانہ قد، نازک اندام تھے"[1]

اولادِ امجاد

حضرت مجدد کو اللہ تعالیٰ نے سات فرزند عطا فرمائے تھے، ان میں دو صغر سنی میں حضرت کی حیات ہی میں فوت ہو گئے، شیخ محمد فرخ، شیخ محمد عیسیٰ، اور شیخ محمد اشرف جو زمانۂ شیر خوارگی میں داغ مفارقت دے گئے، فرزند کلاں خواجہ محمد صادق تکمیل علوم و سلوک کے بعد ۱۰۲۵ھ میں پچیس ۲۵ سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے، تین صاحبزادگان عالی قدر خواجہ محمد سعید، خواجہ محمد معصوم، اور خواجہ محمد یحییٰ، رونق بخش حیات رہے، ان چاروں کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا ؎

این سلسلہ از طلائے ناب ست

این خانہ تمام آفتاب ست

حضرت خواجہ باقی باللہ نے ان کو دیکھ کر بلند الفاظ فرمائے تھے، اور "جواہر علویہ" اور "شجرۂ طیبہ" سے تعبیر کیا، اور فرمایا تھا "فقرائے باب اللہ اند دلہائے عجیب دارند"۔

فرزند اول حضرت خواجہ محمد صادق، حضرت مجدد کے سامنے ہی درجۂ کمال کو پہونچ گئے تھے،

---

[1] ایضاً ص ۱۵۵

حضرت نے ان کے متعلق بڑے بلند کلمات ارشاد فرمائے ہیں، اور ان کی اعلیٰ علمی و باطنی استعداد کی شہادت دی ہے، ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ "فرزند عزیز فقیر کے معارف کا مجموعہ اور جذب و سلوک کے مقامات کا صحیفہ ہے"[1]

فرزند دوم حضرت خواجہ محمد سعید ۱۱۰۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۱۷۰ھ میں راہی ملک بقا ہوئے، انھوں نے بھی حضرت مجدد کے سلسلہ کی اشاعت اور اہل ارادت و اہل طلب کی تعلیم و تربیت میں خاصہ حصہ لیا[2]۔

فرزند سوم حضرت خواجہ محمد معصوم تھے، جو اپنے والد نامدار کے علوم کے حامل و شارح، رازدار و امین اور خلیفہ و جانشین تھے، آپ سے طریقۂ مجددیہ اور اس کی تعلیم و اثرات کی ایسی عالمگیر اشاعت ہوئی کہ کہنے والے نے صحیح کہا ہے ؎

چراغِ ہفت کشور خواجہ معصوم
منوّر از فروغش ہند تا روم

دہلی کی مشہور عالم خانقاہ جو مرجع عرب و عجم تھی (اور جس کی مسند ارشاد پر اپنے اپنے وقت میں خواجہ سیف الدین، مرزا مظہر جان جاناں، حضرت شاہ غلام علی، اور حضرت شاہ احمد سعید متمکن رہے) آپ ہی کے سلسلہ کی تھی، اسی خانقاہ سے مولانا خالد رومی کردی، حضرت شاہ غلام علی صاحب سے سلسلہ کو لے کر شام و ترکی پہونچے، جن کا سلسلہ عراق، شام، کردستان اور ترکی میں شہر شہر اور گھر گھر پھیل گیا[3]۔

---

[1] مکتوب ۲۷۷ دفتر اول، فضائل و کمالات کے لئے ملاحظہ ہو، زبدۃ المقامات ص ۳۰۳-۳۰۶

[2] آپ کے حالات و کمالات کے لئے ملاحظہ ہو "زبدۃ المقامات" ص ۳۰۸-۳۱۵

[3] ملاحظہ ہو ان کے مناقب میں علامہ شامی صاحب "شرح درمختار" کی کتاب "سل الحسام الہندی لنصرۃ مولانا خالد النقشبندی"

(باقی ص ۱۸۴ پر)

آپ کے مکاتیب ہر سہ اجزاء "مکتوبات امام ربانی" کی ایک طرح سے شرح اور تفصیل اور علوم ونکات کا ایک خزانہ ہے، آپ کے حالات وکمالات کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے ع

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

سلطان محی الدین اورنگ زیب کو آپ سے شرف بیعت حاصل تھا، اور آپ ہی کے صاحبزادہ خواجہ سیف الدین نے اس کی سلوک میں تربیت کی، آپ نے اس کو ہندوستان کا مسلمان حکمراں بننے اور اکبری اثرات سے پورے طور پر پاک کرانے کے لئے تیار فرمایا تھا، اور آپ اس کو اپنے مکتوبات میں "شہزادۂ دین پناہ" کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۱ر شوال ۱۰۰۷ھ میں ہوئی اور وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ کو۔[1]

چوتھے صاحبزادہ خواجہ محمد یحییٰ تھے، امام ربانی کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۹ سال کی تھی، تحصیل علوم اور تکمیل طریقت اپنے بھائیوں سے کی، وفات ۱۰۹۶ھ میں ہوئی۔[2]

(باقی ص ۱۸۳ کا) اس وقت بھی اس سلسلہ کے مشائخ شام وعراق، ترکی اور کردستان میں موجود ہیں، راقم سطور نے ان میں سے متعدد کی زیارت کی ہے، ان میں شیخ ابراہیم غلامینی، شیخ ابوالخیر میدانی، شیخ محمد بنہان، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

[1] کتاب کے آخر میں آپ کا مستقل تذکرہ (نزہۃ الخواطر) سے ماخوذ ومقتبس ملاحظہ ہو۔

[2] بھوپال کے حضرت شاہ رؤف احمد اورن کے پوتے حضرت شاہ پیر ابو احمد اورن کے پڑپوتے حضرت شاہ محمد یعقوب انہی کی اولاد میں ہیں۔

باب پنجم

حضرت مجدد کے دائرۂ "تجدید" کا مرکزی نقطہ

نبوت محمدی پر ایمان واعتماد کی تجدید

حضرت مجدد کا اصل تجدیدی کارنامہ کیا تھا؟

ان تمام اہل نظر اور انصاف پسند حضرات کا جنکی گیارھویں صدی (جس سے الف ثانی ہزارۂ دوم کا آغاز ہوتا ہے) کی اسلامی تاریخ پر عمومی اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر خصوصی نظر ہے[1]، اس پر اتفاق ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی سے اسلام کی حفاظت و تقویت کا وہ تاریخ ساز اور عہد آفریں کام انجام پایا جس کو حدیث کی سادہ و معروف اصطلاح میں "تجدید" کہا گیا ہے[2]، اور جس نے ان کے سلسلہ میں ایسی شہرت حاصل کی ہے

---

[1] جس پر کتاب کے پہلے دو ابواب میں اجمالی نظر ڈالی جا چکی ہے۔

[2] سنن ابی داؤد کی مشہور روایت ہے "ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مئۃ سنۃ من یجدّد لھا دینھا" (اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے کو اٹھائے گا جو اس امت کے لئے اس کے دین کو تازہ کر دے گا (ابو داؤد وغیرہ) اس حدیث کی شرح اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! کتاب "جامع المجددین" (از مولانا عبدالباری ندوی) پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کا فاضلانہ مقدمہ ص ۱۶-۲۴

کہ وہ ان کے نام کا قائم مقام بن گیا ہے، اور جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔

یہ کام کیا تھا؟ روح وفکر اسلامی کی جلا و تازگی، وقت کے اہم ترین اور سنگین فتنوں کا سدباب اور استئصال، نبوت محمدی اور شریعت اسلامی کی صداقت وابدیت پر از سر نو اعتقاد اعتماد بحال کرنا، ریاضت واشراقیت پر مبنی اس روحانی تجربہ اور تلاش حقیقت اور خدارسی کی کوشش کی طلسم شکنی جو محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اتباع سے بے نیاز ہو، "ہمہ اوست" اور وحدۃ الوجود کے عقیدہ اور نظریہ کی پردہ کشائی جو اپنے غلو ومبالغہ اور اشاعت ومقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہونچ چکا تھا، اور جس سے عقائد میں تزلزل اور مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا ہو رہا تھا، اور اس کے متوازی "وحدۃ الشہود" کے مسلک ونظریہ کو مدلل ومرتب شکل میں پیش کرنا، بدعات (جنھوں نے ایک مستقل تشریع کی شکل اختیار کر لی تھی) کی کھلی ہوئی تردید ومخالفت حتی کہ "بدعت حسنہ" کے وجود سے بھی انکار، اور پھر آخر میں ہندوستان میں اسلام کے اکھڑتے ہوئے قدموں کے جمانے، اکبری عہد کے مخالف اسلام اثرات کے ختم کرنے، اور ہندوستان میں ایک ایسا تجدیدی دینی انقلاب لانے کی حکیمانہ اور کامیاب کوشش جس کے نتیجہ میں ایک طرف اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر متمکن ہوتا ہے، دوسری طرف حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خلفاء وتلامذہ کا وہ سلسلہ وجود میں آتا ہے جو روحانی اور باطنی طور پر اسی سلسلہ سے وابستہ اور منسوب ہے، اور جس نے اشاعت وترویج کتاب وسنت، ان کی تفہیم وترجمانی، اور ان کے سلسلۂ درس وتدریس، مدارس کے قیام، تزکیہ وتربیت باطنی، اصلاح عقائد ورسوم کے عظیم الشان کام، اور پھر آخر میں جہاد وسعیِ اعلاء کلمۃ اللہ کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں اسلام کو قائم اور شجر اسلام کو پھلتا پھولتا رکھا، بلکہ اس کو عالم اسلام میں دینی علوم (بالخصوص علم حدیث) اور فکر ودعوت اسلامی کا مرکز بنا دیا۔

لیکن اس عظیم و وسیع تجدیدی دائرہ عمل کا نقطۂ مرکزی اور حضرت مجدد کا وہ اصل تجدیدی کارنامہ کیا تھا، جس کو ان کے سارے تجدیدی کارناموں پر اولیت و فوقیت حاصل ہے؟ لوگوں نے اپنے اپنے ذوق و رجحان کے مطابق اس کا جواب دیا ہے۔ ع

وللناس فیما یعشقون مذاھبٌ

ان میں تین گروہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ ایک گروہ جو کہتا ہے کہ وہ اس لئے مجدد الف ثانی کہلانے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کو اسلام کے لئے دوبارہ بازیاب کیا، اور اس کو برہمنیت یا وحدت ادیان کی گود میں جانے کے بجائے دوبارہ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم اور دین حجازی کی تولیت و نگرانی میں دیا، اور اس کو گیارہویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) کی اہم صدی میں اس انجام اور حشر سے بچا لیا جو اس کا تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ہونے والا تھا' بلکہ درحقیقت ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو اس ہمہ گیر اعتقادی، ذہنی، اور تہذیبی ارتداد کے فوری خطرہ سے محفوظ کر دیا جو اکبر کی جیسی باعزم اور قوی الارادہ شخصیت اور اس کے یگانۂ روزگار مشیروں (ملا مبارک، فیضی اور ابوالفضل) کی ذہانت سے ایک امر واقعہ بن کر سامنے آگیا تھا، یہ معنوی و روحانی انقلاب اور یہ ذہنی و تہذیبی ارتداد اس سیاسی زوال اور اقتدار کے خاتمہ سے کہیں زیادہ سنگین، دیرپا اور دوررس تھا، جو اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کی نوخیز غیر مسلم طاقتوں کے ابھرنے سے اور انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں کے تسلط اور اقتدار سے پیش آیا، شاید اقبالؒ نے اپنے اس مشہور شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان — اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

۲- دوسرے گروہ کے نزدیک ان کا اصل تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طریقت پر شریعت کی فوقیت و بالادستی کو ایسے پُراز اعتماد، مبصرانہ و تجربہ کارانہ انداز، اور اس قوت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا، اور اس سے طریقت کا شریعت کے تابع بلکہ خادم ہونا روز روشن کی طرح واضح ہوگیا، اور سلوک و طریقت کے حلقہ میں شریعت سے استغناء بلکہ کہیں کہیں انحراف، اور ریاضت و مجاہدہ اور باطنی حواس اور طاقتوں پر کُلّی اعتماد کا جو فتنہ شروع ہوگیا تھا، اور جس کا (جوگ اور سنیاس کا ایک اہم مرکز ہونے کی بناپر) ہندوستان سب سے بڑا نشانہ تھا رک گیا، اور ان کے بعد پھر کسی کو کھل کر یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ "شریعت و طریقت کے کوچے الگ الگ ہیں، اور طریقت پر شریعت کے پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے"۔

۳- تیسرا گروہ وہ ہے، جو ان کا اصل تجدیدی کارنامہ یہ سمجھتا ہے کہ انھوں نے "وحدۃ الوجود" کے عقیدہ و نظریہ پر وہ کاری ضرب لگائی جو اس سے پہلے کسی نے نہیں لگائی تھی، اور پھر اس کے بڑھتے ہوئے اس سیلاب کو روک دیا، بلکہ اس کا منہ پھیر دیا جس نے آخری صدیوں میں پوری علمی و روحانی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اور جس کے خلاف کسی پڑھے لکھے آدمی کا لب کشائی کرنا بھی اپنی جہالت کا ثبوت دینا اور نصف النہار میں دن ہونے کا انکار کرنا تھا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنے معرکۃ الآراء مضمون "ہزارۂ دوم یا الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" میں صحیح لکھا ہے کہ:-

"وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی فنی نکتہ نوازیوں یا شریعت و طریقت کی مُلّایانہ و صوفیانہ معرکہ آرائیوں کے ہنگاموں میں حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعی اور حقیقی تجدیدی کارنامے کچھ اس طرح رل مل گئے ہیں کہ آج حضرت قدس سرہ العزیز کو

مجدد الف ثانی کہنا بجز ایک روایتی خوش اعتقادی کے بظاہر اور کسی امر مہم پر مبنی نہیں معلوم ہوتا۔"[1]

نبوت محمدی اور اس کی ابدیت اور ضرورت پر اعتماد کی بحالی

لیکن حقیقت میں ان کا اصل کارنامہ جس کے جلو میں ان کے سارے تجدیدی کارنامے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، اور ان کی تجدید کا اصل سرچشمہ جس سے ان کی تمام انقلابی و اصلاحی کاموں کے چشمے پھوٹتے ہیں، اور دریا بن کر سارے عالم اسلام میں رواں دواں ہو جاتے ہیں، وہ نبوتِ محمدی اور اس کی ابدیت و ضرورت پر امت میں اعتقاد و اعتماد بحال کرنے اور مستحکم کرنے کا وہ تجدیدی و انقلابی کارنامہ ہے، جو ان سے پہلے اس تفصیل و وضاحت و قوت کے ساتھ ہمارے علم میں کسی مجدد نے انجام نہیں دیا، شاید یہ اس لئے بھی کہ اس کے زمانہ میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور اس کے خلاف کوئی منظم تحریک یا فلسفہ سامنے نہیں آیا تھا،[2]

اس تجدیدی اقدام سے ان تمام فتنوں کا سدباب ہوتا ہے جو اس وقت عالم اسلام میں منہ پھیلائے ہوئے اسلام کے شجرۂ طیبہ اور اس کے پورے اعتقادی، فکری اور روحانی نظام کو نگل لینے کے لئے تیار تھے، ان میں ایران کی وہ نقطوی تحریک اور اس کے پیرو بھی شامل ہیں، جنھوں نے نبوتِ محمدی اور اس کے بقا و دوام کے خلاف کھلے طریقہ پر علم بغاوت بلند کیا تھا، اور اعلان کیا تھا کہ "نبوتِ محمدی کا ایک ہزار سالہ دور ختم ہوا، اور اب دینی رہنمائی

---

[1] "تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ" مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی ص ۲۷

[2] اس سلسلہ میں سب سے زیادہ وضاحت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے یہاں ملتی ہے، خاص طور پر ان کی جلیل القدر کتاب "النبوات" اور "نقض المنطق" اور "الرد علی المنطقیین" ہیں، لیکن وہ چیز بھی اشارات و اجمال سے آگے نہیں بڑھ سکی کہ یہ کل مقام مقال۔

اور زندگی کی تشکیل جدید اور آئین سازی کا وہ دور شروع ہوتے جارہا ہے جس کی اساس عقلیت و فلسفہ پر ہوگی جس کی قیادت محمود لیخوانی اور اس کی جماعت کے ہاتھ میں اور جس کا مرکز ایران و ہندوستان ہوگا"[1] ان فتنوں میں اکبر کا "دین اکبری" اور "آئین جدید" بھی شامل ہے، جو ہندوستان میں نبوت و شریعت محمدی کی جگہ لینے اور اس کا بدل بننے کا مدعی تھا، دینی زندگی، اعمال و عبادات، اور معاشرہ و تمدن کی وہ دینی بدعات بھی داخل ہیں، جو ایک متوازی شریعت بنتی جارہی تھیں، اور جن کی ایک مستقل "فقہ" مدون ہورہی تھی، اور وہ بھی درحقیقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کے لئے ایک چیلنج اور منصب تشریع کی مدعی تھی۔

اس سلسلہ میں وحدۃ الوجود کا فلسفہ بھی آتا ہے، جو اپنے داعیوں اور علمبرداروں کے بقول کشفی حقائق پر مبنی تھا، اور جس کے متعلق اس کے غالی معتقدین بھی اس بات کے مدعی نہیں ہیں کہ خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالاعلان تبلیغ کی، اور آپ نے صحابۂ کرام کو اور صحابۂ کرام نے اپنے بعد کے لوگوں کو اس کی دعوت دی، یہ فلسفہ اور دعوت بھی نبوت کی پیش کی ہوئی دعوت، اس کی واضح تعلیمات اور اس کے مقاصد کا (دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر) حریف بنتی جارہی تھی اور اس کو جس قدر کامیابی حاصل ہوتی تھی، اور اس کی جڑیں دل و دماغ اور اسلامی معاشرہ میں پیوست ہوتی جاتی تھیں، احکام شریعت پر عمل کرنے، اسلام کے واحد دینِ حق اور ذریعۂ نجات ہونے کے عقیدہ میں ضعف پیدا ہوتا اور الحاد و زندقہ، حریت و اباحیت، تعطل و بے عملی کے لئے راہیں کھلتی تھیں، خواہ اس کے محتاط و متقی قائل صوفیہ و مشائخ خود شریعت کے کتنے ہی پابند اور اس کا کتنا ہی احترام

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب کا باب اول۔ مضمون "دسویں صدی کا فتنۂ کبریٰ"۔

کرتے ہوں، اور اس طرزِ عمل کے کتنے ہی مخالف ہوں۔

اس ضمن میں فرقۂ امامیہ کا گروہ بھی آتا ہے جس کے اساسی عقائد میں امامت کا عقیدہ بھی ہے، اور جو امام کی ایسی تعریف کرتا ہے، اور اس کے ایسے صفات و خصوصیات بیان کرتا ہے، جو اس کو قریب قریب نبی کا ہمسر و مساوی بنا دیتی ہیں[1]، اسی طرح صحابۂ کرام کی ایک بڑی جماعت کے متعلق ایسی رائے رکھتا ہے جس سے ذاتِ نبوی کی تاثیرِ صحبت، اس کی انقلاب انگیزی اور کیمیا اثری پر دھبہ آتا ہے، اور جو "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"[2] کے منافی ہے، اس فرقہ کے اثرات مختلف سیاسی و علمی وجوہ سے ہندوستان میں تیزی سے پھیل رہے تھے، اور مسلم معاشرہ (جس کی

---

[1] فرقۂ امامیہ کی معتبر کتابوں سے "امام" کے بارے میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "امام ظاہراً و باطناً معصوم عن الخطا و طاہر و مطہر ہوتا ہے، اس کی اطاعت فرض ہوتی ہے، اس کے ہاتھوں معجزات کا ظہور ہوتا ہے، اس کو متعلقات شریعت کا علم محیط (جس سے کوئی چیز خارج نہیں) علم لدنی کے طور پر حاصل ہوتا ہے، اور وہ قیامت تک السر کی حجت کے طور پر ہر زمانہ میں ظاہر ہوگا۔ (مقتبس از کتاب الشافی للشریف المرتضیٰ، تلخیص الشافی للطوسی، واصل الشیعۃ واصولہا للعلامۃ الشیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء)۔

علامہ محمد ابو زہرہ اپنی فاضلانہ کتاب تاریخ المذاہب الاسلامیۃ (ج ۱) میں ان اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "فرقۂ امامیہ کے تمام علماء اس پر متفق ہیں ان کے نزدیک "امام" کے مرتبہ کے نبی کے مرتبہ کے قریب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں انھوں نے اس کی صراحت کی ہے کہ "وصی" اور "نبی" میں صرف اتنا فرق ہے کہ "وصی" پر وحی نہیں آتی"۔ (ص ۵۹)

[2] سورۂ جمعہ آیت ۲ (ترجمہ) وہ پاک ذات جس نے ناخواندوں میں انھیں میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے (ان کے اخلاق و نفوس کو) سنوارتا اور بناتا ہے، اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اکثریت سنی العقیدہ تھی) اس کے عقائد، تصورات، افکار و خیالات اور رسوم و عادات سے گہرے طریقہ پر متأثر ہو رہا تھا۔

اس طرح انھوں نے "نبوت محمدی پر ایمان و اعتماد کی تجدید" کی شاہ کلید سے وہ سارے بھاری اور پیچیدہ قفل کھول دیئے جو یونانی و ایرانی فلسفہ اور مصری[1] و ہندوستانی اشراقیت نے ایجاد کئے تھے، ایک تیر سے ان سب فتنوں کو شکار کیا، جن کا مسلمانوں کا ذہین طبقہ نشانہ بنا ہوا تھا۔

عقل و کشف کا غیبی اور مابعد الطبیعی حقائق کے ادراک میں عاجز و ناکام رہنا

مجدد صاحب کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عقل و کشف دونوں کو "غیبیات" ماوراء عقل علوم، ذات و صفات الٰہی کی صحیح معرفت، لاریبی علم اور قطعی الثبوت حقائق کے یقینی ادراک سے عاجز اور قاصر ثابت کیا، اور یہ کہ ان کے حاصل کئے ہوئے نتائج شک و ریب اور خطاء، لغزش اور غلط فہمی سے مبرا نہیں، اللہ کی معرفت صحیح انبیاء ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، جس طرح "عقل" کا مرتبہ "حواس" سے ماوراء ہے، اسی طرح "نبوت" کا مرتبہ "عقل" سے ماوراء ہے، خدا کی تعظیم کا صحیح طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیاء کی اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے، معرفت الٰہی میں عقلائے یونان نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، اور مضحکہ خیز غلطیاں کی ہیں، جس طرح عقل خالص اور عقل مجرد کا وجود نہیں، کشف خالص اور کشف مجرد بھی، (جو اندرونی خواہشات اور خارجی اثرات سے محفوظ ہو) نہایت دشوار بلکہ عنقا صفت ہے، اور اہل اشراق و صفائی نفس نے اسی طرح ٹھوکریں کھائی ہیں، اور وہم و جہالت کا شکار ہوئے ہیں، جیسے مدعیان عقل و فلسفہ، عقل و اشراق دونوں حصول یقین

---

[1] مصر افلاطونیت جدیدہ (NEO PLATIONISM) کا بڑا مرکز تھا، جس میں فلاطینس (POLOTINUS) پارفری (PARPHYRY) پراکلس (PROCLUS) وغیرہ پیدا ہوئے اور ایک نئے مذہب "افلاطونیت جدیدہ" کی بنیاد پڑی۔

اور وصول الی اللہ کے لئے ناکافی ہیں، بعثت ہی اللہ کی ذات وصفات اور احکام کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے۔

انھوں نے اعلان کیا کہ عقل کا خالص و بے آمیز ہونا ممکن نہیں، اور وہ بھی داخلی عقائد و مُسلّمات اور خارجی عوامل واثرات سے متأثر ہوتی ہے، اور اس کے بہت سے فیصلے اور نتائج ان خارجی رنگوں سے رنگین و ممزوج ہو کر سامنے آتے ہیں، جو اس کے اندرون و بیرون میں پائے جاتے ہیں، انھوں نے ثابت کیا کہ عقل حجت ہونے میں ناقص ہے، حجت کامل انبیاء کی بعثت ہے، بعثت کے بغیر حقیقی تزکیہ ممکن ہی نہیں۔

انھوں نے صفائی نفس اور صفائی قلب میں حدّ فاصل قائم کی اور دونوں کا فرق بتایا، انھوں نے ثابت کیا کہ انبیاء کی رسالت کا تصدیق کرنے والا اصحاب استدلال میں سے ہے، انبیاء کی اطلاعات کو اپنی عقل کا پابند بنانا نبوت کا انکار ہے، انھوں نے اس نکتہ کی وضاحت کی کہ مخالف عقل ہونا اور چیز ہے، اور ماوراء عقل ہونا اور چیز۔

مجدد صاحب کی یہ تحقیقات جو عقل وکشف دونوں پر مبنی ہیں، اور جن میں تائید الٰہی اور مشکوٰۃ نبوت سے اخذ کیا ہوا نور شامل ہے، علمی وروحانی دنیا میں ہلچل ڈال دینے والے، فکر وتعقل کا ایک نیا دروازہ کھولنے والے، عقلی وعلمی دنیا کے بہت سے رائج الوقت سکوں کو کھوٹا ثابت کرنے والے، نبوات وشرائع سماویہ کی صداقت وعظمت کا اعلان کرنے والے، اور ان پر از سر نو اعتماد بحال کرنے والے علوم ومعارف اور ایک ایسا تجدیدی و انقلابی اور علمی وتحقیقی کارنامہ ہے، جو تنہا اس وقت کے نظام تعلیم، علمی ماحول اور دماغی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ ان میں وہ باتیں کہی گئی ہیں، جن میں سے بعض تک فلسفہ اور فکر کی دنیا صدیوں کے بعد پہونچی ہے، اور جن کی صداقت پر بالآخر علم اور روحانی

تجربہ نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، یہ محض اس تائید الٰہی اور ہدایت ربانی کا کرشمہ تھا، جس نے ان کو "ہزارۂ دوم" کے آغاز پر تجدید دین اور نبوت و شریعت محمدی کے دفاع کے لئے انتخاب کیا، اور اس اخلاص، حمیّت دینی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع کامل کا فیض جس پر وہ شروع سے گامزن تھے۔

اس اجمال کی تفصیل اور ان اشارات کی توضیح کے لئے اس پس منظر اور صورت حال کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس میں ان تحقیقات کی قدر و قیمت پورے طور پر واضح ہو گی۔

بنیادی سوالات، اور ان کے جواب کی مختلف کوششیں، اور ان کا جائزہ

دین و دنیا کے اہم ترین اور اولین سوالات جن کے صحیح جواب پر اس زندگی کی درستی اور صحیح انتظام اور آخرت کی نجات کا دار و مدار ہے، یہ ہیں کہ دنیا کا بنانے والا کون ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کا ہم سے کیا تعلق ہے، اور ہمارا اس سے کیا اور کیسا تعلق ہونا چاہئے؟ اس کی پسندیدگی اور خوشی کی چیزیں کیا ہیں اور ناپسندیدگی اور ناراضگی کی کیا؟ کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے، اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے، اور اس کے لئے اس زندگی میں کیا ہدایات ہیں۔؟

ان سوالات کے جواب کی تفصیل میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات و افعال، عالم کے حدوث و قدم، آخرت، جنت، دوزخ، وحی اور فرشتوں کے وجود کی بحث اور بعض وہ دوسرے مابعد الطبیعاتی مباحث پیش آجاتے ہیں، جو عقائد اور مذہب کے اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان سوالات کے جواب اور ان مسائل کے حل کے عموماً دنیا میں دو تجربے کئے گئے ہیں ایک عقلی دوسرا اشراقی، پہلے کا نتیجہ فلسفہ ہے، اور دوسرے کا نتیجہ اشراقی تصوف۔

لیکن اصولی اور تنقیدی حیثیت سے یہ دونوں تجربے اور کوششیں بنیادی طور پر غلط اور چند ابتدائی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں، مکتوبات کے اقتباسات سے پہلے تمہید کے طور پر اس کی مختصر تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے

عقل محض اور کشف خالص کی تنقید کا انقلابی کارنامہ

عقل کے متعلق سب سے پہلے یہ حقیقت یاد رکھنی چاہئے کہ وہ اپنا طبعی فریضہ (اکتشاف وتحقیق اور استدلال) انجام دینے میں آزاد نہیں ہے، اس کو اپنے سے کمتر چیزوں کی احتیاج ہے، اس کا کام یہ ہے کہ محسوسات اور معلومات اور تجربات کے ذریعہ غیر محسوس اور غیر معلوم چیزوں کا علم حاصل کرے، اور اپنے ذخیرۂ معلومات اور مبادی ومقدمات کی مدد سے اور ان کو علمی طور پر مرتب کرکے وہ اس نتیجہ تک پہونچے جو اس کو ابھی تک حاصل نہیں تھا، اور محض حواس وتجربہ سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا، تمام معقولات کی تحلیل اور ان کا تجزیہ کرنے سے یہی حقیقت ظاہر ہوگی کہ عقل ان حقائق اور بلند معلومات تک انھیں حقیر محسوسات اور ابتدائی معلومات کی مدد سے پہونچی ہے، جو بلا کسی عقلی اور علمی ترتیب کے ان عظیم الشان نتائج تک نہیں پہونچا سکتے تھے۔

پس صاف ظاہر ہے کہ جہاں انسان کے حواس قطعاً کام نہ کرسکتے ہوں، جہاں اس کے پاس معلومات کا سرے سے کوئی ذخیرہ نہ ہو، اور جس کے مبادی سے بھی وہ بالکل محروم ہو، جہاں کی حقیقت حال کا اس کو کوئی اندازہ وتجربہ نہ ہو، اور جہاں قیاس کی بنیادی موجود نہ ہو، وہاں اس کی عقل وذہانت اور اس کا قیاس کیا کام کرسکتا ہے؟ وہاں اس کی عقل اسی طرح بے بس ہوتی ہے جس طرح انسان کشتی کے بغیر سمندر کو عبور نہیں کرسکتا، اور طیارہ کے بغیر پرواز سے عاجز ہے، ذہین آدمی اعداد سے واقفیت کے بغیر ریاضی کا کوئی سوال حل نہیں کرسکتا، جس شخص نے کسی زبان کا رسم الخط نہیں سیکھا اور وہ اس کے حروف تہجی

(ALPHABET) سے بھی نا آشنا ہے، کتنا ہی ذہین اور جینیس (عبقری) ہو اور ہزار عقل و قیاس اور عرق ریزی سے کام لے اس زبان کی ایک سطر نہیں پڑھ سکتا، بعینہٖ اسی طرح مندرجہ بالا سوالات محض عقل سے حل نہیں کئے جا سکتے کیونکہ اس کے مبادی بھی انسان کو حاصل نہیں، نہ وہاں قیاس کی کوئی گنجائش ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ عقل کی قوت اور اس کا عمل محدود ہے، اس کا ایک دائرہ ہے، جس سے وہ باہر نہیں جا سکتی جس طرح انسان کے حواس کے علاحدہ علاحدہ دائرے ہیں اور ان کا عمل ان کے اندر محدود ہے، حاسۂ بصارت سے ہزاروں مبصرات کا ادراک ہو سکتا ہے، لیکن ایک آواز بھی وہ اخذ نہیں کر سکتا، اسی طرح دوسرے حواس، پھر اپنے ان مخصوص محسوسات اور دائرۂ عمل میں بھی ان حواس کی قوت اور ان کا عمل غیر محدود نہیں۔

اسی طرح عقل اگرچہ اس کا میدان ان حواس ظاہری سے زیادہ وسیع ہے لیکن بہرحال محدود ہے، ابن خلدون کے عالمانہ الفاظ میں :۔

"عقل ایک صحیح ترازو ہے، اس کے فیصلے یقینی ہیں، جن میں کوئی دروغ نہیں، لیکن تم اس ترازو میں امور توحید امور آخرت، حقیقت نبوت، حقائق صفات الٰہی، اور وہ تمام امور و حقائق جو ماوراء عقل ہیں، تول نہیں سکتے، یہ لاحاصل کوشش ہوگی، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کے لئے ہے اس کو اس ترازو میں پہاڑوں کے تولنے کا شوق پیدا ہوا جو ناممکن ہے، اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے، اسی طرح عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتی وہ اللہ اور اس کے صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے[1]"

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۳

تیسری بات یہ ہے کہ عقل میں پوری بے آمیزی اور اس کے فیصلوں اور نتائج میں مکمل غیر جانبداری بہت مشکل ہے، اہل حقیقت جانتے ہیں کہ "عقل خالص" اور "عقل مجرد" سے زیادہ عنقا صفت چیز دنیا میں مشکل سے کوئی ہوگی، جذبات و خواہشات، ماحول، خاص تعلیم و تربیت مخصوص اعتقادات و نظریات، وہم و خیال، سہو و نسیان کے اثر سے وہ مشکل سے آزاد ہوتی ہے، اس لئے اس کے فیصلوں میں ہمیشہ صداقت اور اس کے نتائج میں قطعیت پیدا ہونا اتنا آسان اور عمومی نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔

لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ فلاسفہ نے ان تمام حقیقتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے موضوع کے تعین میں غلطی کی اور خدا کی ذات و صفات اور اس کے متعلقات پر بلا کسی سامان و اسباب اور بلا کسی علم و روشنی کے ایسی تفصیل و تدقیق اور ایسے وثوق و علم سے بحث کی جو ماہر کیمیا اپنے کیمیاوی تجربوں اور تحلیل و تجزیہ کے بعد کرتا ہے، ان کے یہ مباحث و تحقیقات تمام تر فرضیات و تخمینات، اور خیالی طلسمات کا مجموعہ ہیں، اور محض قیاس بر قیاس پر مبنی ہیں، یہ "الٰہیات" کا ایک اچھا خاصا "طلسم ہوشربا" اور "فسانۂ عجائب"[1] ہے، جس کا کچھ نمونہ آئندہ آئے گا۔

اس عقلیت و فلسفہ کے مقابلہ میں ایک دوسری کوشش ہے جس کا نام "اشراق" ہے، اس کا اصول یہ ہے کہ حق اور یقین کی دریافت کے لئے عقل، علم اور برہان و استدلال مفید نہیں، بلکہ مُضر ہیں، صداقت و حقیقت کے یقینی حصول کے لئے مشاہدہ شرط ہے، اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن، صفائی نفس اور ایک اندرونی حاسّہ کو بیدار کرنے سے ممکن ہے، جو روحانیات اور ماوراء طبعیات کا اسی طرح ادراک کرتا ہے، جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں، اور یہ حاسّہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب مادیت کو بالکل فنا اور حواس ظاہری کو مردہ کر دیا جائے، حقائق کی تحصیل اسی خالص و بے آمیز

[1] اردو کی دو مشہور افسانوی کتابیں جو انیسویں صدی عیسوی میں لکھی گئیں۔

عقل (حکمت اشراق) اور اسی اندرونی روشنی (نور باطن) سے ممکن ہے، جو ریاضتوں، نفس کشی، مراقبہ اور تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ انسان میں یہ حاسۂ باطنی موجود ہے، ممکن ہے ایسے اور دوسرے حواس بھی ہوں لیکن بہرحال یہ ایک انسانی حاسہ ہی ہے، اسی طرح کمزور اور محدود، خطا پذیر اور متأثر ہونے والا، جس طرح انسان کی ساری طاقتیں اور انکشاف علم کے سارے ذرائع، اس کے محسوسات اور مشاہدات میں بھی غلطی اور خود فریبی ہوتی ہے، جیسے دوسرے حواس کے نتائج میں ہوتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل اشراق و مشاہدہ کے مکاشفات و تحقیقات میں وہ عظیم الشان تعارض و تناقض اور بڑے بڑے اہم مسائل میں لغزش اور غلط روی ممکن نہ ہوتی، جو غیر مسلم اور مسلمان اشراقیوں کے یہاں ملتی ہے[1]۔

بہرحال عقل کی طرح اس "عقل خاص" کا خالص ہونا بھی بہت مشکل ہے، اس پر بھی اسی طرح خارجی اثرات اور ظاہری اور باطنی چیزوں کا عکس اور پرتو پڑتا ہے، اور یہ آئینہ بھی حقیقت کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا، اشراقیوں کے ماحول، ان کے عقائد و مسلمات کا ان کے مشاہدات پر یہی اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے حکمائے اشراق کو اپنے کشف و مشاہدہ میں بہت سے ان یونانی اور مصری اوہام و خیالات کی تائید نظر آتی تھی، جن کا کوئی سر پیر نہ تھا اور بہت سے ایسے مفروضات حقیقت بن کر نظر آتے تھے، جن کا عالم خارجی میں کہیں وجود نہیں[2]۔

پھر جس طرح مندرجہ بالا سوالات فلسفہ کے موضوع و حدود سے خارج ہیں، اسی طرح

---

[1] تفصیل اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "مذہب و تمدن" باب اول عنوان "اشراقیت"۔

[2] ملاحظہ ہو "مذہب و تمدن"۔

اشراق کے حدود سے بھی، اس سے صرف عالم ارواح کے اسرار و عجائبات کی سیر ہوتی ہے، کچھ صورتیں نظر آتی ہیں، کچھ رنگ نظر آتے ہیں، کچھ آوازیں سننے میں آتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے منشا کا تفصیلی علم، اس کے قوانین شریعت، عالم آخرت کی منزلیں، اور اس کے احوال سے وہ اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح عام انسان۔

درحقیقت فلسفہ اور اشراق میں ایک ہی روح اور ایک ہی ذہنیت کام کرتی ہے، دونوں حقیقت کو اپنی کوشش سے پیغمبروں کے واسطہ کے بغیر معلوم کرنا چاہتے ہیں، منزل دونوں کی ایک ہے، طریقۂ سفر مختلف ہے، ایک ہوا میں اڑکر (خیالی پرواز سے) وہاں پہونچنا چاہتا ہے، اور ایک کسی مخفی زمین دوز راستہ سے (روحانی طریقہ سے)۔

لیکن حقیقت اور علم کا لُبّ لباب یہ ہے کہ یہ حقائق پیغمبروں کے واسطہ کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے، جن کو اللہ منصب رسالت سے سرفراز فرماتا ہے، ان کو اپنی ذات و صفات اور "ملکوت السمٰوٰت والارض" زمین و آسمان کی بادشاہی کا سب سے بڑا علم بخشتا ہے، اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی اور احکام کا براہ راست علم عطا کرتا ہے، اور ان کو اپنے اور انسانوں کے درمیانی واسطہ بناتا ہے، ان کی رسالت و نبوت دنیا کے لئے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے، ذات و صفات الٰہی کا جو عظیم الشان علم وہ بلا زحمت اور بلا قیمت عطا کرتے ہیں، اس کے ایک ذرہ کو بھی ہزاروں برس کی فلسفیانہ غور و فکر اور بحث و استدلال اور سالہا سال کے مجاہدہ و مراقبہ و تزکیۂ نفس سے نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ "ذالک من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون"

یہ بالکل صحیح فرمایا کہ "ولکن اکثر الناس لا یشکرون" فلاسفہ اور حکمائے اشراق اس نعمت نبوت کی ناقدری و ناشکری کرتے ہیں، اور ان حقائق تک اپنی محنتوں سے پہونچنا

چاہتے ہیں، جن سے اللہ نے ان کو مستغنی کیا تھا، ہزاروں برس کی ان کاوشوں اور مجاہدوں کا نتیجہ وہ متعارض و متناقض اور مضحکہ خیز اقوال و تحقیقات ہیں، جو "الٰہیات" کا سرمایہ ہیں، اور جنھوں نے اپنے مشتغلین اور متبعین کو خدا سے بجائے قریب و متعلق کرنے کے خدا سے اور زیادہ دور اور اس کی ذات و صفات سے ناآشنا اور اس سے بیگانہ اور مستغنی کیا.....

"اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ"

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ و روحانیت دونوں کوچوں سے اچھی طرح واقف ہیں، دوسری طرف علوم نبوت کے وارث اور وحی و رسالت کے مرتبہ شناس ہیں، آپ نے حکماء اور اشراقیوں کے اس طرز عمل کی بڑی مبصرانہ تنقید کی ہے، جو آپ کی جامعیت اور رسوخ فی العلم کی دلیل ہے، یہ مبحث آپ کی تجدید کا مرکزی و بنیادی شعبہ ہے، اس لئے کہ پوری شریعت الٰہی اور پورے نظام دینی کی بنیاد اسی بحث کے فیصلہ پر ہے کہ علم قطعی اور حصول یقین کا ذریعہ اور سرچشمہ اور انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اپنے آغاز و انجام اور اپنی فلاح و نجات کے ضروری علم کا صحیح مأخذ کیا ہے؟ آیا وہ غور و فکر اور علمی بحث و استدلال (جس کا نمائندہ فلسفہ ہے) یا اندرونی روشنی، نفس کشی... صفائی اور مشاہدہ اور علم جو باطنی حواس اور روحانی طاقتوں سے حاصل ہوتا ہے جس کو "حکمت اشراق" کہتے ہیں، یا ان دونوں کے برخلاف انبیاء علیہم السلام کی تقلید اور ان پر ایمان، یہی وہ نقطۂ آغاز ہے، جہاں سے راستے ایک دوسرے سے کٹ کر تین مختلف سمتوں کی طرف جاتے ہیں، اور جو آگے جاکر پھر کہیں نہیں ملتے، "وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝"

اس سلسلہ میں مجدد صاحب کے قلم سے جو نادر تحقیقات اور اعلیٰ علوم و معارف نکلے ہیں،

اوران کے مکتوبات کے ضخیم دفتر میں منتشر ہیں، ان کا ترجمہ مختلف عنوانوں کے ماتحت پیش کیا جاتا ہے۔

عقل کا عجز صانع عالم کے اثبات اور اس کے کمالات کی معرفت میں

"اس اللہ کا شکر ہے، جس نے ہم پر انعام کیا اور ہمیں اسلام کی طرف رہنمائی کی، اور محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت میں بنایا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات دنیا والوں کے لئے رحمت ہیں، کیونکہ حضرت حق سبحانہ وتعالےٰ نے ان حضرات کی بعثت کے ذریعہ ہم ناقص عقل والوں اور عاجز فہم رکھنے والوں کو اپنی ذات وصفات کی خبر دی ہے، اور ہماری کوتاہ فہم کے اندازہ سے اپنے ذاتی وصفاتی کمالات کی اطلاع بخشی ہے، اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی چیزوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ اور ہمارے دنیوی اور اخروی منافع اور مضرات کو ممتاز فرمادیا ہے، اگر ان حضرات کے وجود گرامی کا واسطہ درمیان میں نہ ہوتا تو انسانی عقلیں کارخانۂ عالم کے بنانے والے کے ثابت کرنے میں درماندہ ہوتیں، اور اس ذات اقدس کے کمالات کے پہچاننے میں عاجز وناکام ثابت ہوتیں، قدیم فلاسفہ جو اپنے کو سب سے بڑا عقلمند اور حکیم سمجھتے تھے، عالم کے بنانے والے کے منکر تھے، اور اپنی عقل کی کوتاہی سے اشیاء کو زمانہ کی طرف منسوب کرتے تھے، زمین وآسمان کے پیدا کرنے والے کے بارے میں نمرود کا مباحثہ حضرت ابراہیم (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) سے مشہور ہے، اور قرآن مجید میں بھی مذکور ہے، فرعون بدبخت کہتا تھا" مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ "(اے اہل مصر مجھے اپنے سوا تمہارے کسی حاکم ومعبود کا علم نہیں) نیز اس نے حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) سے خطاب کرکے کہا "لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ" (اے موسیٰ اگر تم نے میرے سوا کوئی اپنا معبود وحاکم

ٹھہرایا تو میں تم کو بھی قیدی بنا دوں گا) ہامان سے اسی بدبخت نے کہا "یٰاھَامَانُ ابْنُ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓی اِلٰهِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا" (اے ہامان میرے لئے ایک اونچا محل تیار کر، تاکہ میں پہونچوں رستوں میں آسمانوں کے پھر جھانک دیکھوں موسیٰ کے معبود کو اور میں تو اس کو خیال کرتا ہوں جھوٹا،) خلاصہ یہ ہے کہ عقل اس دولت عظمیٰ کے ثابت کرنے سے قاصر اور ان حضرات انبیاء کی ہدایت کے بغیر اس دولت سرا کا راستہ پانے سے عاجز ہے۔[1]

معرفت الٰہی میں عقلائے یونان کی بے عقلیاں

خالق و مدبر کائنات کے وجود جس کو فلاسفۂ یونان مبدأ اول کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور اس کے عمل خلق اور کائنات کے وجود میں آنے کے متعلق ان فلاسفہ نے جو عقلی موشگافیاں کی ہیں، اور تخیلات و مفروضات کا جو نقشہ تیار کیا ہے، اور پھر اس ہوائی بنیاد پر جو فلک بوس عمارتیں تعمیر کی ہیں، ان کی تشریح و تفصیل تو فلسفہ کی کتابوں میں اور ان پر تبصرہ و تنقید عقائد و علم کلام کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے، یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

لیکن حضرت مجدد کے افکار و علوم عالیہ کے سمجھنے کے لئے اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ان تخیلات و مفروضات کی تردید میں جو محض یونانی ذہن کی تخلیق اور قوت متخیلہ کی ایجاد ہے، ان کے قلم میں اتنا زور اور ان کے بیان میں اتنا جوش کیوں پیدا ہو جاتا ہے، عقل فعال کا جو فلاسفۂ یونان کے نزدیک درحقیقت عالم کی مدبر اور کائنات کے اندر موثر ہے "نسب نامہ" پیش کر دیا جاتا ہے، جو ان حکماء نے تجویز کیا ہے، اور جس پر انھوں نے سارے خلق و امر کی

---

[1] مکتوب ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

بنیاد رکھی ہے، اس کے ایک ایک لفظ پر موافق اور مخالف دلائل کا انبار ہے، لیکن یہاں صرف فہرست شجرہ پر اکتفا کی جاتی ہے :۔

"مبدأ اول (واجب الوجود) چونکہ تمام وجوہ سے واحد ہے، اور یہ مسلّم ہے کہ واحد سے صرف واحد کا صدور ہو سکتا ہے، اور عالم مختلف چیزوں سے مرکب ہے، اس لئے اس کا صدور اس سے نہیں ہو سکتا، اس کے وجود سے اس کے بلا ارادہ و اختیار اور علم، عقل اول کا اس طرح فیضان ہوا جس طرح چراغ سے روشنی کا فیضان ہوتا ہے، اور انسان کے ساتھ سایہ ہوتا ہے، عقل اول ایک ایسا موجود ہے، جو اپنی ذات سے قائم ہے، نہ تو وہ جسم ہے، اور نہ کوئی جسم اس کا محل ہے، اس کو اپنے نفس کی معرفت ہے، اور اپنے مبدأ کی بھی، اس کا نام خواہ فرشتہ رکھا جائے، خواہ عقلِ اول، خواہ کچھ اور، اس کے وجود سے تین چیزیں لازم آتی ہیں، عقل ثانی اور فلک اعلیٰ (یا فلک الافلاک) (جو نواں آسمان ہے) کا نفس اور اس فلک کا جرم، پھر عقل ثانی سے عقل ثالث اور فلک کواکب کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر اس عقل ثالث سے عقل رابع اور فلک زحل کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل رابع سے عقل خامس اور فلک مشتری کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل خامس سے عقل سادس اور فلک مریخ کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل سادس سے عقل سابع اور فلک شمس کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل سابع سے عقل ثامن اور فلک زہرہ کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل ثامن سے عقل تاسع اور فلک عطارد کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل تاسع سے عقل عاشر اور فلک قمر کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، یہی عقل اخیر ہے جس کا نام عقل فعال ہے، اس سے فلک قمر کا حشو لازم آیا جو ایک مادہ ہے، جو عقل فعال اور طبائع افلاک کے اثر سے کون و فساد کو قبول کرتا ہے، پھر ان مواد میں کواکب کی حرکات کے سبب مختلف طرح کے امتزاج ہوتے ہیں، جن سے معادن، نباتات اور حیوانات پیدا ہوتے ہیں، یہ عقول عشرہ

اور افلاک تسعہ ہیں"۔

یہ دراصل یونانیوں کا وہ علم الاصنام ہے جس کا نام انھوں نے فلسفہ اور الٰہیات رکھ دیا' اور لوگوں نے اس پر سنجیدگی سے غور و فکر اور مباحثہ شروع کر دیا یا محض فرضی داستان گوئی اور افسانہ آرائی ہے جس پر بے اختیار قرآن کی یہ آیت یاد آتی ہے:۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	میں نے ان کو آسمان و زمین کی پیدائش پر اور
وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ	خود ان کی پیدائش پر گواہ نہیں بنایا اور میں
الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝	گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنانے
	والا نہیں ہوں۔ (الکہف ۵۱)

امام غزالیؒ نے (اس نقشہ کو نقل کرنے کے بعد) سچ لکھا ہے کہ "یہ محض دعاوی و تحکمات ہیں، بلکہ درحقیقت "ظلمات فوق ظلمات" تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں، اگر کوئی شخص اپنا ایسا خواب ہی دیکھنا بیان کرے تو اس کے سوء مزاج کی دلیل ہوگی"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں" مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے چہ جائیکہ وہ عقلاء جو اپنے خیال میں معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہوں"[2]

ان فلاسفہ نے اللہ سے تمام صفات کمال اور تمام مخلوقات کی خلق و صنعت کی نفی کی اور اس کو بالکل معطل و غیر مختار ثابت کیا اور یہ سب اپنے نزدیک ذات واجب الوجود کی تعظیم و تنزیہ کے لئے کیا، امام غزالیؒ اس موقع پر بے اختیار ہو کر لکھتے ہیں:۔

"جو اس پر قانع ہو کہ اللہ کے بارے میں اس کے قول کا حاصل یہ مرتبہ ہو تو اس نے اس کو ہر اس موجود سے بھی زیادہ حقیر قرار دیا جس کو اپنے نفس کا بھی شعور ہے اس لئے کہ جس کو دوسرے کا

---

[1] تہافت الفلاسفہ ص ۳۰ [2] ایضاً ص ۳۳

اور اپنا شعور ہوگا وہ اس مرتبہ میں بلند ہوگا جس کو اپنے سوا کسی چیز کا شعور نہ ہو، تعظیم میں یہ موشگافی ان کو یہاں تک لے گئی کہ انھوں نے عظمت کے تمام معانی اور مفہومات کو باطل کر دیا اور اس کو ایسے مردہ کے درجہ کو پہونچا دیا، جس کو کچھ خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، بس صرف اتنا فرق ہے کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو یہ بھی نہیں ہوتا) اللہ اس طرح لوگوں کو سزا دیتا ہے، جو اس کے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں، اور ہدایت کے راستہ سے کترا کر چلتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس قول مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (میں نے ان کو آسمان و زمین کی پیدائش پر گواہ نہیں کیا) کے منکر ہیں، جو اللہ کے ساتھ برا گمان رکھتے ہیں، جن کا اعتقاد ہے کہ امور ربوبیت کی حقیقت و گہرائی کو انسانی طاقتیں پورے طور پر پا سکتی ہیں، جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں جن کا خیال ہے کہ عقل کے ہوتے ہوئے انبیاء اور ان کے متبعین کی تقلید کی ضرورت نہیں، اس کا لامحالہ نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ان کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے "معقولات" کا لب لباب وہ نکلا کہ اگر خواب کے طور پر بھی بیان کیا جائے تو تعجب ہو۔"[1]

ان سب چیزوں کو دیکھ کر نعمت رسالت کی قدر آتی ہے کہ "مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ" یہ عقل کی بے بسی اور عقلاء و حکماء (جن کی حکمت و عقل علوم ریاضیہ اور علوم عملیہ میں کامیاب ہوئی) کی ان مسائل الٰہیہ میں ناکامی کا پُر عبرت نمونہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی طرف کس طرح ان چیزوں کی نسبت کی جن کی نسبت وہ اپنی طرف اور حقیر ترین مخلوقات کی طرف پسند نہیں کرتے اور اس کو کس طرح معطل، بے اختیار اور لاعلم قرار دیا، اور اس کو اس کی تعظیم کا عین تقاضا سمجھا "سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"

---

[1] تہافت الفلاسفہ ص ۳۱

اب حضرت مجدد کے مندرجہ ذیل ارشادات پر نظر ڈالئے جو ان کے مختلف مکاتیب سے اقتباس کئے گئے ہیں فرماتے ہیں:۔

"عقل اگر معرفت الٰہی کے مسئلہ میں کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان جنھوں نے عقل کو اپنا مقتدی بنایا ہے گمراہی کے بیابان میں نہ بھٹکتے، اور حق تعالےٰ کو اور دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پہچانتے، حالانکہ اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات کے معاملہ میں جاہل ترین شخص یہی لوگ ہیں کہ انھوں نے حق سبحانہ کو بیکار و معطل سمجھ لیا اور سوائے ایک چیز (عقل فعال) کے اس کو کسی چیز کا فاعل اور خالق نہیں مانتے اور وہ بھی (ان کے خیال کے مطابق) اس سے اضطراراً نہ کہ اختیاراً وجود میں آئی ہے، انھوں نے اپنی طرف سے عقل فعال تراشی ہے، حوادث کو زمین و آسمان کے خالق سے ہٹا کر اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اثر کو موثر حقیقی سے روک کر اپنی تراشیدہ چیز (عقل فعال) کا اثر مانتے ہیں، اس لئے کہ ان کے نزدیک معلول علت قریبہ کا نتیجہ ہوتا ہے، علت بعیدہ کے لئے معلول کے حصول میں وہ کوئی دخل واثر نہیں مانتے، اور اپنی نادانی سے ان اشیاء کی اللہ کی طرف نسبت نہ ہونے کو اللہ کی صفت کمال جانتے ہیں، اور اس کو بیکار و معطل ماننے کو اس کی تعظیم سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالےٰ اپنے کو خود زمین و آسمان کا خالق کہتا ہے، اور "رَبُّ الْمَشْرِقِ وَرَبُّ الْمَغْرِبِ" کے ساتھ اپنی تعریف بیان کرتا ہے۔

ان بے عقلوں کو اپنے خیال کے مطابق اللہ تعالےٰ کی کچھ احتیاج نہیں، اور نہ اس کے سامنے کچھ عجز و نیاز ہے، مجبوری اور ضرورت کے وقت چاہئے کہ یہ اپنی "عقل فعال" کی طرف رجوع کریں، اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل اسی سے چاہیں، اس لئے کہ اصل قدرت اور اصل اختیار ان کے نزدیک اسی کا ہے، بلکہ "عقل فعال" بھی ان کے خیال کے مطابق اپنا عمل کرنے میں مجبور اور غیر مختار ہے، اس لئے اس سے بھی اپنی ضرورت کی تکمیل چاہنا غیر معقول بات ہے،

اصل یہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "اَنَّ الْکَافِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ" (ان کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں) ان کا بھی کوئی حامی و ناصر نہیں، خدا بھی نہیں اور عقل فعال بھی نہیں، عقل آخر کیا چیز ہے، جو چیزوں کا انتظام کرتی ہے، اور حوادث کے ظہور و خلق کی اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے، محض اس کے ثابت ہونے اور اس کی ہستی میں ہزاروں اعتراض و کلام ہیں، کیونکہ اس کا ثبوت و وجود محض فلسفہ کے گڑھے ہوئے مقدمات پر مبنی ہے، جو اسلام کے قواعد صحیحہ کی رُو سے نامکمل اور ناقص ہیں، کوئی احمق ہی ہوگا جو اشیاء کو قادر و مختار جل شانہ، سے ہٹا کر اسے محض ایک فرضی اور موہوم چیز کی طرف منسوب کرے گا، بلکہ خود ان چیزوں کو اس بات سے ہزار ہزار ننگ و عار ہے کہ وہ اپنے خلق میں فلسفہ کی ایک تراشی ہوئی بے حقیقت چیز کی طرف منسوب ہوں، بلکہ یہ چیزیں اپنے نابود ہونے پر راضی و مسرور ہوں گی، اور ان کو موجود ہونے کی کوئی خواہش نہ ہوگی، اس بات کے مقابلہ میں کہ ان کے وجود کی نسبت ایک بے حقیقت فرضی شیئ کی طرف ہو اور وہ قادر و مختار کی قدرت کی طرف منسوب ہونے کی سعادت سے محروم ہو جائیں (قرآن مجید میں ہے) "کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا" (بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے، یہ محض جھوٹ کہتے ہیں) دار الحرب کے کافر اپنی بت پرستیوں کے باوجود اس جماعت (فلاسفہ) سے بہتر ہیں کہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ سے مشکل کے وقت التجا کرتے ہیں، اور بتوں کو اس کے حضور میں شفاعت کے لئے وسیلہ بناتے ہیں۔

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک گروہ ان احمقوں (حکمائے یونان) کو حکماء کے لقب سے یاد کرتا ہے، اور حکمت کی طرف ان کو منسوب کرتا ہے، ان (فلاسفہ) کے اکثر مسائل خصوصاً الٰہیات میں (جو مقصد اعلیٰ ہے) غلط ہیں، اور کتاب و سنت کے مخالف،

حکماء کا ان کو لقب دینا جن کا سرمایہ جہل مرکب ہے، آخر کس لحاظ سے ہے؟ ہاں البتہ طنز و مذاق کے طور پر ہو سکتا ہے یا اس طرح جس طرح نابینا کو بینا کہا جائے[1]"

عقل حقائق دینی کے ادراک میں ناکافی ہے

"اس اللہ کا شکر ہے، جس نے ہم کو اس کی طرف ہدایت کی اور ہم کو ہدایت نہیں ہو سکتی تھی اگر اللہ خود ہماری ہدایت نہ کرتا، بیشک ہمارے پروردگار کے پیغمبر حق کے ساتھ آئے، انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے بھیجنے کے احسان کا شکر کس زبان سے بجا لایا جائے، اور کس دل سے اس... محسن کا اعتقاد کیا جائے اور وہ اعضاء و جوارح کہاں ہیں کہ اعمال حسنہ کے ذریعہ اس نعمت عظمیٰ کی مکافات کی جائے، اگر ان حضرات کا وجود مبارک نہ ہوتا تو ہم کوتاہ فہم انسانوں کو زمین و آسمان بنانے والے کے وجود اور اس کی یکتائی کی طرف کون رہنمائی کرتا، متقدمین فلاسفۂ یونان باوجود اپنی ذہانتوں کے زمین و آسمان کے بنانے والے (جل شانہ) کے وجود کی طرف راستہ نہ پا سکے، اور کائنات کے وجود کو انھوں نے "دہر" (زمانہ) سے منسوب کیا اور جب روز بروز انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی دعوت روشن ہوتی چلی گئی، متاخرین فلاسفہ نے ان انوار کی برکت سے قدماء کے مذہب کی تردید کی اور صانع جل شانہ، کے وجود کے قائل ہو گئے اور اس کی توحید کا بھی اقرار کیا، پس ہماری عقلیں انوار نبوت کی امداد کے بغیر اس کام سے بے بس اور ہمارا فہم انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے وجود کے توسط کے بغیر اس معاملہ سے دور ہے[2]"

---

[1] مکتوب ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

[2] مکتوب ۲۵۹/۱ بنام مخدوم زادہ خواجہ محمد سعید رح۔

نبوت کا طور عقل وفکر کے طور سے ماوراء ہے

"نبوت کا طریق عقل وفکر کے طور سے ماوراء ہے، جن امور کے ادراک میں عقل قاصر ہے، ان کا ثبوت نبوت کے طریق سے ہوتا ہے، اگر عقل کافی ہوتی تو انبیاء کس لئے مبعوث ہوتے" صلوات اللہ تعالیٰ وتسلیماتہ علیہم اجمعین" اور آخرت کے عذاب کو کیوں ان کی بعثت کے ساتھ وابستہ کیا جاتا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا" (ہم اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں، جب تک کسی پیغمبر کو نہ بھیجیں) عقل اگرچہ حجت ہے، لیکن حجت بالغہ نہیں ہے، اور اپنے حجت ہونے میں کامل نہیں ہے، حجت بالغہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت سے ثابت ہوئی ہے، اور اس نے مکلفین کی زبان عذر بند کر دی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا" (پیغمبر جو بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں، تاکہ لوگوں کے لئے اللہ کے اوپر کوئی حجت باقی نہ رہے، انبیاء کی بعثت کے بعد اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے) جب بعض مسائل میں عقل کے ادراک کا عجز اور کوتاہی ثابت ہوگئی، پس تمام احکام شرعیہ کو عقل کی ترازو میں تولنا مستحسن نہیں، ہمیشہ ان مسائل واحکام کو عقل سے مطابق کرنے کی کوشش اور اس کی پابندی عقل کے کافی ہونے کا فیصلہ کرنا ہے، اور نبوت کے طریق کا انکار، اللہ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے[1]

---

[1] مکتوب ۳۶/۳ بنام میر محمد نعمان۔

عقل کا خالص و بے آمیز ہونا ممکن نہیں اور وہ حقائق الٰہیہ کی دریافت کے لئے (خواہ اس کو اشراق اور صفائی نفس کی مدد حاصل ہو) مفید نہیں

حیرت انگیز بات یہ ہے (جس کی تائید الٰہی اور اعلیٰ درجہ کی سلامت فکر کے سوا کوئی توجیہ ممکن نہیں) کہ اس دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) میں جب ساری دنیا پر اور خاص طور پر ایران اور ہندوستان پر فلسفہ و حکمت کی اس تعلیم کے اثر سے جس کا انحصار فلسفۂ یونانی پر تھا اور جس نے افلاطون و ارسطو کو مقام تقدس اور درجۂ عصمت تک پہونچا دیا تھا، دماغوں پر عقلیت کا ایسا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ مقدمات عقلیہ سے منطقی طریقہ پر کسی نتیجہ کو ثابت کر دینے پر اور فلاسفۂ یونان نے جن چیزوں کو بدیہی اور قطعی بتایا ہے، ان کا نام لے لینے کے بعد زبانیں گنگ اور نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں، بلکہ پرستاران حکمت و عقلیت ان مزعومہ "حقائق" کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔

مجدد صاحب نے (ہمارے علم میں کم سے کم علماء اسلام میں) پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی کہ عقل کا خالص و بے آمیز ہونا جسمِ عنصری کے تعلق اور ماحول میں پھیلے ہوئے اوہام و تخیلات، عقائد و مسلمات نیز باطنی رجحانات اور راسخ اخلاق اور خواہشات سے آزاد ہونا تقریباً محال ہے، یہاں تک کہ اگر اس کو اشراق و صفائی نفس کی رفاقت و مدد بھی حاصل ہو تب بھی اس کا باطنی و خارجی اثرات تعلیم و تربیت اور معاشرہ یا ماحول میں جن چیزوں نے مسلمات کا درجہ حاصل کر لیا ہے، ان کے اثر سے آزاد ہو کر حقیقت نفس الامری تک پہونچنا اور بے لاگ فیصلہ صادر کرنا "استاذ کالمعدوم" کا حکم رکھتا ہے اور جس کا کچھ اعتبار نہیں، مجدد صاحب کی یہ تحقیق اور اپنے مکتوبات میں بار بار اس پر

زور دینا یہ اس عہد اور ان کے ماحول کے لحاظ ہی سے نہیں، بلکہ علمی و فکری دنیا میں ایک دریافت اور ایک ایسا انقلابی اور جرأت مندانہ اعلان ہے، جس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ صحیح طور پر ابھی تک نہیں کیا گیا، حالانکہ وہ اس کا مستحق تھا کہ اس کو بحث و تحقیق اور شرح و تفصیل کا موضوع بنایا جاتا۔

عجیب توارد اور حیرت انگیز بات ہے کہ مجدد صاحب سے تقریباً دو سو سال بعد جرمنی کے مشہور فلسفی ایمنول کانٹ (IMMANUEL KANT. 1724-1804) نے عقل کے خالص اور مجرد ہونے اور اس کے ماحول، ورثہ اور عادات و معتقدات سے آزاد ہو کر بے لاگ فیصلہ کرنے کی صلاحیت پر علمی اور تحقیقی بحث کا آغاز کیا اس نے عقل کے حدود کی جرأت و وضاحت کے ساتھ تعیین کی اور ۱۷۸۱ء میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب "تنقید عقل محض" (CRITIQUE OF PURE REASON) شائع کی[1]، جس نے دنیائے فکر و فلسفہ میں ہلچل ڈال دی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے الفاظ میں "روشن خیالوں کے کارناموں کو خاک کا ڈھیر کر دیا"[2] مغرب میں اس کے اس کارنامہ کی عظمت کا شاندار طریقہ پر اعتراف کیا گیا اور کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ وہ جرمن قوم کے لئے خدا کا سب سے بڑا عطیہ تھا، تاریخ فلسفۂ جدید کا مصنف ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفڈنگ اس کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "یہ کتاب فلسفہ کا ایک غیر فانی کمال پارہ ہے جس نے فکر انسانی کی ہر زہ گردیوں میں انگشت رہنما کا کام کیا"[3]

---

[1] اس کتاب کا ترجمہ جو اصلاً جرمن زبان میں تھی، ــــ "تنقید عقل محض" کے نام سے ہندوستان کے مشہور اہل قلم اور کامیاب مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا، اور "انجمن ترقی اردو ہند" دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔

[2] THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM. P. 5

[3] تاریخ فلسفۂ جدید ترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جلد دوم ص ۳۸

کانٹ کے نزدیک فکر اپنا عمل ادعائی طور پر شروع کرتا ہے، اسے غیر ارادی طور پر اور اکثر سادہ لوحی سے اپنے قویٰ اور اپنے مفروضات و مقدمات کی صحت پر اعتماد ہوتا ہے، اسے یقین ہوتا ہے کہ میں تمام مسائل کو حل کر سکتا ہوں اور کائنات کی کنہ تک میری رسائی ہو سکتی ہے.....

اس کے بعد ایک زمانہ آتا ہے جس میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تعمیرات فکر افلاک تک نہیں پہونچ سکتیں اور ہندسوں میں ان کے نقشوں کے متعلق اتفاق رائے نہیں ہو سکتا یہ تشکیک کا زمانہ ہے، اس نے دیکھا کہ ابھی ایک ایسا کام باقی ہے، جسے ادعائیین اور تشککین دونوں نے نظر انداز کر دیا تھا، وہ یہ کہ ہم اپنی عقل اور اپنے علم کی ماہیت کے متعلق تحقیق کریں اور دریافت کریں کہ ہمارے اندر فہم اشیاء کے لئے کس قسم کے صور و قوی پائے جاتے ہیں، اور ان کی مدد سے ہم کہاں تک جا سکتے ہیں[1]۔

اب اس کے بعد ایک مسلمان عالم و مفکر کا (جو ہندوستان کے محدود علمی و مدرسی ماحول میں رہا اور جس نے حکمت و فلسفہ کے بجائے علوم نبوت اور معرفت و رضائے الٰہی کے حصول کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا، عقل خالص کی تنقید میں فلسفہ کے پیچ و خم سے دور رہتے ہوئے عام فہم و دل نشین بیان پڑھئے۔ مجدد صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ "عقل اپنی ذات سے اگرچہ احکام الٰہی میں ناقص و ناتمام ہے، مگر یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ صفائی نفس اور تزکیہ کے بعد عقل کو ایک مناسبت اور ذات الٰہی سے ایک بے کیف اتصال پیدا ہو جائے، جس کے ذریعہ سے وہ وہاں سے احکام اخذ کرے اور بعثت کی ضرورت جو فرشتہ کے واسطہ سے ہوتی ہے نہ پڑے"۔

---

[1] ایضاً ص ۳۰-۳۱

تحریر فرماتے ہیں:-

"(جواب) عقل خواہ وہ مناسبت واتصال پیدا کرے مگر جو تعلق وہ جسم عنصری سے رکھتی ہے، وہ کلیۃً زائل نہیں ہوتا، اور مکمل آزادی و بے آمیزی وہ نہیں پیدا کر سکتی، واہمہ ہمیشہ اس کا دامنگیر رہتا ہے، اور متخیلہ اس کے خیال کو کبھی نہیں چھوڑتا، غصہ اور خواہش کی قوتیں سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتی ہیں، اور حرص وہوس کی صفاتِ مذموم کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بھول چوک جو انسان کے لوازم میں سے ہے، اس سے علیٰحدہ نہیں ہوتے، خطا اور غلطی جو اس زندگی کے خواص میں سے ہیں، اس سے جدا نہیں ہوتے، پس عقل اعتماد کے لائق نہیں، اور اس کے اخذ کئے ہوئے احکام وہم وتصرف اور خیال کے اثر واقتدار سے آزاد نہیں، اور بھول چوک کی آمیزش اور غلطی کے شبہ سے محفوظ نہیں، بخلاف فرشتہ کے جو ان صفات سے پاک ہے، اور ان نقائص سے بری، پس لامحالہ وہ اعتبار کے لائق ہے، اور اس کے اخذ کئے ہوئے احکام وہم وخیال کی آمیزش اور نسیان وغلطی کے شبہ سے محفوظ ہیں، بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ وہ علوم جن کو اس نے روحانی اخذ وتحصیل کے ذریعہ حاصل کیا ہے، قوی اور حواس تک ان کو پہونچانے میں بعض ایسے مقدمات جو اس کے نزدیک مُسلّم ہیں (لیکن غیر واقعی ہیں، اور وہم وخیال یا کسی اور طریقہ سے حاصل ہوئے ہیں) بے اختیار ان علوم کے ساتھ اس طرح شامل ہو جاتے ہیں کہ اس وقت بالکل اس کی تمیز نہیں ہونے پاتی، دوسرے وقت کبھی اس کا امتیاز عطا ہوتا ہے، اور کبھی نہیں ہوتا، پس لامحالہ ان علوم میں ان مقدمات کی شمولیت کی وجہ سے غیر واقعیت اور عدم صداقت کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ اعتبار کے لائق نہیں رہتے"[1]

---

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ۔

اہل اشراق وصَفائے نفس

حصول یقین علم صحیح، تہذیب اخلاق وتزکیۂ نفس اور اس کے ذریعہ انسانی معاشرہ کی تنظیم اور صالح تمدن کی تعمیر کا ایک بے خطا اور معصوم ذریعہ قدیم زمانہ سے اشراقیت وروحانیت کو سمجھا گیا، زمانۂ قدیم میں مصر وہندوستان اس کا بہت بڑا مرکز تھے، اس تحریک کے فروغ اور اس کی ہر دلعزیزی میں وہ ردّعمل بھی کام کر رہا تھا، جو ایک طرف غالیانہ عقل پرستی دوسری طرف مجنونانہ حواس پرستی کے خلاف یونان وروم میں پیدا ہوگیا تھا، اور بالآخر اس نے اسکندریہ (مصر) کو جو مشرقی ومغربی عقلیت ومذاہب کا سنگم تھا اپنا مرکز بنایا۔

اس فلسفہ اور تحریک کے داعیوں اور پیروؤں کا کہنا یہ ہے کہ حصول یقین وعلم صحیح کا سب سے بڑا ذریعہ مشاہدہ ہے، اور وہ نور باطن صفائے نفس اور باطنی حاسہ کو بیدار کرنے سے حاصل ہوتا ہے، حقائق کا حصول اسی خالص وبے آمیز عقل (حکمت اشراق) اور اسی اندرونی روشنی (نور باطن) سے ممکن ہے، جو ریاضت، مخالفتِ نفس اور مراقبہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اگر یہ قول تسلیم کرلیا جائے تو اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کے اندر حواس خمسہ کے علاوہ ایک چھٹا حاسہ (باطنی) عمل کرنے لگتا ہے، اور اس کے عمل کے نتائج (مشاہدات) غیر مرئی انوار غیر مسموع اصوات اور پہلے سے غیر معلوم حقائق ظاہر ہونے لگتے ہیں، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ حاسہ انسان کے دوسرے حواس کی طرح محدود اور غلطی وغلط فہمی میں مبتلا ہونے والا نہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو اس کے نتائج میں تعارض وتضاد کا وجود اور شک واحتمال نہ پایا جاتا، لیکن اشراقیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس حاسۂ باطنی کے محسوسات اور وہ جن نتائج وعقائد

تک پہونچاتا ہے، ان میں اسی طرح سے تعارض واختلاف پایا جاتا ہے، جیسا کہ فلاسفۂ یونان اور مشرق کے حکماء وعقلیین میں پایا جاتا ہے، اشراقیت قدیم کو چھوڑ کر (جس کی تاریخ محفوظ نہیں) اشراقیت جدیدہ (NEO - PLATONISM) کو لے لیجئے اس کے پیشواؤں کے مذہبی عقائد پر مرتب ہونے والے اعمال میں کھلا تضاد پایا جاتا ہے، پلاٹینس (PLOTINUS) اپنے زمانہ کے مذہبی نظام اور مروجہ عبادات کا قائل نہیں، اور آزاد مشرب فلسفی ہے، جو عمل کے بجائے تفکر اور مراقبہ پر زور دیتا ہے، لیکن اس کا شاگرد رشید پارفری (PORPHYRY) ایک زاہد خشک صوفی ہے، PLOTINUS انسانی روح کے جانوروں کے جیون میں ظاہر ہونے کا قائل ہے، لیکن PORPHYRY اس کا منکر ہے، اس مسلک کا تیسرا نامور پیشوا پراکلس (PROCLUS) پورے مصری رسوم، دینی ومذہبی تقریبات کا پابند تھا، اور دن میں تین دفعہ سورج کی پرستش کرتا تھا، اس کا مذہب مختلف مذاہب واعتقادات کا معجون مرکب تھا، اور یہ سب اہل مشاہدہ اور یقین تھے"[1]

PORPHYRY نے مسیحیت کی مخالفت کی اور رومی بت پرستی اور جاہلیت (PAGANISM) کے احیاء کی تحریک میں شہنشاہ روم کی تائید کی، اور اس کو نور باطن نے شرک وبت پرستی کے اس ڈوبتے ہوئے جہاز کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دینے سے روکا نہیں۔

مسلمانوں میں بھی جن کو اشراق اور قوت کشفیہ پر پورا اعتماد تھا، ان کے باطنی محسوسات ومکشوفات میں بھی بکثرت تعارض ملتا ہے، ایک صاحبِ کشف دوسرے صاحبِ کشف سے اختلاف کرتا ہے، اس کے کشف کو امر واقعی کے خلاف بتاتا ہے، اور کبھی اس کو سُکر اور غلبۂ حال پر محمول کرتا ہے، عقول (جن کا ذہن اور کتب فلسفہ کے علاوہ) کہیں وجود خارجی نہیں، ان سے یہ اہل کشف مصافحہ کرتے ہیں، اور ان سے اپنی ملاقات ثابت کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، تصوف

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مذہب واخلاق کا انسائیکلوپیڈیا عنوان (NEO - PLATONISM)

کی تاریخ اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔

شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی مقتول

ان مسلمان اہل اشراق میں چھٹی صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) کا اشراقی حکیم شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی (۵۴۹-۵۸۷ھ) معروف بالمقتول، خاص شہرت رکھتا ہے، جو اپنے مخالف اسلام اور انتشار انگیز عقائد و خیالات کی بنا پر الملک الظاہر کے حکم سے ۵۸۷ھ کو قتل کیا گیا، وہ اپنے کو مشّائی و صوفی کہتا تھا، اس کے یہاں مشائی تصورات کے ساتھ بقول (S. V. DEN BERGH) "وہ سارا متصوفانہ فلسفہ موجود ہے جو مسلمانوں نے یونانی نظریۂ تطبیق، معتقدات اور اتحاد مذاہب سے اخذ کیا" انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مذکورہ بالا مقالہ نگار کے بقول "دراصل یہ نوافلاطونی نظریۂ نور ہے، جس کو اشیاء کی بنیادی حقیقت تصور کیا جاتا ہے"[1]

شہرزوری لکھتے ہیں "وہ دونوں فلسفے یعنی فلسفۂ ذوقیہ (اشراقیہ) اور فلسفۂ بحثیہ (فلسفہ مشائیہ) کا جامع تھا" اس کی اہم کتاب "حکمت الاشراق" ہے، جس کی شرح علامہ قطب الدین شیرازی نے کی اور وہ "شرح حکمت الاشراق" کے نام سے علمی و درسی حلقوں میں مشہور ہے۔

شیخ الاشراق کے نزدیک عقول کی تعداد دس میں محدود نہیں بلکہ ہر نوع کے لئے ایک عقل ہے، جو اس کی حفاظت کرتی ہے، شیخ الاشراق ان کو انوار مجردہ کہتا ہے، شیخ الاشراق کے نزدیک آسمان ایک زندہ مخلوق ہے، اس میں نفس مجردہ پایا جاتا ہے، جو اس کو حرکت دیتا ہے، وہ عدم و فساد سے محفوظ ہے، آسمان میں نفس ناطقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں حواس بھی پائے جاتے ہیں، اس کے نزدیک کل آسمان ایک زندہ مخلوق ہیں، اور انوار عالیہ یعنی عالم مجردات کا

---

[1] دائرۃ معارف اسلامیہ۔

اثر ان پرستاروں کے ذریعہ سے پڑتا ہے، اور انہی کے ذریعہ سے قوائے جسمانیہ حرکت میں آتے ہیں سب سے بڑا ستارہ سورج ہے، اشراقیین کے مذہب میں اس کی تعظیم واجب ہے، عالم کائنات میں بالذات وبالواسطہ نور ہی نور کی حکومت ہے، حرکت وحرارت نور سے پیدا ہوتی ہے، اور آگ میں یہ دونوں اوصاف اور عناصر سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں، جس طرح نفس عالم ارواح کو روشن کرتا ہے، اسی طرح آگ عالم اجسام کو روشن کرتی ہے، خدا نے ہر عالم میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کیا ہے، عالم عقول میں عقل اول، عالم افلاک میں ستارے اور ان کے نفس ناطقہ، عالم عناصر میں نفوس بشریہ اور ستاروں کی شعاعیں اور آگ بالخصوص (رات کی تاریکی میں) اس کے خلیفہ ہیں، یعنی اس کی اصلاح وتدبیر کرتی ہے، خلافت کبریٰ انبیاء کے نفوس کاملہ کو حاصل ہوتی ہے، خلافت صغریٰ آگ سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ تاریک راتوں میں وہ انوار علویہ اور ستاروں کی شعاعوں کی قائم مقامی کرتی ہے، غذا اور خام چیزوں کو پختہ کرتی ہے، شیخ الاشراق کے نزدیک عالم قدیم ہے، زمانہ ازلی وابدی ہے، وہ تناسخ کا قائل نہیں لیکن اس کا انکار بھی نہیں کرتا (کیونکہ اس مسئلہ میں فریقین کے دلائل تسلی بخش نہیں ہیں[1])

اس طرح اپنے وقت کا ممتاز اشراقی حکیم جس نے مشرق میں شیخ الاشراق کا لقب پایا، اور جس کی ذہانت، تبحر علمی اور زہد وتجرد اس کے معاصرین کو بھی تسلیم ہے، اس کو اس کی اشراقیت وصفائی نفس، یونانی مفروضات اور ایرانی ومجوسی مزخرفات کے اختیار کرنے سے باز نہیں رکھ سکی، وہ بعثت محمدی اور اس پر مرتب ہونے والی ہدایت، فلاح دینی ودنیوی اور معرفت صحیحہ سے محروم رہا، اس نے ایک غیر متوازن، انتشار واضطراب سے بھری ہوئی ناکام زندگی گزاری اور وہ اپنے پیچھے ہدایت اور نفع خلائق کا کوئی نظام چھوڑے بغیر دنیا سے رخصت ہوا۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حکمائے اسلام" ج ۲ از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم۔

عقل وکشف دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں

کانٹ (KANT) نے عقل خالص کے وجود میں بہت شبہہ ظاہر کیا ہے، اور ثابت کیا کہ اس کا بے آمیز اور اندرونی و بیرونی اثرات سے آزاد ہونا تقریباً ناممکن ہے، لیکن وہ کشف و علم باطنی کی دنیا سے ناآشنا تھا، اس لئے وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا، مجدد صاحب نے جو اس دریا کے بھی غواص تھے، ایک قدم آگے بڑھ کر کشف خالص اور الہام خالص کے مشکل اور نادرالوجود ہونے پر مفصل روشنی ڈالی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ اشراق اور صفائی نفس کے ذریعہ بھی ان غیبی حقائق اور لاریبی علوم تک رسائی ممکن نہیں جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی بعثت کے راستہ سے عوام و خواص کو حاصل ہوتے ہیں، اس طرح بعثت کے بغیر نہ وصول الی المعرفت ہوتا ہے، نہ حصولِ نجات، نہ حقیقی تزکیہ اس سلسلہ میں ان کے چند مکتوبات کے اقتباسات پڑھئے!

"ان نادانوں (حکماء) کے ایک گروہ نے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے راستہ کی پابندی کے بغیر صوفیہ الٰہیّہ (جو ہر زمانہ میں انبیاء کے پیرو اور متبع رہے ہیں) کی تقلید میں ریاضت اور مجاہدہ کا راستہ اختیار کیا ہے، اور اپنے وقت کی صفائی پر فریب کھایا، اور اپنے خواب و خیال پر اعتماد کیا، اور اپنے خیالی کشف و کشوف کو اپنا مقتدیٰ بنایا، "ضلّوا فأضلّوا" (خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کیا) یہ نہیں جانتے کہ یہ صفائی نفس کی صفائی ہے جو گمراہی کی طرف راستہ دکھاتی ہے، نہ کہ صفائی قلب جو کہ ہدایت کا دریچہ ہے، اس لئے کہ قلب کی صفائی انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات کی پیروی سے وابستہ ہے، اور نفس کا تزکیہ (اصلاح و تصفیہ) قلب کی صفائی کے ساتھ مربوط ہے، "اس شرط کے ساتھ کہ وہ نفس کی اصلاح و تربیت کرے" قلب جو ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار کا مظہر ہے، اس کی ظلمت کے ساتھ نفس جو صفائی پیدا کرے گا اس کا حکم اس چراغ کا سا ہے جس کو اس لئے روشن کیا گیا ہو تاکہ

پوشیدہ دشمن یعنی ابلیس لعین (اس کی روشنی میں) گھر کو تاراج و برباد کردے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کا طریقہ نظر و استدلال کے رنگ میں اس وقت اعتبار و اعتماد پیدا کرے گا، جب وہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی تصدیقات کے ساتھ ہو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ فرماتے ہیں، اور اس کی مدد ان کی امداد کرتی ہے، ان حضرات کا نظام ایسے ملائکہ کے نزول کی وجہ سے (جو غلطی اور گناہ سے محفوظ ہیں) دشمن لعین کے مکر سے محفوظ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے کہ "إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ" (بے شک میرے خاص بندے تیرا (اے ابلیس) ان پر کوئی زور نہیں) اور یہ بات دوسروں کو میسر نہیں اور اس لعین کے نامبارک حال سے ان کی رہائی متصور نہیں، سوائے اس کے جو ان حضرات کی پیروی کرے، اور ان کے نقش قدم پر چلے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے سچ کہا ہے ؎

محالست سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

"سعدی سلامتی کے راستہ پر محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے بغیر چلنا محال ہے" اللہ کا درود و سلام ہو، ان پر اور ان کی آل اور ان کے تمام برادران انبیاء پر"۔[1]

کشف میں آمیزش

"یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کشف کی غلطی ہمیشہ القاء شیطانی ہی کی بنا پر نہیں ہوتی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض غیر واقعی اور صداقت سے عاری احکام متخیلہ میں جاگزیں ہو جاتے ہیں، وہاں شیطان کا کوئی دخل نہیں ہوتا، لیکن (یہ خیالات) خارج میں متمثل ہو کر آتے ہیں، اسی سلسلہ کی

[1] مکتوب ۲۳ دفتر ۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی

یہ چیز ہے کہ بعض لوگوں کو خواب میں آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوتی ہے، اور وہ آپ سے بعض ایسے احکام اخذ کرتے ہیں، (جو شریعت کے ثابت شدہ مسائل اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہوتے ہیں) اس صورت میں القاء شیطانی متصور نہیں ہے، علماء کی تحقیق یہ ہے کہ شیطان آپ کی صورت میں متمثل نہیں ہوتا تو اس صورت میں صرف متخیلہ کا تصور ہوتا ہے، جس نے خلاف واقع کو واقع سمجھ لیا ہے"[1]

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"نفس خواہ تزکیہ کے ذریعہ نفس مطمئنہ بن گیا ہو لیکن وہ اپنی صفات سے پورے طور سے مجرد نہیں ہوتا اس لئے غلطی کو اس کے اندر بھی راہ پا جانے کا موقع ملتا ہے"[2]

فلاسفہ اور انبیاء کی تعلیم کا تضاد

اتنا تحریر فرمانے کے بعد آپ فلاسفہ و انبیاء کی تعلیمات کے درمیان اس کھلے تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے، اور جن میں تطبیق ممکن نہیں اور یہ کہ ان کی عقلی مساعی اور بلند پروازیاں "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے مرادف ہیں۔

ارشاد فرماتے ہیں:۔

"فلاسفہ کی عقل ناقص گویا نبوت سے بالکل ضد اور مقابل سرے پر واقع ہوئی ہے، ابتدائے عالم کے بارے میں بھی اور آخرت کے بارے میں بھی، ان کے مسائل و مباحث انبیأ علیہم الصلوات والتسلیمات کی تعلیمات کے بالکل مخالف ہیں، انھوں نے نہ ایمان باللہ درست کیا نہ ایمان بالآخرت، عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہیں، حالانکہ تمام اہل ادیان و

---

[1] مکتوب نمبر ۱۰۷ بنام محمد صادق کشمیریؒ۔ [2] مکتوب نمبر ۴۱ بنام شیخ درویش۔

اہل ملل کا اجماع ہے کہ عالم حادث ہے، اپنے تمام اجزاء کے ساتھ، اسی طرح آسمانوں کے پھٹ جانے، تاروں کے جھڑ جانے، پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے، سمندروں کے بہ پڑنے کے قائل نہیں جس کا بروز قیامت وعدہ ہے، اسی طرح اجسام کے دوبارہ زندہ ہونے کے منکر ہیں، اور قرآن کی تصریحات کا انکار کرتے ہیں، ان کے متأخرین جو اپنے کو اہل اسلام کے گروہ میں شامل کرتے ہیں، اسی طرح اپنے فلسفی اصول پر جمے ہوئے ہیں، اور افلاک و کواکب اور اسی طرح دوسری چیزوں کے قدیم ہونے کے قائل ہیں، اور ان کے فنا و ہلاک نہ ہونے کے مدعی، ان کی خوراک قرآنی تصریحات کی تکذیب، اور ان کا رزق دین کے اصولی مسائل کا انکار ہے، عجب طرح کے مومن ہیں کہ خدا و رسول پر ایمان لاتے ہیں، لیکن خدا اور رسول نے جو کچھ فرمایا ہے، اس کو قبول نہیں کرتے، اس سے بڑھ کر حماقت نہیں ہو سکتی، کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کُلّ آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثر است

فلسفہ چوں کہ اس کے لفظ کا بڑا حصہ "سفہ" (حماقت ہے) اس لئے وہ کل حماقت ہی ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ اکثر کُل کا حکم رکھتا ہے۔

اس جماعت نے اپنی عمر ایسے آلہ (منطق) سیکھنے سکھانے میں صرف کی جو فکری غلطی سے محفوظ رکھنے والا ہے، اور اس بارے میں انھوں نے بڑی زحمتیں اٹھائیں، مگر جب ذات و صفات و افعال باری تعالےٰ کی بحث کو پہونچے جو مقصد اعلیٰ ہے، تو انھوں نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے، اور اس آلہ کو جو غلطی سے محفوظ رکھنے والا ہے، ہاتھ سے دیکر ٹھوکریں کھانے لگے، اور گمراہی کے دشت و بیابان میں بھٹکنے لگے، جیسے کہ ایک شخص برسوں جنگ کے سامان و آلات کو

تیار کرتا رہتا ہے، اور عین جنگ کے وقت ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے، اور اس سے کچھ بنتا نہیں.

لوگ علوم فلسفہ کو بہت باقاعدہ اور منظم سمجھتے ہیں، اور غلطی و خطا سے محفوظ جانتے ہیں، اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ حکم ان علوم کے بارے میں ہوگا جن میں عقل تنہا کافی ہو سکتی ہے، جو یہاں مبحث سے خارج ہے، اور مالا یعنی (غیر مفید مطلب) کے حکم میں ہے، اور آخرت سے جو دائمی ہے، کچھ واسطہ نہیں رکھتے اور نجات اخروی ان سے وابستہ نہیں، گفتگو ان علوم کے بارے میں ہے کہ عقل ان کے ادراک میں عاجز و قاصر ہے، اور وہ طریقۂ نبوت سے مربوط ہیں، اور نجات اخروی ان سے وابستہ ہے" پھر آگے تحریر فرماتے ہیں :-

"علم منطق جو ایک ایسا علم ہے جو (بعد کے علوم عالیہ کے لئے) ایک آلہ کے طور پر ہے، اور اس کے متعلق لوگوں نے کہا ہے کہ وہ خطا سے حفاظت کرنے والا ہے، ان کو کام نہیں آتا، اور مقصد اعلیٰ میں ان کو خطا اور غلطی سے اس نے باہر نہیں نکالا، وہ ان کے کام نہ آیا تو دوسروں کے وہ کیا کام آئے گا، اور غلطی سے کسی طرح نکالے گا؟

(اللہ تعالیٰ سے اسی کے الفاظ میں دعا ہے) "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ" (اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کر اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت دی، اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش بے شک تو بڑا بخشنے والا ہے۔)

بعض آدمی جو علوم فلسفہ میں کچھ "دخل در معقولات" رکھتے ہیں، اور فلسفیانہ ملمع سازیوں کے فریب میں ہیں، اس جماعت کو حکماء جان کر انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کا ہم سر اور مقابل سمجھتے ہیں، بلکہ قریب ہے کہ ان کے جھوٹے علوم کو سچا جان کر انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی شریعتوں پر مقدم رکھیں، اللہ ہم کو بُرے اعتقاد سے بچائے، تو ہاں حسبِ وقت

ان کو حکماء جانتے ہیں، اور ان کے علم کو حکمت کہتے ہیں، خواہ مخواہ اس بلا میں گرفتار ہوتے ہیں، اس لئے کہ حکمت نام ہے کسی شیئ کے اس علم کا جو حقیقت واقعی کے مطابق ہو، پس جو علوم (مثلاً انبیاء کی شریعتیں) ان علوم حکمت کے مخالف ہوں گے، وہ ان حکماء کے خیال میں حقیقت واقعی کے خلاف ہوں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان کی تصدیق اور ان کے علوم کی تصدیق انبیاء کی تکذیب اور انبیأ علیہم الصلوات والتسلیمات کے علوم کی تکذیب ہے، اس لئے کہ یہ دونوں (حکماء اور انبیاء کے) علوم ایک دوسرے سے بالکل مقابل سرے پر واقع ہوئے ہیں، ایک کی تصدیق دوسرے کی تکذیب کو مستلزم ہے، جو چاہے انبیاء کے دین کا پابند ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے ہو اور اہل نجات میں سے ہو اور جس کا جی چاہے فلسفی ہو جائے، اور شیطان کے گروہ میں سے ہو اور نامراد و ناکامیاب ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا" (جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے بیشک ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ تیار کی ہے جس کی قناتوں نے ان کو گھیر لیا ہے، اور اگر وہ پیاس سے فریاد کریں گے تو ان کی دادرسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو پگھلے سیسہ کی طرح ہوگا جو منہ کو جلا دے گا اور وہ بری چیز ہوگی) اور سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی پابندی کی، ان پر اور ان کے برادران انبیاء کرام و ملائکہ عظام پر مکمل ترین اور اعلیٰ ترین درود و سلام ہو۔"[1]

---

[1] مکتوب ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

بعثت کے بغیر حقیقی تزکیہ ممکن نہیں

"ہم یہ کہتے ہیں کہ تصفیہ وتزکیہ ان نیک اعمال سے وابستہ ہیں، جو مولیٰ جل شانہ کو پسندیدہ اور اس کے یہاں مقبول ہوں اور یہ بات جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا بعثت پر موقوف ہے، پس بعثت کے بغیر صفائی اور تزکیہ کی حقیقت نصیب نہیں ہوتی"[1]

انبیاء کی بعثت کی ضرورت اور عقل کا ناکافی ہونا

مجدد صاحب بعثت انبیاء ورسل کی ضرورت، ہدایت کے لئے اس کے ناگزیر ہونے اور تنہا عقل کے (خواہ وہ کتنی بلند پایہ ہو) ناکافی ہونے پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت دنیا والوں کے لئے رحمت ہے اگر ان حضرات کے وجود کا ذریعہ نہ ہوتا تو ہم گمراہوں کو اللہ تعالےٰ (جو واجب الوجود ہے) کی ذات وصفات کی پہچان کی طرف کون رہنمائی کرتا، اور اس کی پسندیدگی وناپسندیدگی کے کاموں میں کون امتیاز پیدا کرتا؟

ہماری ناقص عقلیں ان حضرات انبیاء کی دعوت کی روشنی کی مدد کے بغیر اس مطلب سے عاجز اور ہماری ناتمام سمجھ ان حضرات کی تقلید کے بغیر اس معاملہ میں بے بس اور درماندہ ہے۔

ہاں عقل ضرور حجت ہے، لیکن حجت ہونے میں نامکمل اور تاثیر وتکمیل کے درجہ کو

---

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ۔

نہیں پہونچتی حجت بالغہ صرف انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت ہے، جس سے دائمی عذاب وثواب اخروی وابستہ ہے"[1]

بعثت اللہ کی ذات وصفات واحکام کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے

"بعثت رحمت ہے اس لئے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات کی پہچان حاصل کرنے کا سبب ہے، جو تمام دینوی واخروی سعادتوں پر مشتمل ہے، بعثت کی اسی دولت سے اس بات کا علم وامتیاز ہوتا ہے کہ جناب باری تعالےٰ کے مناسب شان کیا ہے، اور نامناسب کیا ہے، اس لئے کہ ہماری بے بصیرت اور عاجز عقل جو امکان اور حدوث کے داغ اور نقص سے داغدار ہے، اس کو کیا معلوم کہ حضرت باری جو قدیم ہے کون سے اسماء صفات اور افعال اس کی شان کو مناسب ہیں، جن کا اطلاق کیا جائے اور کون سے نامناسب جن سے احتراز کیا جائے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے نقص کی وجہ سے ہماری عقل کمال کو نقص اور نقص کو کمال جانتی ہے، یہ امتیاز (جو نبوت پیدا کرتی ہے) خاکسار کے نزدیک تمام ظاہری وباطنی نعمتوں سے بڑھ کر ہے، بڑا بدبخت ہے جو نامناسب امور اور ناشائستہ اشیاء کی اس ذاتِ عالی سے نسبت کرے، بعثت ہی ہے، جس نے باطل کو حق سے جدا کیا اور اس میں جو عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور جو عبادت کا مستحق ہے، امتیاز پیدا کر دیا ہے، بعثت ہی کے ذریعہ یہ حضرات انبیاءؑ اللہ تعالےٰ کے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور بندگان خدا کو قرب الٰہی اور وصال مولیٰ کی سعادت سے مشرف کرتے ہیں، اور اسی بعثت کے ذریعہ مالک جلّ وعلا کے مرضیات کا علم حاصل ہوتا ہے، جیسے کہ اوپر بیان ہوا اور اس کی تمیز ہوتی ہے کہ اس کے

---

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ۔

ملک میں کس چیز میں تصرف جائز ہے، اور کس میں جائز نہیں، بعثت کے اس طرح کے فوائد بہت ہیں، پس ثابت ہوا کہ انبیاء کی بعثت رحمت ہے، جو شخص نفس امارہ کی خواہشات کا پیرو ہو کر شیطان لعین کے حکم سے بعثت کا انکار کرے، اور بعثت کے احکام و مقتضا پر عمل نہ کرے تو اس میں بعثت کا کیا گناہ ہے، اور بعثت کیوں رحمت نہ ہو[1]؟"

اللہ کی معرفت انبیاء ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے

"چونکہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے تواتر و تسلسل کی وجہ سے خدا کی طرف (جو زمین و آسمان کا خالق ہے جل شانہ) ان کی دعوت دینے کی شہرت ہوئی، اور ان حضرات کی بات اور پیغام بلند ہوا تو ہر زمانہ کے بے عقل جو صانع عالم کے ثبوت کے بارے میں تردد کرتے تھے، اپنی غلطی پر مطلع ہو کر بے اختیار صانع کے وجود کے قائل ہو گئے، اور اشیاء و مخلوقات کو اس کی طرف منسوب کیا، یہ روشنی حضرات انبیاء ہی کے انوار سے ماخوذ ہے، اور یہ دولت انبیاء ہی کے خوان نعمت سے ملی ہے، اللہ کا درود و سلام ہو ان پر قیامت بلکہ ابدالآباد تک۔

اسی طرح وہ تمام منقولات جو ہم تک انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے پہونچانے سے پہونچے ہیں، مثلاً ذات الٰہی کے صفات کمالیہ، انبیاء کی بعثت، ملائکہ کا معصوم ہونا، علیہم الصلوات والتسلیمات والبرکات، حشر و نشر، بہشت و دوزخ کا وجود اور جنت کی دائمی راحت و عیش اور جہنم کا دائمی عذاب، یہ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کی شریعت خبر دیتی ہے، عقل ان کو پا لینے سے قاصر ہے، اور ان حضرات (انبیاء) سے سنے بغیر ان کے ثابت کرنے میں ناقص اور تنہا ناکافی ہے[2]۔"

---

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ۔ [2] ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

صحیح ترتیب

"سب سے پہلے رسول پر ایمان لانے کی فکر کرنی چاہئے، اور اس کی رسالت کی تصدیق کرنی چاہئے، تاکہ تمام احکام میں اس کو سچا جانا جائے، اور اس کے ذریعہ سے شکوک وشبہات کی تاریکیوں سے نجات میسر ہو، جڑ کو پہلے معقول ومعلوم کرلینا چاہئے، تاکہ سب فروع اور شاخیں بے تکلف معقول ومعلوم ہو جائیں، ہر شاخ وہر فرع کو اصل کے ثابت کئے بغیر معقول بنانا بڑا مشکل ہے۔

اس تصدیق تک پہونچنے اور اطمینان قلب کے حاصل کرنے کا قریب ترین راستہ ذکر الٰہی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝" (یاد رکھو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے خوشحالی ہے، اور اچھا ٹھکانہ) غور و استدلال کے راستہ سے اس بلند مقصد تک پہونچنا دور ہے۔ بقول شاعر ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود"

(اہل استدلال کا پاؤں لکڑی کا ہے، اور لکڑی کا پاؤں بے قابو و بے ثبات ہوتا ہے[1])

انبیاء کی رسالت کی تصدیق کرنے والا اصحاب استدلال میں سے ہے

"معلوم ہونا چاہئے کہ انبیاء کرام کی تقلید کرنے والا ان کی نبوت کے ثابت کرنے

---

[1] مکتوب ۳۶/۳ بنام میر محمد نعمان رح۔

کے بعد اور ان کی رسالت کی تصدیق کے بعد اس کا شمار صاحب استدلال لوگوں میں ہے، اس کا ان حضرات کی باتوں کو بے دلیل ماننا اس وقت (ان کی نبوت کو استدلال کے ساتھ مان لینے کے بعد) عین استدلال ہے، مثلاً ایک شخص نے اصول کو استدلال سے ثابت کر لیا ہے، اس وقت جتنے فروع اس اصل سے پیدا ہوتے ہیں، وہ اسی (پہلے) استدلال کے ساتھ متعلق ہوں گے، اور وہ شخص اس اصل کے استدلال کے ساتھ ان تمام فروع کے اثبات میں صاحب استدلال ہوگا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰانَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی" (اس اللہ کا شکر ہے، جس نے ہم کو اس کی ہدایت دی اور ہم ہدایت پانے والے نہ تھے، اگر ہمیں ہدایت نہ دیتا بیشک ہمارے پروردگار کے پیغمبر حق کے ساتھ آئے اور سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی)[1]

انبیاء کی اطلاعات کو اپنی عقل کا پابند بنانا طریق نبوت کا انکار ہے

"حساب، میزان، صراط، حق ہے، اس لئے کہ سچے خبر دینے والے (علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات) نے اس کی خبر دی ہے، طریق نبوت کے بعض ناواقفوں کا ان کے وجود کو مستبعد سمجھنا درجۂ اعتبار سے ساقط ہے، اس لئے کہ نبوت کا طریق عقل کے طریق سے ماوراء ہے، انبیاء کی دی ہوئی سچی اطلاعات کو عقل کے طریق بحث و نظر سے موافق کرنا درحقیقت نبوت کے طریق کا انکار کرنا ہے (ان مسائل ماورائے عقل میں) دار و مدار انبیاء کی باتوں کے بے دلیل ماننے پر ہے"[2]

---

[1] مکتوب ۳۶/۳ بنام میر محمد نعمان۔ [2] مکتوب ۲۶۶/۱

مخالف عقل اور ماوراء عقل میں بڑا فرق ہے

"یہ نہ سمجھیں کہ نبوت کا طریق کچھ عقل کے طریق کے مخالف ہے بلکہ بات یہ ہے کہ عقل کا طریق (علم واستدلال) انبیاء کی تقلید کے بغیر اس مقصد عالی تک پہونچ نہیں سکتا' مخالفت دوسری چیز ہے، اور نارسائی دوسری چیز، اس لئے کہ مخالفت پہونچنے کے بعد متصور ہوسکتی ہے[1]"

خدا کی تعظیم کا طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیاء کی اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے،

"پس انبیاء کے وجود سے چارہ نہیں، تاکہ محسن حقیقی جل سلطانہ (جس کی ہستی عقل سے لازماً ثابت وضروری ہے) کے شکر کے طرف رہنمائی کریں اور ان احسانات کے کرنے والے کی علمی وعملی تعظیم کو اس کی طرف سے معلوم کر کے ظاہر کریں، اس لئے کہ اس کی تعظیم جو اس کے یہاں سے معلوم نہ کی جائے، اس کے شکر کے شایان شان نہیں، اس لئے کہ انسانی قوت اس کے ادراک کرنے سے عاجز ہے، بلکہ بسا اوقات انسان غیر تعظیم کو وہ تعظیم سمجھنے لگتا ہے، اور شکر سے ہجو کی طرف چلا جاتا ہے، اور اس سے اس کی تعظیم کا معلوم کرنا نبوت پر منحصر ہے، اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے، اولیاء کو جو الہام ہوتا ہے، وہ بھی انوار نبوت سے ماخوذ ہے، اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے اتباع و پیروی کے فیوض و برکات میں سے ہے[2]"

---

[1] مکتوب بنام پیرزادگان خواجہ عبداللہ خواجہ عبیداللہ فرزندان گرامی حضرت خواجہ باقی باللہ م ۲۶۶/۱

[2] مکتوب م ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے ماوراء ہے اسی طرح نبوت کا مرتبہ عقل سے ماوراء ہے

"اور جس طرح سے کہ عقل کا مرتبہ حواس کے مرتبہ سے ماوراء ہے کہ جس چیز کا حواس سے ادراک نہیں کیا جا سکتا عقل اس کا ادراک کرتی ہے، اسی طرح سے نبوت کا طریقہ عقل کے طریقہ اور مرتبہ سے ماوراء ہے، جس کا عقل سے ادراک نہیں کیا جا سکتا، وہ نبوت کے وسیلہ سے ادراک میں آتا ہے، جو شخص عقل کے طریقہ کے علاوہ حصول علم کے لئے کوئی اور طریقہ تسلیم نہیں کرتا، وہ فی الحقیقت طریقۂ نبوت کا منکر اور ہدایت کا مخالف ہے[1]۔"

مقامِ نبوت

یونان کے علوم، حکمت و فلسفہ میں (جو صدیوں تک انبیاء کی دعوت اور نورِ نبوت سے دور دور برگ و بار لاتے رہے ہیں) شب و روز مشغول رہنے اور اسی کو علم و دانش کا سِدرۃُ المنتہیٰ سمجھنے، دوسری طرف کتاب و سنت کی رہنمائی اور ان سے ضروری واقفیت اور حدیث و سیرت سے شغف کے بغیر جسمانی ریاضتوں، نفس کُشی اور چلّہ کشی میں ہمہ تن منہمک رہنے کی بنا پر پچھلی صدیوں میں (جن کا واضح طور پر آغاز آٹھویں صدی سے ہو جاتا ہے) مقامِ نبوت سے نہ صرف ایک ناآشنائی اور بے اُنسی بلکہ ایک طرح کی اجنبیت اور وحشت پیدا ہونے لگی تھی، اور چونکہ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور خود سیرت نبوی ان حکماء اور اشراقیین کے سامنے اس طرح آتی تھی کہ یہ نفوس قدسیہ عام انسانوں کی طرح زندگی گزارتے تھے، شادی بیاہ کرتے تھے، آل و اولاد رکھتے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بعض اوقات

---

[1] مکتوب ۲۳۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

انھون نے تجارت بھی کی، جانور بھی چرائے، جنگوں میں حصہ لیا، واقعات سے متأثر ہوتے تھے، خوشی کی بات پر خوش ہوتے تھے، اور رنج وقلق کی بات پر محزون ومغموم ہوتے تھے، نہ ان کے یہاں ایسی عبادات شاقہ تھیں، نہ صوم دائمی، نہ چلہ کشی، جن کا ذکر متوسط درجہ کے اولیاء و مرتاضین کے یہاں ملتا ہے، پھر دعوت وتبلیغ رسالت کے کام میں ان کو خلق خدا کی طرف توجہ کرنی پڑتی تھی، جس کے بغیر یہ فریضہ ادا نہیں ہوسکتا، اور ایک توجہ دوسری توجہ سے عام طور سے مانع ہوتی ہے، اس لئے اشراق وروحانیت کے ان حلقوں میں جہاں علومِ دینیہ بالخصوص حدیث سے اشتغال نہیں تھا، اور جہاں اولیاء متقدمین اور اشراقیین کے عروج روحانی، تجرید وتفرید کامل اور فنائیت وغیبوبت کے واقعات دن رات ورد زبان رہتے تھے، یہ خیال عام ہوتا جارہا تھا کہ ولایت کا مقام نبوت کے مقام سے افضل ہے، اور یہ کہ ولایت تمامتر توجہ الی الحق اور انقطاع عن الخلق کا نام ہے، اور نبوت کا موضوع دعوت ہے، جس کا تعلق خلائق سے ہے، ولی "روبحق" ہوتا ہے، اور نبی "روبخلق" اور "روبحق" ہونے کی حالت بہرحال "روبخلق" ہونے کی حالت سے اعلیٰ وافضل ہے، بعض لوگوں نے اس میں اتنی احتیاط برتی کہ انھوں نے یہ کہا کہ ولایت مطلقاً نبوت سے افضل نہیں، جنھوں نے ایسا کہا ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے، اور نبی جب مشغول بالخالق ہوتا ہے تو اس کی یہ حالت اس حالت سے افضل ہوتی ہے، جب وہ دعوت کے سلسلہ میں مشغول بالخلق ہوتا ہے، لیکن یہ طرز فکر اس پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ مقام ولایت کی عظمت اور اس کے کمالات وترقیات سے مرعوبیت مسلمانوں کے بھی ایک وسیع دینی حلقہ میں پیدا ہوتی جارہی تھی، جو امت کے اپنے اصل سرچشمہ، نبوت وشریعت کے ساتھ ربط پر اثر انداز ہورہی تھی، اور یہ ایک خطرہ تھا جس کا مقابلہ مجددین اسلام اور

نائبین انبیاء کو کرنا ضرور تھا۔

ہمارے علم میں اس سلسلہ میں سب سے پہلے پرزور مدلل اور وجد انگیز طریقہ پر آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں ہندوستان کے مشہور عارف و محقق صوفی حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (۶۶۱-۷۸۶ھ) نے آواز بلند کی اور اپنے مکتوبات میں اس کی پُرزور تردید کی،[1] انھوں نے یہاں تک لکھا کہ انبیاء کی ایک سانس اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے، انبیاء کا جسم خاکی اپنی صفائی و پاکیزگی اور قرب خداوندی میں اولیاء کرام کے دل اور ان کے سر اور راز و نیاز کے برابر ہے۔[2]

حضرت مخدوم بہاری کے بعد پھر حضرت مجدد الف ثانی ہی اس علم عظیم اور اس طریق قویم کے مجدد اور خاتم ہوئے، انھوں نے اپنے مکاتیب میں ثابت کیا کہ انبیاء کرام اعتقادی، روحانی، ذہنی اور خلقی طور پر اللہ تعالیٰ کی صنعت اور صفتِ جود کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، ان کو ایسا تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے جس میں کوئی توجہ اور مصروفیت حاجب نہیں ہوتی، اور یہ اس شرح صدر کا نتیجہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ ان کو خاص کرتا ہے، ان کی عالی ظرفی، قوت تحمل، وسعت صدر اور ان کے پیغام اور کام کا (جو ان کے سپرد کیا جاتا ہے) تقاضا "صحو دائم" ہر وقت کی بیداری، حاضر دماغی اور ہوش ہے، جو اہلِ ولایت و اہل سُکر کو حاصل نہیں، ان کی جہاں سے ابتدا ہوتی ہے، وہ اولیاء کی انتہا ہے، نبوت کی پیروی میں قرب بالفرائض حاصل ہوتا ہے جس کو قرب بالنوافل کبھی نہیں پہونچ سکتا، کمالاتِ ولایت کمالات نبوت کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتے ہیں جو قطرہ کو سمندر کے ساتھ ہے، اب قارئین مجدد صاحب کی زبانِ قلم سے ان حقائق اور علوم عالیہ کو سنیں: !

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم باب دہم ص ۲۹۸-۳۰۲ [2] ایضاً ص ۳۰۲

انبیاء بہترین موجودات ہیں، اور بہترین دولت ان کے سپرد کی گئی ہے

"انبیاء تمام موجودات میں بہترین ہیں، اور بہترین دولت ان کے حوالہ کی گئی ہے، ولایت جزءِ نبوت ہے، نبوت کُل ہے، لامحالہ نبوت ولایت سے افضل ہوگئی، خواہ نبی کی ولایت ہو خواہ ولی کی، پس صحو بھی سُکر سے افضل ہے، اس لئے کہ صحو میں سُکر مندرج ہے، جیسے کہ ولایت نبوت میں مندرج ہے، باقی تنہا ہوش و بیداری جو عوام الناس کو رہتی ہے خارج از بحث ہے، اس عامیانہ صحو پر ترجیح دینا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، وہ صحو جو سُکر پر مشتمل ہے، وہ ضرور سُکر سے افضل ہے، علوم شریعت جن کا آخذ و سرچشمہ مرتبہ نبوت ہے، سراسر صحو ہے، ان علوم کے مخالف جو کچھ ہوگا وہ سُکر ہے، صاحب سُکر معذور ہے، تقلید کے لائق علوم صحو ہیں نہ کہ علوم سُکر۔"[1]

انشراحِ صدر کی وجہ سے انبیاء کی توجہِ خلق توجہِ حق سے مانع نہیں ہوتی

"بعض مشائخ نے سُکر و مستی کے وقت فرمایا ہے کہ ولایت نبوت سے افضل ہے، اور بعض دوسرے صاحبوں نے فرمایا کہ اس ولایت سے نبی کی ولایت مراد ہے، تاکہ ولی کی نبی پر افضلیت کا وہم دور ہو جائے، لیکن فی الحقیقت معاملہ اس کے برعکس ہے، اس لئے کہ نبی کی نبوت اس کی ولایت سے افضل ہے، ولایت میں سینہ کی تنگی کی وجہ سے خلق کی طرف پوری توجہ نہیں ہو سکتی، اور نبوت میں سینہ کی انتہائی فراخی اور کشائش کی وجہ سے نہ توجہ حق توجہ خلق سے مانع ہوتی ہے، اور نہ توجہ خلق توجہ حق میں حائل ہوتی ہے، نبوت میں تنہا خلق کی

---

[1] مکتوب ۹۵/۱ سید احمد بجواڑہ۔

طرف توجہ نہیں ہوتی کہ ولایت کو (جس کا رخ اور توجہ حق کی طرف ہوتی ہے) ترجیح دی جائے عیاذاً باللہ سبحانہ، تمامتر توجہ خلق عوام کالانعام کا مرتبہ ہے، نبوت کی شان اس سے بلند و برتر ہے، اس حقیقت کا سمجھنا ارباب سُکر کے لئے دشوار ہے، یہ معرفت صاحبِ استقامت اہلِ ہوش کا حصہ ہے۔ ع

ھنیئاً لأرباب النعیم نعیمھا[1]"

نبی کا باطن حق کے ساتھ ہوتا ہے اور ظاہر خلق کے ساتھ

"بعض اہل سُکر علم ولایت کو جو سُکر کی طرف رخ رکھتا ہے، علم نبوت پر جو صحو کا رنگ رکھتا ہے، ترجیح دیتے ہیں، اسی عالم سکر کا یہ مقولہ بھی ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ" (ولایت نبوت سے افضل ہے) اس بنا پر کہ ولایت میں توجہ حق تعالےٰ کی طرف ہوتی ہے، اور نبوت میں خلق کی طرف، اور اس میں شبہ نہیں کہ "رو بحق" "رو بخلق" سے افضل ہے، اور بعض اس کی توجیہ میں کہتے ہیں کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے۔

خاکسار کے نزدیک اسی طرح کی باتیں دور از کار ہیں، اس لئے کہ نبوت میں خلق ہی کی طرف توجہ نہیں ہوتی، بلکہ اس توجہ کے ساتھ حق کی طرف بھی رخ ہوتا ہے، صاحب مقامِ نبوت کا باطن حق کے ساتھ ہوتا ہے، اور ظاہر خلق کے ساتھ جو تمام تر خلق کی طرف متوجہ ہو وہ مدبّروں اور برگشتہ لوگوں میں سے ہے[2]"

"اولیاء کی ابتداء انبیاء کی انتہا ہے" کے مقولہ کی تردید

"کسی کا یہ مقولہ بالکل بے معنیٰ بات ہے کہ اولیاء کی ابتداء انبیاء کی انتہا ہے، اور

---

[1] مکتوب ۱۰۸/۱ میاں سید احمد بجواڑی [2] مکتوب ۹۵/۱ سید احمد بجواڑہ

اولیاء کی ابتداء اور انبیاء کی انتہا سے مراد ان کے نزدیک شریعت ہے، ہاں اس غریب کو چونکہ حقیقت حال سے آگاہی نہیں اس لئے یہ خلاف ظاہر بات زبان سے نکالی، ان حقائق کو اگرچہ کسی نے بیان نہیں کیا، بلکہ اکثر لوگوں نے اس کے بالکل برعکس اظہار خیال کیا ہے، اور یہ بعید از فہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن وہ منصف جو انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بزرگی کا پہلو دیکھتا ہے، اور شریعت کی عظمت اس پر مستولی ہے وہ ان دقیق اسرار کو قبول کرسکتا ہے، اور اس کو قبول کرنے کو زیادتیٔ ایمان کا وسیلہ بنا سکتا ہے[1]"

انبیاء نے دعوت کو عالم خلق پر منحصر کیا ہے اور صرف قلب سے بحث کی ہے

"اے فرزند سنو! کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات نے دعوت کو عالم خلق پر منحصر رکھا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں (شہادت توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ حج) پر ہے، اور چونکہ قلب کو عالم خلق سے زیادہ مناسبت ہے، اس لئے قلب کی تصدیق کی بھی دعوت دی، اور قلب کے ماوراء کو نہیں چھیڑا اور اس سے بحث نہیں کی، اور اس کو مقاصد میں شمار نہیں کیا، دیکھو بہشت کے عیش، دوزخ کی تکلیفیں، دولت دیدار اور محرومی کی بے دولتی یہ سب عالم خلق سے وابستہ ہیں، عالم امر کو ان سے تعلق نہیں[2]"

نبوت کی پیروی میں قرب بالفرائض حاصل ہوتا ہے

"اسی طرح فرض، واجب اور سنت کے اعمال کی ادائیگی کا تعلق قالب سے ہے، جو عالم خلق سے ہے، جو عالم امر کا حصہ ہے وہ اعمال نافلہ میں سے ہے، جو قرب ان اعمال کی

---

[1] مکتوب ۲۶۰/۱ بمخدوم زادہ میاں شیخ محمد صادق [2] ایضاً

ادائیگی کا ثمرہ ہے، وہ اعمال کے مطابق ہوتا ہے، پس لامحالہ جو قرب اداء فرائض کا ثمرہ ہے، وہ عالم خلق کا حصہ ہے، اور جو قرب ادائے نوافل کا ثمرہ ہے وہ عالم امر کا حصہ ہے، اور اس میں شک نہیں کہ نفل کا فرض کے مقابلہ میں کوئی شمار و حساب نہیں، اس کو وہ نسبت بھی تو نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے، بلکہ نفل کو سنت کے مقابلہ میں بھی یہی نسبت ہے اگرچہ سنت و فرض کے درمیان بھی قطرہ و دریا کی نسبت ہے، اس بات سے دونوں قرب کا باہمی تفاوت میں قیاس کیا جا سکتا ہے، اور عالم خلق کی فضیلت و خصوصیت عالم امر پر اس فرق سے سمجھی جا سکتی ہے"[1]

کمالات ولایت کمالات نبوت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے

"اس فقیر پر اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ کمالات ولایت کا کمالات نبوت کے مقابلہ میں کوئی شمار نہیں، وہ نسبت بھی تو نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے پس جو فضیلت و خصوصیت نبوت کی راہ سے حاصل ہوتی ہے، وہ اس فضیلت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، جو ولایت کی راہ سے حاصل ہوتی ہے، پس افضلیت مطلق انبیاء ہی کو حاصل ہے (علیہم الصلوات والتسلیمات) ملائکہ کرام کو جزئی فضیلت حاصل ہے، اس لئے جمہور علماء ہی کا قول درست ہے۔

اس تحقیق سے ظاہر ہوا کہ کوئی ولی نبی کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتا (علیہم الصلوات والتسلیمات) بلکہ اس ولی کا سر اس نبی کے قدم کے نیچے ہوگا"[2]

علماء کے علوم و تحقیقات کی صحت و فوقیت کی وجہ

"جس مسئلہ میں علماء اور صوفیاء کے درمیان اختلاف ہے، اگر تم غور سے دیکھو گے تو

---

[1] مکتوب نمبر ۲۶۰/۱ بمخدوم زادہ میاں شیخ محمد صادق [2] مکتوب نمبر ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و عبید اللہ۔

حق علماء کی جانب نظر آئے گا، اس کا راز یہ ہے کہ انبیاء کی پیروی کی وجہ سے علماء کی نظر کمالات نبوت اور ان کے علوم تک نفوذ کر جاتی ہے، اور صوفیہ کی نظر کمالاتِ ولایت اور ان کے علوم و معارف پر مقصور رہتی ہے، بس لامحالہ جو علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوگا، وہ زیادہ صحیح اور حق ہوگا بمقابلہ اس کے جو مرتبۂ ولایت سے ماخوذ ہوگا۔"[1]

"فقیر نے اپنی کتابوں اور خطوط میں لکھا ہے، اور تحقیق کی ہے کہ کمالات نبوت سمندر کا حکم رکھتے ہیں، اور کمالات ولایت ان کے مقابلہ میں ایک حقیر قطرہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے، ایک جماعت نے کمالات نبوت تک نہ پہونچنے کی وجہ سے کہا ہے "الولایۃ افضل من النبوۃ" (ولایت نبوت سے افضل ہے) ایک دوسرے گروہ نے اس کی تاویل اس طرح کی ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے، ان دونوں گروہوں نے حقیقت نبوت کو نہ جاننے کی وجہ سے غائب پر حکم لگایا ہے، اسی حکم کے قریب سُکر کو صحو پر ترجیح دینا بھی ہے، اگر صحو کی حقیقت ان کو معلوم ہوتی تو ہرگز سُکر کو صحو سے کچھ نسبت بھی نہ دیتے۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

شاید انھوں نے خواص کے صحو کو عوام کی ہوشیاری و بیداری کے مثل سمجھ کر سُکر کو اس پر ترجیح دی ہے تو خواص کے سُکر کو عوام کے نشہ و مستی کا مماثل قرار دے کر یہی حکم لگاتے

حقلاء کے نزدیک ثابت ہے کہ صحو سکر سے بہتر ہے، اگر صحو و سُکر مجازی ہے، تو بھی یہی حکم ہے، اور اگر حقیقی ہے تو بھی یہی حکم ثابت ہے۔"[2]

انبیاء کی عظمت نبوت کی وجہ سے ہے

"اتنا ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات نے جو کچھ عظمت و بزرگی

---

[1] ایضاً

[2] مکتوب ۲۶۸/۱ بنام خانخاناں

پائی ہے، وہ نبوت کی راہ سے پائی ہے نہ کہ ولایت کی راہ سے، ولایت کی حیثیت نبوت کے لئے ایک خادم سے زیادہ نہیں، اگر ولایت کو نبوت پر ترجیح ہوتی تو ملاءِ اعلیٰ کے ملائکہ جن کی ولایت تمام ولایات سے زیادہ کامل ہے، انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات سے افضل ہوتے، اس جماعت کے ایک گروہ نے چونکہ ولایت کو نبوت سے افضل مانا اس لئے ملاءِ اعلیٰ کی ولایت کو انبیاء کی ولایت سے اکمل سمجھا اور لامحالہ ملائکہ ملاءِ اعلیٰ کو انبیاء علیہم الصلوات التسلیمات سے افضل گردانا، اور جمہور اہل سنت سے علیٰحدہ ہو گئے، یہ سب حقیقت نبوت سے بے خبری ولاعلمی کا نتیجہ ہے، چونکہ عہد نبوت کے بُعد کی وجہ سے لوگوں کی نگاہ میں کمالاتِ نبوت کمالاتِ ولایت کے مقابلہ میں حقیر نظر آتے ہیں، اس لئے اس مضمون کو میں نے اس باب میں تفصیل و وضاحت سے لکھا، اور حقیقت حال کا ایک شمہ بیان کیا، "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ"

ایمان بالغیب انبیاء ان کے اصحاب اور علماء و عام مومنین کا حصہ ہے

"حمد و صلوٰۃ کے بعد سیادت پناہ اخوی واعزی میر محب اللہ کو معلوم ہو کہ وجود واجب تعالیٰ اور اس کی تمام صفات پر ایمان بالغیب انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات اور ان کے اصحاب کا حصہ ہے، اور ان اولیاء کا جو بتمام و کمال (خلق کو خالق جل وعلا کی طرف دعوت دینے کے لئے) بازگشت فرماتے ہیں، اور ان کی نسبت بھی (پیغمبروں کے) اصحاب کی نسبت ہوتی ہے، اگرچہ وہ کمتر بلکہ اقل قلیل ہیں، اور یہ ایمان بالغیب علماء اور عام مومنین کا بھی حصہ ہے، اور ایمان شہودی عام صوفیاء کا حصہ ہے، ارباب عزلت (خلقِ خدا سے یکسو)

لہ مکتوب ۲۶۸/۱ بنام خانخاناں۔

ہوں، یا ارباب عشرت (اصحاب اختلاط) ہوں، اس لئے کہ ارباب عشرت اگرچہ مرجوع (بازگشت کرنے والے) ہیں لیکن بتمام وکمال ان کا بازگشت نہیں ہوتا، ان کا باطن اسی طرح اوپر کی طرف نگراں رہتا ہے، وہ بظاہر خلق کے ساتھ ہوتے ہیں، اور بباطن حق جل شانہ کے ساتھ، اس لئے ہر وقت ایمان شہودی ان کے حصہ میں ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات چونکہ بتمام وکمال بازگشت فرما چکے ہوتے ہیں، اور ظاہر و باطن سے خلق کو حق جل وعلا کی طرف دعوت دینے میں متوجہ ہوتے ہیں، اس لئے ایمان غیب ان ہی کا حصہ ہوتا ہے[1]۔"

انبیاء کی بازگشت کامل نہایۃ النہایۃ تک پہونچ جانے کی علامت ہے

"اس فقیر نے اپنے بعض خطوط میں ثابت کیا ہے کہ بازگشت کے باوجود بلندی کی طرف آنکھوں کا لگا رہنا نقص کی علامت ہے، اور انجام کار تک نہ پہونچنے کا ثبوت ہے، اور بتمام وکمال بازگشت نہایۃ النہایۃ (انتہا کی انتہا) تک پہونچ جانے کی علامت ہے، صوفیاء نے دونوں توجہات (توجہ بخلق وتوجہ بحق) کی جامعیت کو کمال سمجھا ہے، اور تشبیہ و تنزیہ کے جامع کو کاملین میں شمار کیا ہے۔ ع

آں ایشانند و من چنینم یا رب[2]"

شریعت کی حمایت و نصرت اصلاح عقائد اور ردِّ شرک و رسوم جاہلیت

تعلق مع اللہ کی تقویت واستواری، غفلت ومادیت سے حفاظت اور امراض نفسانی کے علاج کا وہ طریقہ جس کا نام مرور زمانہ اور بعض اسباب ومحرکات کی بنا پر بعد میں تصوف

---

[1] مکتوب ۲۷۲/۱ بنام میر سید محب اللہ مانکپوری۔ [2] ایضاً

پڑگیا، حقیقت میں قرآنی اصطلاح کے مطابق "تزکیہ" اور حدیث صحیح کی تعبیر کے مطابق "احسان" ہی کا وہ دینی شعبہ تھا، جس کو قرآن مجید میں بعثت محمدیؐ کے مقاصد چہارگانہ میں شمار کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

(الجمعہ ۔ ۲)

وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں، اور ان کو (عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ) سے پاک کرتے ہیں، ان کو کتاب اور دانشمندی (کی باتیں) سکھلاتے ہیں، اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

امت کی یہ خدمت اور دین کو اس کے قالب و قلب، جسم و روح اور ضابطہ و رابطہ کے ساتھ قائم رکھنے کا کام خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین اور نائبین برحق کے ذمہ تھا، اور وہ شریعت محمدی کے ساتھ اس "طب نبوی" کی بھی حفاظت و تجدید کرتے رہے، اور فقہ ظاہر کے ساتھ فقہ باطن کی بھی اشاعت و تبلیغ میں سرگرم رہے، ان کا یہ کام تفصیل کے بجائے اجمال، اور فروع سے زیادہ اصول پر مبنی تھا، لیکن قلمرو خلافت اور فتوحات اسلامی کی توسیع، وسیع پیمانہ پر اشاعت اسلام، دولت اور وسائل عیش و عشرت کی فراوانی، زمانۂ نبوت سے بُعد اور بمصداق "فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ" جب شیطان کے مکائد، مادیت کے فتنے اور امراض نفسانی و روحانی نئی نئی شکلوں میں اور نئے نئے فلسفوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے تو تزکیہ و احسان کا فن بھی "تصوف" کی حادث اصطلاح کے ساتھ اسی طرح ایک مدون فن بن گیا، جس طرح عجمی قوموں کے اختلاط نے قواعد زبان (صرف و نحو) اور فن معانی و بیان کو (جن کے اصول و مبادی عربی اللسان قوموں کی فطرت میں داخل تھے) نحو و بلاغت کے وسیع و دقیق فن کی شکل میں منتقل کر دیا اور اس کے ماہرین خصوصی پیدا ہونے شروع ہو گئے، جنھوں نے مستقل "مدارس" و "جامعات" قائم کئے اور ان کے لئے مستقل نصاب

وضع کئے، اوران کی طرف ان علوم کے طالبین اوران مقاصد کے شائقین کا رجوع عام شروع ہوا۔

ابتدائی صدیوں میں اس طریقۂ علاج (تزکیہ یا تصوف) کا مدارِ کار کتاب وسنت، اسوۂ رسولؐ کی پیروی اور شمائل واخلاق نبوی کے تتبع پر تھا لیکن زمانہ کے اثرات عجمی اور نومسلم قوموں کے اختلاط، عجمی زہاد ونساک کی صحبت وعقیدت کے نتیجہ میں تصوف میں بدعات، زہد وعبادت میں غلو، تجرد ورہبانیت کے جراثیم، اشخاص ومعتقدفیہ لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی تعظیم وتقدیس کی رسم اور بہت سے خود ساختہ اعمال ورسوم داخل ہونے شروع ہوگئے، یہاں تک کہ یہ غیر اسلامی اور سرتاسر اجنبی وبیرونی اعتقاد بھی بعض روحانی حلقوں اور سلسلوں میں دبے پاؤں چلا آیا کہ "اخلاص وانہماک اور پوری دقیقہ رسی کے ساتھ ایک عرصہ تک عبادت میں مشغول رہنے اور فرائض وسنن کی پابندی کرنے اور عرفان کامل حاصل ہونے کے بعد ایک منزل ایسی آتی ہے، جب سالک ان فرائض شرعی اور عبادات راتبہ کا مکلف نہیں رہتا اور وہ ان کی پابندی سے مستثنیٰ ہوجاتا ہے" اسی کا نام "سقوط تکلیف" ہے اور اس اعتقاد کے لوگ قرآن مجید کی مشہور آیت "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ"[1] (اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے) سے استدلال کرتے ہیں، یہ ایک عظیم فتنہ تھا، جو پورے نظام شریعت کو معطل اور سالک کو بے قید اور عبادات کی پابندیوں سے آزاد کردیتا تھا۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی کی ابتدا سے جب عباسی خلافت اپنے اوجِ شباب پر اور عظیم اسلامی شہر اپنے تمدن وترقی کے نقطۂ عروج پر تھے، بدعات وتحریفات کا یہ سلسلہ

---

[1] یہاں یقین سے باتفاق مفسرین واہل لغت موت مراد ہے۔ (الحجر - ۹۹)

واضح طریقہ پر شروع ہوگیا تھا، تصوف کی سب سے قدیم کتاب جو اس وقت تک زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے، شیخ ابوالنصر سراج (م ۳۷۸ھ) کی "کتاب اللمع" ہے، اس کا ایک حصہ "کتاب الاسوۃ والاقتداء برسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" سے موسوم ہے[1]، اس کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ[2] (م ۴۶۵ھ) کی کتاب "کشف المحجوب" میں غالباً اسی بنا پر "اقامت حقیقت بے حفظ شریعت محال..... وحقیقت بے شریعت نفاق" کے آگاہی دینے والے الفاظ آئے ہیں، امام ابوالقاسم قشیری متوفی ۴۶۵ھ کا "رسالہ قشیریہ" تصوف کا سب سے قدیم ہدایت نامہ اور دستور العمل تھا، ان کے زمانہ ہی میں تصوف میں اتنا تنزل ہوگیا تھا کہ وہ "رسالہ قشیریہ" میں لکھتے ہیں :-

وارتحل عن القلوب حرمة الشريعة	دلوں سے شریعت کی حرمت رخصت ہوگئی
فعدُّوا قلة المبالاة بالدين اوثق	انھوں نے دین سے لاپرواہی کو ایک بڑا قابل
ذريعة .....واستخفّوا بأداء	اعتماد ذریعہ سمجھ لیا، عبادات کے ادا کرنے کو
العبادات، واستهانوا بالصوم والصلوة[3]	کوئی اہمیت نہیں دی اور صوم وصلوٰۃ کو
	معمولی چیز سمجھا۔

ان کی کتاب کے باب اول کا عنوان ہی تعظیم شریعت سے متعلق ہے، اور اس میں انھوں نے قدیم صوفیاء اور مشائخ کی تعظیم شریعت اور اتباع سنت کے حالات لکھے ہیں، آخری باب (۵۴) میں جو "باب وصیۃ المریدین" کے عنوان سے ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ :-

بناء هذا الامر وملاكه على حفظ آداب	اس معاملہ کی بنیاد اور دار و مدار آداب شریعت
الشريعة۔	کی حفاظت پر ہے۔

---

[1] "کتاب اللمع" ص ۹۳-۱۰۴ مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ء [2] پورا نام ابوالحسن علی بن عثمان بن ابی علی الجلّابی ہے، عام طور پر داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں، لاہور میں مزار ہے۔ [3] رسالہ قشیریہ ص ۱ مطبوعہ مصر۔

پوری کتاب حقائق شرعیہ وعلوم صحیحہ کے مطابق ہے، اور محققین صوفیاء نے اس کو ایک مستند درسی کتاب کی سی اہمیت دی ہے۔

مشائخ طریقت وائمۂ حقیقت میں شریعت کے سب سے بڑے حامی وناصر سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہوئے ہیں، ان کی تعلیمات میں سب سے زیادہ زور پابندی سنت واتباعِ شریعت پر تھا، اور ان کی پوری زندگی اسی کا جلوہ اور نمود تھی "غُنیۃ الطالبین" لکھ کر انھوں نے طریقت کا پلو شریعت کے دامن سے باندھ دیا ہے، ان کے مواعظ "فتوح الغیب" کا مقالۂ دوم اتباع سنت وترک بدعت ہی سے مخصوص ہے، اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

اتبعوا ولا تبتدعوا — پیروی سنت کرتے رہو اور راہ بدعت نہ اختیار کرو!

طریقت کو شریعت کا خادم وتابع بنانے کے کام میں ان کو مجدد کا درجہ حاصل ہے، وہ پہلے فرائض پھر سنن پھر نوافل سے مشغول ہونے کی ہدایت فرماتے ہیں، اور اول کو چھوڑ کر دوسرے سے مشغول ہونے کو حمق ورعونت بتاتے ہیں۔

تصوف کی مقبول ترین ومستند ترین کتاب شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) کی "عوارف المعارف" ہے، جس کو محققین صوفیاء نے ہر دور میں حرز جان بنا کر رکھا، اور بہت سی خانقاہوں میں اس کا درس ہوتا تھا، اس کتاب کی جلد ثانی ارکان شریعت کے آداب واسرار کے بیان میں ہے، شیخ نے کتاب میں نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "تصوف نام ہے قولاً فعلاً حالاً ہر حیثیت سے اتباع رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا، اور اسی پر مداومت رکھنے سے اہل تصوف کے نفوس مقدس ہو جاتے ہیں، حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور ہر شئی میں اتباع رسول ہونے لگتا ہے[1]"۔

نویں صدی ہجری میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے تلامذہ کے برقی اثر سے جو

---

[1] تفصیل اور مزید مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو "تصوف اسلام" از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم۔

عالم اسلام میں ایک تیز لہر کی طرح پھیل رہا تھا، تصوف ایک فلسفہ بن گیا، جس میں یونانی فلسفۂ الٰہیات کی بہت سی اصطلاحیں اور مسائل شامل ہوگئے، وحدۃ الوجود اہل تصوف کا شعار اور سرمایۂ افتخار بن گیا، اور خانقاہوں سے لے کر مدرسوں تک اسی کا دم بھرا جانے لگا، کتاب و سنت سے عدم اشتغال، اور فن حدیث سے ناواقفیت، اور اس کی صحیح اور اس کی مستند کتابوں سے محرومی کی بنا پر، خانقاہیں، ایسے عقائد و اعمال کی آماجگاہ بن گئیں، جن کی سند دین کے اصلی ماخذوں سے ملنا مشکل اور جن سے قرون اولیٰ کے مسلمان یکسر ناآشنا تھے۔

ادھر ہندوستان میں جو ہزاروں برس سے جوگ اور سنیاس کا مرکز تھا، مسلمان صوفیوں کا واسطہ ان مرتاض جوگیوں سے پڑا جنھوں نے اپنے خیال اور نفس کی قوت حبس دم اور آسنوں کے ذریعہ بہت بڑھالی تھی، بعض مسلمان صوفیوں نے ان سے یہ علم حاصل کیا، دوسری طرف (گجرات کو مستثنیٰ کرکے جہاں علمائے عرب کی تشریف آوری اور حرمین شریفین کی آمد و رفت کی وجہ سے حدیث کی اشاعت ہو چکی تھی، اور علامہ علی متقی برہان پوری اور ان کے نامور شاگرد علامہ محمد طاہر پٹنی پیدا ہوئے تھے) یہ ملک صحاح ستہ اور ان مصنفین کی کتابوں سے ناآشنا تھا، جنھوں نے نقد حدیث اور ردّ بدعت کا کام کیا، اور سنت صحیحہ اور احادیث ثابتہ کی روشنی میں زندگی کا نظام العمل پیش کیا، ہندوستان کے ان مقامی روحانی فلسفوں اور تجربوں کا اثر اپنے زمانہ کے مشہور و مقبول شطاری شیخ محمد غوث گوالیاری کی مقبول کتاب "جواہر خمسہ" میں دیکھا جا سکتا ہے، جس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل و سیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا، اس میں نماز احزاب، صلوٰۃ العاشقین، نماز تنویر القبر اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں، جن کا حدیث و سنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے "جواہر دوم" میں

اسماء اکبریہ خاص شیخ کے جمع کئے ہوئے ہیں، جن میں فرشتوں کے عبرانی و سریانی نام ہیں، اور حرف ندا سے ان کو خطاب کیا گیا ہے، جس سے استعانت بغیر اللہ کا شبہ ہوتا ہے، ایک دعائے بشیخ بھی آتی ہے، جس میں عبرانی و سریانی اسماء حرف ندا کے ساتھ ہیں، ساری کتاب کی بنیاد دعوت اسماء پر ہے، ان اسماء کے موکّل مانے گئے ہیں، جو اس کی اصل ماہیت سے واقف ہیں، حروف تہجی اور ان کے مؤکّلوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اور "نادعلیا مظہر العجائب" کی دعا بھی ہے۔

سنت و بدعت، شریعت و فلسفہ اور تصوف (اسلامی) اور جوگ کے اس اختلاط کے زمانہ میں حضرت مجدد الف ثانی کا تجدیدی کام شروع ہوا، اس صورت حال کی تصویر کھینچتے ہوئے، وہ خود اپنے مخدوم زادہ خواجہ محمد عبداللہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

دریں وقت عالم بواسطہ کثرت ظہور بدعت در رنگ دریائے ظلمات بنظری درآید و نور سنت باغربت و ندرت در آں دریائے ظلمانی در رنگ کرمکہائے شب افروز محسوس می گردد۔[1]

اس وقت عالم میں بدعات کا اس کثرت سے ظہور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ظلمات کا دریا امنڈ رہا ہے، اور سنت کا نور اس مواج دریا میں اس کے مقابلہ میں اس طرح ٹمٹما رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کے اندھیرے میں کہیں کہیں جگنو اپنی چمک دکھا رہے ہیں۔

حضرت مجدد نے اس نازک دور میں کہ ہندوستان میں مسلمان سلطنت کے ہاتھوں اسلام کی بیخ کنی اور خانقاہوں میں سنت کی ناقدری کی جا رہی تھی، اور صاف صاف کہا جا رہا تھا کہ "طریقت و شریعت دو الگ الگ کوچے ہیں، جن کی راہ و رسم ایک دوسرے سے جدا اور

---

[1] مکتوب ۲۳/۲ بنام مخدوم زادۂ خواجہ محمد عبداللہ۔

جن کا قانون ایک دوسرے سے الگ ہے" اور جہاں کسی صاحبِ علم طالب حق کو جو کبھی کسی امر کا شرعی ثبوت پوچھنے کی جرأت کر دیتا تھا، یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا تھا ؎

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا

پوری بلند آہنگی سے آواز لگائی کہ "طریقت تابع و خادم شریعت ہے، کمالات شریعت احوال و مشاہدات پر مقدم ہیں، ایک حکم شرعی پر عمل ہزار سالہ ریاضت سے زیادہ نافع ہے، اتباعِ سنت میں خواب نیمروز (قیلولہ) احیائے لیل (شب بیداری) سے افضل ہے، حلت و حرمت میں صوفیاء کا عمل سند نہیں، کتاب و سنت اور کتب فقہ کی دلیل چاہیئے، اہل ضلالت کی ریاضتیں موجب قرب نہیں باعث بُعد ہیں، صور و اشکال غیبی داخل لہو و لعب ہیں، تکلیف شرعی کبھی ساقط نہیں ہوتی"۔

اب اس کے بعد مکتوبات کے وہ اقتباسات پڑھیئے جو انھیں حقائق پر مشتمل ہیں :-

"شریعت تمام دنیوی و اخروی سعادتوں کی ضامن ہے، کوئی مطلوب ایسا نہیں کہ اس کی تکمیل کے لئے شریعت کے علاوہ کسی اور چیز کی احتیاج واقع ہو، طریقت و حقیقت جو صوفیاء کا مابہ الامتیاز ہے، دونوں شریعت کے خادم اور اخلاص کے حصول میں معاون ہیں، اس طرح طریقت و حقیقت کے حصول کا مقصد محض شریعت کو اس کی اصل روح کے ساتھ عمل میں لانے کا ذریعہ ہے، نہ کہ کوئی اور بات جو شریعت کے دائرہ سے خارج ہو، وہ حالات، وجد کی کیفیات اور علوم و معارف جو صوفیاء کو سلوک کے درمیان حاصل ہوتے ہیں، مقاصد میں داخل نہیں، وہ کچھ اشکال و خیالات ہیں، جن کے ذریعہ اطفال طریقت کے دل بہلائے اور ان کی ہمت بڑھائی جاتی ہے، ان سب سے گزر کر مقام رضا پر پہونچنا چاہیئے جو مقامات و

سلوک وجذبہ کی انتہا ہے[1]"

اسی مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"کوتاہ اندیش، احوال ومواجید کو مقاصد اور مشاہدات وتجلیات کو مطالب میں شمار کرتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہم وخیال کے زندان میں گرفتار ہیں، اور کمالات شریعت سے محروم۔

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ — مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ ان کو

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ — بلا رہے ہیں، اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص

اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ[2]" — (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دیدیتا ہے

ایک دوسرے مکتوب میں نوافل پر فرائض کی تقدیم وترجیح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"جن اعمال سے تقرب خداوندی حاصل کیا جاتا ہے، وہ یا تو فرائض ہیں یا نوافل، نوافل کی فرائض کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں، اپنے وقت پر کسی فرض کی ادائیگی ایک ہزار سال کے نوافل سے بہتر ہے، اگرچہ وہ نیت خالص سے ادا کئے جائیں[3]"

ایک دوسرے مکتوب میں کہ نفس کی اصلاح اور اس کے امراض کے ازالہ میں بھی احکام شریعت پر عمل ہزاروں ریاضتوں اور مجاہدوں سے کہیں زیادہ مفید ہے، فرماتے ہیں:۔

"احکام شرعیہ میں سے کسی حکم پر عمل ہوائے نفسانی کے ازالہ میں ایک ہزار سال کی ان ریاضتوں اور مجاہدوں سے زیادہ اثر کرتا ہے جو اپنی طرف سے کئے جائیں، بلکہ یہ ریاضات ومجاہدات جو شریعت غراء کے تقاضے سے واقع نہ ہوں نفسانی خواہشات وامراض کو اور زیادہ قوت پہونچانے والے ہیں، برہمنوں اور جوگیوں نے ریاضت ومجاہدہ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن وہ ان کے لئے کچھ مفید نہ ہوئے، اور سوائے نفس کو اور موٹا کرنے اور اس کو

---

[1] مکتوب ۳۶/۱ بنام ملا حاجی محمد لاہوری [2] ایضاً [3] مکتوب ۲۹/۱ بنام شیخ نظام تھانیسری۔

غذا پہونچانے کے کچھ اور کام نہ آئے"۔

ایک دوسرے مکتوب میں کمالات شریعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"دنیا کے اکثر لوگ خواب وخیال میں مست اور بادام واخروٹ پر اکتفا کئے ہوئے ہیں، ان کو کمالات شریعت کی کیا خبر اور طریقت وحقیقت کی اصل حقیقت کا کیا علم؟ شریعت کو وہ پوست (چھلکا) اور حقیقت کو مغز (گودا) سمجھتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ حقیقت حال کیا ہے، صوفیاء کی سطحی باتوں پر فریب کھائے ہوئے، اور ان کے احوال ومقامات پر فریفتہ ہیں"[1]۔

ایک مکتوب میں ایک سنت نبوی پر عمل کرنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"فضیلت تمام تر سنت سنیہ کی پیروی سے وابستہ اور امتیاز دواعز از شریعت پر عمل کرنے سے مربوط ہے، مثلاً دوپہر کا سونا جو اتباع سنت کی نیت سے واقع ہو کروڑوں شب بیداریوں سے افضل اور زکوٰۃ کا ایک پیسہ ادا کرنا سونے کے پہاڑ خرچ کر دینے سے جو اپنی طرف سے ہو افضل ہے"[2]۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں کہ :۔

"صوفیائے خام ذکر وفکر کو اہم المہام سمجھ کر فرائض وسنن کی ادائیگی میں تساہلی برتتے ہیں، چلّوں اور ریاضتوں کو اختیار کر کے جمعہ وجماعت ترک کر دیتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ جماعت کے ساتھ ایک فرض نماز کی ادائیگی، ان کے ہزاروں چلّوں سے بہتر ہے، ہاں ذکر وفکر جو آداب شرعی کے مراعات کے ساتھ ہوں بہت بہتر اور ضروری ہے، ناقص علماء بھی نوافل کی ترویج میں کوشاں رہتے ہیں اور فرائض کو خراب وابتر رکھتے ہیں"[3]۔

میر محمد نعمان کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"اس گروہ (صوفیاء) میں ایک جماعت ہے، جو نماز کی حقیقت سے آگاہ اور اس کے کمالات

---

[1] مکتوب ۴۰/۱ بنام شیخ محمد چتری۔ [2] مکتوب ۱۱۴/۱ بنام صوفی قربان [3] مکتوب ۲۶۰/۱ بنام مخدوم زادہ شیخ محمد صادق

مخصوصہ سے واقف نہیں ہوسکی، وہ اپنے امراض کا علاج دوسری چیزوں سے ڈھونڈتی اور اپنے مقاصد کا حصول دوسرے امور سے مربوط سمجھتی ہے، بلکہ ان میں سے ایک گروہ نماز کو دوراز کار سمجھتے ہوئے اور اس کو غیرت و غیریت پر مبنی سمجھتے ہوئے روزے کو نماز سے افضل سمجھتے ہیں کہ اس میں صفت صمدیت کا ظہور ہے، اور ایک جم غفیر اپنے اضطراب کی تسکین سماع و نغمہ ـــ وجد و تواجد سے تلاش کرتی ہے، اور رقص و رقاصی کو بھی کمال سمجھ لیا ہے، کیا انھوں نے نہیں سنا کہ "ما جعل اللہ فی الحرام شفاءً" (اللہ تعالیٰ نے حرام چیز میں شفا نہیں رکھی) اگر ان پر ان کمالات کا جو نماز سے حاصل ہوتے ہیں، ایک شمہ بھی منکشف ہوجاتا تو وہ سماع و نغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد و تواجد کو یاد نہ کرتے۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند[1]"

ایک جگہ اس صفائی نفس کا ذکر کرتے ہوئے جو غیر مسلموں اور فسق و فجور میں مشغول رہنے والے مرتاضوں کو حاصل ہوتی ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"حقیقی تصفیہ و تزکیہ اعمال صالحہ کے کرنے پر موقوف ہے، جو مالک کی مرضیات میں شامل ہوں اور یہ بات بعثت پر موقوف ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، پس بغیر بعثت کے حقیقی تصفیہ و تزکیہ میسر نہیں آسکتا، وہ صفائی جو کفار و اہل فسق کو حاصل ہوتی ہے، وہ نفس کی صفائی ہے، قلب کی صفائی نہیں، صفائی نفس سوائے ضلالت کے کسی اور چیز کو نہیں بڑھاتی، اور سوائے خسارت کے کوئی اور راستہ نہیں دکھاتی، باقی بعض امور غیبی کا کشف جو کفار و اہل فسق کو صفائی نفس کے وقت کبھی حاصل ہوجاتا ہے، وہ استدراج ہے جس کا حاصل بربادی اور خسارہ کے علاوہ اس جماعت کے حق میں کچھ نہیں[2]"

سالک و عارف سے تکلیف شرعی کے سقوط اور فرائض و احکام شریعت کی پابندی سے اس کو چھٹی مل جانے کے خطرناک عقیدہ کی جو پوری شریعت کو ختم کردینے کے لئے ایک آتش گیر مادہ

---

[1] مکتوب نمبر ۲۶۱/۱ بنام میر محمد نعمان [2] مکتوب نمبر ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ۔

یا سرنگ کا کام انجام دے سکتا تھا، کی تردید کرتے ہوئے، ــــ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"متصوفین خام اور ملحدین بے سرانجام اس فکر میں ہیں کہ اپنی گردنوں کو شریعت کی طوق غلامی سے آزاد اور احکام شرعیہ کو عوام کے ساتھ مخصوص بنا دیں، ان کا خیال ہے کہ خواص صرف معرفت کے مکلف ہوتے ہیں، جیسا کہ امراء و سلاطین محض عدل و انصاف کے مکلف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ شریعت پر عمل کرنے کا مقصد حصول معرفت ہے، جب معرفت میسر آگئی تکلیفات شرعیہ ساقط ہوگئیں اور اپنے استدلال میں یہ آیت پڑھتے ہیں:۔

"وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ"[1] اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔

ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہوئے کہ حلّت و حرمت میں صوفیاء کا عمل سند نہیں تحریر فرماتے ہیں:

"صوفیاء کا عمل حلت و حرمت میں سند نہیں، کیا اتنا کافی نہیں کہ ہم ان کو معذور رکھیں اور ملامت نہ کریں، اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں، اس معاملہ میں تو امام ابو حنیفہؒ امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول معتبر ہے، نہ کہ ابو بکر شبلی، ابو الحسن نوری کا عمل، اس زمانہ کے صوفیاء خام نے اپنے پیروں کے عمل کو بہانہ بنا کر سرود و رقص کو اپنے دین و ملت کے طور پر اختیار کیا ہے، اور اس کو طاعت و عبادت بنا لیا ہے "اِتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا" (انھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے)[2]"

مجدد صاحب کی یہ حمایتِ شریعت حمیت کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، اور جب وہ کتاب و سنت اور جمہور اہل سنت کے عقیدہ کے خلاف کوئی صوفیانہ تحقیق یا حال سنتے اور اس کی سند تصوف کی کسی کتاب یا بزرگوں کے احوال و اقوال سے لائی جاتی تو ان کی رگِ فاروقی حرکت میں آجاتی اور ان کے قلم سے حمایت شریعت اور غیرت سنت کا طوفان امنڈ پڑتا،

---

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام میاں شیخ بدیع الدین [2] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبد اللہ و عبید اللہ۔